READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
نئے افق کراچی
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1

ہجر و فراق کے رنگوں سے مزین

نائلہ طارق کا سلسلے وار ناول

شب آرزو تیری چاہت میں

جلد حجاب کے صفحات کی زینت بنے گا

عشق و محبت کے انداز بھی
تو جدائی کے جاں گسل لمحات بھی ہیں

غم جاناں، غم دوراں کی بھرپور عکاسی کرتا
یہ ناول آپ کی سوچ کو نیا رخ عطا کرے گا

نئے افق
مدیر اعلیٰ
مشتاق احمد قریشی
مدیر
عمران احمد
مدیر معاون
اقبال بھٹی
طاہر احمد قریشی
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
رکن چیمبر آف کامرس
NAEY UFAQ
PUBLICATION
پاکستان (فی پرچہ)........50روپے
پاکستان (سالانہ)........500روپے
اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242
جلد 40
شمارہ 11
اکتوبر 2016
aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ”نئے افق“ پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 بے کے اور مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل editorufaq@aanchal.com.pk

مشتاق احمد قریشی

امریکہ کی بھارت پر مہربانی کیوں......؟

بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی نے جو ایک دہشت گرد تنظیم کے سربراہ بھی ہیں غالباً اب فیصلہ کرلیا ہے کہ بھارتی حکومت کو بھی ایک دہشت گرد حکومت میں تبدیل کر کے ہی دم لیں گے۔ شاید اسی لیے انہوں نے گزشتہ دنوں امریکا کو نا صرف اپنے فوجی اڈے بوقت ضرورت استعمال کرنے کی اجازت دی اور ایک دوسرے معاہدے کے تحت امریکا بھارتی فوجیوں کی خدمات بھی حاصل کرسکتا ہے۔ امریکا جو خطے میں چین کے بڑھتے ہوئے اثرات سے خوف زدہ ہے اسے خطرہ لاحق ہورہا ہے کہ اس کا دنیا پر بلاشرکت غیرے حکمرانی کا خواب چین کی مداخلت سے کہیں بے تعبیر ہی نہ رہ جائے' ویسے بھی امریکی منصوبہ سازوں کی منصوبہ بندی کے مطابق روس کو منتشر اور کمزور کرنے کے بعد اب ان کا ہدف چین ہے جو ترقی کے ہر میدان میں آگے ہی آگے بڑھتا جارہا ہے اور وہ بھی امریکی آشیرواد کے بغیر، چین نے دنیا کے دیگر ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں بہت کم عرصے میں نا صرف قدم جمالیے بلکہ بتدریج چھاتا ہی چلا جارہا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سپر پاور بن کر امریکا کے شانہ بشانہ کھڑا ہورہا ہے۔ یہ بات امریکا اور اس کے حواریوں کے حلق سے نہیں اتر رہی کسی ہڈی کی طرح ان کے حلق میں پھنس کر رہ گئی ہے۔

بھارت کی سرحد بھی چین سے ملتی ہے گو کہ پاکستان کی سرحد بھی چین سے ملتی ہے لیکن پاک چین بے مثال دوستی کا اندازہ امریکا کو بخوبی ہے پاکستان بھارت کی مانند کبھی بھی چین کے خلاف امریکا کا آلہ کار نہیں بن سکتا، اب جبکہ چین پاکستان میں ایک بڑی سرمایہ کاری کررہا ہے جو تقریباً چھیالیس ارب ڈالر کی ہے اس سے پاک چین راہداری سی پیک کی تکمیل ہوگی یہی وہ وجہ ہے جس نے بھارت اور امریکا کو بے چین کردیا ہے امریکا نہیں چاہتا کہ خطے میں کسی بھی طرح امریکی اثر ورسوخ کی جگہ چین کا اثر ورسوخ بڑھے پاکستان کے ایک طرف امریکا کا مقبوضہ افغانستان ہے تو دوسری طرف پاکستان کا ازلی دشمن بھارت ہے جو اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ نہیں چاہتا کہ کسی بھی طرح سی پیک منصوبے کی تکمیل تو دور کی بات ابتدا ہی نہ ہو بھارت نے سی پیک منصوبے کو روکنے اور اس کے اثرات کم کرنے کے لیے ہی امریکی شہہ پر ایران سے چاہ بہار معاہدہ کیا ہے امریکا چین کے مدمقابل آئے اسے سبق سکھانے کے لیے بھارت کا استعمال کرنا چاہ رہا ہے جس طرح اس نے روس کے لیے پاکستان کو استعمال کیا تھا۔ چین اپنی جانب بڑھتے ہوئے امریکی خطرے کا بخوبی اندازہ کررہا ہے اور وہ اس کا تدارک بھی کررہا ہے اس کے سامنے روس کا حشر بھی ہے امریکی منصوبہ سازوں نے جس طرح ہوشیاری سے روس کے خلاف پاکستان کی افواج کو استعمال کیا اور روس کو نا صرف افغانستان سے بے دخل کیا بلکہ روس کو اس کے گھر پہنچانے اور منتشر کرنے کا کام بھی پاکستانی افواج سے ہی لیا اب ایسا ہی ڈرامہ جلد شروع ہونے والا ہے جس کے لیے امریکا نے بھارت سے اسٹریٹجک معاہدہ کیا ہے جس کے تحت بھارت امریکا کو اپنی سرزمین اور امریکی افواج کو اپنے اڈے اور فوجی جوان فراہم کرے گا۔ اس معاہدے کے ذریعے امریکا چین کے مدمقابل آنا چاہتا ہے جس

طرح پاکستان کو افغانستان میں موجود روسی افواج کے خلاف استعمال کیا تھا جبکہ حقیقت وہاں بھی کچھ اور تھی پاکستان کی پشت پر ہاتھ رکھ کر ایک بڑی اور اپنی ہم پلہ سپر پاور کے سامنے کھڑا کر دیا تھا اللہ نے پاکستان کی حفاظت فرمائی ورنہ امریکا نے تو اپنے طور پر پاکستان کو جہنم میں جھونک ہی دیا تھا۔

بھارت چونکہ ایک غیر اسلامی ملک ہے اس لیے اس کی حفاظت بھی امریکا کے پیش نظر ہے پاکستان تو اپنے اسلامی تشخص کے باعث کلیسا کی آنکھوں میں کھٹکتا ہی رہتا ہے اس لیے غالباً اگر چین سے معرکہ ہوا تو امریکا بھارت کے شانہ بشانہ کھڑا نظر آئے گا کیونکہ وہاں کوئی جنرل ضیاء الحق نہیں جو اسلام کے نام پر مرمٹنے کو ہر دم تیار رہتا تھا۔ جو آنکھیں بند کر کے اس فساد میں کود پڑا تھا بھارت میں تو نریندر مودی اور اس کے قبیلے کے ہی لوگوں کا راج ہے۔ اگر بھارتی راجیہ سبھا اس اسٹریٹیجک معاہدے کی توثیق کر دیتی ہے تو امریکا اس معاہدے کے تحت مستقبل میں بحر الکاہل اور بحر ہند کے خطے میں اپنی بحری افواج کی بڑی قوت جمع کرنا چاہتا ہے جو تقریباً ساٹھ فیصد تک ہو سکتی ہے اور ان کے لیے وہ بھارتی اڈوں کو استعمال کرے گا۔

امریکا کے ان معاہدوں کو اگر بغور دیکھا جائے تو بات سمجھ میں آسانی سے آسکتی ہے امریکا جو کل تک پاکستان کو اپنی کالونی بنائے ہوئے تھا اور سمجھتا تھا کہ پاکستان کو وہ جس طرح چاہے اپنی انگلیوں پر نچا سکتا ہے لیکن پاک چین راہداری نے اس کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا ہے امریکی اجازت و علم کے بغیر ایک غلط فہمی جو ہر قوت کے حصول سے دور ہوئی تھی اب وہ جہاں سی پیک کی تکمیل نہیں چاہ رہا وہیں پاکستان کو کوئی سبق بھی دینا چاہتا ہے اس لیے کہ افغانستان جہاں وہ خود قابض ہے اور بھارت کو بھی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت افغانستان کے مختلف شعبوں میں دو ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے دی ہے اس کے بعد ہی امریکا نے بھارت سے یہ اسٹریٹیجک معاہدات کیے ہیں تاکہ پاکستان پر دو طرفہ دباؤ ڈالا جا سکے اور پاکستان سی پیک منصوبے سے باز رہے جبکہ چین اور پاکستان امریکی من مانی ماننے کو قطعی تیار نہیں ہیں۔ امریکا کی اس چال کو سمجھتے ہوئے ہی چین کے ایک اہم تھنک ٹینک کے ڈائریکٹر ہوشی شینگ نے بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کی تقریر کے حوالے سے اپنے شدید خدشات کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ چین کو خدشہ ہے کہ بھارت بلوچستان میں اپنے لوگوں کے ذریعے مداخلت کر رہا ہے تاکہ سی پیک پر کام شروع نہ کیا جا سکے۔ بھارت کی جانب سے بلوچستان میں دراندازی دراصل سی پیک منصوبے کو نقصان پہنچانے کے لیے کی جا رہی ہے جبکہ چین نے اس عظیم سی پیک منصوبے کو بچانے بنانے اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا ہر قیمت پر فیصلہ کر لیا ہے چین، بلوچستان میں بھارتی مداخلت کے معاملے کو اقوام متحدہ میں بھی اٹھا سکتا ہے۔ چین کو بھارت اور امریکا کے بڑھتے ہوئے تعلقات پر شدید تحفظات ہیں وہ سمجھ رہا ہے کہ بھارت چین کے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ اس سے قبل چین اور بھارت اپنے تنازعات نمٹانے کے لیے ایک دوسرے کے قریب آ رہے تھے۔ اب امریکی مداخلت سے صورت حال بتدریج بدل رہی ہے اور عسکری قوتوں کا آمنے سامنے آنے کا خطرہ لحہ لحہ بڑھتا جا رہا ہے جو عالمی جنگ میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے دنیا کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔ اللہ وطن عزیز کی حفاظت فرمائے اور دشمنوں کا منہ کالا کرے، پاکستان کا بول بالا کرے آمین۔

عمران احمد

> "حضرت انسؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ جس شخص میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کا مزہ پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو سب سے زیادہ ہو۔ دوسرے یہ کہ صرف اللہ کے لیے کسی سے دوستی رکھے تیسرے یہ کہ دوبارہ کافر بننا اسے اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں جھونکا جانا۔"
> (البخاری، باب حلاوۃ الایمان)

عزیزان محترم..... سلامت باشد

اکتوبر کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے، جس وقت آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں گے لاکھوں مسلمان فریضہ حج ادا کر چکے ہوں گے اور ہمارے ہاں لوگ قربانی کے جانوروں کی تکا بوٹی کر رہے ہوں گے۔ یہ اسلامی سال کا آخری مہینہ ہے یہ اسلام ہی کی شان ہے کہ ہجری سال کی ابتدا بھی قربانی سے اور اختتام بھی قربانی سے ہوتا ہے۔ رب کریم ہمیں ان قربانیوں کا پس منظر سمجھنے کی توفیق دے۔

اس ماہ قارئین کی اکثریت نے پرچا لیٹ ملنے کی شکایت کی ہے دراصل بعض تکنیکی مجبوریوں کے باعث نئے افق اب آنچل کے ساتھ پوسٹ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے پرچا آپ کو تاخیر سے مل رہا ہے، دوسرے لفظوں میں اب نئے افق اور آنچل آپ کو ساتھ ساتھ ملیں گے۔

ریاض حسین قمر..... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم امید ہے آپ بمع اپنے محنتی اور فرض شناس عملہ کے خیریت سے ہوں گے دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد گفتگو کی محفل میں حاضر ہوں غیر حاضری کی بڑی وجہ تو حادثہ تھا جو ہمارے ساتھ 27 مئی کو اسلام آباد میں پیش آیا دوسری وجہ جریدہ کی میر پور آزاد کشمیر اور دینہ ضلع جہلم میں عدم دستیابی تھی میر آزاد کشمیر میں النور بک کارنر پر پرچہ دستیاب ہوتا تھا یا دینہ میں سید نیوز ایجنسی سے پرچہ مل جاتا تھا مگر جولائی اور اگست کا پرچہ دونوں جگہوں سے نہ ملا ماہ ستمبر کا پرچہ بڑے ہی دلکش ٹائٹل کے ساتھ میرے سامنے ہے ایک درخت کی ٹہنی پہ بیٹھا کبوتروں کا خوب صورت جوڑا اور اسے ٹہنی سے کلاک بارہ بجا کر نہ جانے کیا کہہ رہا ہے۔ اس کے نیچے خوب صورت دوشیزہ کا چہرہ اور پیچھے خوب صورت منظر اتنا اچھا ٹائٹل دینے پر دلی مبارکباد ٹائٹل کے سحر سے نکلے تو دستک تک آ پہنچے دستک میں محترم مشتاق قریشی جیسی زیرک ہستی نے جس طرح کشمیریوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے یہ صرف ان ہی کا حصہ ہے انہوں نے اپنے طور پر پاکستانی حکمرانوں کو جھنجوڑنے کی کوشش کی ہے خدا کرے کہ یہ بات ان کی سمجھ میں آ سکے ایک طرف بھارت ہمارے نہتے مسلمان کشمیری بھائیوں کے خون سے ہولی کھیل رہا ہے دوسری طرف ہمارے حکمرانوں پر بھارت سے پیار کی پینگیں بڑھانے کا بھوت سوار ہے خدا انہیں اپنی قدرت کاملہ سے ہدایت عطا فرمائے عمران بھائی گفتگو کے آغاز میں آپ نے بہت پیاری حدیث مبارک ہمارے گوش گزار کی اللہ کریم آپ کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے، آمین۔ آپ نے دکھی دل کے ساتھ سانحہ کوئٹہ کا ذکر فرمایا ہے اور سوال کیا ہے کہ ہم اٹھارہ کروڑ لوگوں کی قوم ہیں یا اتنے لوگوں کا انبوہ کثیر تو بھائی میرے خیال میں ہم اٹھارہ کروڑ لوگوں کا انبوہ کثیر بھی نہیں ہم تو اٹھارہ کروڑ لوگوں کی بکھری ہوئی ٹولیاں ہیں جن

کی کروڑوں زبانوں سے آگ نکل رہی ہے تازہ ترین واقعہ جس میں اس پیارے پاکستان اس کی مسلح افواج اور نجانے اور کتنے اداروں پر پاکستان کی تاریخ کا بدترین زہر اگلا گیا اور جس طرح توڑ پھوڑ کی گئی کیا یہ قابل معافی جرم ہے مگر ہم حرص نسیان کا شکار ہیں کوئی بات ہمیں دو دن سے زیادہ یاد نہیں رہتی ۔ ہم غداروں کو معاف کرنے کی قبیح عادت میں مبتلا ہیں جب حکومت وقت نے مجیب الرحمان کو پکڑا تو پاکستان کی ایک مشہور ہستی نے اسے رہا کرایا اور ہم اتنی قربانیوں سے حاصل کیے گئے وطن عزیز کو ہم نے دو ٹکڑے کر دیا اور پھر اقتدار کی بھنگ پی کر سو گئے کمیشن بنے اور لاک اپ ہو گئے دعا ہے اللہ ہمیں اس خواب غفلت سے بیدار فرمائے آمین ۔ کرسی صدارت کے مزے لوٹتے پیارے بھائی ریاض بٹ صاحب نظر آئے ریاض بٹ صاحب اس بار آپ نے اتنی پیاری کہانی خون کی گواہی ہمیں پڑھنے کو دی جب آپ کی کہانی چھپی ہو تو میرے جیسے ہی قارئین آپ کی کہانی سب سے پہلے پڑھتے ہیں یہ ہوئی نہ دلوں پر راج کرنے والی بات میری طرف سے بہت بہت مبارک جولائی کے شمارے میں آپ نے جس انداز سے مجھ سے معذرت کی اس نے مجھ ناچیز کو شرمسار کر دیا بھائی بھائیوں سے اس طرح معذرت نہیں کرتے بہر حال غزل پسند فرمانے پر میں بے حد شکر گزار ہوں ۔ کرسئ صدارت کے پاس ہی بیٹھے جناب عبدالحمید صاحب نے بھی اپنے خوب صورت تبصرہ کا رنگ جمایا ہے انہوں نے لائق صد احترام جناب عبدالستار ایدھی مرحوم و مغفور کو جس طرح نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے وہ بہت خوب ہے اتنے اچھے خیالات کا اظہار کرنے پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں ایم حسن نظامی صاحب کا تبصرہ خوب ہے نوبہار علی بھائی قاری نے مخصوص وقت میں اپنا تبصرہ بھیجنا ہوتا ہے اس مخصوص وقت میں مکمل جریدہ کا مطالعہ کر لینا ناممکنات میں سے ہے پھر ہر قاری اپنے پسند کے رائٹر کی کہانی پڑھتا اور اس پر تبصرہ کرتا ہے آپ پورے خطوط کا مطالعہ کریں تو ان میں آپ کو تقریباً ہر شائع ہونے والی کہانی پر تبصرہ ملے گا پیارے ظہور احمد صائم بھائی آپ نے میری محفل میں غیر حاضری کو محسوس کیا میں آپ کا شکر گزار ہوں اور جس انداز میں آپ نے میری غزل کو پسند فرمایا میں اس پر تہہ دل سے آپ کا ممنون ہوں حق نواز صاحب اور جناب ثناء اللہ صاحب پہلی بار محفل میں مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائے دونوں بھائیوں کو ست بسم اللہ جی آیاں نوں موسٹ ویلکم اور پھیر اغلے آئندہ بھرپور تبصروں کے ساتھ تشریف لایئے گا شکریہ خواجہ حسین بھی مختصر خط کے ساتھ تشریف لائے ہیں ۔ منچن آباد کے شہزادے حسین جاوید آپ نے اتنا پیارا تبصرہ کر کے مجھ جیسے کتنے ہی لوگوں کو خرید لیا ہے تبصرے کا یہ منفرد انداز صرف اور صرف آپ ہی کو زیب دیتا ہے آپ نے جس طرح میرے کلام کو پذیرائی بخشی اس کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں آپ نے مجھ ناچیز کی ہستی کو جس انداز سے عزت بخشی میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں رب ذوالجلال آپ کو سدا خوش و خرم رکھے آمین ۔ عامر زمان عامر صاحب رب کریم نے آپ کو جس نعمت سے نوازا ہے اس پر آپ کو ہماری پیاری بہنا ریحانہ عامر کو بہت بہت مبارک خدائے لم یزل نومولود کو آپ اور آپ کے خاندان کے لیے قابل فخر بنائے آمین ۔ جناب احسن ابرار رضوی کا تبصرہ خوب جاندار اور شاندار ہے محترم ایم راحیل صاحب کا غصہ بھرا خط پڑھا دکھ ہوا بہر حال ادارہ کی وضاحت سے انہیں مطمئن ہو جانا چاہیے کوئی بھی ادارہ صرف پانچ سو روپے کی خاطر اپنی ساکھ داؤ پر نہیں لگاتا اور نئے افق جیسا ادارہ جو جناب مشتاق احمد قریشی جیسے مخلص نیک اور صاحب اصول انسان کے زیر سایہ چل رہا ہے اس سے تو کسی غلط بات کی توقع تک نہیں کی جاسکتی ۔ مجید احمد جائی صاحب ایک اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے محترمہ صائمہ نور کا تبصرہ جاندار بھی تھا اور شاندار بھی عبدالجبار رومی انصاری نے بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا محترم فلک شیر ملک اور پرنس افضل شاہین کے خط بہت خوب صورت تھے محترم ممتاز احمد صاحب نے اپنے خط میں بہت خوب صورت خیالات کا اظہار

فرمایا ویلڈن محترم آپ نے میرے کلام کو پسند فرمایا اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں محترم جناب عمران صاحب اس شمارے میں آپ نے 19 چھوٹے بڑے خطوط کو جگہ دے کر بہت اچھا کیا ہے۔ سلسلہ اقرا تو پرچے کی جان ہے جو ذہنوں میں ایک پاکیزہ خیالات کو جنم دیتا ہے خوش بوئے سخن میں منتخب کلام ایک سے بڑھ کر ایک ہے اور ذوق آگہی میں قیمتی موتیوں کو یکجا کیا گیا ہے ایک سو سولہ چاندکی راتیں سلسلہ شروع کر کے آپ نے بہت اچھی مثال قائم کی ورنہ آج کا نوجوان تو اپنے کانوں میں ہیڈ فون ٹھونسے اس پاک سرزمین کی دھرتی کی سڑکوں پر دندناتا پھرتا ہے اسے معلوم ہی نہیں کہ اسے اتنی آزدی سے اپنی سڑکوں پر مٹر گشت کرنے کا موقع فراہم کرنے والا ملک حاصل کتنی قربانیوں کے بعد ہوا ہے۔

☆ ریاض صاحب یاد کرنے کا شکریہ، آپ نے جن دو ایجنسیوں کا تذکرہ کیا ہے نئے افق باقاعدگی سے انہیں جاتا ہے ہم نے آپ کا خط ملنے کے بعد انہیں آپ کی شکایت سے آگاہ کر دیا ہے آپ بھی اپنے طور پر انہیں یاددہانی کرادیں، ان شاء اللہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔

مجید احمد جائی ......ملتان شریف۔ مزاج گرامی! تمام اہل ایمان کو عیدالاضحیٰ بہت بہت مبارک ہو۔ جب اکتوبر کا نئے افق مارکیٹ میں آئے گا عید گزر چکی ہوگی۔ ہم تو روز ہی قربان ہوتے ہیں کبھی اپنوں کے ہاتھوں، کبھی دشمنوں کے ہاتھوں۔ سڑکیں قربان گاہ بنی ہوئی ہیں، بازار خون سے رنگین ہیں، مسجدیں جہاں خطبے پڑھے جاتے ہیں، نمازیں پڑھی جاتی ہیں، عبادات ہوتی ہیں، ویران سی ہو رہی ہیں، دہشت ہے، خوف ہے، کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں سے بے گناہوں کے خون کی خوشبو نہ آتی ہو، روز ہم یتیم ہوتے ہیں، ہم تو آئے روز قربانی دیتے ہیں اپنوں بچوں کی، اپنے پیاروں کی، اپنے سہاگوں کی، اپنے آنچلوں کی، یا اللہ! بس کرم فرمادے۔ امن فرمادے آمین ثم آمین۔ دل غمگین کے ساتھ حال احوال سے اپنا تبصرہ شروع کرتا ہوں، آپ سب کیسے ہیں؟ اُمید فضل ربی ہے خیر خیر یت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سکھی اور چاہتوں بھری زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے، غریبوں، مسکینوں، یتیموں کے ساتھ احسن سلوک سے پیش آنے اور محبتیں دینے کی توفیق عطا فرمائے، ایمان کی سلامتی کے ساتھ، صحت کی سلامتی قائم رہے اور یونہی ہنستے مسکراتے رہیں۔ آمین ثم آمین ماہ ستمبر کا نئے اُفق لیٹ ملا، جانے کیا وجوہات رہی ہوں گی۔ ہم تو انتظار کے کیکر پہ اُلٹے لٹکتے رہے، پکارتے رہے کدھر ہو، کہاں ہو، کوئی بتائے۔ کہاں پندرہ تاریخ سے پہلے مل جاتا تھا اور آج کہاں 24 اگست کو ملا۔۔ نئے افق ہاتھوں میں آیا تو بے قراری کے ساتھ سرورق پہ نظریں ٹکائی اور نظریں وہاں ہی ٹکی رہیں، اتنا خوبصورت ٹائٹل پیش کرنے پر ممنون ہیں، سوکھے شجر پہ پھولوں کی بیل کہاں سے چڑھ آئی ہے جس نے سوکھے پیڑ کو جوانی یاد دلا دی اور کبوتروں کا جوڑا، شاخ پہ بیٹھا دُنیا کی ظالم نظروں سے بے نیاز عشق و محبت کی چونچیں لے رہا ہے۔ اللہ کرے، ان پرندوں اور جانوروں کی محبتیں قائم رہیں اور کسی شکاری کی نظر بد نہ پڑے۔ گھڑیال بارہ بجا چکا اور دوشیزہ ننگے سر، کھلے بالوں کے ساتھ کن اکھیوں سے شکار کو نظر پہ رکھے ہوئے ہے۔ ویلڈن۔ دستک میں جناب محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے پاکستانی حکومتوں کے خوب لتے لئے ہیں، ان کو شرم دلانی ہی چاہیے اگر ان کو شرم نہ آئی تو پاکستان بھی آزادی کی جنگ پھر سے لڑ رہا ہوگا۔ افسوس کن بات تو یہ ہے عالمی برادری بھی کانوں میں روئی ٹھونسے بیٹھی ہے اور آنکھوں سے اندھے ہو چکے ہیں۔ گفتگو میں ریاض بٹ صاحب بہترین اور خوبصورت جملوں سے مزین خط کے ساتھ سر فہرست تھے اور سج دھج کے آئے ہیں۔ ہمیں یاد رکھا ممنون ہوں، ملتان کی گرمی کا حال کیا بتائیں جناب، آجائیں اور محسوس کریں، ہم تو عادی ہو چکے ہیں اور ویسے جس طرح سمندر کنارے کھڑے شخص کو سمندر کی گہرائی معلوم نہیں ہوتی اسی طرح آپ بھی گرمی کی حدت محسوس نہیں کر پائیں

گے آئیں اور نظارے دیکھیں۔ عبدالحمید بھی غیر حاضری کے بعد طویل خط کے ساتھ حاضر تھے۔ گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کے پاس معلومات کا بے پناہ خزانہ موجود ہوتا ہے۔ ایم حسن نظامی بھی خال خال نظر آتے ہیں، جب نظر آتے ہیں تو نگاہوں میں سما ہی جاتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنے کا شکریہ۔ ظہور احمد صائم، مانگا منڈی کہاں رہتے ہیں، بھائی وہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں، ہم وہاں ایک عرصہ گزار کے آئے ہیں آپ ریگولر آیا کریں ناں۔ حسنین جاوید نے تفصیلی اور مدلل خط لکھا۔ یاد رکھنے کا شکریہ، احسن ابرار رضوی بھی متواتر زبردست لکھ رہے ہیں اور اس بار ایم اے راحیل کچھ زیادہ ہی جلے کٹے میٹھے ہیں اور کھری کھری بلکہ کڑوی کڑوی سنا رہے ہیں، کول ڈاؤن ڈیئر۔ مجھے نا ٹکنے کا شکریہ اور صائمہ نور مختصر مگر جاندار خط لکھتی ہیں۔ عبدالجبار روی انصاری جیتے رہو، آپ کا ایس ایم ایس بلاناغہ موصول ہوتا ہے اور شادی کی مبارک باد قبول ہو۔ محمد رفاقت آپ بھی سپر جا رہے ہیں۔ پرنس افضل شاہین، بروار گلاں چنگیاں نیں، جو غیروں کی باتوں پہ بندوق تانے کھڑے ہو۔ پیارے ممتاز احمد آپ کا خط بازی لے گیا، اور نئے افق میں پہلی کہانی کی اشاعت پہ بہت بہت مبارک باد قبول ہو، چند ساتھی کہیں غائب ہو گئے ہیں جن میں احسان سحر، گل ناز، ناز شگوش ذیشے، جاوید احمد صدیقی، ریاض حسین قمر، شامل ہیں، جہاں بھی ہیں لوٹ آئیں۔ اقراء میں طاہر قریشی اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کے بارے میں ذکر کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو اجر عظیم عطا فرمائے اور ہمیں عمل کرنے ۔ انٹرویو میں جناب محمد یاسین صدیق صاحب اور اُن کے ساتھ شامل پینل میں سبھی ساتھیوں نے خوبصورت سوال کیے ہیں اور میں داد دیتا ہوں رزاق شاہد کوہلر صاحب کو جنہوں نے تفصیلی جواب دے کر نہ صرف ہمارا مان بڑھایا بلکہ تشنگی کم کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، میں اُن کا شکر گزار ہوں کہ نہ صرف وہ میرے بہترین دوست ہیں بلکہ اُن کا ناول میری لائبریری کی زینت بن چکا ہے۔۔ یہ اُن کی محبتیں ہیں۔ میں رزاق شاہد کوہلر سے درخواست گزار ہوں کہ وہ ہمیں اپنے ناول، اور کتابیں لائبریری کے لئے عنایت کریں تاکہ میرے علاقے کے لوگ اُن سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ انٹرویو کے ساتھ ایک دو تصویریں ہوتیں تو دیدار بھی ہو جاتا۔ کہانیوں میں وقت آزادی، غریب شہر فغاں، خون کی گواہی ریاض بٹ جرم وسزا کے بہترین لکھاری ہیں اور اس طرح جناب ممتاز احمد آف سرگودھا کو کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ اُن کو جو بھی موضوع دیا جائے دوسرے دن تحریر حاضر ہوتی ہے۔ یاسین صدیق صاحب میں آپ کا منتظر ہوں۔ باقی تحریریں پڑھنی باقی ہیں، مصروفیات کا عذاب نازل ہے اور نئے اُفق کی محبت لکھنے پہ مجبور کرتی ہے۔ سو محبت کی خاطر حاضری یقینی ہونی چاہیے ناں۔ ذوق آگہی، خوش بوئے سخن بھی زبردست رہے۔ اجازت، بشرط زندگی ملاقات پھر ہوگی۔ جاتے جاتے پوچھنے کی گستاخی کروں گا کہ ماہ اپریل میں بذریعہ ای میل "عذاب مسلسل" کہانی بھیجی تھی جس کی ابھی تک کوئی خیر خبر نہیں۔ میں مزید انتظار کروں یا پھر کہیں اور جریدے کو دے دوں۔؟ جواب کا منتظر

☆ تھوڑا انتظار کرلیں تو بہتر ہے۔

جاوید احمد صدیقی..... راولپنڈی۔ محترم اچھے عمران جی و اقبال بھٹی صاحب السلام علیکم بڑی تگ ودو کے بعد ستمبر کا شمارہ ملا ٹائٹل پر حسینہ مہ جبینہ آنکھوں میں سپنے سجائے وقت کے ظالم پنجوں سے بچنے کے سپنے دیکھ رہی تھی۔ زبردست تبدیلی سنجیدگی اور محبت کا چھلکتا شاہکار اب ہمارا نئے افق ہے آپ نے ایک سو سولہ چاند کی راتیں کا تعارف کرایا اور پہلی قسط پڑھ کر یہ تفصیل حرف بہ حرف صحیح معلوم ہوئی آگے آگے دیکھیے، ریاض بٹ صاحب کہانی تو زبردست لائے ہیں زبردست مگر پنڈی سے ایک گھنٹہ کے فاصلہ پر ہونے کے باوجود پورے خط میں ہمارا ذکر خیر ہے ہی نہیں؟ یعنی چراغ تلے اندھیرا عبدالحمید صاحب کا خط تو نوے فیصد ایدھی کے تذکرے سے بھرا ہوا تھا ہمارا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ نو بہار علی صاحب ذرا ان چند رائٹرز کا ذکر خیر بھی کر دیتے تو اچھا تھا اتنا بھی یک

طرفہ چشمہ بڑھا کر نہ دیکھیں۔ حسین جاوید کا تبصرہ بھرپور متوازن اور گہرائی لیے ہوئے تھا میرے تبصرے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ عامر زمان عامر بھئی بیٹے کی سلامتی لمبی عمر اور تابعداری کی خاص دعا کی گئی ہے۔آپ دونوں کو خوشیاں نصیب ہوں اور مٹھائی خود کھالیں مبارک باد احسن ابرار رضوی اچھا تبصرہ تھا اور یاد کرنے کا شکریہ ایم اے راحیل اتنی بدگمانی اور بے حوصلگی وہ بھی صرف چند سو روپے کے لیے باقی جواب تو ادارہ نے دے دیا مجید احمد جائی آپ کی باتیں خوب تھیں شکریہ بھئی صائمہ نور کا تبصرہ خوب تھا اور عبدالجبار روی خوب تبصرہ اور ذکر کرنے کا شکریہ۔فلک شیر کا ناول بہت ہی قابل تعریف اور دل کے اندر اترنے والا تھا۔ بے حد شکریہ۔ ممتاز احمد کا طویل تبصرہ بڑا پسند آیا ذکر کرنے کے لیے بے حد شکریہ۔ کہانیوں میں اچھا معیار تھا کہنہ مشق رائٹر اور نئے لکھنے والوں کے امتزاج سے نئی بہار آ گئی ہے۔ انٹرویو کو ہلر کا جواب تھا اور اسی بات کے ساتھ محمد یاسین صدیق صاحب کی کاوش تعریف کے قابل ہے فن پارے میں تمام کہانیاں اچھی تھیں اور بہترین رہی امین صاحب کی پھر یاسین صدیق اور پھر نمبر دار آپ لوگوں کی یہ نئی کاوش بے حد سراہی جا رہی ہے اور قابل تعریف بھی ہے اسمگلر میں زیرک اور عقابی نظروں سے مسئلہ حل ہوا انتہائی قابل تعریف تھا۔ امجد جاوید کی طویل کہانی بھی قابل تعریف رہی اور امجد صاحب کا اپنا طرز تحریر تو اور مزہ دے گیا خلیل جبار نے آخر کار فیصلہ بہت مثبت انداز میں کیا۔ بدلتے رنگ قدرت کے فیصلوں سے بھرپور کہانی تھی ممتاز احمد کو مبارکباد عامر زمان عامر کی جال بڑی خوب صورتی سے کہانی کا تانا بانا بنایا گیا تھا اور واقعات کے رواں دواں رہتے ہوئے کہانی اپنے انجام تک پہنچ گئی۔ طلوع سحر ایک پختہ ارادہ اور پختہ ذہن کی کہانی جو آخر جیت جاتی ہے۔ بڑی اچھی کہانی ہے جو طیبہ افتخار کے تخیل کا بلیو پرنٹ ہے۔ وری گڈ زرین قمر کی کاوش انتہائی تعریف کے قابل رہی۔ اور وقت آزادی کشمیر کے اب منظر میں بڑی ہی بہترین لکھی گئی کہانی تھی دستگیر شہزاد کو مبارکباد اسی طرح جرم آزادی بھی خوب رہی۔ فلک شیر فلک کی اور کہانیوں کا سب کو انتظار رہے گا آخر میں ریاض حسین شاہد کی بھرپور کاوش اور انتہائی دل موہ لینے والا طرز تحریر پل صراط عشق لاجواب اور زبردست رہی ریاض صاحب سے ایسے شاہکار لکھواتے رہیے۔ طاہر قریشی کا اقرا میں اللہ جل شانہ پر تفصیلاً لکھی گئی تحریر زندگی کا سرمایہ ہے جزاک اللہ محترم مشتاق احمد قریشی کی لکھی دستک تو کشمیر کے مسئلے کے گرد گھومتی ہے اور جوش و جذبہ کو اجاگر کرتی ہے وادی مقبوضہ کشمیر میں ظالموں کے ظلم کا پردہ بھی چاک کر رہی ہے۔ ذوق آگہی میں انعام یافتہ کو مبارک باد روبی علی نے انتہا سے زیادہ دل میں اتر جانے والی تحریر بھیجی اذان واقعی دنیا میں ہر لمحہ ہر وقت گونجتی رہتی ہے ریاض بٹ کی کاوش زبردست تھی باقی تمام فن پارے زبردست تھے اور خوش بوئے سخن ایک سے ایک بڑھ کر ایک ہے کیوں کہ نوشین اقبال کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ زبردست لیکن ہمارے نئے لکھنے والے کہاں ہیں ان کے نام پھر لکھوں گا صرف پیغام ہے کہ ضرور تشریف لائیں۔

صائمہ نور...... ملتان شریف۔ آداب! اُمید ہے خوشیوں کے ساتھ خوش حال ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر حال میں اپنا شکر گزار بندہ بنائے رکھے اور جسمانی، روحانی بیماروں سے محفوظ رکھے۔ ماہ ستمبر کا شمارہ قدرے لیٹ موصول ہوا۔ سرورق عمدہ اور دیدہ زیب تھا۔ ننگے سر بھورے بالوں والی لڑکی پُر اسرار لگ رہی ہے اور کبوتروں کا جوڑا محبت کرنے میں مصروف ہے۔ دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی کشمیریوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے پاکستان کے حکمرانوں کو جگا رہے ہیں جو ستر سال سے سوئے ہوئے ہیں۔ جن کے کانوں پہ جوں رینگتی تو ہے مگر اپنے تفکرات میں اتنے مصروف ہیں کہ حرکت تک نہیں کرتے۔ بیچارے ملک کو لوٹ کر کنگال کرنے پہ تلے ہوئے ہیں جبکہ ان کی تجوریاں بھری رہتی ہیں۔ ملک قرضوں کے بوجھ تلے دب رہا ہے اور ان کی رقم بیرون ممالک کے

بیٹکوں میں آرام فرما رہی ہے۔ گفتگو میں انکل ریاض بٹ کا خط بہت اعلیٰ تھا، وہ جرم و سزا پہ کہانیاں تو زبردست لکھتے ہی ہیں لیکن تبصرے بھی خوب کر لیتے ہیں۔ عبدالحمید صاحب حسین وادیوں سے آتے ہیں اور معلومات میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو صحت کی بادشاہی کے ساتھ سلامت رکھے آمین۔ ایم حسن نظامی بھی عمدہ لکھتے ہیں حسین جاوید احسن ابرار رضوی، مجید احمد جائی، عبدالجبار روی انصاری، محمد رفاقت، پرنس افضل شاہین، انکل ممتاز احمد، کے خطوط بہت اعلیٰ اور معلومات کا خزانہ لئے ہوئے تھے۔ ایم اے راحیل صاحب اس بار غصے میں تھے۔ غصہ تھوک دیں اور محبت کے ساتھ اپنامدعا بیان کریں، ہم سفارش کرتے ہیں۔ ادارہ آپ کی شکایات دُور کرے گا۔ ثنا اللہ شگی، خواجہ حسین، حق نواز، ظہور احمد صائم، نوبہار علی، ارے بھائی ہمارے ہاں تو بہار نہر بھی بہتی ہے اور مزے کی بات یہ بھی ہے ہم اسلام آباد میں فیصل مسجد میں ملتان صاحب سے بھی مل آئے ہیں۔ اقراء میں طاہر قریشی انکل اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کا تذکرہ کر رہے ہیں، بے شک وہ ذات رحیم ہے، انٹرویو میں رزاق شاہد کوہلر کو پڑھا مزہ آ گیا۔ انٹرویو کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے، تا کہ ہم اپنے ہیروں سے ملاقات کرتے رہیں اور اُن سے سیکھتے رہیں۔ محمد یاسین صدیق داد کے مستحق ہیں کہ وہ محنت سے انٹرویو کرتے ہیں کہانیوں میں خون کی گواہی نے متاثر کیا، بدلتے رنگ، واقعی انسان لمحوں میں بدل جاتا ہے اور خبر تک نہیں ہوتی۔ منزل مراد بہترین تحریر تھی، نیا فیصلہ زبردست رہی، طلوع سحر، وقت آزادی، جرم آزادی، غریب شہر فغاں نے بہت متاثر کیا، ایک سو سولہ چاند کی راتیں پہلی قسط بہت اعلیٰ تھی۔ یورپی کہانی اسمگلر اعلیٰ تھی۔ فن پارے کی تمام تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ذوق آگہی، خوش بوئے سخن، شاندار ہیں۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو سلامت رکھے آمین

فریدہ جاوید فری...... لاہور۔ السلام علیکم۔ میں نئے افق کی بہت پرانی قاری ہوں اور یہ میرا بے حد فیورٹ میگزین ہے اس میں پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ پڑھتی تو ہر ماہ ہوں اور رسائل میں بھی لکھتی ہوں اس مرتبہ سب کے افسانے اور تحریریں بے مثال ہیں یہ سلسلے مہتاب خان، جنت کا خواب سفیان بٹ، عورت ذات کیا غضب کی تحریر تھی۔ امجد جاوید صاحب کی عقیدت کے پھول، قیامت، چندا مندا، عذاب حرص اور تسیم سکینہ جو کہ ہماری بے حد پیاری سی دوس ہیں ان کی دونوں غزلیں بے حد پسند آئیں تسیم جی بے حد سلام اور دعا۔ یہ خط میں اسپتال سے لکھ رہی ہوں بے حد بیمار ہوں میری صحت یابی کے لیے سب دعا کریں اور سب کو دعا اور سلام خاص کر طاہر قریشی صاحب کو۔

احسن ابرار رضوی......ساہیوال۔ السلام علیکم! اُمید کرتا ہوں خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے خیریت سے رکھے اور دُشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے آمین ثم آمین۔ ماہ ستمبر کا نئے افق بہت لیٹ ملا۔ سرورق بہت اعلیٰ بنایا گیا ہے۔ دل کش اور دل کو لبھانے والا۔ محبت کا پیغام دیتا۔ نفرتوں کو بھگاتا۔ امن کا الارم بجاتا بہت پیارا لگا۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی نے کشمیریوں پہ ڈھائے جانے والے ظلم کی داستان سنا کر دل غمگین کر دیا اور حکومت پاکستانی نے ہٹ دھری کا مظاہرہ کر کے اپنا نام خاص غلاموں میں لکھوالیا ہے۔ باتوں سے بادام توڑ لیتے ہیں عملاً! چیونٹی تک نہیں مارتے۔۔۔ کھوکھلے نعرے، کھوکھلی باتیں۔۔۔ کاش! کشمیر میں ان کی بیٹیاں ہلاک ہوئی ہوتیں، ان کے بیٹے معذور ہوئے ہوتے شاید تب ان کو احساس ہوتا۔ دُکھیارے دِل کے ساتھ گفتگو کی محفل میں پہنچے جہاں ریاض بٹ صاحب ہنستے مسکراتے نظر آئے۔ ماشاءاللہ! خط مدلل اور جاندار تھا۔ پرانے ساتھیوں کے ساتھ کچھ نئے لوگ بھی گفتگو کی محفل میں نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو سلامت رکھے۔ مجید احمد جائی آپ کا تبصرہ جاندار ہوتا ہے، آپ کے لفظوں کا چناؤ بہت پیارا ہے۔ آپ کہانیاں کیوں نہیں لکھتے۔؟ مجھے آپ کی کہانی کا انتظار رہے گا۔ صائمہ نور بہن آپ کا خط مختصر اور شاندار ہوتا ہے۔ لگتا ہے آپ کے اندر درد کا سمندر پنہاں

ہے۔آپ کے لفظوں میں درد ہے۔ممتاز احمد صاحب سادہ اسلوب بہت پیارا لکھتے ہیں۔گل مہر آپی کہاں غائب ہیں۔؟ناز شلوش ذیشے بھی منظر عام سے ہٹ گئی ہیں۔منشی محمد عزیز مے کی کسی کو خبر ہو تو مطلع کریں۔احسان سحر آپ کی کمی محسوس کر رہا ہوں، عبدالجبار رومی انصاری، خواجہ حسین، کے تبصرے دل کو بھاتے ہیں، محمد عمر فاروق ارشد کہاں ہیں۔؟ریاض حسین قمر، آپ بھی سن رہے ہیں۔ایم اے راحیل صاحب غصہ تھوک دیں، انعام نہیں ملا تو کیا ہوا۔۔لکھنا تو نہ چھوڑیں۔طاہر احمد قریشی صاحب نے اقراء میں اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کا تذکرہ کر کے ہماری معلومات میں نہ صرف اضافہ کیا ہے بلکہ دل کے نہاں خانوں کو منور بھی کیا ہے۔انٹرویو میں یاسین صدیق اور اُس کے پینل نے خوب محنت کر کے رزاق شاہد کوہلر سے سوالات کیے ہیں۔اور میں داد دیتا ہوں رزاق شاہد کوہلر صاحب کو اُنہوں نے تفصیلی جوابات دے کر تشنگی کو کسی حد تک کم کیا ہے۔کہانیوں میں بدلتے رنگ بہت پسند آئی فن پارے میں غلط فہمی ٹاپ پہ تھی اور باقی تحریریں بھی بہت اعلیٰ تھیں۔ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن بھی اچھے ہیں۔اب تک اتنا ہی پڑھ سکا ہوں۔۔۔۔چند کہانیاں پڑھنی باقی ہیں تبصرے کے لئے معذرت۔

سید عبداللہ توفیق..... حیدر آباد۔ مکری جناب عمران صاحب سلام مسنون آپ کے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر و عافیت کا خواستگار ہوں امید ہے کہ کامل صحت ایمان کے ساتھ اپنے پیشہ ورانہ کام میں مصروف ہوں گے آپ کے اسٹاف کے لوگوں میں جناب اقبال بھٹی اور طاہر احمد قریشی کی خدمت میں محبت و عقیدت بھرا اسلام۔ مزید عید الضحیٰ کے موقع پر آپ سب کے لیے نیک تمنائیں اور تہوار کے لیے میری جانب سے میٹھی و شیریں مبارکبادیں قبول فرمایئے۔گزشتہ ماہ اگست کا پرچہ بصد شوق پورا ہی پڑھ کر فارغ ہو گیا تھا ارادہ تھا کہ تبصرہ لکھ کر بھجوا دوں گا پھر ذرا تساہل کی وجہ سے بزم گفتگو میں شریک نہ ہو پایا پہلا انعامی خط ریحانہ سعیدہ زنانہ نیچر کا آئینہ دار تھا ہم تو اسلامی معاشرے کے ہر اول بنتے ہیں مگر کیا مہذب سوسائٹی میں کمتر عورتوں کی تذلیل یوں ارزاں ہوتی ہے میں محترمہ ریحانہ سعیدہ کے موقف کی تائید کرتا ہوں برادر ریاض حسین قمر اس دفعہ محفل میں دکھائی نہیں دیے دعا گو ہوں کہ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو کر گفتگو میں شریک ہوں مجید احمد جائی کے تبصرے میں فصاحت و ابلاغ کا جوہر خوب محسوس ہوتا ہے۔انہیں میرا اسلام و نیک آرزوئیں محترم احسان سحر محمد رفاقت اور احسن ابرار رضوی کی نامہ نگاری بہت لاجواب اور سر فہرست رہی عزیزم حسین جاوید، تم نے ناحق چھیڑ چھاڑ کی ہے۔مجھے خود ادارے والوں نے بابائے نئے افق بنا دیا تھا جس کا بھوجھ اب تک اٹھا رہا ہوں ریاض بٹ شرکائے محفل کو اچھا ڈیل کرتے ہیں۔یوں لحظہ لحظہ ہر ایک کی رہنمائی کرنے کا انداز دل موہ لیتا ہے۔ویسے سینئر ہونے کا تقاضا بھی یہی ہے دعاؤں میں یاد رکھیے گا صائمہ نور کی خدمت میں سلام گاہے گاہے ان کے تبصرے پڑھ کر ان کی جرات اظہار سے متاثر ہوا ہوں عجیب معمہ ہے کہ صائمہ فلم انڈسٹری کی مشہور اداکارہ ہے اور نور بھی ہماری ایک خوبرو آرٹسٹ ہے اس لحاظ سے صائمہ نور کا نام مشکوک لگتا ہے یوں جیسے میں اپنا فرضی نام معمر شان رکھ لوں پہلے یہ بتائیں کہ آپ کو اپنے نام کا مطلب معلوم ہے یا نہیں عنبرین اختر صاحبہ کو محفل میں پہلی بار آمد پر خوش آمدید، بقدر فرصت آپ کو آتے جاتے رہنا چاہیے۔دیرینہ شرکا میں عالیہ انعام الٰہی اور شہنی ارشاد سے رہتی گفتگو یاد آتی ہے محترم جاوید احمد صدیقی کا طویل تبصرہ پڑھ کر مزہ آ گیا ویسے آپ ہی بتائیں کہ نفس انسانی نئی و پرانی یادوں کا پرمذاق چولا کیا نہیں ہے آنجناب مدیر معذرت یہ کہ اب اگست کی کہانیوں پر خاک تبصرہ ہوگا۔ماہ ستمبر کے تازہ شمارے پر بھی شرکائے محفل نئے نکور تبصرے کہہ سن رہے ہیں۔سرورق پر کبوتروں کا دودھیا رنگ چمک رہا تھا اور پل صراط عشق کے لیے آخری صفحات کا انتخاب دیدنی تھا۔

خواجہ حسین ظالم.....منچن آباد۔ سلام عرض عمران بھائی صاحب شمارہ اس بار کافی تاخیر سے

ملا مجھے لگا شاید میری کہانی کی وجہ سے شمارہ لیٹ ہو رہا ہے لیکن کہانی تو اس بار بھی آپ نے شائع نہیں فرمائی پھر شمارہ کیوں لیٹ ہوا اس بار شمارہ ظالم تھا اور گفتگو میں ایک عدد خط بھی بہت ظالم تھا مشتاق احمد قریشی صاحب کا نقطہ نظر بھی ظلم سے پر تھا اور طاہر قریشی صاحب کے وظیفے بھی ظلمت کو دور کرنے کے لیے تھے اور تو اور خوش بوئے سخن کی ساری غزلیں ظالم تھیں۔ سرورق پر حسینہ بھی ظالم، عمران صاحب پورے پاکستان میں بارشوں کا سلسلہ شروع ہے اور بارش کے بعد مچھر ظالم۔

حاجی عمران خان سانگی..... رحیم یار خان۔ محترم ومکری السلام علیکم۔ بندہ خاکسار شیخ خلیفہ کالج میں خدمت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ سرکار کا خادم ہوں اس لیے اپنی ذات کے لیے وقت ذرا کم ہی حاصل ہوتا ہے اور جو وقت اپنی ذات کے لیے حاصل ہوتا ہم اس کو میں نئے افق کے ساتھ گزارتا ہوں طاہر قریشی صاحب کا ممنون ہوں کار خیر پر اور مشتاق احمد قریشی صاحب جس احسن طریقے سے بات کرتے ہیں یہ بس انہی کا کمال ہے اور محفل یاراں کی چٹ پٹی گفتگو اک اپنائیت کا احساس دلواتی ہے ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن شمارے کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں عمران صاحب میں اس امید وثوق کے ساتھ حاضر ہوا ہوں کہ میری جائز خواہش پوری کریں گے۔ خدارا سوچ نگر کے نام سے سلسلہ شروع کریں جس میں قاری اپنی مثبت سوچ کا اظہار کرسکے ہاں یا نہ پلیز جواب ضرور دیجیے گا نئے افق کی ترقی کا خواہش مند۔

پرنس افضل شاہین..... بہاولنگر۔ اس بار بھی نئے افق کا سرورق منفرد ہی تھا کلاک بارہ بجا رہا تھا اور حسینہ نے فل لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی نشیلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔

خواب دکھائے ہیں کیا کیا اس انوکھی آس نے
جانے کتنی مرتبہ میں بن سنور کر رہ گئی

دور ایک درخت پر کبوتروں کا جوڑا چونچ سے چونچ ملائے ایک دوسرے کو کچھ یوں کہہ رہے تھے۔

دھیان کی تاک سے ہم کو نہ ہٹانا جب تک
رات کے نام پر تاروں کے دیے جلتے رہیں
دیکھنا ہمیں دیکھتے جانا جب تک
ہم تیری آنکھ کی وادی میں سفر کرتے رہیں

دستک میں آپ آزادی کشمیر کے بارے میں حکمرانوں کے ضمیر جھنجوڑ رہے تھے وزیراعظم صاحب نے 22 ممبران قومی اسمبلی کو کشمیر کے مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے دنیا بھر میں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے گویا کروڑوں روپے ان کے لیے مختص کردیے گئے دیکھتے ہیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ایم کیو ایم کے بانی نے وطن عزیز کے بارے میں جو اول فول بکے ہیں وہ الفاظ کسی ہندوستانی کو بھی کہنے کی جرأت نہیں ہوسکی۔ ہم الطاف حسین کے ادا کیے گئے الفاظ کی پرزور مذمت کرتے ہیں اور حکومت وقت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ الطاف حسین کو برطانیہ سے لاکر سخت سزا دے میری نگارشات اور خط پسند فرمانے پر ریاض بٹ، عبدالحمید، احسن ابرار رضوی، مجید احمد جائی، عبدالجبار روی، صائمہ نور، محمد رفاقت، فلک شیر ملک، ممتاز احمد کا شکریہ آپ کے خطوط اور ایم حسن نظامی، حسین جاوید کے خطوط بھی شاندار تھے۔ ایم اے راحیل آپ نے اپنے خط کا جواب پڑھ لیا ہوگا آپ اپنا مکمل ایڈریس دفتر بھیج دیں وہ آپ کا منی آرڈر آپ کو بھیج دیں گے۔ امید ہے اب آپ غصے کا اظہار نہیں کریں گے۔ پہلے کی طرح مستقل خطوط تحریریں لکھیں گے پلیز ہر ماہ خط پر انعام ضرور دیا کریں کیونکہ اس سے مقابلے کا رجحان بڑھتا ہے اور خطوط بھی زیادہ شائع ہوتے ہیں ہم

حق نواز شاء اللہ شگی کو پہلی حاضری لگانے پر خوش آمدید کہتے ہیں۔ عشنا کوثر سردار کی قسط وار کہانی ایک سو سولہ چاند کی راتیں کی پہلی قسط 69 سال قبل کی یہ محبت بھری کہانی ابھی کرداروں کو متعارف کرا رہی ہے آگے چل کر انشاء اللہ یہ کہانی اپنا آپ منوائے گی ذوق آگہی میں امیر حمزہ، سمیرا التعبیر، محمد کاشف، محمد احمد رضا انصاری، عائشہ اعوان، پاکیزہ ایمان اور خوش بوئے سخن میں عروسہ سکندر حیات، فیصل صاحب، عنبرین اختر، نیئر رضوی، ظہور احمد صائم، وجیہہ سحر، راشد ترین چھائے رہے اقرا میں اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں پر مضمون پڑھ کر ایمان کو پختہ کیا رزاق شاہد کوہلر کا انٹرویو بہت ہی شاندار تھا آپ سے گزارش ہے کہ معروف شعرا اور فنکاروں کے انٹرویوز نئے افق کی زینت بنائیں سرورق کی مناسبت سے اشعار کا سلسلہ شروع کریں یعنی سرورق دیکھ کر ہمارے ذہن میں جو شعر آئے وہ ہم آپ کو بھیجیں اور آپ وہ شائع کریں اس سلسلے کو آپ جو بھی نام دیں ہمیں منظور ہے۔ دعا ہے کہ نئے افق اور اس کی پوری ٹیم اور اس سے وابستہ تمام افراد ہمیشہ خوش و خرم رہیں آمین، خدا حافظ۔

عبدالغفار عابد..... چیچہ وطنی۔ محترم مشتاق احمد قریشی، عمران و بھائی بھٹی سمیت پورے اسٹاف اور محفل گفتگو کے سبھی ممبران کو میرا اسلام پہنچے امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے کافی عرصہ بعد آپ لوگوں سے ملاقات ہو رہی ہے۔ ادارے کی طرف سے مسلسل حاضری کی تاکید ہوتی رہی مگر والدہ کی جدائی نے زندگی کے لمحات کو بے ترتیب کر کے رکھ دیا۔ چلتے ہیں کہانیوں کی طرف بھائی فلک شیر ملک نے اپنی تحریر الف لام میم میں جو نقشہ پیش کیا اسے دیکھ کر اندازہ بلکہ اس کو حقیقت کہہ لیتے ہیں کہ وادی کشمیر گزشتہ ستر سال سے بھارتی درندگی کا شکار ہے جبر و تشدد کے ذریعے کشمیری عوام کے جذبہ حریت کو کچل دینے کے زعم میں مبتلا بھارتی حکومت مسلسل اٹوٹ انگ کی تسبیح پڑھ رہی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر طرح کا ظلم و ستم ڈھانے کے باوجود وہ کشمیریوں کے عزم آزادی کو کمزور نہیں کر سکی بلکہ یہ گزرتے لمحے کے ساتھ کشمیریوں کی تحریک میں تیزی آتی جا رہی ہے رات کتنی بھی لمبی ہو جائے آخر سحر ہو کر رہتی ہے اسی طرح جویریہ سلیم کی جرم آزادی دستگیر شہزاد کی وقت آزادی اور زرین قمر کی غریب شہر فغاں ستمبر کے حوالے سے ہمیں آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر رہی تھیں ان تینوں کہانیوں پر اتنا لکھنا ہی کافی ہے کہ یقین ایسا ہتھیار ہے جس میں بارود نہ بھی ہو تو نشانے پر صحیح بیٹھتا ہے اس یقین میں جمع و تفریق شامل کر دو تو اندازہ ہے اور اندازہ کچھ نہیں محض فریب ہے عشنا کوثر سردار کی سلسلے وار نئی تحریر ایک سو سولہ چاند کی راتیں امید ہے مقبولیت حاصل کرے گی محبت دو دلوں کے مابین ایسا تناسب ہے جس کی کوئی اکائی نہیں ہوتی۔ ریاض بٹ نے اپنی تحریر خون کی گواہی میں جھوٹ کو شکست دے کر سچ کو فتح دلائی۔ معاشرے کی اصلاح ایسی تحریر سود مند ثابت ہو سکتی ہے طیبہ افتخار کی طلوع سحر کے لیے یہی لکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں محبت اور اختیار ایک ہی راستے کے سنگ میل ہیں جہاں اختیار کی حد ختم ہو جائے وہاں سے محبت کی سرزمین کا آغاز ہوتا ہے اور عشق اس راستے کا آخری موڑ ہے عامر زمان عامر کی جال سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حکمت حیات ہوتی ہے اور ہٹ دھرمی موت۔ خلیل جبار نے اپنی تحریر نیا فیصلہ میں لفافہ صحافت پر روشنی ڈالی ہے محترم جناب امجد جاوید کا افسانہ منزل مراد با ضمیر لوگ ہی منزل پاتے ہیں اور بے ضمیر لوگ راستے کی خاک میں رل جاتے ہیں۔ فن پاروں میں شامل سبھی تحریریں غور طلب تھیں انکل ریاض حسین شاہد کی پل صراط عشق قارئین کی توجہ حاصل نہ کر سکی انکل مشتاق احمد قریشی کے اداریے پر ایک نظر ڈالتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ کسی کے جذبے کو محض گولی کے ڈر سے نہیں دبایا جا سکتا پاکستان میں سیاستدان تو بہت ہیں مگر لیڈر کوئی نہیں کشمیر کی آزادی لیڈر سے وابستہ ہے آخر میں یہ کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تنقید کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے جبکہ نکتہ چینی کے لیے جہالت کافی ہے آپ سب کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

سردار اویس اویسی..... رحیم یار خان۔ السلام علیکم محترم ومکرم جناب عمران احمد صاحب۔ میں آپ احباب کی دعاؤں سے خیریت سے ہوں اور تمام امت مسلمہ کی خیریت کے لیے دعا گو ہوں اس بار شمارہ اتنی تاخیر سے ملا کہ کیا بتاؤں آپ کو سرورق پر بارہ بجے ہوئے تھے وہ بھی پورے دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب نے کشمیر کی موجودہ صورتحال سے آگاہ فرمایا شکریہ۔ جناب خدا واحد جانتا ہے کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور کشمیر انڈیا کے مظالم اگر بیان کروں تو قلم سے بھی خون ٹپکنا شروع ہو جاتا ہے۔ خداوند کریم کشمیر میں امن عطا فرمائے آمین۔ گفتگو میں عبدالحمید صاحب نے یاد رکھا شکریہ جناب کا تبصرہ بہت زبردست تھا مجید احمد جائی صاحب آپ کو میرا تبصرہ کمال کا لگا میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے ایم اے راحیل، احسن ابرار رضوی، نور بہار علی، حق نواز، ایم حسن نظامی کے خطوط لاجواب تھے اقرا میں طاہر قریشی صاحب نے کمال کر دیا خداوند کریم خوش رکھے اقرا شمارے کا بہترین سلسلہ ہے اس بار انٹرویو میں جس شخصیت سے متعارف کرایا گیا وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں رزاق شاہد صاحب کی عظمت کو سلام۔ فلک شیر ملک صاحب کی کہانی الف لام میم لاجواب تھی وقت آزادی دستگیر شہزاد کی کمال کی کہانی تھی فن پارے کی تمام تحریریں اچھی تھیں خاص کر (شب قدر) اور (غلط فہمی) مجھے بہت پسند آئیں۔ ذوق آگہی میں بہن سمیرا کو مبارکباد میرے ہم شہر کاشف صاحب کا انتخاب اچھا تھا بہن عائشہ اے بی، بہن روبی علی اور بہن عائشہ اعوان کے انتخاب مجھے بہت پسند آئے ہیں جاوید احمد صدیقی، ریاض بٹ، افضل شاہین بہت عمدہ غزل یاسر اعوان اور عمر فاروق ارشد صاحب نے دل جیت لیا اگلے ماہ تک کے لیے اجازت خداوند کریم آپ کا میرا اور تمام امت مسلمہ کا حامی و ناصر ہو۔

مسکان ظفر بھٹی..... شام کے بھٹیاں۔ السلام علیکم اس دفعہ نئے افق کے سرورق کی باجی سے دیر سے ملاقات ہوئی۔ بھائی مجید احمد جائی اور صائمہ نور عبدالستار ایدھی کو سلام عقیدت پیش کر رہے تھے ممتاز احمد حاسدین کے حسد اور منافقین کی منافقت کا روگ پالے نظر آئے۔ پچھلے سولہ ماہ سے یہ فقرے پڑھ پڑھ کر آنکھیں تھک گئی ہیں۔ ممتاز احمد سے گزارش ہے کہ اب ان لفظوں کی جان چھوڑ دو کسی عرض نویس سے نئے جملے خرید لو۔ اقرا اللہ تعالیٰ کے ناموں کی برکتوں سے دامن بھرنے کا خوب سلسلہ ہے۔ فلک شیر ملک چناروں کی سرزمین کی زخمی زندگی پر نوحہ کناں تھے جویریہ سلیم آزادی جیسی نعمت پر بہترین تحریر پیش کر رہی تھیں آزادی کی شمع جلانے میں دستگیر شہزاد بھی پیچھے نہ رہے زرین قمر مسلمانوں اور ہندوؤں کی فکر سوچ پر مدلل تحریر لائیں ریاض بٹ ہر ماہ تفتیش کر کے خود سراغ رساں بن گئے ہیں طیبہ افتخار عزم کے پہاڑ کے آگے ہمالیہ کو روندتی نظر آئی۔ ممتاز احمد کی بدلتے رنگ انتہائی بکواس تحریر تھی کہاں قانون کے رکھوالے اور کہاں قانون کے چور کسی بھی لائن کا دوسری لائن سے ربط نہ تھا خوش بوئے سخن میں عروہ سکندر واقعی انعام کی حقدار تھی۔

ریاض بٹ..... حسن ابدال۔ السلام علیکم ماہ ستمبر کا شمارہ اس بار کافی انتظار کے بعد بے قرار نگاہوں کے سامنے آیا سرورق ہمیں وقت کا احساس دلا رہا ہے کہ وقت تیزی سے گزر رہا ہے ہمیں اپنے حالات ٹھیک کرنے ہیں لیکن معاملے دن بدن گمبھیر ہوتا جا رہا ہے۔ ایک طرف مقبوضہ کشمیر میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے اور دوسری طرف پاکستان مخالف تقریر بھی کی جا رہی ہے۔ پاکستان مردہ باد کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ یہ دن بھی آنے تھے ہر محب وطن پاکستانی کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے کیونکہ یہ وطن ہمیں طشتری میں سجا کر پیش نہیں کیا گیا۔

ملا نہیں یہ ارض پاک ہم کو تحفے میں
جو لاکھوں چراغ بجھے ہیں تو یہ چراغ جلا

دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب ہاشمی کے کان میں سوئے ہوئے صاحب اختیاروں کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں اس وقت ہمیں جتنے اتحاد و اتفاق کی ضرورت ہے اتنی شاید پہلے نہ تھی خدا ہمارے ملک کی حفاظت کرے آمین بہر حال ایک بات پر ہم فخر کر سکتے ہیں کہ اس بار آزادی کے موضوع پر کافی تحریریں ہمارے پرچے کی زینت بنی ہیں جن میں الف لام میم (فلک شیر ملک) جرم آزادی (جویریہ سلیم) غریب شہر فغاں (زریں قمر) ایک سو سولہ چاند کی راتیں (عشنا کوثر سردار) یہ سب تحریریں بہت پر اثر اور ہمارے لیے سوچ کے در وا کر رہی ہیں ان میں ایک سو سولہ چاند کی راتیں ابھی اٹھان میں ہے امید ہے آگے چل کر ایک یادگار تحریر ثابت ہوگی ان شاء اللہ آزادی کی ایک نئی سحر طلوع ہونے کو ہے طلوع سحر طیبہ افتخار کی ایک اچھی تحریر ثابت ہوئی آخر ایشان کو منزل مل ہی گئی، بدلتے رنگ ممتاز احمد کی ایک کٹیلی تحریر ہے جو لوگ دوسروں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے چکر میں ہوتے ہیں وہ ایک دن خود بھی مجبور ہو جاتے ہیں ڈاکٹر جواد ایک ایسا ہی مسیحا تھا جسے وقت کی ایک ٹھوکر نے کہیں کا نہ رکھا اس دفعہ خلیل جبار ذرا اپنی ڈگر سے ہٹ کر کہانی لے کر آئے لیکن خوب کہانی لے کر آئے انجم فاروق ساحلی اسمگلر لے کر آئے سراغ رساں اور اسمگلر کے درمیان ڈراما خوب رہا۔ فن پاروں میں تمام فن پارے اپنی مثال آپ ہیں ذوق آگہی میں کیفیرا تعبیر کا انتخاب واقعی تعریف کے قابل ہے اس کے علاوہ روبی علی، محمد کاشف، احمد رضا انصاری، عائشہ اعوان، جاوید احمد صدیقی، پرنس افضل شاہین کا انتخاب خوب تر ہے۔ باقی لوگوں کا انتخاب بھی خوب ہے خوش بوئے سخن میں عروہ سکندر حیات، محمد یاسر اعوان، عبدالجبار رومی انصاری، ریحانہ سعیدہ، عمر ارشد بازی لے گئے۔ اس دفعہ کترنیں بھی کافی تھیں جو پرچے کی شان بڑھا رہی تھیں لیجیے جناب اب بڑھتے ہیں اپنی پیاری محفل گفتگو کی طرف عبدالحمید بھائی آپ نے اپنے خط میں لکھنے کا حق ادا کر دیا عبدالستار ایدھی کے متعلق آپ کی تحریر موتیوں میں تولنے کے قابل ہے اور ان نام نہاد سیاستدانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو بڑے بڑے وعدے کر کے سادہ لوح عوام سے ووٹ لے جاتے ہیں لیکن بعد میں ان کی شکل بھی نظر نہیں آتی میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ ایم حسن نظامی میرے تبصرے کی اتنے خوب صورت الفاظ میں تعریف کرنے پر مشکور ہوں آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے ظہور احمد صائم، حق نواز، خواجہ حسین، ثنا اللہ شگی آپ کے مختصر مختصر خط بھی پرچے کی شان بڑھا رہے ہیں۔ بھائیوں ذرا کھل کر لکھو، حسین جاوید آپ کا خط بھی آپ کے نام کی طرح حسین ہے اور آپ کے خواب کے کیا کہنے۔ بہر حال آپ نے مجھے اگنور کر دیا خوش رہو، ارے عامر زمان عامر بیٹے کی پیدائش مبارک ہو خدا لولو کی عمر دراز کرے آمین اور ہماری مٹھائی؟ احسن ابرار رضوی کیسے ہو بھائی آپ کا تبصرہ بھی خوب ہے ایم اے راحیل اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہوتا، امید ہے ایڈیٹر صاحب کی وضاحت کے بعد آپ کے غصے پر برف پڑ گئی ہوگی۔ اگلا خط ہے جناب مجید احمد جائی کا بھائی حسب معمول آپ کا خط مدلل اور اپنے اندر گہرائی لیے ہوئے ہے آپ نے خوب لکھا کہ سب نے ایدھی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں ایدھی بنوں گا بہر حال ایدھی جیسے لوگ تو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں خدا ان کے درجات بلند کرے آمین یاد کرنے کا شکریہ صائمہ نور بہن آپ کا یہ فقرہ بہت زبردست ہے کہ کاش عبدالستار ایدھی صاحب کی آنکھیں حکومت کو لگا دی جائیں میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ مہربانی۔ محمد رفاقت صاحب آپ کی حاضری بھی پرچے میں آپ کی موجودگی کا احساس دلا رہی ہے۔ میرے تبصرے کو خوب کہنے کا شکریہ۔ فلک شیر ملک آپ کا ناول اس بار پہلے نمبر پر موجود ہے اچھی کاوش ہے لکھتے رہیں اور ساتھ انتظار کی عادت بھی ڈالیں پرنس افضل شاہین اور ممتاز احمد آپ کے خطوط بھی محفل کی جان ہیں میرے تبصرے کو پسند کرنے کے لیے آپ دونوں کا بھی مشکور ہوں۔ اب اجازت والسلام۔

میاں کرامت حسین۔۔۔ جہلم۔ السلام علیکم میں نئے افق کا دیرینہ قاری ہوں تب سے جب یہ پندرہ روزہ ہوا کرتا تھا میں اب 70 سال کا ہوں پھر بھی باقاعدگی سے تو نہیں مگر کبھی کبھار جہاں کہیں نظر آجائے تو خرید کر اس کا مطالعہ کرتا ہوں مگر سچی بات یہ کہ اس کی تحریروں میں وہ جان اور مزہ نہیں رہا جو اس کا خاصا ہوا کرتی تھیں۔ ستمبر کا پرچہ میرے ہاتھوں میں ہے چند کہانیاں الف لام میم، غریب شہر فغاں، ایک سو سولہ چاند کی راتیں اور منزل مراد جاندار تحریریں ہیں جبکہ باقی بھرتی ہیں۔ جال اور بدلتے رنگ تو قطعی نئے افق کے معیار کی نہیں ہیں۔ جال میں لفاظی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پلاٹ انتہائی کمزور اور بے مقصد ہے کتابت کی غلطیاں اس کے علاوہ ہیں مصنف نے خوامخواہ ہی کہانی کو طویل کر دیا ہے کہانی میں کوئی سبق نہیں ہے۔ ایک معمولی سی بات کو واقعہ بنا کر قارئین سے مذاق کیا گیا ہے۔ بدلتے رنگ بچوں کے رسالے کی کہانی ہے جس میں کوئی ربط نہیں ہے نہ جانے آپ ایسی بے رنگ اور بے تکی کہانیوں کو کیوں شائع کرتے ہیں سرگودھا سے ایک ماہانہ سفید چھتری شائع ہوتا رہا ہے جو محترم پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا اس میں ہی شاید ڈاکٹر صاحب کا وہ انٹرویو شائع ہوا تھا۔ جو آپ نے ممتاز احمد صاحب کے نام سے نئے افق میں شائع کیا۔ سفید چھتری میں ممتاز احمد صاحب نے یہ انٹرویو نہیں لیا تھا موصوف نے بھی انٹرویو اپنے نام ممتاز احمد قادری کے نام سے لاہور سے شائع ہونے والے ایک سہ ماہی پرچے صدائے دل میں بھی شائع کرا چکے ہیں تو پھر نئے افق میں بھیجنے اور وہ بھی کاپی کرنے کی کیا ضرورت تھی آج کل تو الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے کہانیاں اور خطوط بھی ای میل سے بھیجے جاتے ہیں میرے بیٹے نے بہت کہا کہ میں آپ کا خط ای میل سے بھیج دیتا ہوں مگر میں نے انکار کر دیا کہ میں اپنے ہاتھ سے لکھوں گا لہٰذا کانپتے ہاتھوں سے لکھ رہا ہوں قریشی صاحب ای میل میں یہ کیسے پتا چل سکتا ہے کہ یہ خط اسی بندہ نے لکھا ہے اس میں کسی اور کے نام سے بھی ای میل بھیجی جا سکتی ہے ایڈیٹر اس بات کا اندازہ کیسے کر سکتا ہے کہ یہ میل کس نے بھیجی ہے۔ گفتگو میں چند رائٹر ایک دوسرے کی تحریروں کی خوامخواہ تعریف کرتے نظر آتے ہیں مثلاً مجید احمد جائی صائمہ نور اور کبھی صائمہ مجید کی تعریف کرتے ہیں اور صائمہ ان کی تعریف کرتی ہے مجھے تو لگتا ہے بلکہ یقین ہے کہ یہ دونوں میاں بیوی ہیں اور دونوں خطوط میاں جی ای میل کرتے ہیں۔ فن پارے میں اچھی کہانیاں ہوتی ہیں مگر یہ ان کہانیوں کے مصنفین کے ساتھ زیادتی ہے کہ ان کا نام فہرست میں شامل نہیں ہوتا۔ برائے کرم فن پارے ختم کر کے ان کی کہانیوں کو ان کے نام سے فہرست میں شامل کر کے ان کی حوصلہ افزائی کیا کریں۔ بہت ہی دعائیں آپ اور آپ کے بیٹوں اور آپ کے اسٹاف کے لیے اب نہ جانے کب حاضری ہوگی۔

☆ میاں کرامت صاحب رہنمائی کا بہت بہت شکریہ، جن کہانیوں کو آپ نے پسند کیا وہ کل پرچے کا ساٹھ فیصد ہے یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم اچھا مواد دینے میں کامیاب رہے اور جن کہانیوں کو آپ نے رد کیا وہ نئے لکھنے والے ہیں اگر آپ یونہی رہنمائی کرتے رہے تو ان شاء اللہ وہ بھی خوب صورت اور معیاری تحریریں تحریر کرنے لگیں گے۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ۔ محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم ماہ ستمبر 2016ء کا شمارہ اس بار زرا دیر سے ملا یعنی 24 اگست کو سر ورق دیکھ کر بے ساختہ درج ذیل شعر نوک قلم پر مچل گیا۔

وقت کے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں
آئینہ گردش دوراں کو دکھانے والے

آگے بڑھے تو مشتاق احمد قریشی صاحب حکمرانوں کو خوب لتاڑ رہے تھے اور انہیں جگانے کی کوشش بھی بہر حال

ہمارے حکمران اپنے حال میں مست ہیں نہ عوام کی فکر ہے اور نہ ارد گرد کے حالات کی بھارت اپنی من مانیاں کر رہا ہے اور عالمی برادری خاموش ہے۔ اپنی محفل کی طرف بڑھتے ہیں ہیں یعنی گفتگو میں یہاں پر پہلے نمبر پر ہیں ریاض بٹ صاحب جمے ہوئے ہیں اپنے دلکش انداز بیان کے ساتھ آپ سے ایک بات پوچھنی ہے کہ آپ نے انعام سلسلہ کیا ختم کر دیا ہے۔ ریاض بٹ صاحب کو میری طرف سے بہت بہت مبارک ہو عبدالحمید صاحب ایم حسن نظامی، احسن ابرار رضوی، ایم اے راحیل، مجید احمد جائی اور ممتاز احمد صاحب کے مراسلے زبردست رہے میرے خط کو پسند کرنے پر میں سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہانیوں میں ریاض بٹ صاحب کی کہانی خون کی گواہی بہت پسند آئی فلک شیر ملک کا ناول الف لام میم ایک اعلیٰ پائے کا ناول ہے وقت آزادی جرم آزادی غریب شہر فغاں، بہت اچھی تحریریں ہیں ابھی مطالعہ جاری ہے اس ماہ کے لیے اتنا ہی والسلام۔

☆ جی ہاں ہم نے خطوط پر انعام کا سلسلہ فی الحال روک دیا ہے۔ کیونکہ ہم بڑی ایمانداری سے انعامی خط کا تعین کر کے رقم ارسال کرتے تھے مگر غلط ایڈریس یا کسی اور وجہ سے رقم وصول نہ ہونے پر کچھ قارئین کو شکایت ہوتی تھیں لہٰذا ہم نے اس سلسلے کو فی الحال روک دیا ہے روک دیا ہے۔

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور

بلوری آنکھیں سنہری زلفیں چاند سا چہرہ ماہتابی
نئے افق پہ چھائے بادل گھنگھور گھٹا ہے اسحابی
موسم رنگین پھولوں سے سجا ہے وقت کا پہر ٹھہرا سا ہے
امن کے پنچھی منا رہے ہیں پیار کی شام گلابی

نئے افق اس دفعہ لیٹ ملا، جب ٹائٹل دیکھا تو اس پہ بے اختیار شاعری کہنے کو دل کیا اور پھر کہہ بھی دی سچ میں ٹائٹل بہت خوب صورت لگا بالکل اپنے کشمیر کی طرح جس کی وادی رنگ برنگے پھولوں سے سجی امن و محبت کے ساتھ صبر کا دامن تھامے ایک ایک گھڑی پاکستان سے بھرپور محبت کے ساتھ آزادی کی طرف گامزن ہے بس اس گھڑی کی ٹک ٹک اور پاکستانی پرچم تھامے کشمیریوں کے پاکستان زندہ باد کے نعروں کی دستک سوئے ہوئے پاکستانی حکمرانوں کو جگا دے اور ہمارے سپہ سالار بھی محمد بن قاسم بن کر کشمیر کی بیٹی کی آہ پکار سن لیں تو ان شاء اللہ کشمیر کی آزادی پہلے سے زیادہ قریب آجائے گی ویسے بھی انڈیا پاکستان کی سلامتی میں بلوچستان اور کراچی میں شورش بپا کر رہا ہے اور اس کا کھلے بندوں اظہار بھی کر رہا ہے تو اس کا ایک ہی علاج ہے کہ انڈیا کو بھرپور سبق سکھایا جائے اور اگلا پچھلا حساب پورا کیا جائے۔ حالات اس طرح کے آگئے ہیں کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہو رہا ہوتا ہے اور یہ سب حکمرانوں کی پانامہ لیکس اور کشمیر پر ہوتے مظالم سے توجہ ہٹانے کی غرض سے ہیں بہر حال اللہ تعالیٰ پاکستان کی حفاظت فرمائے آمین۔ ریاض بٹ کا خوب صورت محبت نامہ اچھا لگا خیر مبارک اور میں آپ کو بھلا کیوں نظر انداز کروں گا عبدالحمید کا عبدالستار ایدھی کو بھرپور خراج عقیدت پسند آیا بے شک بابائے خدمت عظیم شخصیت تھے ایم حسن نظامی کی پسندیدگی تو بہار علی کی بہار اور ظہور احمد صائم کا اظہار خیال بھی اچھا لگا حق نواز خواجہ حسین ثناء اللہ سنگی بھی مختصراً اپنی جگہ بنا گئے عمدہ، حسین جاوید محو پرواز شاہین تھکا نہیں ہے بس اسے پلٹنے جھپٹنے کی ضرورت ہے دشمن سامنے آنکھیں دکھا رہا ہے لیکن ابھی اس کا لہو گرم نہیں ہو رہا مجید احمد جائی کا بھرپور خط بہت عمدہ، صائمہ نور کا ہر خط ہی زبردست ہوتا ہے محمد رفاقت مختصر مگر خوب باتیں کر گئے فلک شیر ملک آپ کا تبصرہ خوب رہا آپ کے ناول الف لام میم میں نام شیر ملک آیا ہے یہ کیا؟ باقی ناول میں صوفیانہ کلام تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا زبردست رہا چاروں مجاہدین کی جواں

ہمتی نے انڈین فوجیوں کو تہہ تیغ کر ڈالا اور خود بھی جام شہادت نوش کر گئے۔ بہت اچھا ناول تھا۔ خیر مبارک پرنس افضل شاہین اللہ تعالیٰ آپ کو بھی خوش رکھے ممتاز احمد کا بھرپور خط اپنی مثال آپ تھا یاد رکھنے کا بہت شکریہ اقرا ایں اللہ تعالیٰ کے نام اور ان کے معانی بہت ہی زبردست سلسلہ ہے پڑھ کے سکون ملتا ہے اور خوشی ہوتی ہے محترم رزاق شاہد کوہلر کا انٹرویو بہت پسند آیا ہاں یاسین صدیق سے کہیں گے کہ وہ سوالات کو مختصر رکھیں کئی کئی چیزیں ایک ہی سوال میں پوچھ لیتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے سوال جواب سے بڑا ہو جائے گا باقی وہ بہتر جانتے ہیں رشتوں کا تقدس ہی معاشرے کی جڑیں مضبوط کرتا ہے اور ایک دوسرے کا احساس بھی دلاتا ہے زاریہ نے بھی رمنا کو بھی حقیقت سے آگاہ کر دیا اور پھر منزل مراد بھی پوری ہوتی زاریہ فیصل بنی تو عاتکہ رمنا ہو گئیں۔ غریب شہر فغان غریب الوطن عمر سیف کو درندہ صفت اسرائیلیوں نے شہید کر دیا یہ سب بھی سفارت خانے والوں کی ملی بھگت تھی جو اتنی رات کو کوئی بھی اس کی مدد کو نہ آیا بس بے حسی کے مارے مسلمانوں پر ہی افسوس ہوتا ہے جو فلسطینیوں سے ہمدردی کے بیان تو جاری کرتے ہیں مگر یہودیوں کے تسلط سے آزاد نہیں کرا سکتے۔ غلط کاموں کے غلط نتائج ناصر اور ناصرہ تو اپنے انجام کو پہنچے اور خون کی گواہی نے آفتاب کو بھی ڈھونڈ نکالا ریاض بٹ کی کہانی بھی اچھی رہی۔ مجبوری سے نجات حاصل کرنا تو بے وقوفی ہے ہی اور جس مجبوری سے فائدہ مل رہا ہو پھر اسے چھوڑنا بھی اچھی بات نہیں ساجد کا نیا فیصلہ بہترین رہا خلیل جبار کی یہ کہانی عمدہ رہی میڈم کا بچھایا جال تو کامیاب رہا ہی اسلم خود بھی اس کی پناہ چاہتا تھا اور کوثر بے چاری پھر کیا کر سکتی تھی جب اس کے سر کی چادر ہی پھسل گئی تو عامر زمان عامر کی تحریر بھی بے چارگی اور خواہش نفسانی کو سمیٹتی اچھی رہی۔ آداب عرض خالص لکھنو کا لہجہ لیے عشنا کوثر سردار نے ایک سو سولہ چاند کی راتیں میں زبردست تحریر دی ہے۔ بہت پسند آئی تیمور بہادر یار جنگ بین النور کی حیرت کس طرح دور کرتے ہیں ہم منتظر ہیں ایک سو سولہ چاند کی اگلی راتوں عشق مجاز کے ساتھ عشق حقیقی کو پانے والے معیز اور نایاب کی اپنی مرشد کے ساتھ گنبد خضرا کے سامنے مرشد سے بیعت ایمان افروز رہی جب نایاب نے اولیا اللہ سے کھل کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا تو اس کے سارے درد و غم جاتے رہے اور اسے اطمینان قلب بھی نصیب ہوا اہل صراط عشق، عشق حقیقی کو لیے اپنے انجام کو پہنچی آخری قسط کا اینڈ زبردست ہوا جزاک اللہ۔ ہمارا خیال بھی خوشیوں کے ساتھ ساتھ انجوائے کرنے کا ہے جب نئی طلوع سحر ہو رہی ہو تو وہ رات کی سیاہیوں سے نکل کر نکھری نکھری ہی لگتی ہے سویرا آید درست آید ایشان حیدر نے پانچ سال بعد سدرہ حیدر کی ڈائری پڑھ کر اپنی زندگی کا اچھا فیصلہ کیا تھا اور دس سال سے بچھڑے گھر والوں کو بھی سدرہ حیدر کے ساتھ خوشیاں عطا کیں طیبہ افتخار کی طلوع سحر زبردست رہی۔ ذوق آگہی میں سمیرا تعبیر، محمد کاشف، عروسہ شہوار اور عائشہ اعوان کے مراسلے بہترین رہے اور خوش بوئے سخن سے عروہ سکندر حیات عائشہ اے بی وجیہہ سحر اور راشد ترین کی خوش بو پسند آئی۔ جبکہ کترنوں میں مہرون راشہ تیجا، ارم کمال، بشیر بھٹی، کا تعاون اچھا رہا۔

حسین جاوید...... منچن آباد۔ آداب پیکر شیریں سخنان جان سخن و جان کلام پیارے عمران شمارہ اس بار اتنی تاخیر سے ملا ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا 24 اگست کی صبح شمارہ پا کر غنچہ کی مداح کھلا دل تنگ سرورق اس بار تجریدی تھا سوئے ہوئے ضمیروں پر مکرم و معظم مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک کافی ہے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو اب ہوش کے ناخن لینے چاہیے میں ہر بار حیران رہ جاتا ہوں کہ جناب مشتاق احمد قریشی کیسے جامع موضوع کو مختصر الفاظ میں بیان کر لیتے ہیں کم الفاظ اور جامع مفہوم بس انہی کا خاصہ ہے طاہر قریشی صاحب تو فکر رسا معلوم ہوتے ہیں پروردگار عالم کے صفاتی نام کامیابی کی کنجی ہیں مالک دو جہاں اجر و ثواب عطا فرمائے طاہر قریشی صاحب کو اس کار خیر پر بے شک مخلوق خدا طاہر قریشی صاحب کی اس کاوش سے مستفید ہو رہی ہو گی دشت چمن کے محفل آرا

کی جانب دو قدم بلبل باغ خوش بیانی فلک شیر ملک صاحب نے میرے دل کی بات کہہ دی جناب کا شکریہ ادارہ آپ بیتیاں، جگ بیتیاں سلسلہ کب تک شروع کرے گا میں جواب کا طالب ہوں اہل قلم مجید احمد جائی صاحب سخن معتبر احسن ابرار رضوی صاحب جان سخن رفاقت صاحب ہر دل عزیز افضل شاہین صاحب میں تمام احباب کی محبتوں کا ممنون ہوں اہل قلم نے ذرہ ناچیز کو یاد رکھا اس سے بڑھ کر اور کیا خوش نصیبی ہوسکتی ہے کہ میں ذکر سخنوراں میں ہوں برادرم ذی وقار ایم اے راحیل صاحب حد سے زیادہ برہمی اچھی نہیں ہوتی ناراضگی آپ کا حق ہے لڑائی نہیں بے شک مجھے کوئی حق حاصل نہیں کہ میں آپ کے اور ادارہ کے بیچ میں مداخلت کروں میں تو بس یہی چاہتا ہوں کہ آپ کا اور ہمارا کبھی ساتھ چھوٹے نا میری التجا کو ضرور قبول فرمایئے گا حقیر انعامی رقم کے پیچھے ادارہ اپنی پالیسی نہیں بدلتا یقیناً کوئی اور مسئلہ بنا ہوگا۔ رفیقان قلم عامر زمان عامر مولود برخوردار فیضان عامر کی آمد پہ آپ کو بہت بہت مبارکباد خداوند کریم نیک و صالح بنائے آمین۔ اظہار قوت کے مالک نور بہار علی صاحب آپ کا تبصرہ تو سولہ آنے تھا۔ لیکن (نہیں بے گا نگی) اچھی رفیق راہ منزل سے عالی جاں جن لوگوں میں دسی سوچ کا وصف پایا جاتا ہے ان کی میں دل سے عزت کرتا ہوں سلسلہ ذوق آگہی میں بہن سمیرا بہن روبی علی اور بہن عائشہ اے بی کا انتخاب نے دل موہ لیا اور بھائی کاشف احمد رضا انصاری جاوید احمد صدیقی نے بہت پیارے انتخاب کیے ہیں خوش بوئے سخن میں سبھی لاجواب تھے راشد ترین اور سکندر حیات صاحب کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں اس بات بہت سے احباب غیر حاضر تھے سب کی بہت کمی محسوس ہوئی یہ میرا آخری خط ہے وجہ بتانے سے میں قاصر ہوں بس دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور آخر میں دعا الہٰی طرہ دستار رقیباں بلند رہے۔

☆ بھائی یہ آخری خط والی کیا حلت ہے ہوسکے تو فون پر بتادیں۔

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان۔ پیارے مدیران نئے افق سدا سلامت رہو۔ ماہ ستمبر کا شمارہ لیٹ تو ہوا مگر پڑھ کر ساری کوفت ختم ہوگئی کیونکہ اتنی خوب صورت تحریریں تھیں کہ دل خوش ہوگیا بس ایک دھچکا بھی لگا کہ آپ نے میرے خط کے جواب میں جو بات کہی تھی وہ پوری نہیں کی اس شمارے میں میری تو کوئی تحریر شامل نہ تھی حالانکہ آپ نے لکھا کہ آپ کا ناول الف لام میم شائع کردیا ہے ملک شمیر اور فلک شیر ملک میں کافی فرق ہے (بھائی فلک شیر ملک، آپ کا نام ادھورا چھپنے کی معذرت چاہتے ہیں) پلیز اس دفعہ میری کوئی تحریر ضرور لگایئے گا۔ ورنہ...... ورنہ...... ایم اے راحیل کی طرح میں بھاگ نہیں جاؤں گا بلکہ کہانیاں لکھتا رہوں گا جب تک ہے جاں...... جب تک ہے جاں...... دستک دی گئی حکمرانوں کے دروازوں پر مگر لگتا ہے۔ تمنی جیسا حکمران ناگزیر ہوگیا ہے اب جو رشوت اور منافقوں کو دار پر لٹکائے ورنہ تو حالات دن بدن بدترین مراحل میں داخل ہوتے جارہے ہیں کشمیر ہمارے جسم کی طرح ہے اگر درد ایک حصے میں ہو تو تکلیف تمام اعضا کو محسوس ہوتی ہے ہمارے کشمیری بھائیوں پر ظلم کا بازار گرم ہے دل خون کے آنسو روتا ہے مگر سوائے دعا کے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ گفتگو میں عمران کی باتیں بہت ہی قیمتی تھیں ہم ایک قوم ہیں اور تمام امت مسلمہ ایک ہے لیکن ہم مسلمان پیچھے کیوں ہیں وجہ ہم نے اللہ کو چھوڑ کر غیروں کا سہارا لینا شروع کردیا ہے حالانکہ سب سے زیادہ تیل مسلمانوں کے پاس ہے اتحاد کو ہم نے چھوڑا عراق، افغانستان، لبنان، صومالیہ، فلسطین غرضیکہ سب نے اکیلے اکیلے مار کھائی حکمران اپنی اپنی حکومت بچانے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں۔ آج مسلمان اور کافر ایک پلڑے میں بیٹھے ہیں کافر کہتا ہے پیسے ہوں گے تو بات بنے گی اور مسلمان بھی کہہ رہا ہے کہ پیسے سے بات بنے گی حالانکہ ہمیں تو یہ یقین ہے کہ اللہ ساتھ ہوا تو بات بنے گی ورنہ نہیں۔ ریاض بٹ کا تبصرہ بہترین قرار پایا ان کی تحریر خون کی گواہی بھی اچھی رہی مگر ناصر کے ساتھ ناصرہ کا قتل کچھ عجیب لگا۔ حسین جاوید، مجید جائی، پرنس

افضل شاہین اور ممتاز احمد نے بھی دل کھول کر لکھا۔ اقرا بہترین سلسلہ ہے رزاق شاہد کوہلر کا انٹرویو بھی زبردست رہا۔ جرم آزادی 14 اگست کے حوالے سے خوب صورت تحریر تھی آزادی تو وڈیروں، نوابوں اور سیاست دانوں کے لیے ہے غریب تو گھن کی طرح ہیں پس رہا ہے مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے روزمرہ کے استعمال کی اشیا دال سبزی، گھی، چینی بہت مہنگی کر دی گئی ہیں نچلا طبقہ پیاز کھانے پر مجبور، حکومت کو لعن کر رہا ہے۔ وقت آزادی بھی کشمیری پر لکھی گئی بہترین تحریر رہی۔ زرین قمر نے فلسطین کے مظلوموں پر غریب شہر فغاں لکھ کر بہت رلایا، ایک سو سولہ چاند کی راتیں کی پہلی قسط نے ہی ثابت کر دیا کہ ناول کامیاب رہے گا گزرے واقعات کے ساتھ ایک لو اسٹوری کمال کی ہے۔ طلوع سحر میں لڑکیوں کا گورکھ دھندا تھا پھر بھی یہ ایشان نامی عاشق تُو اتنی چھوکریوں کو نپٹا کر آخر کامیاب ہو ہی گیا کہانی کو طول بہت دیا گیا عامر زمان عامر کی جال ہلکی پھلکی دل کو لگی اسم نے شارجہ پلٹ حسینہ کا جو حشر کیا خوب تھا بدلتے رنگ بہترین تحریر تھی ایک سبق آموز یادگار کہانی ڈاکٹر جواد جیسے سنگ دل اب بھی موجود ہیں اور مشتاق جیسے رحم دل بھی ہیں پلڑا تو نیکی کا ہی بھاری رہا نیا فیصلہ خلیل جبار کی مختصر سی کتھا بڑے کام کی تھی یہ بڑے بڑے لوگ پریس والوں سے کیوں ڈرتے ہیں اپنے سیاہ کرتوت چھپانے کے لیے منزل مراد کیا بات ہے امجد جاوید صاحب کی اور اس تحریر کا مزہ آ گیا پڑھ کر منظر کشی جملوں کا استعمال اور سسپنس سے بھرپور داستان اسٹوری آف دا منتھ ہے امجد صاحب سے گزارش ہے کہ نئے افق میں موتی بکھیرتے رہیں۔ اسمگلر، جاسوسی وائی تحریر تھی سراغ رساں کی گہری نظر نے اسمگلر ایلسا کی ناک میں ہیرا جا نچ لیا تھا فن پاروں میں پانچوں ہی بہترین انداز میں نظر آئے۔ مگر بھائی جان، نمکین محبت نے زیادہ متاثر کیا۔ ذوق آگہی اور خوش بو تخن بہترین ادب کا نمونہ تھے محمد کاشف کے اذان پر لکھے گئے اقتباس میں 77 لاکھ نیکیوں کی بجائے صرف 77 نیکیاں لکھی گئی اس غلطی کو درست کر لیں، معذرت کے ساتھ۔ پل صراط عشق کو بند کر کے قارئین کرام پر بڑا ظلم کیا گیا بہت خوب صورت ناول تھا جس کا ایک ایک لفظ دل میں اتر رہا تھا اتنی جلدی اینڈ کر دیا؟ سمجھ سے بالاتر ہے ریاض حسین شاہد نے کمال کا اینڈ کیا جس کہانی کا اختتام ایسی سرزمین مقدس پر ہو جہاں سرکار مدینہ ﷺ پر آرام فرما ہیں اور پھر روضہ رسول ﷺ کی منظر کشی واہ مبارک ہو مصنف کو۔ سیدہ علیشاہ اور طیبہ نذیر کے اقوال زریں اور توبہ پر نظم زبردست تھی۔ کامیاب رسالہ پیش کرنے پر تمام ارکان ادارہ کو مبارکباد اور دوبارہ گزارش کرتا ہوں کہ میری عرض پر غور کریں جو خط کے شروع میں کی گئی۔

سانحۂ ارتحال

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے بانی محمود ریاض مرحوم کی اہلیہ قضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں قارئین سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔ علاوہ ازیں ادارہ نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز کے دیرینہ رفیق کار محترم اقبال بھٹی کی بڑی ہمشیرہ کا رضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون. ادارہ اور ادارے کے تمام ارکان ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے قارئین سے بھی دعا کی التماس ہے۔

اقرا

ترتیب: طاہر قریشی

قرآنِ حکیم میں اور بھی بہت سی صفاتِ الٰہی کا ذکر آیا ہے' ویسے تو پورا کلامِ پاک ہی صفاتِ الٰہی اور احکام وکلامِ الٰہی کا مجموعہ ہے اور اپنی صفاتِ عالیہ کے مطابق تو خود باری تعالیٰ کا سورۂ لقمان ۲۶ میں ارشاد ہے کہ دنیا کے تمام درختوں کے اگر قلم بنالئے جائیں اور تمام سمندروں کی روشنائی بلکہ ایسے مزید سات سمندر اور بھی ہوں تب بھی صفاتِ الٰہی رقم نہیں ہوسکتی۔ لیکن قرآنِ مجید میں پیش کردہ تصورِ الوہیت اور اسماء الحسنیٰ کو صفاتِ الٰہیہ سے تعبیر کرنے سے ذاتِ باری تعالیٰ کا ایک ایسا تصور قائم ہوجاتا ہے' جو ہر لحاظ سے مکمل' مغلوب اور ادراک ووجدان کے مطابق ہے۔ ہمارے حواس اور مشاہدات اس بات کی شہادت دیتے ہیں' اور یوں ایمان باللہ ایک اصولِ حیات کی صورت دلوں میں بس جاتا اور اپنی گہری چھاپ بنالیتا ہے۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت اور کلیہ ہے کہ علامات (آثار) کسی خاص نام کی رہنمائی کرتے ہیں۔ مثلاً کسی سائنس یا ریاضی کی کتاب پر سائنس یا ریاضی کا نام دیکھ کر انسانی ذہن فوراً سمجھ لیتا ہے کہ یہ سائنس سے متعلق کتاب ہے ایسے ہی ریاضی کی کتاب پر ریاضی کی مخصوص علامات اس کا ریاضی سے تعلق ظاہر کرتی ہیں۔ یہ علامات اس کتاب کے نام کی دلیل کہلائیں گی اور اس نام کی صفت کا ثبوت بھی ہوں گی۔ اس کتاب کائنات کے سرورق پر جتنی علامتیں' نشانیاں' آثار ہمیں نظر آتی ہیں وہ سب کی سب صفاتِ الٰہی اور خالقِ کائنات اللہ جلِ شانہٗ کی ذاتِ عالی کا محور ہیں۔ خالقِ کائنات نے اپنا تعارف اپنے نام اور اپنے صفاتی کاموں کے ذریعے کرایا ہے' اگر انسان کھلی آنکھوں اور عقل وفہم کو کام میں لاکر دیکھے' سوچے سمجھے تو اسے کائنات کا ذرہ ذرہ اس مالک کون ومکاں کی موجودگی' قوت واقتدار' ملکیت کی شہادت دیتا ہوا نظر آئے گا۔

قرآن حکیم ربِ کائنات کا اپنا کلام ہے' گویا اللہ جلِ شانہٗ نے اپنی پہچان کے بارے میں انسان کے لئے

جن ہدایات کا اہتمام فرمایا انہیں قرآن حکیم کی صورت میں محفوظ کر دیا تا کہ قیامت کے دن تک کے لئے لوگوں کے پاس بطور سند محفوظ رہے اور وہ ہدایت حاصل کرتے رہیں اور کوئی بھی انسان روز آخرت میدان حشر میں یہ نہ کہہ سکے کہ یہ بات یا ہدایت تو میں نے سنی ہی نہیں تھی یا میرے پاس کوئی ہدایت نامہ یا ہدایت دینے والا نہیں پہنچا' یا جب انبیاء علیہم السلام تشریف لائے تھے میں دنیا میں تھا ہی نہیں۔ اس لئے ہی اللہ نے قرآن حکیم کو قیامت تک کے لئے محفوظ و مامون فرمادیا' ہر تحریف و تبدیلی سے پاک اور انسانوں اور جنوں کو اپنی پہچان کے لئے اپنی صفات اور صفاتی ناموں سے آشنا کر دیا تا کہ ان کا ہر ہر قدم پر جن جن صفاتِ الٰہی سے واسطہ پڑنے یا سامنا ہو تو وہ اللہ جلِ شانہٗ کو یاد کریں اور اس کا شکر ادا کرتے رہیں اور اپنا سر اس کی بارگاہ میں خم رکھیں۔

آئندہ صفحات میں صفاتِ الٰہی یعنی اسماء الحسنیٰ کی تشریح مقصود ہے اس کے لئے مختلف فہرستوں کو دیکھا ان میں علامہ ابو بکر جلال الدین السیوطیؒ اور حضرت حافظ ابن حجر کی فہرست میں خاصا قرب پایا گیا یہاں ہم حضرت حافظ ابن حجر کی کتاب فتح الباری میں دی گئی فہرست کے مطابق تشریح کی کوشش کریں گے کیونکہ وہ تمام اسماء الحسنیٰ جو قرآن کریم میں آئے ہیں اس میں موجود ہیں۔

شہروز/ زین الدین شانی

عشنا کوثر سردار کا ایک چھوٹا سا تعارف جو کہ ان کی شخصیت اور تحریروں کو مکمل بیان نہیں کر سکتا۔ عشنا کوثر سردار نہ صرف فکشن رائٹر ہیں بلکہ وہ اسکرپٹ رائٹر ہونے کے ساتھ ایک انڈی پینڈنٹ فلم میکر بھی ہیں۔
عشنا کوثر سردار کی چھ اردو کتابیں مارکیٹ میں آچکی ہیں۔ اے شمع کوئے جاناں، افسون جاں، اک جنوں خواب طرب، جس تن لاگیا عشق کمال اور دو سال پہلے محبت ربط ہے، اور کچھ خواب۔ یہ کتابیں آپ مانچسٹر لائبریری کی ویب سائٹ پر آن لائن بھی پڑھ سکتے ہیں۔
عشنا کوثر سردار کو صرف اردو میں ہی نہیں انگریزی میں بھی کمال حاصل ہے اور ان کی چار انگریزی کتابیں یو ایس اے کے آن لائن اسٹور لولو پر بھی موجود ہیں۔

'The Skin Of My Teeth, dog's breakfast, the apple's dark curves & 'monocular depth cues' were self-published

عشنا کوثر نے کچھ انگریزی مصنفین کے ساتھ مل کر کتابیں لکھیں۔

'The Spoken Light' was a collaboration book with Neil Johnson (2008- USA)

عشنا کوثر کے آرٹ شاہکار یو کے اور یو ایس اے میں بھی فروخت ہو چکے ہیں۔ عشنا کوثر سردار ہم سب کی ہر دل عزیز مصنفہ ہونے کے ساتھ ساتھ اجالا ڈائجسٹ کی مدیرہ بھی ہیں ان سے ایک ملاقات کا اہتمام کیا گیا ہے۔

مہوش ملک

س: السلام علیکم مزاج بخیر، سب سے پہلے تو یہ بتائیں کہ لکھنا کب شروع کیا؟
ج: وعلیکم السلام خوش رہو۔ لکھنا میں نے اپنے بچپن میں شروع کیا۔ پہلی کہانی سات سال کی عمر میں لکھی اور وہ اسکول میگزین میں پبلش ہوئی پھر یہ سلسلہ چل پڑا جیسا کہ میں پہلے بھی کئی بار بتا چکی ہوں میں نے لکھنا تب شروع کیا جب بچے کھلونے سے کھیلتے ہیں اس عمر میں، میں نے لفظوں سے دوستی کر لی۔ مجھے لگتا تھا میں بس لکھنا چاہتی ہوں اور مجھے لکھنا چاہیے۔ میں نے دس، بارہ سال کی عمر میں اپنے دادا ابا کی لائبریری کی بڑی بڑی موٹی موٹی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ کلاسک اردو لٹریچر کی کتاب سے لے کر انگلش اور رشین اور جرمن، میں سب کو پڑھ چکی تھی۔ دادا مجھے بہت اچھی کتابیں بتاتے تھے اور ہم جب گپ شپ کرتے تھے تو کتاب کی بہت سی معلومات شیئر بھی کرتے تھے۔ میں نے اپنے دادا ابا سے بہت کچھ سیکھا۔ مجھے اپنی نانو کے ساتھ بیٹھنا ان کی باتیں سننا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ مجھے پڑھنے کا جنون تھا اور لکھنا میرا فیورٹ مشغلہ تھا۔ میں نے ایک اسٹوری اسکول میگزین کے لیے 9 برس کی عمر میں لکھی "چراغ تلے اندھیرا" میری بہت تعریف ہوئی پھر یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ رکا ہی نہیں۔ شارٹ اسٹوری یا افسانہ پہلے روزنامہ جنگ میں چھپا تھا گیارہ سال کی عمر میں "ھیئہ دل" کے نام سے پھر جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی صلاحیتیں بھی پروان چڑھتی گئی۔ میرے لیے یہ ایک دلچسپ مشق رہی۔ میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور مسلسل سیکھ رہی ہوں۔
س: پہلی کہانی کس رسالے میں شائع ہوئی تھی؟ کیسا لگا تھا آپ کو؟

ج: پہلی کہانی روزنامہ جنگ میں شائع ہوئی تھی شارٹ اسٹوری تھی شاید دو سو الفاظ ہوں گے۔ "اے شیشہ دل کے نام سے" تب بہت خوشی ہوئی تھی لیکن ڈائجسٹ میں پہلا مکمل ناول آنچل میں "اے وحشت دل" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

س: آپ کے الفاظ میں ایسا سحر ہے جو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے آپ کی اپنی فیورٹ اسٹوری کون سی ہے؟

ج: بہت شکریہ، آپ کو میرے ناولز میں وہ سحر دکھائی دیتا ہے۔ میں نے اب تک جو بھی لکھا دل سے لکھا شاید اسی لیے وہ اس طور پر آپ کے دل کو چھو پایا۔ میرے فیورٹ ناولز میں افسون جاں اور ایک سو سولہ چاند کی راتیں ہیں۔

س: کبھی تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟

ج: اللہ کا کرم ہے تنقید نہیں ہوئی اگر ہوتو میں اسے تعمیری سوچ کے ساتھ قبول کروں گی۔ ہم ہر لمحہ سیکھنے کے عمل سے گزرتے ہیں۔

س: اگر کوئی بار بار کال کر کے تنگ کرے تو کیا ری ایکشن ہوتا ہے آپ کا؟

ج: میں گمنام کال ریسیو نہیں کرتی۔

س: زندگی کو پرفیکٹ بنانے کے لیے کیا چیز ضروری ہے آپ کے نزدیک۔ عزت، دولت، شہرت؟

ج: عزت سب سے اہم ہے۔ زندگی کو پرفیکٹ بنانا ہو تو صبر اور شکر کرنا سیکھیے۔ صابر اور شاکر دونوں جنتی ہیں اور یہی عمل زندگی کو ایک توازن دیتا ہے۔

س: کوئی ایسی خواہش جو آج تک پوری نہیں ہوئی ہو؟

ج: ہزار خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ نہیں ایسی کوئی خواہش نہیں ہے، خواہشیں کبھی ختم نہیں ہوتی۔ مگر میں حقیقت پر یقین رکھتی ہوں۔ جو ممکن ہو وہ پورا ہو جاتا ہے۔

س: آپ کی بیسٹ فرینڈ جس نے ہر لمحہ آپ کا ساتھ دیا ہو؟

ج: مشی میری دوست وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہی اس کا ساتھ میری طاقت ہے۔

سباس گل

س: آپ کا بچپن کہاں گزرا اور کیسا گزرا؟

ج: میرا بچپن بہت شرارتی تھا میں بہت زیادہ شرارتیں کرتی تھیں ہم کزنز مل کر بہت زیادہ اودھم مچاتے تھے۔ مگر پھر سارے کزنز باہر ممالک شفٹ ہو گئے اور میں اپنے فرینڈز کھونے لگی تب بہت زیادہ فرینڈز نہیں بنا پائی۔ زیادہ وقت دادا ابا کے ساتھ گزارنے لگی تھی اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

س: بچپن میں کیسی تھیں سنجیدہ یا شرارتی؟

ج: سباس میں بہت شرارتیں کرتی تھی کزنز کا گروپ تھا اور ان کے ساتھ میں خود کو بہت کمفرٹیبل محسوس کرتی تھی۔ بہت زیادہ دھما چوکڑی مچاتے تھے۔

س: عشنا جی کیا آپ کے ناول کی طرح ریئل لائف میں بھی آپ کے ساتھ کوئی رومانٹک سا شرارتی سا سین ہوا؟

ج: میں لندن میں تھی جب میری انگیجمنٹ کے بعد فیانسی کی طرف سے ڈنر پر لے جانے کی آفر ہوئی میں بہت نروس تھی میں نے منع کر دیا تھا مگر تب موصوف خود پک کرنے پہنچ گئے تھے اور تب پتا چلا تھا وہ کنٹری سائیڈ پر دی جانے والی ایک فیملی گیٹ ٹو گیدر تھی۔

س: عشنا جی کبھی دل میں خیال آیا کہ بس اب نہیں لکھنا؟

ج: نہیں ایسا بھی نہیں لگا مگر میں لکھنے میں لیے گیپ لیتی رہی ہوں کیونکہ اسٹڈی ساتھ چل رہی تھی تو ہر ناول میں ایک اچھا خاصا گیپ آ گیا دو تین سال کا مگر اس سے مجھے مدد ملی۔ میری رائٹنگ اسکلز مزید روانی میں آ گئیں اور میں اپنے ہی لکھے ہوئے گزشتہ ناول سے بالکل ہٹ کر بنا اثر لیے کچھ نیا لکھ پائی۔

س: کیسے ہم سفر کی تمنا ہے؟

ج: میں نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کون ہوگا کیسا ہوگا مگر میں اتنا چاہتی تھی جو ہو وہ سمجھنے والا ہو مجھے جاننے والا ہو خیال کرے عزت دے اور اللہ کا کرم ہے اس ذات پاک نے ویسا ہی ہم سفر نواز دیا ہے۔

س: پاکستان کے بارے میں کیا سوچتی ہیں؟

ج: پاکستان میری روح میں ہے، میرا دل ہے جان ہے جب ملک سے باہر ہوں تو پاکستان کی بہت شدت سے یاد آتی ہے جو دیارِ غیر میں مقیم ہیں وہ اس کا اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں میری تمنا ہے پاکستان بہت ترقی کرے اور اللہ پاک اس سرزمین کو پرامن بنا دے، آمین۔

س: چاندنی راتوں میں لکھتی ہیں۔

ج: لکھنے والے نیچر سے بہت اٹریکٹ ہوتے ہیں اور ان کی طبیعت پر اس کا ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ مجھے چاندنی راتیں بالخصوص لکھنے پر اکساتی ہیں۔

عرشیہ ہاشمی

س: آپ کیوں لکھتی ہیں مقصد کیا ہے پیسہ، شہرت، عزت یا کچھ اور؟ اور ایک رائٹر کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟

ج: میں نے بچپن میں لکھنا شروع کیا تھا تب پتا نہیں تھا کہ کیوں لکھتی تھی بس مجھے لکھنا اچھا لگتا تھا بچپن میں لکھنے پر بہت ڈانٹ پڑتی تھی میرے والدین کو لگتا تھا کہ میں لکھنے کی وجہ سے پڑھائی پر توجہ نہیں دے پاؤں گی۔ مگر میرے دادا ابا نے مجھے بہت سپورٹ کیا۔

نزہت جبین ضیا

س: آپ کا پسندیدہ رائٹر؟

ج: ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، سعادت حسن منٹو، اشفاق احمد۔

Fyodor Mikhailovich Dostoyevsky

And

Franz Kafka

کہکشاں صابر

س: پہلی تحریر لکھتے وقت آپ کے تاثرات کیا تھے؟

ج: بچپن تھا ایک شوق تھا اس وقت بہت پر جوش تھی۔

س: محبت کو آپ بہت گہرائی سے بیان کرتی ہیں۔ جب آپ نے اپنی کہانی ناول یا افسانہ میں اس گہرائی کو پہلی بار بیان کیا تھا تب آپ کی اپنی زندگی میں محبت کا یہ احساس تھا کیونکہ انسان وہی لکھتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے؟

ج: میں خود کو بہت زیادہ خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ میرے پاس ایک لوونگ، کیئرنگ فیملی ہے میں نے تب لکھنا شروع کیا جب شعور بیدار نہیں تھا اس خاص محبت کا تو کوئی نشان نہیں تھا۔ مگر میرے ذہن میں وہ سبھی فنتیسی کریکٹر تھے جن میں پرنس سونی پرنسز کے لیے سب زیر و زبر کر دیتی ہے۔

س: آپ ہمیشہ اپنے ناولز میں ہائی اسٹیٹس کے ہیروز کی محبت کو قلم بند کرتی ہیں کبھی عام اسٹیٹس پر کیوں کوشش نہیں

کی؟
ج: یہ الزام ہے کہ میں نے ہمیشہ ہائی کلاس کے ہیرو لکھے ہیں۔ سوبان کا کردار ہائی نہیں تھا اسی طرح اور بھی کچھ کردار تھے جو اپر کلاس سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ایسا دانستہ نہیں ہوا مجھ سے ہو جاتا ہے۔ بہت کوشش کرتی ہوں ہر طبقے کی ترجمانی کروں۔ ایک افسانہ لکھا تھا کرن ڈائجسٹ کے لیے ''زرد دوپہر'' وہ کسی نے پڑھا ہو تو پتا ہوگا کہ کتنا حساس موضوع تھا۔

س: جس طرح آپ اپنے ناولز میں محبت کرنے والوں کو اتنی آسانی سے ملا دیتی ہیں آپ کی نظر میں حقیقی زندگی میں بھی محبت کرنے والے اتنی آسانی سے مل جاتے ہیں؟

ج: ناولز خیالی ہیں حقیقت نہیں۔ حقیقت مختلف ہوتی ہے۔ کچھ دن پہلے ناول ''اعادہ جان گزشتہ'' کے اختتام پر بات ہو رہی تھی مجھے لگتا تھا میں ناول کو تصوراتی نہیں بناؤں گی۔ مجھے منطقی انجام لکھنا ہے اور تب میرے قارئین نے کہا تھا ہم حقیقت میں جیتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں ہے حقیقت میں محبت اس طرح نہیں ہوتی جس طرح ناول میں ہوتی ہے مگر ایک رائٹر کی ذمہ داری ہے کہ وہ تبدیلی لائے۔

س: برت بدلی میں نہ بدلا کیا شادی کے بعد بھی لکھتی رہیں گی اگر بھائی کو آپ کے لکھنے سے مسئلہ ہوا تو؟

ج: ان شاء اللہ میں لکھنا جاری رکھوں گی آپ کے بھائی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

س: اگر ہوا تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟

ج: میں لکھنا ترک کر دوں گی۔

س: کیا کبھی لکھتے لکھتے ایسا محسوس ہوا ہے یہ جو ناول شروع کیا ہے بکواس ہے جبکہ آپ آدھے سے زیادہ لکھ چکی ہوتی ہیں؟

ج: ایسا نہیں ہوا مگر ایک بار لکھتے ہوئے چھوڑ دوں تو پھر اس میں انٹرسٹ ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے کئی تحریریں لکھتے ہوئے چھوڑی تو مکمل نہیں کر پائی۔

س: کس وقت لکھنا زیادہ اچھا لگتا ہے صبح، شام یا کبھی بھی؟

ج: میں رات میں زیادہ لکھتی تھیں مگر پھر یہ پیٹرن بدل گیا اور میں دن میں زیادہ لکھنے لگی جب تک پڑھائی چلتی رہی میں دن میں زیادہ لکھ نہیں پاتی تھی مگر اب دن کا وقت چنتی ہوں۔

س: آپ اپنی تحریر کردار پہلے سے سوچے ہوئے طریقہ سے لکھتی ہیں کہ کردار جب دل چاہے جس طرف مڑ جائے آپ اپنے قلم کو بھی اس طرف موڑ لیتی ہیں۔

ج: کردار پہلے ذہن میں ترتیب دیتی ہوں لکھتے ہوئے کردار اپنے تسلسل کے ساتھ اپنے آپ کو خود آپ کو لکھواتے ہیں۔ ایک خاص کشش چھا جانے والی شخصیت مگر میں نے سبکتگین کو سوچا تھا سبکتگین نے اس سے آگے کا سفر خود طے کیا اور لازوال کردار بن گیا۔ اشعر ملک میرے لیے حیران کن رہا میں نے جو خاکہ بنایا تھا اشعر ملک نے مجھ سے سو فیصد اچھا لکھوایا خود میں ایسا کردار پہلی بار لکھ رہی تھی اور اپنی نیچر میں وہ اپنی طرز کا ایک انوکھا کردار بن کر ابھرا۔

س: آپ محبت کے ہر پہلو کو اتنا کھل کر بیان کرتی ہیں گھر میں بابا یا بھائیوں کو یا پھر خاندان میں کسی کو اس انداز بیانی پر اعتراض ہوا ہے کیا؟

ج: رومانس لکھنے میں اور عامیانہ پن میں بہت فرق ہے اور میرے پڑھنے اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ میرے ناولز میں رومانس ہے کوئی عامیانہ پن نہیں۔ مجھے ریحانہ علی خان کے الفاظ اپنے لئے بہت بڑی سند لگتے ہیں جب انھوں نے کہا عشنا سے بہتر رومینٹک ناول کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔ اگر میں بے حساب مقبول ہوں یا میرے لکھے
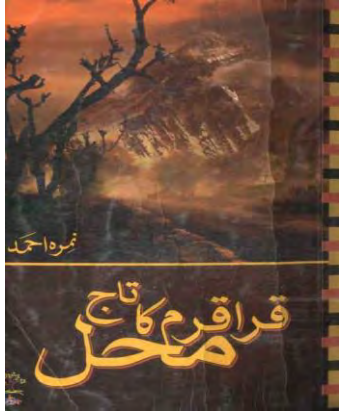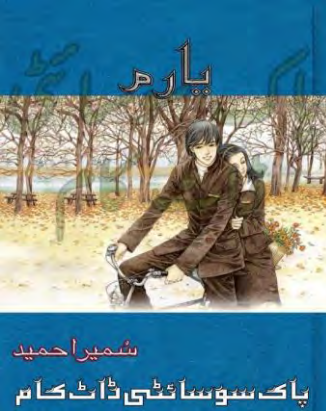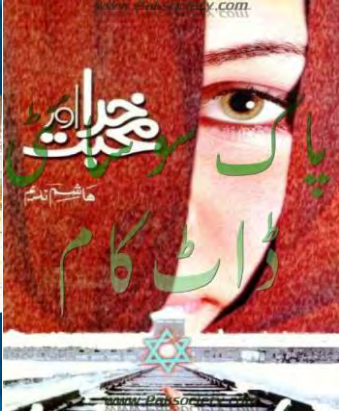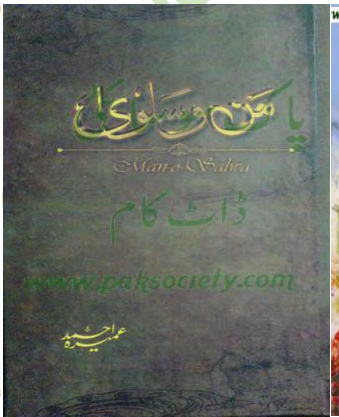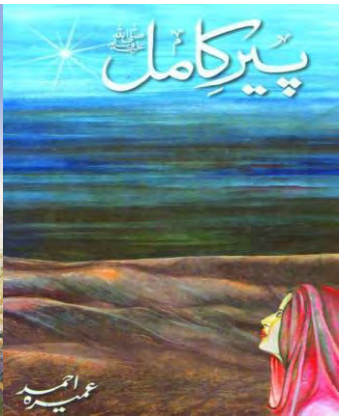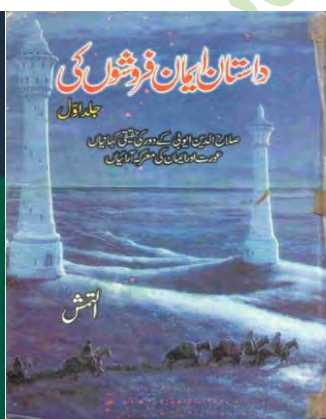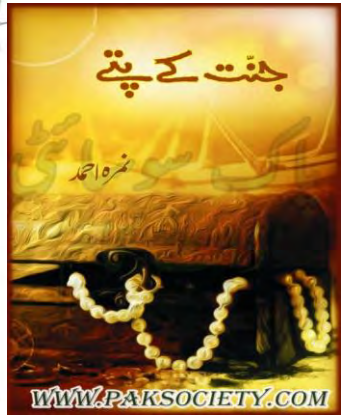
ہوئے ناولز بے پناہ مقبولیت پا سکے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ان ناولز کو پڑھنے والوں میں 12 سال کی عمر سے لے کر 80 برس کی عمر تک کے قارئین شامل ہیں۔ اگر کوئی قابل اعتراض بات ہوتی تو اتنی پذیرائی ہر عمر کے طبقے سے نہیں ملتی۔ میرے بابا میرے ناولز پڑھتے رہے ہیں کسی کو اس پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

یاسین صدیقی

س: آپ نے اب تک کن کن رسائل میں لکھا سب سے زیادہ کس میگ یا ڈائجسٹ کے لیے لکھا تازہ ترین کون سی کہانی لکھ رہی ہیں اور وہ کہاں شائع ہو رہی ہے۔

ج: لکھا تو سبھی میگزین کے لیے ہے لیکن آنچل سے خاص محبت رہی ہے۔ اس لیے میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ مجھے آنچل اپنا گھر لگتا ہے۔ میں آنچل میں اپنی ابتدائی عمر سے لکھ رہی ہوں۔ تازہ ترین کہانیوں میں ''اعادہ جان گزشتہ اور ایک سو سولہ چاند کی راتیں ہیں'' کتاب گھر کی ویب سائٹ پر جلد شروع ہونے جا رہے ہیں۔

دلکش مریم

س: آپ خود محبت پر کتنا یقین رکھتی ہیں آپ نے نوک قلم سے ہمیشہ اپنے قارئین پر محبت کا سحر پھونکا ہے؟

ج: مجھے معلوم تھا یہ سوال آئے گا اور تمہاری طرف سے ہی آئے گا۔ بہت زیادہ یقین رکھتی ہوں میں محبت کے بنا ادھوری ہوں نامکمل ہوں کسی کام کی نہیں ہوں میرے بہت زیادہ محبت کرنے والے رشتے میری سب سے بڑی طاقت ہیں میری سب سے بڑی ڈھال ہیں کوئی ایک رشتہ نہیں ہوتا جس کی محبت اہم ہوتی ہے محبت بذات خود بہت زیادہ اہم ہے اور اتنی ہی طاقتور اللہ کا کرم ہے میرے پاس اتنی ڈھیروں ڈھیر محبت ہے اور اس میں میری فیملی کی محبت سے لے کر میرے ہونے والے شریک سفر کی محبت اور آپ سب کی محبت شامل ہے۔ میں محبت کے بنا نہیں لکھ سکتی محبت میری جزئیات بھی ہے اور کل بھی۔

س: محبت جتنی منفرد اور نئی ہے آپ کے ناولز کے نام منفرد ہوتے ہیں کیوں، اگر آپ محبت پر نہ لکھتی تو پھر کس موضوع پر لکھتیں؟

ج: اگر محبت پر نہ لکھتی تو شاید بہت پھیکا لکھتی یا شاید نہ لکھ رہی ہوتی۔ میں ہر رشتے میں محبت کو دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں، ہر رشتہ محبت سے بھرپور ہے۔ میں نے باپ بیٹی کی محبت لکھی دادا پوتی کی محبت لکھی ماں بیٹے کی محبت لکھی دو بہنوں کی محبت بھی لکھی ہر محبت خوب صورت ترین رہی ہے۔ کوئی ایک رنگ نہیں ہے محبت کے کئی رنگ ہیں۔ سو میں محبت کو ایک روایتی رنگ سے ہٹ کر بھی دیکھتی ہوں۔

س: ناولز کے نام منفرد رکھنے کی کیا وجہ ہے آپ کے ناول کے ہر نام میں عشق، محبت، خواب اور جان کا لفظ ضرور ہوتا ہے کیوں؟

ج: ناول کے نام منفرد رکھنا میری عادت ہے شاید یہ انفرادیت میرے اندر ہے میری اپنی ایک سمت ہے میں اپنے راستے خود بناتی ہوں جب کچھ لکھنے کا خیال آتا ہے اسے بہت خاص بنانا چاہتی ہوں چاہے وہ عنوان ہو یا پلاٹ چاہے لکھنے کا انداز، میں کسی اور سمت پر قدم رکھ کر چلنے کی عادی نہیں۔ جان، خواب، محبت کے استعارے ہیں سو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ الفاظ عنوان کا حصہ بن جاتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر ایک بات جو آج تک میرے کسی قاری نے نوٹس نہیں کیا میرے ناولز کے نام لفظ الف سے شروع ہوتے ہیں میری زندگی میں لفظ الف بہت اہم ہے۔ پہلا ناول جو لکھا ''اے وحشت دل'' تھا جس رسالے میں چھپا وہ آنچل تھا سلسلے وار ناول اے شمع کوئے جاناں تھا۔ میرے سبھی ناولز الف سے آغاز ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

س: کی جانے والی محبت اور ہو جانے والی محبت میں کیا فرق ہوتا ہے؟
ج: محبت زبردستی نہیں ہوتی، محبت ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی میرے ناول تارا تارا اجالا کی لائن ہے۔
''محبت کچھ نہیں دیتی محبت کے سوا اور محبت کچھ نہیں لیتی محبت کے سوا'' بس یہی محبت ہے محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔
س: کسی ایسی لڑکی/لڑکے سے ملی یا بات ہوئی جو آپ کے ناول کے کسی کردار سے بہت ملتی/ملتا ہو؟
ج: ایسے بہت سے کردار تھے اور ہیں، ایان شگری سے ملی تھی اور سنگین کو لکھنے کے بعد ایک بندے سے ملی تھی اس طرح بہت سی لڑکیوں سے ملی جو میرے کرداروں سے مماثلت رکھتی تھیں ایک بار لندن میں ٹرین میں ایک لڑکی کو دیکھا تھا عموماً میں کار سے سفر کرتی تھی مگر اس روز اتفاق تھا میں ٹرین میں تھی اور اس لڑکی سے ملی تھی میں نے اسے روتے دیکھا تھا مجھے لگا تھا وہ میرب تھی۔
س: کون سا کردار آپ کی شخصیت کے قریب تھا اور کون سا حقیقت کے قریب تھا؟
ج: میرے بھی کردار میرا بھرپور عکس ہیں میرب سیال اور اجاج منصور میری شخصیت کے قریب ہیں۔ ایان شگری (میرے رشتے کے ایک دیور) مجھ سے ملنے آئے تھے اور تب میں ایان شگری کے کردار کو بن رہی تھی تب اس رئیل جیتے جاگتے کردار سے مل کر اچھا لگا تھا کیونکہ وہ ایان شگری جیسا تھا۔
س: کس سے ملنا چاہتی ہیں؟
ج: جو سونے کا دل رکھتے ہوں اچھے لوگوں سے۔
س: کوئی آپ کا منتظر ہو تو اس کا انتظار طویل کرتی جائیں گی یا مختصر کریں گی۔
ج: میں کسی کو انتظار نہیں کرانا چاہوں گی ایسا نہیں ہوا مگر میں بہت صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ نہایت سکون سے کسی کا انتظار کر سکتی ہوں۔
س: آپ کی قیمتی ملکیت؟
ج: میری فیملی، میری لکھنے اور سوچنے کی صلاحیت۔
س: کوئی عجیب خواہش؟
ج: دنیا سے جنگ و جدل کا خاتمہ ہو جائے اور کوئی کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے نہ دکھ دے ہر چہرے پر مسکراہٹ ہو بس۔ کہیں کوئی جنگ نہ ہو ہر جگہ سکون اور امن و امان ہو۔
س: آپ حیران رہ جاتی ہیں جب......؟
ج: انسانی نفسیات بہت حیران کن ہے انسانی رویے اکثر مجھے حیران کرتے ہیں مگر میں مسلسل حیرت میں نہیں رہتی۔
س: زندگی میں کب تبدیلی آئی؟
ج: آگے بڑھتے ہوئے میں نے ہمیشہ ایک تبدیلی اپنے اندر محسوس کی ہے میں ہر لمحہ خود میں خود کو محسوس کرتی ہوں ہر لمحہ کچھ نیا سیکھتی ہوں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے ڈیڈ کے انتقال کے بعد مجھ میں تبدیلی آئی وہ میرے پاس ہوتے تو میں اور بھی مضبوط ہوتی اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، آمین۔
س: انسان کو کیا بات بہت نقصان پہنچاتی ہے؟
ج: انسان کی اپنی سوچ۔
س: آخر میں ایک شرارتی سا سوال، آپ زیادہ خوب صورت ہیں یا آپ کا دل؟
ج: ہاہاہا، میرا دل، حسن فانی ہے ڈھل جائے گا اندر کی خوب صورتی ہمیشہ باقی رہے گی۔

س: کیا یہ ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں اردو ناول بھی ٹیم ورک کا نتیجہ ہوں اور ایک اچھے ناول کو اسی طرح لکھا جانے لگے جیسے کسی فلم کی تکمیل میں مختلف ماہرین مل کر اپنا کردار ادا کرتے ہیں پلاٹ سوچنے سے لے کر ناول کے مختلف مراحل ٹیم ورک کی صورت مکمل ہوں؟

ج: انگلش میں ناولز کولابوریشن رائٹنگ میں لکھے جاتے ہیں دو افراد مل کر ناول لکھتے ہیں میں نے انگلش میں کولابوریشن رائٹنگ کی ہے مگر اردو میں کولابوریشن کا رجحان نہیں ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ دو رائٹرز مل کر کوئی ایک ناول لکھیں مگر پھر کریڈٹ کا مسئلہ ہوتا ہے ناول موسٹلی ون مین شو ہوتا ہے۔ مووی ایک الگ چیز ہے وہ ٹیم ورک ہوتا ہے۔ اسکرین پلے ایک لکھتا ہے ڈائیلاگ دوسرا۔ میں نے ایک سلسلہ کہانی گھر کے نام سے شروع کیا تھا ایک کہانی کو بہت سے لوگ مل کر لکھ رہے تھے۔ یہ باتیں بہت اہم ہیں ان کو ریکارڈ میں آنا چاہیے۔

ھانیہ درانی

س: میرے پسندیدہ ناول اے شمع کوئے جاناں (ادعیہ، اعصار شیخ) اور افسون جان (انابیہ، عفنان احمد) ان دونوں کپل کی الجھی ہوئی زندگی کو ایک پل میں سنوار کر آپ نے ان کے شروع سے لے کر ناول کے درمیان تک کے جاندار کردار کو ناول کے اینڈ تک کچھ ہلکا نہیں کر دیا تھا آپ کی نظر میں کیا ان کرداروں کے لیے آپ کے قلم کو بس یہیں رک جانا چاہیے تھا؟

ج: میں نے ان کرداروں کو بہت مضبوطی سے لکھا میں کرداروں کو لکھتی نہیں وہ خود کو خود مجھ سے لکھواتے ہیں۔ میں لکھتے ہوئے کسی کردار کے ساتھ کوئی زبردستی کر کے انہیں توڑنے موڑنے کی کوشش نہیں کی مجھے ان کرداروں کے لیے وہی اختتام مناسب لگا۔

جویریہ نواز

س: اپنے بچپن کی کوئی شرارت بتائیں؟

ج: میں تین چار برس کی تھی جب اپنے کزنز کے ساتھ ٹیرس پر کھیل رہی تھی بہت اچھے سے تو یاد نہیں مگر مام بتاتی ہیں کہ میں ان شرارتوں کے دوران میں نے چیئر ٹیرس کی ریلنگ کے ساتھ جوڑ دی تھی اور تبھی میں ٹیرس کی ریلنگ سے گر گئی تھی اور تب بہت مشکل سے بچی تھی۔

س: آپی آپ کس شہر سے تعلق رکھتی ہیں۔

ج: میرا تعلق کراچی شہر سے ہے۔

عمراحه الیان

س: آپ نے اپنے ناول کو ڈراموں میں دینے کا سوچا ہے کبھی؟

ج: ڈراما آفر بہت بار ہوئی، ان شاء اللہ تھوڑا وقت ملتا ہے تو وہ لکھوں گی۔

س: آپ فارغ اوقات میں کیا کرنا پسند کرتی ہیں؟

ج: میں فری ٹائم میں میوزک سنتی ہوں مووی دیکھتی ہوں پینٹنگ کرتی ہوں، فوٹوگرافی کرتی ہوں بک کرتی ہوں اور واک کرتی ہوں۔

حفصہ عارف

س: السلام علیکم! کیسی ہیں آپ مجھے بھی لکھنے کا بہت شوق ہے لیکن الفاظ چننا مشکل لگتا ہے آپ بتائیں کیسے لکھنا شروع کر سکتی ہوں مجھے آپ کے ناولز بہت پسند ہیں آپ کی تحریر میں واقعی کچھ ایسا ہے جو مجھے اٹریکٹ کرتا ہے میں

آپ کے جیسا لکھنا چاہتی ہوں۔
ج: وعلیکم السلام، الحمدللہ میں ٹھیک ہوں۔ اگر آپ لکھنا چاہتی ہوں تو اس کے لیے ہمارے اجالا گروپ میں رائٹنگ کلاسز کا حصہ بنیے آپ کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا میری رائے ہے اپنا مطالعہ وسیع کیجیے آپ کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہونا ضروری ہے پھر سوچوں کو مجتمع ہونا جو لکھیے بہت دل سے لکھیے سب بڑے مصنفین کو پڑھیے مگر لکھتے ہوئے اپنی انفرادیت کو قائم رکھیے اللہ آپ کو بہت کامیاب کرے آمین۔

لبابہ خان

س: آپ نماز بھی پڑھتی ہیں؟
ج: یہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیانی معاملات ہیں میں کوشش کرتی ہوں جہاں تک ممکن ہو اپنے رب کے قریب رہوں۔

لبنیٰ خان

س: آپ کو میوزک میں انٹرسٹ ہے؟
ج: میوزک پسند ہے۔ روک، آر این بی اور سول یہ میرے پسندیدہ میوزک ہیں مجھے پاکستانی روک میوزک بھی پسند ہیں۔
س: آپ کو کھانے میں کیا پسند ہے؟
ج: مجھے اٹالین فوڈ پسند ہے مگر میری مام کے ہاتھ کے دیسی مسالوں کے ساتھ اس کے علاوہ ہمارے مزے مزے کے پاکستانی کھانے۔ میں ریڈ میٹ نہیں کھاتی، میٹ، بیف، مٹن میرے کھانوں میں شامل نہیں چکن پسند ہے۔
س: کپڑوں میں آپ کا فیورٹ کلر؟
ج: نیلا، سفید اور پنک میرے فیورٹ ہیں۔

لبنیٰ خالد

س: کوئی ایسا موضوع جسے لکھنے کی خواہش کے باوجود لکھ نہ پائی ہوں؟
ج: ایک انگریزی ناول ہے جو شروع کیا تھا، میری لکھنے کی بہت زیادہ خواہش تھی مگر میں نہیں لکھ سکی۔ موضوع فی الحال نہیں بتا سکتی، کیونکہ میں کبھی اسے مکمل کرنا چاہوں گی۔
س: اپنی کس تحریر کو اپنی تمام تحریروں کا نچوڑ سمجھتی ہیں؟
ج: اچھا ایسا ہے کہ میں تاحال ایسا نہیں سمجھتی کہ وہ لکھ دیا جو لکھنا چاہیے تھا، اگرچہ میرے تین، چار ناولز بہت زیادہ پذیرائی اور مقبولیت سمیٹ سکے۔
س: کوئی ایسی تحریر بھی ہے جس سے آپ خود مطمئن نہ ہوں مگر قارئین نے اسے بے حد و بے حساب سراہا ہو؟ اور آپ آج تک حیران ہوں؟
ج: نہیں، ایسی کوئی تحریر نہیں ہے، میں جب تک خود اپنے لکھے سے مطمئن نہ ہوں اسے اپنے ریڈرز کو پڑھنے کے لئے نہیں دیتی۔
س: زندگی تو زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں آپ خود اپنے مزاج کی کیسے وضاحت کریں گی؟
ج: میں بات دل میں نہیں رکھتی، اگر کچھ اچھا نہیں لگتا تو صاف کہہ دیتی ہوں، میرے جاننے والے کہتے ہیں میں humble ہوں اور میں محسوس کرتی ہوں یہ سچ ہے۔ بہت زیادہ مثبت مائنڈڈ ہوں، ہمیشہ مثبت سوچتی ہوں۔

س: ہمیشہ دیر کرو دیتا ہوں میں "کبھی اس کیفیت سے گزرنا پڑا اس مصرعہ کی حقیقت محسوس ہوئی؟
ہاہ! میں وقت کی کبھی کبھی قدر نہیں کرتی۔ میں اپنے موڈ کے خلاف نہیں جا پاتی جب کئی لمحے ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہیں مگر میں اس کے لیے پچھتاوا محسوس نہیں کرتی۔ میرا ماننا ہے جو ہو رہا ہے اللہ کی رضا ہے، نہیں بھی ہو رہا تو رب کی کوئی رضا ہوگی۔

فوزیہ سمیع

س: کیا کبھی ایسا ہوا کہ آپ جو لکھنا چاہ رہی ہوں اس کے لیے الفاظ نہ مل پائیں یا لکھ کر بار بار مٹانا پڑے کہ یہ نہیں کچھ اور؟
ج: نہیں جب سے لکھ رہی ہوں میں ایک بار لکھتی ہوں بنا ڈیسائیڈ کیے کوئی پلان کیے اور کبھی مٹا کر لکھنا نہیں پڑا اللہ کا خاص کرم ہے۔
س: مصنف حساس طبیعت کے مالک ہوتے ہیں دوسرے کے دکھ جلد سمجھنے والے آپ خود کو بھی حساس طبیعت کی پاتی ہیں کسی کے چھوٹے سے دکھ پر کبھی آپ نے آنسو بہائے ہیں؟
ج: یہ درست ہے لکھنے والے بہت حساس ہوتے ہیں ہاں میں کسی کے دکھ درد کو بہت گہرائی سے محسوس کر پاتی ہوں اور دوسروں کے دکھ پر بہت افسردہ بھی ہو جاتی ہوں۔

ناہید اختر بلوچ

س: عشنا میم کیا آپ نے کبھی کسی متنازع موضوع یا شخصیت پر کوئی تحریر لکھی؟ یا اگر لکھنا چاہیں تو کس متنازع موضوع یا شخصیت پر لکھنا چاہیں گی اور لکھنے کی وجہ؟ اگر آپ کو اچانک پتہ چلے کہ دنیا کل ختم ہو جائے گی (فرض کریں) تو آپ کون سا کام جلد از جلد نمٹا دیں گی؟ دولت، شہرت اور روحانیت میں سے آپ کا انتخاب کیا ہوگا؟ مغربی مصنفین کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ کیسا رہا؟ آپ کے نزدیک آج کی عورت کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد کیا ہے؟
ج: ہاں ایسا ہے، متنازع تو نہیں مگر کسی قدر حساس موضوع ذہن میں ہے، ابھی تک نہیں لکھ پائی۔ میں لکھنا چاہوں گی۔ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس موضوع پر اگر نہ لکھا تو مجھے بہت پچھتاوا ہوگا۔ میں نماز پڑھوں گی اللہ سے معافی مانگوں گی اور اپنے سارے پیاروں سے ملنا چاہوں گی۔ دولت، شہرت اور روحانیت میں میرا انتخاب روحانیت ہے۔ مغربی مصنفین کے ساتھ کام کرنے کا تجربہ بہت دلچسپ رہا۔ اپنوں کے درمیان خود کو منوانے میں وہ لطف نہیں جو مغربی لکھنے والوں کو چونکا دینے میں ہے۔ ان کے ساتھ کام کرنا، اپنی صلاحیتوں کو منوانا، ان کو حیرت میں ڈالنا اور ان سے بے پناہ داد سمیٹنا میرے لئے یہ ایک بہت دلچسپ تجربہ رہا۔ بہت کچھ سیکھا ان سے اور بہت کچھ innovative لکھا۔ آج کی عورت کا مسئلہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں یہاں عورت کو بہت عزت دی جاتی ہے۔ کیونکہ اسلام میں عورت کی عزت اور مرتبہ بہت واضح کیا گیا ہے۔ دوسرے ملکوں میں عورت کو وہ مرتبہ نصیب نہیں۔ پاکستان وہ واحد مسلم ملک ہے جس میں سب سے پہلے عورت وزیراعظم بنی۔ مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ یو کے میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں کم تر سمجھا جاتا ہے۔ وہاں جتنی تنقید مارگریٹ تھیچر Thatcher Hilda Margaret کے دور حکومت اور پالیسیوں کو لے کر ہوئی ہمارے ہاں کی عورت سیاست دانوں کو وہ مشکل مراحل نہیں دیکھنے پڑے۔ یہاں خواتین مصنفین کا طوطی بولتا ہے اور رسالوں سے، کتابوں سے لے کر ٹی وی ڈرامہ لکھنے تک اور پروڈکشن ہاؤسز چلانے تک۔ جہاز اڑانے سے ملک چلانے تک یہاں خواتین کو فوقیت حاصل ہے۔ مردوں کا حوصلہ کمال کا ہے وہ اس برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔ UK میں خواتین مصنفین کو ایون قابلِ صلاحیت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں خواتین کو حقوق حاصل

ہیں۔ اس سرزمین پر خواتین مردوں کے مقابل شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ اگر کہیں کوئی چیز غلط ہو رہی ہے تو اس کو سدھارنے کے لیے کام کیا جاسکتا ہے۔ میری زندگی کا مقصد...... بہت سے مقاصد ہیں اب سے بڑا مقصد لکھنا ہے۔

ردا فاطمہ

س: السلام علیکم، آپ کی فیملی نے آپ کے کسی ناول کو پڑھا ہے اور کیا تبصرہ کیا تھا؟

ج: میری فیملی نے میرے کسی ناول کو نہیں پڑھا یہ گھر والے کوئی خاص قدر نہیں کرتے۔

س: آپ اپنی تحریر کا اختتام کرنے کے بعد سب سے پہلے کس کو پڑھنے کو دیتی ہیں اور کس کے تبصرے سے مطمئن رہتی ہیں؟

ج: اختتام پذیر کرکے پڑھنے کا یا پڑھوانے کا وقت نہیں ملتا سو سیدھا میگزین/ایڈیٹر کے پاس جاتا ہے۔ اپنے ریڈرز کے تبصرے سے مطمئن ہوتی ہوں، میرے ریڈرز کی رائے میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے، ان کی رائے میرا انعام ہے اور سند بھی اور ایوارڈ بھی۔

شہزادہ کلیم آرائیں

س: مجھے آپ کی بکس گفٹ میں چاہیے کوئی ایک ہی مل جائے۔

ج: نیکسٹ ناول پبلش ہوگا تو ضرور۔

ام حبیبہ

س: زندگی میں ایسا کیا پایا، یا پانے کی خواہش ہے کہ سب کچھ پالیا؟

ج: اللہ کا کرم ہے کھویا کچھ نہیں پایا بہت کچھ ہے۔ کچھ زیادہ پانے کی خواہش نہیں ہے۔ جو اللہ نے نوازہ ہے اس کے لیے شکر گزار ہوں۔

س: دنیا کی سب سے بڑی دولت کیا ہے؟ اور دولت مند کون؟

ج: دنیا کی سب سے بڑی دولت سچی خوشی ہے جب آپ دل سے خوش ہوں اور بے فکر اور بے پرواز زندگی گزاریں، چاہے آپ کے پاس کچھ نہ ہوں مگر دل اور روح کا سکون ہو۔ سب سے امیر شخص وہی ہے جس کے پاس یہ دل اور روح کا سکون موجود ہو۔

س: جینے کا کون سا انداز پسند ہے، جو آخری دم تک چاہیں گی؟

ج: بے فکر انداز زندگی جس میں کوئی بلاوجہ کی فکر نہ ہو، ایسے جینا چاہوں گی۔

س: کبھی یہ خیال آیا ہو کہ اگر میں یہ ہوتی تو یہ کام کرتی؟

ج: پری ہوتی تو جادو کی چھڑی گھما کر بہت سے چہروں پر سکون والی مسکان لانا چاہتی، دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی۔ اور سب دلوں کو خوشی سے بھر دیتی۔

س: کس سیاسی شخصیت سے متاثر ہیں؟

ج: مجھے سیاست میں بالکل انٹرسٹ نہیں۔ مگر آئی فیل نیلسن منڈیلا جو تبدیلی لائے وہ ایک بہت بڑی مثال ہے۔

س: کونسی دعا زیادہ کرتی ہیں؟

ج: اللہ میری مم کو ہمیشہ تندرست رکھیں اور میری فیملی کو اپنے حفظ و امان میں رکھیں۔

س: پانچ سال بعد اپنے آپ کو کہاں اور کس حال میں دیکھتی ہیں؟

ج: پانچ سال بعد..... یہ تو کبھی سوچا نہیں۔

نمرہ ملک

س: کیا جو کچھ آج تک لکھا ہے اس میں تخلیق کے سفر نے آپ کو بھی سیراب کیا کہ بس! سفر ایسے ہی مقام پہ اینڈ ہونا چاہیے اگر نہیں تو کیسا اینڈ چاہتی ہیں؟
ج: نمرہ، لکھنے والا کبھی مطمئن نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ہمیشہ پہلے سے بہتر کرنا چاہتا ہے۔ جہاں لکھنے والا مطمئن ہو جائے وہاں سفر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ سو میں نے جتنا بھی لکھا ہے میں اس سے بہت بہتر مزید لکھنا چاہتی ہوں کیونکہ میں ہر لمحہ مزید سیکھ رہی ہوں اور اس مزید سیکھنے سے مزید استفادہ کرنا چاہتی ہوں اگر چہ مجھے معلوم ہے جو آج اور اب تک سیکھ کر لکھوں گی آنے والے کل میں اس سے کچھ اور زیادہ سیکھ چکی ہوں ہونگی۔ یہ سیکھنے کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے اور لکھنے کی صلاحیتوں میں بھی بہتری آتی جاتی ہے۔
س: اگر کبھی عورت کے حقوق پر لکھنے کی خاص دعوت ملے تو بالخصوص کس مسئلے کو ہائی لائٹ کریں گی؟
ج: عورت کے حقوق پر لکھنے کی خاص دعوت ملی تو ضرور لکھوں گی اور عورتوں کی تعلیم کو موضوع بناؤنگی۔ ہر لڑکی کو کم از کم ہائی اسکول پاس یا گریجویٹ ہونا ضروری عمل قرار دونگی سو وہ اپنے حقوق کے لئے خود ایک مثبت طرز عمل اختیار کریں اور معاشرے کی فعال شہری بن سکے اور ایک خاندان کو اچھی تربیت دینے کے قابل ہوسکیں۔
س: مسئلہ صرف تعلیم کا نہیں، لوگ ڈگری خرید بھی لیتے ہیں ایسا کیا لکھیں گی کہ عورت کی تربیت میں حقوق و فرائض کی لسٹ آجائے اور معاشرے کو اعتراض بھی نہ ہو؟ کیا سمجھتی ہیں تحفظ نسواں بل عورت کے لیے ان کے حقوق کی جنگ لڑسکتا ہے؟
ج: ڈگری پیسوں سے شاید خریدی جاسکتی ہیں مگر گدھے پر کتابیں رکھ دینے سے وہ پڑھا لکھا نہیں ہوسکتا جو نالج بکس سے اور اسکول کالج یا یونیورسٹی جانے سے آتی ہے یا بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے وہ ڈگریاں خرید لینے سے ممکن نہیں۔ تعلیم شعور و آگاہی دیتی ہے۔

شہباز اکبر الفت

س: السلام علیکم عشنا سس، چھوٹی سی عمر میں اتنی کامیابیاں، کیسا محسوس کرتی ہیں؟
ج: وعلیکم السلام شہباز بھائی، اس کے لئے اس ذات پاک کی شکر گزار ہوں جس نے بنا مانگے بہت کچھ نواز دیا ہے۔ بہت اچھا لگتا ہے، خوشی ہوتی ہے اور کسی قدر اطمینان کے تھوڑا بہت کرلیا۔ مجھے جب پی ٹی وی سے چند سال قبل ینگ فلم میکر اور ینگ ناولسٹ کے طور پر انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا تو مجھے لگا تھا جو کیا ہے اس کا صلہ مل گیا۔
س: کیا ادب میں اپنے موجودہ مقام سے مطمئن ہیں؟
ج: کسی حد تک مطمئن ہوں مگر ابھی بھی لگتا ہے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ شہباز بھائی میں اپنا خود کا لکھا بہت کم پڑھتی ہوں۔ مگر جب پڑھتی ہوں تو مجھے ہمیشہ لگتا ہے اس سے کچھ اور بہتر کرتی اگر اب کرتی، اگر چہ وہ سبھی ناولز بہت مقبول ہیں مگر میں خود اپنی نقاد ہوں۔ میرے آنے والے کچھ ناولز تخلیقی اعتبار سے ان پہلے کے ناولز سے بہت زیادہ مختلف ہونگے۔ مجھے لگتا ہے میں اپنے ہر ناول میں پہلے سے زیادہ میچور ہوئی ہوں اور تخلیقی اعتبار سے میں نے پہلے سے کچھ زیادہ سیکھ لیا ہے۔ مگر سیکھنے کا یہ عمل تو ہمیشہ جاری رہتا ہے سو لکھنے والا کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ میں بھی اپنے ناولز میں مستقبل میں مزید بہتری کی گنجائش دیکھتی ہوں۔
س: کسی ہم عصر ادیبہ سے حسد یا رشک محسوس کیا؟
ج: میں حسد نہیں کرتی، یہ خصوصیت یا حس مجھ میں نہیں ہے۔ میں اپنے طور پر جو کرتی ہوں اسے بہترین کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ماشاء اللہ سبھی ہم عصر بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔
س: کبھی ایسا ہوا کہ جس موضوع کا آپ نے انتخاب کیا اس کی تکمیل سے پہلے ہی اسی مرکزی خیال پر آپ نے کسی

اور کی تحریر دیکھی ہو، اگر ایسا ہوا تو کیا ردعمل تھا؟
ج: ایسا کبھی ہوا نہیں شہباز بھائی، پچھلے دنوں میرے ایک ناول کا عنوان کافی کامن ہو گیا تھا وہ عنوان میرے اپ کمنگ ناول کا تھا جو میں نے تین چار سال قبل آغاز کیا تھا سو میں بے عنوان بدلنا مناسب خیال کیا۔

سارہ خان

جی تو عشنا جی میں اپنے معصوم سے سوالوں کے ساتھ آئی ہوں۔
خوش آمدید بلبل آنے میں اتنی دیر کردی مگر آئی ہو سوا تنے دھما کا خیز سوالات کی ساتھ آئی ہو۔
س: آپ کو میں کیسی لگتی ہوں (آہم آہم)
ج: تم مجھے بہت کیوٹ سی چہک پہک کرتی بے فکری بلبل لگتی ہو ہمیشہ ایسی رہنا۔
س: جب آپ روٹھیں تو کیسے منایا جائے آپ کو (بھائی سے کتنی بار روٹھی ہیں)
ج: میں خفا بہت کم ہوتی ہوں مگر جب کچھ اچھا نہیں لگتا تو خاموش ہو جاتی ہوں۔ مگر جلد مان جاتی ہوں اور دوبارہ جب بات آغاز کرتی ہوں تو اس ناراضگی یا اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں کرتی۔ کسی کو منانے کے لئے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑتی۔ تمہارے بھائی کی اکثر شامت آتی رہتی ہے، میں خاموش ہو جاتی ہوں اور تب وہ فوراً کال کر لیتے ہیں اور میں نارمل انداز میں بات کرنے لگتی ہوں۔
س: رومینس جب لکھتی ہیں کیا کیفیت ہوتی ہے آپ کی۔ (ہم تو شرمائے جاتے ہیں)
ج: رومانس لکھتے ہوئے کیا کیفیت ہوتی ہے...... کوئی خاص کیفیت نہیں ہوتی مجھے زیادہ تر deadline مل چکی ہوتی ہے کہ جلدی مکمل کر کے قسط سینڈ کرنا ہے تو بس جلد سے جلد ختم کرنے کی لگن ہوتی ہے۔
س: زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے آپ کی؟
ج: زندگی کی سب سے بڑی خواہش! میرے پاس خواہشوں کا ایسا کوئی ڈھیر نہیں ہے، ایسی کوئی خواہش نہیں۔ لیکن ہاں ایک خواہش بہت پہلے تھی کہ میں اپنی انگریزی کتابوں کیلئے نوبل پرائز ون کروں اور ایک ایسی شارٹ فلم بناؤں جس پر اکیڈمی ایوارڈ ون کروں۔ مگر یہ خواہش تب تھی جب شعور اس قدر بیدار نہ تھا اب پتہ چلا یہ ایوارڈز کا سٹنڈ آف فیک ہیں اور کوئی بھی انہیں آرام سے خرید کر سکتا ہے۔
س: عشنا جی اعادہ جاں گزارشات ناول مقبول ہوگا اس بات کا یقین تھا آپ کو؟ کیا محسوسات ہیں آپ کے اتنی پزیرائی ملی ناول کو جب؟
ج: ''اعادہ جان گزارشات'' ناول کی بے پناہ کامیابی پر خوش ہوں اور اپنے رب کی شکر گزار ہے جو کامیابیوں کا یہ سلسلہ جوڑے ہوئے ہے۔
س: میری نظر و سوچ میں آپ محبت کی ملکہ ہیں جس خوبصورتی سے محبت کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتی ہیں ہم خود جھوم اٹھتے ہیں کیا اپنی ذاتی زندگی میں بھی محبت میں شدت پسند ہیں آپ؟
ج: اپنی ذاتی زندگی میں باقی سب رشتوں کے لئے ایسی شدت کا مظاہرہ کر دیتی ہوں مگر جس کی طرف تمہارا اشارہ ہے اس سے ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ اس معاملے میں تمہارے بھائی شدت پسند ہیں اکثر ان کے قول و فعل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔
س: کبھی گفٹ دیے تو کیا دینا پسند کرتی ہیں؟ گفٹ میں کیا لینا پسند کرتی ہیں (بھائی سے کتنے گفٹ لیے)
ج: تمہارے بھائی گفٹس دیتے رہتے ہیں اکثر وہ بزنس کے سلسلے میں مختلف جگہوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں تو کچھ نا کچھ میرے لئے لے کر سینڈ کر دیتے ہیں۔ میں گفٹس عمر اور انٹرسٹ کے حساب سے دیتی ہوں کوئی بچہ ہے

تو کوئی ایسی شے دیتی ہوں جس میں اس کا کوئی انٹرسٹ ہے۔ کوئی مین ایج ہے تو اس حساب سے۔

س: جب باہر جائیں کیا چیزیں آپ کے بیگ میں ہر وقت موجود ہوتی ہیں؟

ج: میں اس معاملے میں کوئی خاص پلان نہیں کرتی زیادہ تر جیسے کوئی بیگ رکھا ہوتا ہے ویسے ہی اٹھا کر چل پڑتی ہوں۔ فون اور کچھ کیش اور کریڈٹ کارڈز ساتھ رکھنا نہیں بھولتی۔

س: آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں اور آپ خود بھی بہت خوبصورت ہیں اپنی خوبصورتی کا راز بتاؤ (بیچ والا عشنا جی)

ج: میری خوبصورتی کا راز...... یہ کیسے کیسے سوال آ رہے ہیں...... میں تو اپنے معاملے میں بہت کیئرلیس واقع ہوئی ہوں۔ کوئی خاص خیال نہیں رکھتی۔ میرے نزدیک ظاہری خوبصورتی سے زیادہ باطن کی خوبصورتی اہم ہے اور وہ تب آتی ہے جب آپ کا دل اور روح خوب صورت ہو۔ آپ کی مثبت سوچ آپ کو خوب صورت بناتی ہے۔ جتنا مثبت آپ سوچیں گے آپ کی اتنی ہی اندر کی خوبصورتی آپ کے چہرے پر آئے گی۔ بہت شکریہ تمہیں میرے ناولز اور میری آنکھیں پسند ہیں۔

چاند سی لڑکی

س: السلام علیکم صفا کوثر سروار؟ میں آپ کی کین ریڈر نہیں لیکن پھر بھی سوالات کرنے کی جسارت کی ہے اگر آپ کو کچھ ناگوار گزرے تو...... خیر ہے۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں آپ اپنی ہیروئن میں چھپی ہوتی ہیں یا ہیروئن آپ میں چھپی ہوتی ہے؟

ج: میں اپنی ہیروئن میں چھپی ہوتی ہوں، میں جیتی جاگتی حقیقت ہوں میں کردار تخلیق کرنے والی ہوں، میرے کردار مجھ سے نکلتے ہیں، میں اپنے کرداروں میں سے نہیں نکلتی۔

س: شور ہنگامہ یا خموشی؟

ج: شور اور خاموشی دونوں مگر یہ صورت حال پر انحصار کرتا ہے کبھی خاموشی بہت بھلی لگتی ہے اور کبھی خاموشی اور کبھی بولتے ہوئے چپ۔

س: رنگ کون سے بھاتے ہیں؟

ج: قوس وقزح کے رنگ، شفق کے رنگ، ہلکے رنگ، محبت کے بھی رنگ۔

س: پھول کونسے پسند آتے ہیں؟

ج: RosssandLillyTullp

س: بارش میں لمبی سی واک کرنے کا دل کرتا ہے یا پھر بارش کی رم جھم میں تنہا اپنے خیالوں کے ساتھ اپنے قلم کے ساتھ رہ کر کافی پینا اچھا لگتا ہے؟ کیا پسند ہے؟

ج: بارش میں لمبی واک پسند ہے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنے کمرے میں کافی کے کپ کے ساتھ میری نانو کہتی ہیں جب بارش ہو تو لڑکیوں کو بند کمروں میں نہیں بیٹھنا چاہیے۔ سو میں ٹیرس پر آ جاتی ہوں۔ یا روم کی Windows کھول کر بارش کو دیکھتی یا سنتی ہوں کافی کے ساتھ۔ اگر کچھ کر رہی ہوں تو بارش کی آواز کو سنتی ہوں۔ مجھے بارش کی آواز بہت پسند ہے۔ بارش گفتگو کرتی محسوس ہوتی ہے۔

س: مجھے پوچھنا ہے آپ کا ہیرو کار کا مالک کیوں ہے؟ رکشہ ٹیکسی میں کیوں نہیں سفر کرتا؟ اس کا آفس کیوں ہے دکان کیوں نہیں ہے؟ آپ کی ہیروئن ہیرو کو لندن میں کیوں ملتی ہے صدر میں کیوں نہیں ملتی؟

ج: میرا ہیرو کار کا مالک کیوں ہے؟ کیونکہ وہ پڑھا لکھا ہے، محنت پر یقین رکھتا ہے، اپنے بل بوتے سے اپنے

قدموں پر کھڑا ہوتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں لکھا کہ ہیرو باپ سے ملنے والی جائیداد پر عیش کر رہا ہے، میں نے ہمیشہ لکھا ہے کہ ہیرو نے خود محنت کر کے یہ مقام پایا، مجھے کچھ کر دکھانے والے لوگ پسند ہیں، میں بہت مشکل سے لوگوں سے متاثر ہوتی ہوں، ان لوگوں سے متاثر نہیں ہوتی جو ورثے میں ملنے والے مال پر اکڑفوں کرتے ہیں۔ میں محنت کی عظمت سے متاثر ہوتی ہوں، پھر چاہے وہ رہبان عالم شاہ ہو یا معارج تغلق یا ایان شگری۔ ہر کردار نے اپنی تعمیر کا سفر خود کیا کوئی پیدائشی Enterprenour یا Businesstykoon نہیں تھا۔ ایان شگری کو اس کے ڈیڈ نے محض سترہ برس کی عمر میں گھر سے نکال دیا تھا، وہ ایک کامیاب بزنس ٹائکون اور Enterprenour بنا صرف اپنی محنت کے بل بوتے پر سو ہر لڑکا ایان شگری بن سکتا ہے۔ ایان شگری ایک motivational کردار ہے۔ اچھا اس کا آفس کیوں ہے اور دکان کیوں نہیں؟ ایک دکاندار بھی انسان ہے اور ہر کسی کی عزت ہے خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ محنت سے ایک دکاندار بھی کامیابی کا سفر شروع کر کے آگے بڑھ سکتا ہے۔ ہاہاہا رامین ناٹ فیئر! تم خود تو The Clifton-Forum میں ٹائم آؤٹ میں بیٹھ کر smoothie پینا پسند کرتی ہو اور میری بچاری ہیروئن کے لندن میں ملنے پر لگتہ چینیاں؟ لندن میں نہیں ملی، سارے ناولز کی ہیروئنز پاکستان میں ہی ملی ہیں تم نے میرے ناولز پڑھے نہیں سو آج سے مطالعہ شروع کر دو۔

س: کبھی ایسا ہوگا کہ آپ کسی دارالامان میں جا کر کسی زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ساجدہ یا خالدہ سے ملیں اور اس کی کہانی لکھیں؟

ج: میں نے ساجدہ اور خالدہ پر بھی لکھا ہے اگر تم نے میرا کرن میں شائع ہونے والا ایک افسانہ ''زرد دوپہر'' پڑھا ہو۔ میں نے ایسے کئی اداروں کو وزٹ کیا ہے اور میں ایسی عورتوں کے دکھ درد سے واقف ہوں۔

س: شادی کے لئے محبت کرنا ضروری ہے کیا آپ کے خیال میں یا پھر محبت اور شادی الگ الگ چیزیں ہیں؟

ج: شادی کے لئے کسی کو تھوڑا بہت جاننا ضروری ہے۔ جب تک آپ کسی کو جانیں گے نہیں آپ اس سے محبت میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ میرا یقین ہے محبت شادی کے بعد بھرپور انداز میں واقع ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں جس سے شادی ہو اسی سے محبت ہونا چاہئے اور جس سے محبت ہو اسی سے شادی ہونا چاہیے۔

س: آپ ایان اور اتباع کو کیوں تخلیق کرتے ہیں شاہد اور خالدہ کی کہانی کیوں نہیں سناتے جن کے 6 بچے ہیں جو پیار کرتے ہیں لیکن پیار سے پیٹ نہیں بھر رہا؟

ج: شاہد اور خالدہ اور ان کے چھے بچوں والے ناولز نہیں لکھ سکتی کیونکہ میں رامین کو جانتی ہوں کسی خالدہ کو نہیں میرے ارد گرد رامین جیسے کردار زیادہ کثرت سے موجود ہیں نا اب یہ جو ہے تو اس کا کیا کروں جو نہیں تو اس کا کیا کروں؟ تم نے اشعر ملک کی یاد دلا دی۔

ناظم بخاری

س: آپ کا نثر میں نہ ہونے سے ہونے تک کا سفر کتنے عرصے پر محیط ہے؟

ج: لکھنے کا سفر میرے بچپن سے شروع ہوا تھا سیکھنے کا عمل اب تک جاری ہے، ابھی بھی لگتا ہے کہ کچھ زیادہ نہیں سیکھ پائی۔

آب اور آتش

محمد شعیب

آ گ کا کام ہے جلانا اور پانی کا کام اسے ٹھنڈا کرنا ہے۔ لیکن اگر آل تیز ہو تو پانی بھاپ بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر پانی کی مقدار زیادہ ہو تو وہ بھاپ بننے سے قبل آگ کو شعلہ بننے سے قبل ہی ٹھنڈا کر دیتی ہے۔

ایک اسم با مسمی نوجوان کی روداد، وہ اپنے رستہ میں آنے والی ہر شے کو جلا کر راکھ کرنے کے درپے تھا۔

نئے افق کے ان قارئین کے لیے بطور خاص ایک طویل ناول جو روایات سے ہٹ کر کچھ پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

"میں نے کہہ دیا تو بس کہہ دیا" اس نے عقابی نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ میں بھی دیکھتی ہوں کہ تم اپنی ضد کیسے پوری کرتے ہو۔" اس کے جلال کو ہوا دیتے ہوئے شاہین بیگم نے کہا۔

"میں آپ کو صرف بیس دن کی مہلت دیتا ہوں اگر آپ نے میری شادی ان بیس دنوں میں نہیں کروائی تو آگے جو ہوگا اس کی ذمہ دار آپ خود ہوں گی۔" اس کی آنکھیں اب بھی دہک رہی تھیں۔

"تمہاری ان باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ یہ جو تمہارے نخرے ہیں نا جا کر کسی اور کو دکھاؤ بڑا آیا میری شادی کرواؤ...... ہنہ۔" اس کی بات پر گردن مارتے ہوئے شاہین بیگم نے کہا۔

"یہ تو آپ کو بیس دن بعد معلوم ہوگا کہ میں کیا کرسکتا ہوں" اس نے ان کی بات کو ان سنا کر دیا اور دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

"دفع ہوجاؤ یہاں سے" انہوں نے پہلی بار غصہ میں اس کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے۔

"جا رہا ہوں مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے۔ آپ سے الجھنے کا" چلاتے ہوئے کہا اور دروازے کو زوردار ٹھوکر مار کر چلا گیا۔ ٹھوکر کی آواز سنتے ہی انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا مگر وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ سر پکڑ کر بیڈ کے سرہانے بیٹھ گئیں۔

"واہ بھئی آج تو آپ نے بھی اپنے لاڈلے سے اس لہجے میں بات کر لی" دروازے سے جمال الدین داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی شاطرانہ ہنسی تھی۔ وہ آنے کے بعد ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔

"اڑالیں آپ بھی مذاق آپ کو تو موقع ملنا چاہیے" ان کی آواز میں درد تھا۔ "یہ نہیں کہ میری مشکل کو کم کریں" وہ اپنے بالوں کو پکڑتے ہوئے بولیں۔

"آپ تو سنجیدہ ہی ہوگئیں۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا" انہوں نے حالات کی نزاکت کو بھگتے ہوئے اپنی بات کا رخ تبدیل کر دیا۔

"آپ کا مطلب جو بھی تھا پلیز میری ہیلپ کریں۔ سمجھائیں اس کو جا کر"

"اب کیا کیا آپ کے لاڈلے نے؟"

"شادی کی ضد پکڑ کر بیٹھا ہے۔"

"کیا؟" بات کاٹتے ہوئے۔

"بیس دن کی مہلت دی ہے اس نے اگر بیس دنوں میں اس کی شادی نہ کروائی تو وہ کچھ بھی کر لے گا۔" وہ تمام گفتگو جو ان کے اور اس کے درمیان ہوئی تھی۔ ایک ایک بات بتادی۔

کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

"ہو گیا نا نام کا اثر میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ ایسا نام نہ رکھو۔ مگر تم پتا نہیں لوگوں کو کیا ملتا ہے منفرد نام رکھ کر۔ نام رکھتے وقت لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ نام کا اثر انسان کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ اس کا کردار اس کے نام کی منہ بولتی تصویر ہوتا ہے۔"

"بس آپ کو تو ایک نقطہ چاہیے میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑنے کا۔"

"انسان حقیقت سے منہ تو موڑ سکتا ہے مگر اس سے چھپ نہیں جاتا۔"

"غلطی ہوگئی معاف کردو مجھے" ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ہر غلطی قابل معافی نہیں ہوتی" وہ انتہائی سنجیدہ انداز میں بولے۔

"خدا کے لیے اس مشکل کا حل بتائیں۔ میں مانتی ہوں میرے ہی لاڈ پیار کی وجہ سے وہ بگڑا ہے مگر میں ایسا بھی نہیں چاہتی تھی۔" انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے انتہائی عاجزی سے فریاد کی۔

"اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ سوائے" انہوں نے افسردگی سے کہا۔

"سوائے؟ پوری بات کہیے" ان کے چہرے کو تکتے ہوئے پوچھا۔

"حالات ہی کچھ کریں گے" ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پورے یقین سے کہا۔

میں ہوں آتش۔ آتش کا مطلب ہے 'آگ' میرا کام جلانا ہے۔ چیزوں کو راکھ کر دینا۔ ان کا نام و نشان مٹا دینا۔ میرا نام جس نے بھی رکھا، بہت سوچ سمجھ کر رکھا تھا۔ لوگ اکثر نام رکھتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس نام کا اس کی شخصیت پر بہت گہرا اثر ہوگا۔ کسی کا نام ہوتا کچھ اور

ہے اور اس کی طبیعت کسی اور طرح کی ہی ہوتی ہے مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ میں اپنے نام کی طرح ہی گرم دماغ ہوں اور مجھے اس پر کوئی افسوس بھی نہیں۔ افسوس ہو بھی کیوں؟ سب کچھ تو ہے میرے پاس۔ نام، شہرت، رعب، دبدبہ۔ جب سے میری ذات کو وجود ملا۔ میں نے صرف اپنے بارے میں سوچا ہے۔ اپنی ذات کو ترجیح دی ہے۔ اپنا مقام دوسروں سے اولیٰ سمجھا۔ دوسرے تو میرے پاس بھٹک بھی نہیں سکتے کیونکہ میرے اندر ہے ہی اتنی تپش۔ میری تپش، میری حرارت سب کو مجھ سے جدا رکھتی ہے۔ میری نظر آسمان پر ہوتی ہے۔ میرے شعلے ہوا میں متحرک رہتے ہیں۔ میری ایک چنگاری مجھ تک پہنچنے والی ہر شے کو راکھ بنا دیتی ہے۔ اس لیے کوئی مجھ تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ ہر کوئی مجھ سے اپنا دامن بچاتا ہے۔ جتنا ہو سکے اپنے آپ کو مجھ سے جدا رکھتا ہے۔ یہ میرا امتیاز ہے۔ میری شان ہے اور یہی میری پہچان ہے۔

"میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔ میری عمر صرف انیس سال ہے۔ اور آپ ابھی سے" اس نے انتہائی عاجزی سے درخواست کی۔

"میں نے کہا نا اب بس کوئی اور بات نہیں" اس کی ماں نے اس کو ہمیشہ کی طرح خاموش کروا دیا اور چولہے پر ایک برتن میں پانی ڈالا۔

"مگر۔" اس کا چہرہ مرجھا گیا۔

"اے رانو! کدھر مر گئی جلدی چاول لا کر دے" ماں اس کی بات کو ان سنا کرتے ہوئے زور سے چلائی۔

"آئی ماں" کچن کے باہر سے ایک زوردار آواز آئی۔

اس نے گردن مار کر دوبارہ بڑبڑاتے ہوئے برتنوں کو الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا۔

"امی" اس نے آگے بڑھ کر بات کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"یہ لو چک دیے ہیں" رانو باہر سے پرانت میں چاول لائی اور زوردار آواز کے ساتھ چولہے کے ساتھ پرانت کو پٹخ دیا۔ جس کی وجہ سے کچھ چاول کے دانے اچھل کر باہر گر گئے۔

"ہاں ہاں! حرام کی کمائی ہے۔ ضائع کرو دل کھول کر" اس کی اس حرکت کو دیکھ کر اس کی ماں نے آگ بگولا ہو کر جملہ کسا۔

"میں صاف کر دیتی ہوں" بجھے دل سے اس نے کہا اور پاس بیٹھ کر چاول سمیٹنا شروع کر دیے۔

"تیری کیوں مریل سی آواز نکل رہی ہے۔ کس بات کا ماتم کر رہی ہے؟" اس کے بجھے دل کو ایک بار پھر آگ میں ٹٹولا۔

"امی آپ تو بس ہمیں طعنے ہی دینا اور کچھ نہیں آپی کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ کبھی جاننے کی کوشش بھی کی ہے؟" اس کی حالت زار کو سمجھتے ہوئے رانو نے اپنی ماں کو جواب دیا۔

"ہاں ہاں! میں تو تمہاری دشمن ہوں۔ تمہیں بیچ کر کھا جاؤں گی" اس کے ہاتھوں سے چاولوں کی پرانت کو کھینچتے ہوئے ایک بار پھر جملہ کسا۔

"رانو! خاموش" اس نے ایک بار پھر ماں بیٹی کی بحث کو ختم کرنے کی غرض سے رانو کو خاموش رہنے کو کہا۔

"آپی کس مٹی کی بنی ہو آپ۔ آپ کے اندر سیلف ریسپیکٹ نام کی کوئی چیز ہے یا نہیں؟" رانو نے اس کو غلطی کا احساس دلانے کی ناکام کوشش کی مگر اس نے سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے الماری سے نمک کی ڈبیا نکال کر اپنی ماں کو دی۔

"زیادہ ناٹک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" غصے میں اس سے نمک کی ڈبیا چھینتے ہوئے جملہ کسا۔

"اماں کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم ہماری ماں نہیں ہو بلکہ جلاد ہو۔" غصہ میں رانو نے کہا۔

"رانو! تم یہاں سے جاؤ" اس نے باہر کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بھیج اسے ورنہ میرے ہاتھوں سے ماری جائے گی" اپنے پاس رکھے بیلن کو اٹھا کر رانو کو مارنے کی کوشش کی مگر اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔

"امی چھوڑ دا سے بچی ہے یہ" ایک بار پھر اس کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ کچھ کہہ نہیں پائی۔

......☆☆......

"ارے ارے کہاں چلی آ رہی ہو؟" شاہین بیگم سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ایک عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا جو بغیر اجازت ان کے لاؤنج میں چلی آئی

تھی۔

"جی آپ؟" اس عورت نے اپنا تعارف کروانے کی بجائے ان سے سوال پوچھا۔

"یہی میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ کون ہو تم؟ اور کس کی اجازت سے اندر آئی ہو؟" آخری سیڑھی پر سے اپنا جملہ شروع کیا اور جملے کی تکمیل تک وہ اس عورت کے بالکل سامنے تھیں۔

"میں آتش کے لیے رشتہ لائی ہوں۔" اس نے ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے صوفہ پر بیٹھ کر جواب دیا۔

"مگر ہم نے آپ کو دعوت نہیں دی کہ آپ" وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پاتی۔

"انہیں میں نے دعوت دی ہے" آتش نے باہر سے آ کر گفتگو میں مداخلت کی۔

"مگر کیوں؟" شاہین بیگم کی ساری توجہ اب آتش کی طرف تھی۔

"بھئی رشتے کے لیے" ایک بار پھر اس نے اپنی بے تکلفی کا اظہار کیا جو شاہین بیگم پر ناگوار گزرا۔

"میں نے آپ سے سوال نہیں کیا بہتر یہی ہوگا کہ آپ خاموش رہیں۔" سخت لہجے میں اس کو جواب دیا۔

"مہمانوں سے بات کرنے کا یہ کیا طریقہ ہے؟" آتش نے شاہین بیگم کے اس رویہ کو ناپسند کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

"اپنا لہجہ درست کرو" آتش کے اس رویے پر انہیں ندامت محسوس ہوئی تو انہوں نے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"میرا لہجہ درست ہے۔" ان کی باتوں سے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

"اور آپ آپ خاموش کیوں بیٹھی ہیں۔ جس کام کے لیے آئی ہیں وہ کریں اور چلتی بنیں۔" اس نے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ میں تو بھول ہی گئی" وہ آتش کے اچانک جملے سے بوکھلا گئی۔ اور جلدی جلدی میں اپنے پرس سے چند تصویریں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

"یہ کیا تصویروں کا بازار بنا دیا ہے۔ جو کام کی تصویر ہے، وہ دکھائیں۔" آتش نے کہا۔

"یہ سب تصویریں ہیں ان سب میں سے کوئی بھی پسند کرلیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"امی کرلیں پسند" اپنی ماں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب بات یہاں تک پہنچ ہی گئی ہے تو پسند بھی خود ہی کرلو" انہوں نے یہاں سے جانے کی کوشش کی مگر آتش راہ میں حائل ہوگیا۔

"میں نے کچھ کہا ہے آپ سے سنا نہیں؟" اس نے عقابی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ایک گھڑی گزرنے کے بعد انہوں نے اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے ایک تصویر اٹھا کر اس کو تھما دی۔

"پکڑو" غصے میں بغیر دیکھے اس کے ہاتھوں میں دے کر وہاں سے چلی گئیں۔

"ہنہ" ان کی اس حرکت پر اس نے گردن ماری۔

"تو بیٹا؟" اس نے باریک آواز میں پوچھا

"یہ پکڑیے" تصویر کو تھماتے ہوئے مزید کہا۔ "اور جتنی جلدی ہوسکے اس سے میری شادی کی بات کریں۔"

"مگر تم نے تو ایک بار بھی اس تصویر کو نہیں دیکھا" اس نے دکھاوے کی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

"آپ سے جو کہا ہے وہ کیجیے آئی بات سمجھ میں؟" اس نے عقابی نظروں سے اس عورت کی طرف دیکھ کر اپنا فیصلہ صادر کیا۔

"ہاں۔" اس نے نظروں کو ادھر اُدھر گھماتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

"بہت خوب اب وہ دروازہ ہے چلتی بنیں" باہر کا راستہ دکھاتے ہوئے کٹھور انداز میں کہا۔

☆☆

"پھر کیسا لگا تمہیں لڑکا؟" جہاں آرا کو تصویر دکھاتے ہوئے اس نے کہا۔

"دیکھنے میں تو اچھا ہے مگر؟" کچھ کہتے کہتے ایک دم اس کی زبان رک گئی۔

"یہ دیکھنے میں ہی اچھا نہیں ہے بلکہ سیرت میں بھی بہت اچھا ہے۔ بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ سارے اخلاق اس سے ہی جنم لیتے ہیں۔ کیا بڑا، کیا چھوٹا سب سے بڑے ہی احسن طریقے سے بات کرتا ہے۔" اس لڑکے کی

اچھائیاں بیان کرتے ہوئے مزید کہا۔
"تمہیں پتا ہے جب میں اس کے گھر رشتہ کے لیے گئی تو خالہ جی خالہ جی کہتے کہتے اس کی زبان نہیں رکی اور اس کی گفتگو آفرین اب میں تمہیں کیا بتاؤں" جہاں آرا کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر مزید کہا۔
"اور اس کا گھر۔ تمہیں کیا بتاؤں۔ محل ہے محل اپنی شائستہ راج کرے گی راج"
"کہتی تو تم ٹھیک ہو مگر کچھ گڑبڑ وغیرہ تو نہیں ہے لڑکے میں؟" اس نے دبے لفظوں میں کہا۔
"کیا بات کر رہی ہو جہاں آرا؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔
"نہیں ایسی بات نہیں ہے مگر بیٹی کا معاملہ ہے نا۔ سوچنا تو پڑتا ہے"
"اتنی فکر مت کرو دیکھنا ایک بار بس یہ شادی ہو جائے دعائیں دو گی مجھے۔" اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہوئے کہا۔
ان کی یہ ساری باتیں شائستہ کمرے کی کھڑکی سے سن رہی تھی۔ ان کی باتوں پر ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، ایک بار پھر اس کی امیدوں کا گلہ گھونٹ دیا گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں کے آنسو اس کے دامن پر گرنے لگے۔ ایسا لگا جیسے برسوں سے کسی ندی کا بند ٹوٹا ہوا اور پانی کا ریلہ بہہ رہا ہو۔
جو میں چاہوں، وہ نہ ہو ایسا تو ممکن ہی نہیں۔ ایک بار کسی چیز کو پسند کر لوں اس کو تو میرا ہونا ہی پڑتا ہے اور یہی طور مجھے پسند ہے شادی یہ میری ضد ہے اور مجھے اپنی ضد کو پورا کرنا پسند ہے۔ اور اس میں کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پہلے پہل تو نہ ہی امی میرے رشتے کے لیے رضامند ہوئیں نہ ہی ابو مگر میں نے اپنی ضد نہیں چھوڑی، اپنی ضد پر اٹل رہا تو پھر ہوا وہی جو میں نے چاہا انہیں میری ضد کے آگے جھکنا ہی پڑا۔ انہیں میرا فیصلہ قبول کرنا ہی پڑا۔ اب بس پانچ دن بقایا ہیں میری شادی میں مگر مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک لڑکا جس کی شادی میں صرف پانچ دن بقایا ہوں۔ اس کے تو پاؤں زمین پر ٹکتے ہی نہیں، اس کا مزاج سب سے جدا ہوتا ہے۔ ایک الگ رنگ، ایک نیا جذبہ، ایک نیا جوش اس پر حاوی رہتا ہے۔ صبح سے شام، شام سے صبح، رات دن، ہجر و شجر میں اپنے ہونے والے ہمسفر کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کی تصویر سے باتیں کرتا ہے۔ اس کے پیار میں پاگل ہوا جاتا ہے۔ اس کے وجود کو خود میں سمونے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ پہلی رات، وہ کیسی لگ رہی ہو گی، اس نے کس قسم کا جوڑا پہنا ہو گا، اس کی چمک کیسی ہو گی، اس کا انداز گفتگو کیسا ہو گا، میں کیا بات کروں گا اس سے؟ کیسے اس سے اپنے پیار کا اظہار کروں گا؟ کیسے اس سے اپنے دل کی بات بتاؤں گا؟ اس کا احساس کیسا ہو گا؟ اس کی محبت کیسی ہو گی؟ اور پتا نہیں کیا کیا کچھ؟
ارے ایک لڑکی ہے وہ۔ کوئی نئی مخلوق تو نہیں اتنے سارے نئے جذبات تو بہ ہے۔ میرے نزدیک سب بے کار ہے۔ سب ڈھونگ ہے۔ کوئی کسی سے پیار ویار نہیں کرتا، بس ایک ہوس ہے۔ جس کو پورا کرو اور بس۔ مگر میرا مقصد تو کچھ اور ہے۔ یہ رشتے میرے نزدیک کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ میری دنیا سب سے نرالی ہے، سب سے الگ۔ سب سے جدا۔ میری دنیا میں نہ تو کوئی میری اجازت کے بغیر قدم رکھ سکتا ہے اور نہ ہی باہر جا سکتا ہے۔ اور جو میری دنیا میں قدم رکھ دے تو اس کو میرے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ میرے بنائے گئے اصولوں کی پاسداری کرنا ہوتی ہے ورنہ اس کا خمیازہ اس کو خود بھگتنا پڑتا ہے۔
وہ مایوں کے لباس کو زیب تن کیے آئینہ میں خود کو تک رہی تھی۔
"کیا یہی ہے زندگی؟" اس بار اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔
"اپنی خواہشوں کو قربان کر دینا دوسروں کے فیصلوں کو قبول کرنا ان کی ہاں میں ہاں ملانا۔ کیا ہر بیٹی کا مقدر ایسا ہی ہوتا ہے؟" یہ اور اسی طرح کے عجیب سوال آج پہلی بار اس کے ذہن میں جنم لے رہے تھے۔ اتنے میں باہر سے رانو بھاگتے ہوئے آئی۔
"آپی آپ ابھی تک یہاں ہو؟ باہر سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا مگر جیسے ہی اس کی نظر شائستہ کے چہرے پر گئی۔ اس کا جوش ماند پڑ گیا۔
"یہ گلاب مرجھایا ہوا کیوں ہے؟" اس کا چہرہ اپنی

طرف کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں جو ابھی تک آنسوؤں کے سیلاب کو روکے ہوئے تھی، رانو کے یہ پوچھنے پر امڈ آئیں اور اس کے گلے لگ کر بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔ اس کی آواز نے اس کا درد واضح کر دیا۔

"کیا ہوا؟ آپی" رانو نے اس کی کمر پر تھپکی دیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں" اچانک اس کو یاد آیا کہ اس کا رونا کسی کام کا نہیں۔ مقدر میں جو لکھ دیا گیا ہے، وہ تبدیل نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی اور جلدی سے اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھتے ہوئے صاف کیا۔

"دیکھ لو اسے بھی طرح آج کے بعد تمہارا مقدر یہی ہے۔" رانو نے اس کی بے بسی پر جملہ کسا۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟ اور تم تم تو اسے لینے آئی تھی خود بھی یہاں ڈیرہ لگا لیا" دروازے سے جہاں آرا نے داخل ہوتے ہی جملوں کی برسات کر دی۔

"آپ چلیے ہم آتے ہیں۔" باریک آواز میں کہا۔

"کیا ہوا؟ اب پھر کیا رونا دھونا لگا رکھا ہے؟" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر چلائی۔

"امی آپ تو ہر وقت آپی کے پیچھے ہی پڑے رہنا ہے چاری کچھ بولتی نہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ جو چاہے ظلم کریں۔" شائستہ کی حمایت میں بولتے ہوئے کہا۔

"تمہاری زبان کچھ زیادہ ہی چلنے لگی ہے۔ سسرال میں بھی اسی طرح چلتی رہی تو دو دن میں گھر بیٹھی ہو گی اور میرے پاس اتنی جائیداد نہیں ہے کہ تمہیں ساری عمر برداشت کر سکوں۔"

"آپ سے مجھے امید بھی یہی ہے۔ بڑی بیٹی کو تو نکال دیا اب بس مجھے نکالنے کے بارے میں سوچو مگر اتنا یاد رکھنا میں شائستہ نہیں ہوں جو آپ کا ہر ظلم برداشت کرے۔"

"کون سا ظلم کر لیا میں نے تم پر مجھے بھی بتاؤ ذرا" اس کے قریب آ کر اس کی چٹیا پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

"امی چھوڑو مجھے" اس نے چلا کر کہا یہ دیکھ کر شائستہ نے گھبرا کر اپنی ماں کو روکنے کی کوشش کی مگر اپنے ہاتھ آگے بڑھا نہیں پائی۔

"امی پلیز چھوڑ دیں اسے" درد بھری آواز میں کہا مگر جہاں آرا پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

"آج تو میں اس کو بتا کر رہوں گی کہ یہ میری ماں نہیں بلکہ میں اس کی ماں ہوں" دانت بھینچتے ہوئے اس کی چٹیا کو مزید کھینچا۔ رانو اپنے ہاتھوں سے مسلسل جدوجہد کرتی رہی مگر ناکام

"امی چھوڑو"

"اب بولے گی منحوس ماری؟ بول۔" دانت مزید بھینچتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں بولوں گی ایک بار نہیں ہزار بار بولوں گی تم نے ہماری جانوں پر ظلم کیا ہے" درد سہتے ہوئے بھی اپنی زبان پر قابو نہیں کرتی اور مسلسل اپنی ماں کی ہر بات کا جواب دیتی رہی۔

"خدا کے لئے امی چھوڑ دیں اسے" اس نے اپنی ماں کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے منتیں کیں اور ساتھ ساتھ اشک اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

"تو چپ رہ" جہاں آرا نے اس کو جھڑک دیا۔

اس کی آنکھوں کے آنسوؤں میں اضافہ ہوتا گیا۔ کہاں وہ اپنے نصیب کو رو رہی تھی اور اب اپنی بہن کے لئے۔

"امی جیسا تم کہو گی میں ویسا ہی کروں گی مگر اسے چھوڑ دو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں اس کو چھوڑ دو" وہ روتے ہوئے اپنی بہن کو ماں کے چنگل سے آزاد کروانے میں کامیاب ہو گئی۔

"سمجھا دینا اسے آئندہ اپنی زبان کو لگام دے" جہاں آرا نے اس کو ایک زوردار جھٹکے سے پیچھے پھینک دیا۔ شائستہ نے جلدی سے جا کر اپنی بہن کا ماتھا چوما اور اس کے سر کو بوسہ دیا۔

"جلاد کہیں کی" ایک بار پھر رانو غصہ میں بڑبڑائی۔

"کیا کہا تو نے ایک بار پھر سے کہہ ذرا" اس کی ماں نے الٹا ہاتھ اس کی طرف مارنے کی غرض سے اٹھایا مگر شائستہ راہ میں حائل ہو گئی۔

"امی میں اسے سمجھا دوں گی آپ جائیے پلیز" اپنی باہوں سے اپنی بہن پر سایہ کرتے ہوئے کہا۔

"سمجھا دینا اسے" نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی کہ وہ پیچھے ہٹ گئی اور پھر اچانک پلٹا کھایا۔

"پانچ منٹ کے اندر اندر تیار ہو کر باہر آؤ آئی بات

سمجھ میں" یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

دلہن کے لباس میں شائستہ بیڈ کے درمیان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ہر طرف گلاب کے پھول کی پنکھڑیاں بکھری تھیں۔ بھینی بھینی خوشبو دل کو مچل دینے کے لیے کافی تھی مگر اس ماحول میں بھی اس کا دل افسردہ تھا۔ ایک عجیب سی کشمکش، عجیب سا احساس اس کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ خوف کی وجہ سے اس نے اپنے ہاتھوں کی مٹھی کو بند کیا ہوا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور آتش کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ کافی دیر تک ادھر ادھر چیزوں کا بغور مشاہدہ کرتا رہا اور پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازے کو بند کر دیا۔ اس کی آنکھیں نشے میں چور تھیں۔ کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے دروازے کی چٹکی اوپر کی اور پھر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس کے آنے کے احساس نے شائستہ کو مزید خوف میں ڈال دیا۔ اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ آتش لے بیڈ کے پہلو میں آ کر نئی نویلی دلہن کی طرف سرسری طور پر نظر کی اور پھر تیوری چڑھا کر واش روم کی طرف چل دیا۔ اس کی ایک ایک حرکت شائستہ کی بے چینی میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر گھونگٹ میں سے اسے صاف نظر نہیں آیا۔ دس منٹ میں وہ سیاہ رنگ کے کرتا پہنے واش روم سے باہر نکلا۔ اس کی حالت اب پہلے سے کافی بہتر تھی۔ نشہ کافی حد تک اتر چکا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں اب بھی نشہ میں دہک رہی تھیں۔ وہ بغیر کچھ بولے بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا اور پھر اس کی کمر کے پیچھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس حرکت نے شائستہ کے خوف کو مزید ہوا دی۔ اس کا ہاتھ اس کی کمر کے عین پیچھے تھا تب اچانک جھٹکے سے اس نے وہ تکیہ کھینچ لیا جس کے سہارے وہ اتنی دیر سے بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور زوردار ہوتا ہے کہ شائستہ کو سنبھلنے کا موقع تک نہیں ملا اور وہ اپنا توازن کھو بیٹھی۔ اور اس کا سر بیڈ کی ٹیک سے جا لگا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے تکیے پر بیٹھنے کی؟؟"

ایک زوردار آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس لے اپنے تکیہ کو ہاتھ میں لے کر اس کو جھاڑتے ہوئے کہا

"پاگل لڑکی۔ سارا تکیہ خراب کر کے رکھ دیا" وہ اپنے آپ کو سسکیاں لیتے ہوئے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی سسکیوں نے اس کے نشہ کو مزید بھڑکا دیا۔

"بند کرو یہ سسکیاں بھرنا" ایک زوردار آواز پھر اس کے کانوں میں پڑی۔ اس بار اس آواز کی دہشت سے اس کا ہاتھ بیڈ کے ساتھ میز پر جا لگا اور وہاں سے پرفیوم کی بوتل نیچے گر گئی۔ کانچ کے ٹوٹنے کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ یہ دیکھ کر آتش کا غصہ مزید بھڑک گیا۔ اس نے دہکتی آنکھوں سے اس کی طرف حملہ کیا اور ایک لمبی چھلانگ لگا کر اس کی طرف لپکا اور اس کی گردن کو دبوچنے کی کوشش کی۔ قریب تھا کہ وہ اس کی گردن دبا کر اس کو مار ڈالتا مگر دروازے پر دستک نے اس کے ہاتھوں کو پیچھے کرنے پر مجبور کر دیا۔

"کون ہے؟" اس نے اس کی سسکیوں کی آواز کو دبانے کی غرض سے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"بیٹا! دروازہ کھولو میں ہوں۔" باہر سے اس کی ماں کی آواز آئی۔

وہ ایک ہاتھ سے اس کو کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لے گیا جبکہ اس کا دوسرا ہاتھ ابھی بھی اس کے منہ پر تھا۔

"خبردار! اگر تمہاری آواز آئی۔ ورنہ گلہ دبانے میں مجھے دیر نہیں لگے گی؟" اس نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا۔ جبکہ شائستہ کو پیچھے دروازے کی طرف دھکیل دیا۔

"کیا ہوا؟ یہ آوازیں کیسی؟" شاہین بیگم نے اندر آنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا مگر آتش نے انہیں وہیں روک دیا۔

"آپ کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ بیٹے کے کمرے میں بلا اجازت تانک جھانک نہیں کرتے" اس نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

"مگر میں تو" اس کے رویہ کو دیکھ کر ان کے قدم اسی جگہ پر رک گئے۔

"مگر میں تو کیا؟؟ چلتی بنیں یہاں سے" نظروں سے ان کو جانے کا اشارہ کیا۔

"مگر بہو" اپنا جملہ مکمل نہیں کر پاتیں۔

"سنا نہیں آپ نے کیا کہا میں نے" اس نے ایک بار پھر اونچی آواز میں کہا۔ یہ کہنے کے بعد اس نے فوراً دروازہ بند کر لیا اور شائستہ کی طرف دیکھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے

اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
"اور تم۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری کسی بھی چیز کو توڑنے کی؟" اس نے طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی اس کے منہ پر تھا۔ شائستہ کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے۔
"یہ ٹسوے بہانا بند کرو" اس نے دہکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر اس کی آواز اس کی سسکیوں میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔
"سنا نہیں تم نے بند کرو یہ رونا دھونا" ایک زوردار طمانچے کے ساتھ اس کو بیڈ پر پٹخ دیا۔ وہ اپنے پلو میں مزید الجھ گئی جس کی وجہ سے اس کا سر بیڈ کے کنارے پر جا لگا اور ماتھے سے خون بہنے لگا۔ سسکیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس بار اس کے دیکھنے نے آتش کے خمار کو کم کر دیا۔ اس کی دہکتی آنکھیں ایک دم بجھنے لگیں۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال کر اس کے پاس آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگا مگر اس کے چھونے سے راحت کی بجائے اس کے جسم میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا ہوا جس کی وجہ سے وہ ایک دم جھنجلا گئی۔
"دیکھو مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس کی آواز میں ایک دم خاصی نرمی آ گئی۔ مگر اس کی سسکیاں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر الماری سے فرسٹ ایڈ باکس نکال کر لایا اور اس میں سے تھوڑی سی کاٹن نکال کر اس کا خون صاف کرنے لگا۔
"اب کیسا لگ رہا ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا مگر اس کی سسکیوں نے اس کو خاموش کروا دیا۔
"میں نے پوچھا کیسا لگ رہا ہے تمہیں؟" اس کی آواز میں تھوڑی سختی آ گئی۔ جب اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ برہم ہو گیا۔
"بہری ہو گیا؟ سنتا نہیں ہے یا گونگی ہو؟ بول نہیں سکتی؟" کھڑے ہوتے ہوئے اونچی آواز میں پوچھا۔
"جی جی" وہ سسکیاں لیتے ہوئے ہکلائی۔
"آگے بھی بکو کیا جی جی لگا رکھی ہے" وہ دوبارہ برہم ہو گیا۔

اس کے غصہ کو دیکھ کر اس کی آواز ایک بار پھر دب گئی اور آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔
"کھڑی ہو جاؤ۔ میں نے کہا کھڑی ہو جاؤ؟" اس نے اس کو حکم دیا جس کی تعمیل وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کر رہی تھی مگر اس کا وجود اس کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت کی طرح تھا۔ آتش اس کے اردگرد چکر لگا رہا تھا اور سرتاپا اس کا بغور مشاہدہ کرتا جا رہا تھا۔ اس کی نظریں اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دینے والی تھیں۔
"دیکھنے میں تو کافی اچھی نظر آتی ہو۔ کافی اسمارٹ ہو۔" اس کے چہرے کو پکڑ کر "دیکھنے میں بھی خوبصورت ہو" طنز کرتے ہوئے کہا۔
"مگر یہ مت سمجھ لینا کہ اپنی خوبصورتی کو مجھ پر آزمانے میں کامیاب ہو جاؤ گی تم جیسی ہزاروں میری زندگی میں آئی جاتی ہیں" وہ اس پر اپنی بڑائی ظاہر کرنے کی ہرسو کوشش کر رہا تھا۔
"پھر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟" لرزتی آواز میں اس نے آتش سے پوچھا مگر آنسو اب بھی رواں تھے۔
"اوہ تمہارے منہ میں زبان بھی ہے" تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ کہا۔
"مگر اس زبان کو اپنے منہ کے اندر رکھنا کیونکہ جس دن یہ زبان باہر نکلی واپس اندر جانے کے قابل نہیں رہے گی" اس نے بے دردی سے اس کا منہ نوچتے ہوئے کہا۔
"میں آپ کی بیوی ہوں آتش" اس نے درد کو سہتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔
"شٹ اپ بیوی ہو۔ تو بیوی بن کر رہو میری حاکم بننے کی کوشش مت کرنا۔" جھٹکے کے ساتھ اس کو بیڈ پر دھکیلتے ہوئے۔ "دفع ہو جاؤ اب یہاں سے۔"
شائستہ کا ہاتھ بیڈ کی بائی کے ساتھ جا کر لگا اور اس کے ہاتھوں کی رنگ برنگی چوڑیاں جو اس کی بہن نے بڑے چاہ سے پہنائی تھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ کانچ کا ایک ٹکڑا اس کی کلائی میں جا لگا۔ اب ماتھے کے ساتھ ساتھ اس کی کلائی بھی خون میں سرخ ہو چکی تھی۔ لال رنگ جو سہاگ کی نشانی ہوتا ہے۔ اس کے وجود پر اس قدر حاوی ہو گیا کہ پہلی ہی رات اس کو اس رنگ سے نفرت ہو گئی۔ ایک لڑکی اپنا گھربار چھوڑ کر اس لیے اپنے ساجن کے گھر آتی ہے کہ نیا

آشیانہ بسا سکے۔ اپنے ٹوٹے خوابوں کو ایک نیا موڑ دے سکے اگر وہی ساجن ایک رات کی دلہن کے خوابوں کو مٹی کر دے تو اس کے دل پر کیا بیتے گی؟ اس کا حال وہ سمجھ چکی تھی۔ وہ سسکیاں لیتے دہکتے کے دامن کو اپنے زخمی ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے، کمرے کے ایک کونے میں چلی گئی۔ آتش اس کی حالت سے اس قدر بے رخی اختیار کیے ہوئے تھا کہ اس کے بیٹھنے یا لیٹنے سے پہلے ہی کمرے کی لائٹس کو بند کر کے بیڈ پر جا لیٹا۔ کمرے میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ تاریکی نے اس کو چاروں طرف سے آ گھیرا تھا اور اس کا وجود اس تاریکی میں کہیں کھو کر رہ گیا۔

☆☆

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی قسمت میں صرف اور صرف دکھ لکھے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے خوشیاں ایسے دور بھاگتی ہیں جیسے اندھیرے سے اجالا۔ وہ چاہے جتنی بھی کوشش کر لیں۔ جتنی بھی منت سماجت کر لیں دکھ ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میں بھی شاید انہی لوگوں میں سے ایک ہوں۔ بچپن سے آج تک صرف دکھ کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ کبھی ارمانوں کا گلہ گھونٹ کر زہر کا پیالہ پیا۔ کبھی تعلیم چھوڑ کر خود سوزی کی کوشش کی۔ کبھی دوسروں کے طعنے میرا مقدر بنے تو کبھی غریبی لے ڈوبی۔ اگر ان سب سے بھی بات نہ بنتی تو میری ذات خود میرے خلاف ہو جاتی۔ میرا وجود مجھ پر حاوی ہو جاتا۔ صرف اس لیے کہ میں ایک لڑکی ہوں کیا لڑکیوں کے کوئی ارمان نہیں ہوتے؟ کیا ان کی اپنی کوئی پسند نہیں ہوتی؟ کیا ہمارا معاشرہ لڑکیوں کو اپنی زندگی جینے کا کوئی حق نہیں دیتا۔ کیا سارے فیصلے صرف ماں باپ نے ہی کرنے ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کیوں؟؟ آخر کیا جرم ہے ہم لڑکیوں کا؟ یہی کہ ہم لڑکیاں ہیں۔

جہاں تک تعلیم چھوڑ کر گھر بیٹھنے کی بات تھی تو میں نے کچھ نہیں کہا۔ امی کی دلیل بھی کسی حد تک ٹھیک تھی

"آج کل کا معاشرہ بہت خراب ہے۔ لڑکیوں کا یوں اکیلے گھر سے باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تھوڑی سی بھی اونچ نیچ ہو گئی تو دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں کہ ہر ایک کے سوال کا جواب دے سکوں۔ ہر ایک کو قائل کر سکوں۔ میری بات مانو اپنی ضد چھوڑ دو"

انہوں نے باتوں کے جال میں اس قدر پھانس لیا کہ میرا نکلنا محال ہو گیا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی بات پر راضی ہو گئی۔ مگر ان سب کے پیچھے اس کا کیا مقصد تھا میں وقتی طور پر سمجھ نہیں پائی۔ کچھ دنوں کے بعد ہی وہ میرے رشتے کی ضد پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

"کل تمہاری خالہ تمہارے لیے رشتہ لے کر آ رہی ہیں" رانو کی چٹیا کرتے ہوئے ایک دم مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

"امی ہوش کے ناخن لو" ان کی بات سن کر میں ہکا بکا رہ گئی اور میرے ہاتھ سے چائے کا کپ نیچے گر گیا تو رانو نے بڑی تیزی کے ساتھ ان کی بات کا جواب دیا۔

"تو چپ رہ" انہوں نے اس کے سر پر تھپڑ مارتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مزید کہا۔

"اور تو نے یہ کیا کیا؟؟ ایک کپ کا نقصان کر دیا پتا بھی ہے کہ ایک کپ کتنے کا آتا ہے؟" انہوں نے میری حالت کو نظر انداز کر دیا تھا۔

"امی تم کو کپ کی پڑی ہے" وہ ابھی بات کر ہی رہی تھی کہ پیچھے کمر پر ماں کے ایک زوردار گھونسے نے اس کو خاموش کروا دیا۔

"منحوس ماری کبھی اپنی زبان بھی بند کر لیا کر۔ جب دیکھو قینچی کی طرح چلتی رہے گی"

"امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں میں اور شادی؟؟" ان کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے نہایت عاجزی سے کہا۔

"ہاں تو اور شادی تجھے ساری عمر گھر بٹھا کر رکھنے کا ارادہ نہیں ہے میرا"

"مگر" میرے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

"مگر وگر کچھ نہیں میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا" یہ کہہ کر وہ رانو کو دھکا دے کر اٹھیں اور کمرے میں چلی گئیں اور میں وہیں پر اپنی قسمت کا روگ لے کر بیٹھ گئی۔

"آپی یہ ہماری اماں جو ہے نا جلاد ہیں جلاد جب دیکھو صرف اپنے بارے میں سوچتی رہے گی۔ کبھی انہوں نے ہمارے بارے میں سوچا ہے؟ تمہیں بارہ جماعتیں پڑھا کر گھر بٹھا دیا اور مجھے تو پانچ سے آگے پڑھنے ہی نہیں دیا۔ کاش ابا کے بدلے ہماری اماں مر جاتی کم سے کم ابا ہم

پر اتنی پابندیاں تو نہ لگاتے'' رانو نے غصہ میں ان کے خلاف بولنا شروع کردیا۔

''رانو ایسے نہیں بولتے'' افسردگی کی حالت میں بھی میں نے اس کو خاموش کروادیا

''آپی تم کبھی اپنے حق میں آواز بلند نہ کرنا'' وہ بھی گردن مار کر چلی گئی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ میری شادی کے دن قریب سے قریب تر آتے جارہے تھے۔ میری کیفیت اس وقت کیا تھی صرف میں جانتی ہوں یا میرا خدا دنیا کو اس سے کیا خبر؟ ہر کوئی اپنی اپنی دھن میں مگن تھا جہاں تک رانو کی بات ہے وہ بھی کیا کرسکتی تھی؟ بچی تھی بچی سمجھ کر دبادی جاتی اور میں؟؟ منہ میں زبان ہوتے ہوئے بھی کچھ بول نہیں پائی اور قسمت کا لکھا سمجھ کر سمجھوتہ کرنے کی کوشش میں لگ گئی۔

سوچا تھا کہ جو خوشیاں مجھے میکے میں نہیں ملیں شاید سسرال میں مل جائیں جو سپنے ادھورے رہ گئے تھے شاید پیا سچ کر دکھائے۔ میرے خوابوں کو تعبیر بخش دے۔ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر ایک نئی دنیا میں لے جائے۔ ایک ایسی دنیا، جہاں محبت ہو، امن ہو، پیار ہو اور ساجن کا ساتھ ہو۔ کیونکہ ایک لڑکی کی اصل دنیا وہی ہوتی ہے جو اس کا ساجن اس کے لیے منتخب کرتا ہے۔ ایک ایسی دنیا، جہاں یہ لڑکی اپنے پیا کو اپنا سمجھتی ہے۔ ایک ایسی دنیا، جہاں یہ لڑکی اپنے ساجن کا لباس بنتی ہے۔ ایک ایسی دنیا، جہاں دونوں کا دکھ سکھ سانجھا ہوتا ہے۔ دونوں کا وجود ایک ہوتا ہے۔ تن اگرچہ دو ہوں مگر روح ایک ہوتی ہے۔ میں بھی اسی دنیا کی تلاش میں اپنے گھر سے اپنے پیا کے سنگ چل پڑی۔ راستا بہت کٹھن تھا۔ خود کو راضی کرنا ایک سمجھوتہ تھا مگر یہی سچ تھا۔ آج سے میرا وجود میرا نہیں رہے گا۔ میں میں نہیں رہوں گی۔ میرا نام کسی اور کے نام سے منسوب ہوجائے گا۔ ہاتھوں کی کپکپی، دل کا اضطراب اس سچائی کو کم نہیں کرسکتا تھا۔ آج نہیں تو کل مجھے یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ میرا وجود اب میرا نہیں رہا۔ مجھ پر میری ذات کے علاوہ بھی کسی اور کا حق ہے۔ تو پھر دیر کرکے وقت ضائع کیوں کروں؟ سچ کو جتنی جلدی تسلیم کرلیا جائے، یہ اتنا ہی راحت کا سامان پیدا کرتا ہے۔ بس یہی سوچتے ہوئے اپنے ساجن کا انتظار کررہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ جس نے میرے اضطراب کو بڑھادیا۔ گھونگٹ کی وجہ سے ان کا چہرہ دیکھ نہیں پائی۔ مگر ان کے قدموں کی آواز میرے کانوں میں عجیب سی کیفیت پیدا کررہی تھی۔ میری بے چینی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ عروج پر پہنچ رہی تھی۔ میں اس اضطراب کی حالت میں اپنی انگلیوں کو مسلسل دباتی جارہی تھی۔ مگر کافی دیر گزرنے کے باوجود وہ میرے پاس نہیں آئے تو اس وقت میں پل بھر کے لیے یہ سمجھی کہ شاید وہ میری حالت کو سمجھ چکے ہیں۔ میری بے چینی ان پر واضح ہوگئی ہے۔ اس لیے وہ میرے پاس نہیں آئے۔ میری آنکھوں میں ایک کشش نے جنم لیا اور دل میں یہ حسرت ابھری کہ اپنے ساجن کے چہرے کا ایک بار دیدار کرلوں۔ کن انکھیوں سے دیکھنے کی ایک ناکام کوشش بھی کی۔ مگر دل کو سرور نہیں ملا۔ پھر اچانک بستر پر کسی کے بیٹھنے کا احساس ہوا جس نے میری بے چینی کو یک دم ہوا دے دی۔ دھیرے سے ایک ہاتھ میری کمر پر رینگتا محسوس ہوا اور مجھے پلنگ کی ٹیک پر پٹخ دیا۔ میرے وجود پر ایک کپکپی طاری ہوگئی۔ یکے بعد دیگرے میری ذات پر وہ شخص جو دنیا کے سامنے میرا شوہر کہلانے کا حق رکھتا تھا ظلم کا پہاڑ توڑ رہا تھا۔ میرے وجود کو مسمار کرکے رکھ دیا۔ جو چہرہ میں دیکھنے کی تاک میں تھی۔ دیکھنے میں تو اتنا خوبصورت ہوگا، یہ تو میرے گمان میں تھا مگر سیرت میں ایسی خو کا مالک ہوگا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک ساجن اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ ایسا برتاؤ کرسکتا ہے۔ شادی کی پہلی ہی رات اس کے نرم و نازک جسم کو زخموں سے چھلنی کرسکتا ہے۔ اس کو کیا حق پہنچتا ہے ایسا کرنے کا؟؟ میں نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد میرے دکھوں کا مداوا ہوجائے گا۔ مگر یہ سوچ بھی پہلے کی طرح حالات کی بھینٹ چڑھ گئی۔ پہلی ہی رات میرے سرتاج نے میرے سر کے تاج کو مسمار کرکے رکھ دیا۔ میری نازک ہتھیلیاں مہندی کے رنگ میں اتنی نہیں رچی تھیں جتنی کہ خون کے رنگ میں رچ گئیں۔ میری آنکھیں، میرے لب، میرا تن، میرا من سب اس کی طرف حسرت سے متوجہ تھے اور میرے جسم کا ایک ایک پور ہلک ہلک کر یہ پوچھ رہا تھا کہ آخر میرا قصور کیا ہے؟ کس جرم کی پاداش میں سزا میری مقدر بن رہی ہے؟ آخر کون سا گناہ

ہے۔ جس کی نحوست میرے وجود کو اتنا پامال کر رہی ہے؟ اگر تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی تو تم نے مجھ سے نکاح ہی کیوں کیا؟ میرے وجود کو اگر اتنا ہی ذلیل کرنا تھا تو مجھے اپنا شریک حیات کیوں بنایا؟ مگر ہر بار کی طرح میرے خاموش لبوں کی پکار کوئی نہیں سن پایا۔ دل کی آواز دل میں ہی دم توڑ کر رہ گئی۔ جابر وجود عقابی نظریں میرے ہر سوال کا جواب تھا۔ اگر شادی کے بعد بھی یہی ذلالت نصیب میں تھی تو قسمت میں شادی ہی کیوں لکھی تھی؟ ایسی کم نصیبی کی مالک تو میں پہلے بھی تھی۔ پل پل مرنا تو پہلے بھی ہوتا تھا۔ بس فرق صرف جگہ اور نام کا ہے۔ پہلے میکے اور اب سسرال۔ پہلے شائستہ روتی تھی اور اب شائستہ آتش۔

شائستہ کمرے کے ایک کونے میں گم صم بیٹھی دیوار کو تک رہی تھی۔ ایسے وہ کتنے وقت سے بیٹھی تھی اسے کچھ معلوم نہیں۔ شادی کو ہوئے ابھی دو دن ہی گزرے تھے مگر اس کی حالت کو دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دو دن کی دلہن ہے بکھرے بال، ہاتھ، پاؤں اور ماتھے پر زخموں کے نشانات، چہرے پر اشکوں کا خشک رستہ، لباس ایسا جیسے خاصا پرانا ہو۔ طبیعت میں ایسی سنجیدگی جیسے کسی گلشن میں سال ہا سال سے خزاں چھائی ہو۔ نہ کوئی پوچھنے والا۔ نہ کوئی بتانے والا۔ نہ رحم کھانے والا۔ نہ رحم کرنے والا۔ ایک زندگی جو مجبوریوں کے چکر میں پس کر رہ گئی۔

آتش کمرے میں سیٹی بجاتے ہوئے داخل ہوا۔ اس کا چہرہ خوشی سے مسرور تھا۔ ہاتھ میں کی چین کو مسلسل گھمائے جا رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا مگر یہ آواز شائستہ کے وجود کو جھنجوڑنے میں ناکام رہی۔ اس کی نظریں اب بھی دیوار پر مرکوز تھیں۔ وہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد سیدھا سیف الماری کی طرف بڑھا۔ اور سیٹی بجاتے ہوئے دروازہ کھولا۔ الماری سے ایک پرفیوم نکال کر پلٹا تو اس کا پاؤں شائستہ کے پاؤں کے ساتھ الجھ گیا اور اس کے ہاتھ سے پرفیوم نیچے گر گیا جس نے شائستہ کے پاؤں کے انگوٹھے کو زخمی کر دیا۔

''بے وقوف لڑکی کیا کیا تم نے؟'' زوردار آواز اس کو خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی اور وہ آتش کو وہاں دیکھ کر گھبرا گئی اور اس کی ہیبت اس پر اتنی طاری ہو گئی کہ وہ اپنے زخموں کو بھول گئی اور اپنے آپ کو سمیٹ لیا۔

''یہ جگہ ہے پسرنے کی؟'' عقابی نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے مسلسل جملے کستا رہا۔

''جب سے آئی ہو ناک میں دم کر رکھا ہے ہر جگہ نحوست پھیلا رکھی ہے'' اس کے بالوں سے پکڑتے ہوئے۔ ''اٹھو یہاں سے'' اس نے درد سے آہ بھری

''تمہیں بیسیوں بار کہہ چکا ہوں ایک کونے میں پڑی رہا کرو مگر تمہارے سر پر تو جوں تک نہیں رینگتی آج تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا'' وہ اس کو گھسیٹتے ہوئے آئرن سٹینڈ کی طرف لے گیا۔ کرب کی وجہ سے اس کے آنسو ایک بار پھر رواں ہو گئے۔

''آتش چھوڑیے مجھے پلیز۔'' درد بھری آواز اس کے لبوں سے نکلی مگر ہوا میں کہیں کھو کر رہ گئی۔

''خاموش ایک لفظ بھی آگے بولنے کی ہمت کی نا تو مجھ سے برا کوئی اور نہیں ہوگا'' وہ کاغذ کی طرح اس کے نازک چہرے کو نوچتے ہوئے چلاتا جا رہا تھا۔

''آتش'' اس کے لبوں سے ایک بار پھر اپنے ساجن کا ہی نام نکلا۔ ایسے ساجن کا نام جو اس پر اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ اس کے نزدیک اس کی ذات ایک ذرہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی تھی مگر وہ مسلسل اس امید سے اس کا نام پکار رہی تھی کہ شاید اس کی پکار اس کے دل پر اثر کر جائے۔ مگر سب بے سود اس نے آئرن کا سوئچ سرکٹ کے ساتھ منسلک کیا۔

''آتش یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' وہ اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی اسی لیے روتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی معلوم ہو جائے گا تمہیں'' اس نے بے دردی سے اس کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور استری سٹینڈ پر الٹا کر کے رکھ دیا۔

''آتش چھوڑیے مجھے'' آواز میں درد بڑھتا چلا جا رہا تھا مگر اس بے حس انسان پر کوئی اثر نہیں ہوا

''آتش'' اس نے بچوں کی طرح بلکتے ہوئے کہا مگر اس نے اس پر رحم کرنے کی بجائے گرم گرم استری کو اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''آتش'' جلن کی وجہ سے اس کا پورا جسم کانپ اٹھا۔ وہ مسلسل اس کے سامنے آہ و زاری کرتی جا رہی تھی مگر بے سود تب وہاں پر بھاگتے ہوئے جمال الدین آگئے۔ یہ

دیکھ کر انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر شائستہ کو اس کے چنگل سے آزاد کروایا اور ایک زور کا طمانچہ اس کے رخسار پر رسید کیا۔
"تمہیں شرم نہیں آتی اپنی بیوی کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ کرتا ہے۔" انہوں نے غصہ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ شائستہ کانپتے ہوئے تن اور بلکتے ہونٹوں کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی۔
"آپ کی ہمت کیسے ہوئی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی؟ "اس نے عقابی نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
یہ سن کر جمال الدین نے ایک بار پھر اس پر ہاتھ اٹھایا اور اس کے دوسرے رخسار پر اپنی انگلیوں کے نشانات کو پیوست کیا۔
"اس طرح" انہوں نے کہا۔
ایسا کرنا آتش کے غصہ کو مزید ہوا دے چکا تھا۔ اس کی نظریں پہلے سے زیادہ خونخوار ہو چکی تھیں۔ وہ عقابی نظروں سے ان کا شکار کرنے کی کوشش میں تھا۔
"اپنی نظروں کو لگام دو میں تمہارا باپ ہوں" انہوں نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"باپ ہیں تو باپ بن کر رہیں۔ میرے اور میری بیوی کے معاملے میں آنے کی کوشش مت کریں" ان کے ہاتھ کو نیچے کرتے ہوئے اپنی ہٹ دھری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
"بیوی تم جانتے بھی ہو بیوی کا مطلب؟ لفظ بیوی صرف ایک عورت کی شناخت ہی نہیں بلکہ ایک احساس کا نام ہے۔ وہ احساس جو اس کو پل پل اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ کوئی ہے جو اس کا ہمسفر ہے۔ کوئی ہے جو اس کی فکر کرتا ہے۔ کوئی ہے جو اس کا خیال رکھتا ہے۔ کوئی ہے جو اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا ہے۔ کوئی ہے جس کے نزدیک اس کے آنسو موتی سے زیادہ قیمتی ہیں۔ کوئی ہے جس کے نزدیک اس کی خوشیاں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ کوئی ہے جو اس کی ایک مسکراہٹ کی خاطر دنیا سے لڑ سکتا ہے۔ کوئی ساتھ دے یا نہ دے مگر اس کا ساجن ہر پل اس کا ساتھ نبھائے گا۔ ہر موڑ پر اس کا ہاتھ تھامے رکھے گا۔ کبھی کسی غم کو اس تک پہنچنے نہیں دے گا۔ مگر تم؟؟ تم تو خود اس کے لیے غم کا سامان پیدا کر رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں" اتنے میں وہاں پر شاہین بیگم آ گئیں۔
"کیا ہوا؟ اتنا شور کیسا؟" شائستہ کے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے۔
"یہ کیا ہوا؟" اس کے ہاتھوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے پوچھا مگر کرب کی وجہ سے وہ انہیں ہاتھ نہیں لگانے دے رہی تھی۔
"یہ سب کچھ اپنے لاڈلے بیٹے سے پوچھیں۔ جسے اتنی تمیز نہیں کہ بیوی کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے" انہوں نے شاہین بیگم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
"تم ہی کچھ بتاؤ کیا ہوا؟ یہ بہو کا ہاتھ کیوں جلا ہوا ہے؟" انہوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"اپنے شوہر کو سمجھا لیں یہ جو نصیحتوں کے انبار ہیں نا۔ کسی اور پر نچھاور کریں۔ مجھے ان کی یا ان کی نصیحتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔" ان کے سوال کو نظر انداز کر کے اپنا حکم صادر کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھ لیا۔ یہ ہے تمہارا آتش جسے اتنی بھی تمیز نہیں کہ باپ سے کیسے بات کرتے ہیں۔" انہوں نے اب شاہین بیگم پر برسنا شروع کر دیا۔
"جسٹ شٹ اپ میرا نام آتش ہے اور مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ کوئی میرے سامنے اونچی آواز میں بات کرے۔ اس لیے آئندہ میرے سامنے اونچی آواز میں بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔ سن لیا آپ نے مسٹر جمال الدین"
"تم سے امید بھی کیا کی جا سکتی ہے؟ آتش ہو اپنا رنگ تو دکھاؤ گے دیکھ لینا یہ آگ ایک دن تمہیں بھی جلا کر راکھ کر دے گی" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد شاہین بیگم بھی وہاں سے چلی گئیں مگر اس کی آنکھیں اب بھی دہک رہی تھیں۔
"تم کیا کر رہی ہو دفع ہو جاؤ یہاں سے" اس کو جھڑکتے ہوئے کہا تو وہ اپنا سا منہ لے کر ایک کونے میں چلی گئی اور وہ دروازے کو ٹھوکر مار کر باہر کی طرف چل دیا۔
بعض اوقات کئی فیصلے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ میرے

ساتھ بھی یہی ہوا۔ اپنے طیش میں آ کر میں نے شادی تو کر لی مگر یہ شادی تو میرا سر درد بن گئی۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، آتے جاتے، ہر وقت اس کا چہرہ میرے ارد گرد منڈلاتا رہتا۔ کاش میں شادی ہی نہ کرتا نہیں شادی تو مجھے کرنی تھی۔ اپنی ناک کیسے کٹوا سکتا تھا؟ کوئی مجھے چیلنج کرے اور آتش ہار مان لے۔ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک رات ویک اینڈ پارٹی سے گھر لوٹتے ہوئے عیان، زیب اور فہیم میرے ساتھ میری کار میں تھے۔ ویسے تو اکثر فہیم کار ڈرائیو کرتا تھا مگر اس رات اس کا خمار کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ ایسے میں اس سے کار ڈرائیو کروانا آ بیل مجھے مار کے مترادف تھا۔ اسی لیے میں ہی کار ڈرائیو کرنے لگا۔ ڈرنک تو میں نے بھی کافی کی تھی مگر مجھ پر اتنا اثر نہیں ہوا تھا شاید اس لیے کہ یہ میرا روز کا معمول تھا۔ میرے ساتھ فہیم بیٹھ گیا اور پیچھے زیب اور عیان بیٹھ گئے۔ راستے میں مسلسل گانا بجانا اور شور و غل ہوتا رہا۔ راستے میں ہمارا گزر ایک سنسان سڑک سے ہوا۔ وہاں ایک جوڑا تھا۔ جن کی کار کا ایکسیڈینٹ ہوا تھا۔ شوہر کو تو زیادہ چوٹیں نہیں آئیں مگر بیوی شاید صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ ان کو دیکھ کر میں نے کار کی بریک لگا دی اور ہم سب کار سے باہر آ گئے۔

"کیا ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں؟" زیب نے لڑکھڑاتے قدموں سے ان کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا

"جی نہیں" اس نے ہماری حالت دیکھ کر فوراً منع کر دیا۔

"ارے! آپ کی بیوی وہ تو بے ہوش ہے دکھائیں میں ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں" فہیم نے مدہوش آنکھوں سے اس کی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی بیوی دیکھنے میں کافی خوبصورت تھی۔ ایک پل کے لئے تو میرا دل بھی مچل گیا۔ مگر میں ہوش میں تھا اس لئے کچھ نہ بولا۔

"پیچھے میں نے کہا نا مجھے تم میں سے کسی کی کوئی مدد نہیں چاہیے" وہ فہیم کو پیچھے کرتے ہوئے بولا۔

"ارے! اس میں اتنا برہم ہونے کی کیا بات ہے؟ صرف آنکھوں سے ہی تو مزہ لے رہے ہیں۔ کوئی ہاتھ تھوڑی لگا لیا" مدہوشی میں عیان نے کہا، یہ سن کر اس کا پارہ چڑھ گیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی اتنی بے ہودہ بات کرنے کی؟" اس نے عیان کا کالر پکڑ لیا۔

"ارے تم تو برا مان گئے" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جسٹ شٹ اپ تم جیسے اوباش لڑکوں کو کیا معلوم رشتوں کی اہمیت" اس نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

"اے" یہ سن کر فہیم برہم ہو گیا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی ہمیں اوباش کہنے کی" زیب نے اس کی کمر پر ایک گھونسہ مارا۔

"چل یہاں سے ہم ہی پاگل تھے جو اس کی مدد کے لیے رک گئے" فہیم نے دونوں کو واپس کار کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ میں بار بار ان کی طرف دیکھتا رہا مگر کچھ کہے بغیر اپنے دوستوں کے ساتھ چل دیا۔

"پاگل مجھے تو شکل سے ہی پاگل لگتا تھا۔" زیب اب بھی اس کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

"ارے سارے شوہر ہوتے ہی ایسے ہیں۔ شادی سے پہلے دوستوں کے ساتھ مزے اڑاتے ہیں اور شادی کے بعد تو کون اور میں کون" عیان نے بات کو لقمہ دیا۔

"یار اب چھوڑو بھی اس کی بیوی تھی جو دل چاہے وہ کرے اس کے ساتھ" بات کو بہت ہلکا لیتے ہوئے میں نے بے رخی سے کہا۔

"تو بہت اس کی طرف داری کر رہا ہے کہیں تو بھی تو شادی کے بعد بدل نہیں جائے گا" فہیم نے میری بات پر حیران ہو کر پوچھا۔

"یار اس میں اب میری شادی کی بات کہاں سے آ گئی" میں نے فوراً پوچھا۔

"یار یہ بھی بدل جائے گا شرط لگا لے" عیان نے کہا۔

"جی نہیں مجھے کوئی بدل نہیں سکتا" ہنسی کے ساتھ اس کی بات کو ان سنا کر دیا۔

"لگی شرط" فہیم نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لگی" اس کے ہاتھ پر تالی مارتے ہوئے کہا ہماری حرکت دیکھ کر زیب ہنسنے لگ گیا۔

"اب تمہیں ہنسی کیوں آ رہی ہے؟" فہیم نے پوچھا۔

"شرط تو اس طرح لگا رہے ہو جیسے اس نے کل ہی شادی کر لینی ہے" زیب نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"یار تم آتش کو بلا مت لو" فہیم نے دلیل دی۔
"بچنہ" کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
"آتش تیری عزت کا سوال ہے۔ تجھے اب کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا" عیان نے ہنستے ہوئے کہا۔
"میں شادی کروں گا اور دیکھ لینا مجھے کوئی بدل نہیں سکتا، میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔" میں نے سب کی بات کا جواب دیا۔
"کب؟ دس سال بعد تب تک تو بھول جاؤ گے سب کچھ" زیب نے تمسخر کرتے ہوئے کہا۔
"صرف بیس دن، بیس دن میں میں شادی کر کے دکھاؤں گا" سب کو چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ میری بات سن کر سب ہنسنے لگ گئے جیسے میں نے ایک لطیفہ سنا دیا ہو۔
"یار کیوں مذاق کر رہے ہو؟" زیب نے تمسخرانہ کہا۔
"بیس دن میں شادی اٹس اے ڈیل" عیان نے کہا۔
"میں جو کہتا ہوں وہ کرتا ہوں یہ تو تم بھی جانتے ہو" میں کار ڈرائیو کرتے ہوئے مسلسل ان کی باتوں کا جواب دیے جا رہا تھا۔
"لگی ہزار ہزار کی" فہیم بولا۔
"ہاں لگی" عیان نے اس کے ہاتھ پر تالی مارتے ہوئے کہا۔

اس شرط کو پورا کرنے کے لئے مجھے زیادہ تگ و دو تو نہیں کرنی پڑی مگر اس کے بعد اس لڑکی کو بھگتنا میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ میرا کمرہ جس میں کسی کا آنا مجھے پسند نہیں، ہر وقت اس کا موجود رہنا ایک زہر کی مانند تھا۔ میں نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر میرے ساتھ رہنا ہے تو ایک کونے میں پڑی رہے۔ کسی بھی چیز کو چھونے کی کوشش بھی مت کرے اور کمرے سے باہر نکلنے کی تو کوشش بھی مت کرے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میرے نام کا اثر غالب رہا۔ وہ میرے جلال کے آگے کچھ نہ بول سکی۔ خاموشی کے ساتھ الماری کے ساتھ کونے میں پڑی رہتی۔ مگر اس کا وجود اب بھی میرے لئے باعث ندامت تھا۔ جب بھی نظر اس پر جاتی تو دل میں ہلچل مچ جاتی۔ دل چاہتا کہ اس کو جان سے مار دوں۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے میں نے اپنے پاؤں میں بیڑیاں باندھ لی ہوں۔

"دیکھ لیا تم نے" غصہ میں کمرے میں داخل ہوتے ہی جمال الدین نے کہا۔
"اب یہ سب کچھ کرنے کو میں نے اس سے کہا تھا؟" شاہین بیگم بھی پریشانی کے حالات میں تھیں۔
"کہا نہیں مگر اس کے پیچھے تو تمہارا ہی ہاتھ تو ہے نا" وہ غصہ میں پلنگ پر بیٹھ گئے۔
"اب میری غلطی کیا ہے؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ تم بہو کا ہاتھ جلاؤ میں نے کہا تھا کہ بہو سے ایسا سلوک کرے" پلنگ کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔
"تم عورتوں کی تو یہ خو ہے کہ سب کچھ کر کے بھی اپنے اوپر الزام تک آنے نہیں دیتیں۔"
"کیا کیا میں نے ذرا مجھے بھی بتائیں" انہوں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"سننا چاہتی ہو تو سنو" پلنگ سے کھڑے ہو کر ان کی طرف بڑھتے ہوئے۔
"آتش بہت نام پسند تھا نا تمہیں بڑے چاہ سے رکھا تھا نا یہ نام کتنا روکا میں نے تمہیں یہ نام رکھنے کو مگر تم نے میری ایک نہیں سنی تمہیں تو بس یہ لگی تھی کہ نام ایسا ہو جو منفرد ہو خاندان میں کسی کا نہ ہو۔ مگر کیا ملا تم کو یہ رکھنے سے صرف بدتمیزی؟
تم خود سوچو کہ اس نے آج تک تمہاری یا میری دل سے عزت کی ہے؟ عزت تو دور کی بات ادب سے دیکھا بھی ہے جب دیکھو اپنی انا میں رہتا ہے۔ میں میں اور بس میں اس میں سے باہر وہ کچھ نہیں دیکھتا۔" ایک لمحہ توقف کرنے کے بعد ان کے لہجے میں نرمی آ گئی۔
"دیکھو آتش آگ سے نکلا ہے اور آگ اپنے علاوہ کسی اور پر رحم نہیں کھاتی۔ نہ ہی اپنے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچتی ہے۔ اس کے نزدیک صرف میں ہوتی ہے۔ اسی میں میں آ کر شیطان ابلیس بنا۔ اسی آگ پر اس نے مٹی کو حقیر جانا مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا وہ ذلیل و خوار ہوا۔ ندامت اس کا مقدر بنی۔ اور اسی آگ میں قیامت کے دن وہ جلے گا"
"یہ سب مجھے بتانے کا مقصد؟" انہوں نے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔
"ادھر دیکھو میری طرف" کندھوں سے پکڑ کر اس کا

چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے مزید کہا۔
''نام منفرد ہو اس میں کوئی حرج نہیں مگر اس کا مطلب اچھا ہو یہ ضروری ہے۔ انسان پر اس کے نام کا بہت اثر ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ انسان کا نام اس کے کردار کا منہ بولتا ثبوت ہوتا ہے۔ اور آتش صرف آگ ہے، صرف آگ۔ اور اس آگ میں اب شائستہ پل پل جلے گی اور اس کی وجہ صرف اور صرف تم ہو'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے جبکہ شاہین بیگم حیرت سے ان کو تکتی رہی۔
گیٹ پر مسلسل رنگ ہونے کی وجہ سے آتش کی نیند میں خلل ہو رہا تھا۔ اس نے کروٹیں بدلنا شروع کر دیں مگر رنگ تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔
''کیا ہے؟ صبح صبح کون پاگل آ گیا ہے؟ اٹھ کر دیکھو'' اس نے شائستہ کو کہا۔ شائستہ جو پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی مگر اس کی خفگی کی وجہ سے اپنی جگہ پر لیٹی تھی فوراً اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی اور دروازے کی طرف بڑھ کر دروازہ کھولا تو انہیں وہاں پر دیکھ کر حیران ہو گئی۔
''آپ؟؟'' برجستہ کہا۔
''کیوں؟ ہم یہاں نہیں آ سکتے؟'' رانو نے مسکراتے چہرے کے ساتھ جواب دیا اور فوراً اپنی بہن کے گلے لگ گئی۔
''کیسی ہو آپی؟ تمہیں پتا ہے ہم نے تمہیں کتنا یاد کیا؟'' وہ گلے لگے بولتی جا رہی تھی۔
''کون ہے بہو؟'' شاہین بیگم نے لاؤنج سے آواز دے کر پوچھا۔
''امی اور رانو آئی ہیں'' اس نے رانو کو پیچھے کرتے ہوئے انہیں جواب دیا۔
''کیسی ہے میری بیٹی؟'' جہاں آرا نے آگے بڑھ کر اس کے رخسار کو چھوتے ہوئے پوچھا۔
''میں ٹھیک ہوں آپ سنائیں اتنی صبح صبح کیسے آنا ہوا؟'' دکھاوے کی ہنسی کے ساتھ اس نے وہاں آنے کی وجہ پوچھی۔
''ہمیں اندر آنے کا نہیں کہو گی؟'' رانو نے جھٹ سوال کیا۔
''ہاں کیوں نہیں آؤ اندر'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے انہیں اندر لے گئی مگر اس کے چہرے پر ایک پریشانی مسلسل حاوی تھی۔
''واؤ کتنا بڑا گھر ہے بالکل محل کی طرح تم تو بڑی عیش سے رہتی ہو گی؟ میں بھی کہوں اپنے سسرال جا کر آپی اپنا میکہ کیسے بھول گئیں ایسی جنت سے کس کا نکلنے کو دل چاہتا ہے'' گھر کی بناوٹ اور دلکشی میں محو ہو کر رانو نے شائستہ کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے کہا۔
''ارے اسی لئے تو اس کی شادی جلدی کی میں نے، تا کہ عیش کر سکے اور تم تم تو مجھے اپنا دشمن ہی سمجھتی تھی'' یہ باتیں سن کر شائستہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر اس نے یہ آنسو سب سے پوشیدہ رکھے۔
''آپ بیٹھیں میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں'' شائستہ یہ کہہ کر کچن میں چلی گئی۔
''اماں میری شادی بھی ایسے ہی گھر میں کروانا جہاں میں عیش سے رہ سکوں'' رانو نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنے دل کی بات کہی۔
''کتنا ملائم ہے اور نرم بھی اماں تم بھی اس طرح کے صوفے گھر منگواؤ نا'' صوفے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔
''چپ ہو جا کسی نے سن لیا نا؟ کتنا عجیب لگے گا؟'' جہاں آرا نے اس کو جھڑکتے ہوئے کہا۔
''کون سنے گا؟ اتنا بڑا گھر ہے مگر نظر تو کوئی بھی نہیں آ رہا'' رانو نے کہا۔
''یہ لیجیے'' شائستہ نے ان کے سامنے چائے کے کپ رکھ دیے اور ایک طرف کھڑے ہو کر دوبارہ وہی سوال کیا۔
''آپ نے بتایا نہیں صبح صبح کیسے آنا ہوا؟''
''کیوں تمہیں ہمارا آنا اچھا نہیں لگا کیا؟'' جہاں آرا نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔
''بس تمہاری یاد آ رہی تھی ہم نے سوچا تم تو آؤ گی نہیں اب ہم ہی تم سے ملنے آ جائیں'' رانو نے پلٹ کر کہا۔
''مگر آنے سے پہلے بتا تو دیتے'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
''اب بھلا ہمیں بتانے کی کیا ضرورت؟'' باتیں کرتے ہوئے ان کی آواز مسلسل بلند ہوتی جا رہی تھی۔
''مگر پھر بھی'' وہ اپنے ہاتھوں کو مسلتے ہوئے کہہ رہی

تھی۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہارے وہ کہاں ہیں؟'' چائے کا کپ میز پر رکھ کر شائستہ کے پاس جا کر اس نے پوچھا۔

اس کے پوچھنے پر اس کی آنکھیں جھک گئیں اور اس پر مزید وحشت طاری ہو گئی۔

''کیا ہوا اتنی خاموشی کیا بات ہے؟ ان کا نام سن کر شرما گئیں؟'' اس کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں'' اس نے ایک بار پھر دکھاوے کی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

''پھر کیسی بات ہے؟'' اس نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''تم آرام سے بیٹھ کر اپنی چائے پیو چلو'' اس نے رانو کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''کیا صبح صبح ڈرامہ لگا رکھا ہے تمہیں پتا نہیں ہے میں سونے کی کوشش کر رہا ہوں'' آتش نائٹ سوٹ میں لاؤنج میں آیا اور آتے ہی سب پر برہم ہو گیا۔

''میں نے تمہیں رنگ بجانے والوں کو چپ کروانے بھیجا تھا تا کہ ان کے ساتھ مل کر شور وغل کرنے'' وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے مسلسل اونچی آواز میں کہتا جا رہا تھا۔

''جی'' وہ اس کو وہاں دیکھ کر گھبرا گئی اور صرف یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلے۔

''کیا جی جی لگا رکھی ہے'' رانو اور جہاں آرا کی طرف دیکھ کر اس نے مزید کہا۔

''کون ہیں یہ بھکاری؟ اور اندر کیا کر رہے ہیں'' اس نے غصہ میں پوچھا۔ یہ سن کر رانو اور جہاں آرا کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی جبکہ شائستہ اندر ہی اندر شرمندہ ہوتی جا رہی تھی۔

''یہ میرا گھر ہے کوئی بھکاری گاہ نہیں'' اس نے ایک بار پھر ان کے لباس کو نشانہ بنایا۔

''او ہیلو میں آپی کی بہن ہوں یہ بھکاری کس کو بول رہے ہو تم؟'' رانو کا جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو فوراً جواب دیا۔

''اوہ جب ہی تو ایسی حالت ہے'' اس نے طنزیہ کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' رانو نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''رانو خاموش۔ ایسے بات کرتے ہیں اپنے بہنوئی

ہے؟'' وہ آہستہ سے اس کو خاموش کرواتے ہوئے بولی۔

''زیادہ ناٹک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں چل ان کو یہاں سے دفع کر جو مانگنے آئے ہیں دے ان کو اور بھیج'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یہ مجھ سے ملنے آئے ہیں'' اس کے جملے نے اس کو بہت ٹھیس پہنچائی، جس کی وجہ سے اس نے پہلی بار آتش کی بات کا جواب دیا جو اس سے قطعاً برداشت نہیں ہوا اور اس نے ایک طمانچہ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

''بکواس بند کرو اپنے میکے والوں کے سامنے زیادہ زبان چل رہی ہے تمہاری'' اس نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

''آپ کی ہمت کیسے ہوئے میری آپی پر ہاتھ اٹھانے کی؟'' آتش کی اس حرکت نے رانو کو آگ بگولا کر دیا۔ اس نے عقابی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ایسے۔'' اس نے رانو کے چہرے پر بھی ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

''بیٹا! یہ آپ'' جہاں آرا نے کپکپاتے لبوں سے کہا۔

''شٹ اپ'' انگلی کے اشارے سے ان کو خاموش کروا دیا اور شائستہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''جتنا جلدی ہو سکے ان فقیروں کو بھیجو یہاں سے، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد شائستہ رانو کی طرف متوجہ ہوئی۔

''خدا کے لئے چلی جاؤ یہاں سے'' آنکھوں سے اشک بہاتے ہوئے اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔

''آپی اتنا کچھ ہو گیا اور تم اتنا کچھ سہہ رہی ہو؟ کیوں؟'' اپنی بہن کے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا تھا؟'' حیرانی سے جہاں آرا نے شائستہ سے پوچھا۔

''یہ میری قسمت تھی جس کو آپ نے میرا مقدر بنا دیا'' اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

''دیکھ لیا تم نے میں نہ کہتی تھی یہ ماں نہیں جلاد ہے جلاد جس نے تمہیں برزخ میں پھینک دیا'' رانو نے اپنا غصہ

اپنے الفاظ کی شکل میں باہر نکالا۔
"رانو" اونچی آواز میں جہاں آرا نے کہا۔
"بس۔ اب تمہاری آواز مجھے چپ نہیں کرواسکتی تمہاری وجہ سے میری آپی کی زندگی برباد ہوگئی صرف اور صرف تمہاری وجہ سے" اپنی ماں کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔
"بس کرو رانو" اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے۔" اس میں ماں کی کوئی غلطی نہیں جب قسمت میں ہی یہ سب کچھ لکھا تھا تو کسی سے کیا گلہ؟ اگر ماں میری شادی نہ کرواتی تو بھی مجھے کسی نہ کسی صورت میں دکھ مل ہی جاتے"
"مگر" رانو نے کہا۔
"مگر وگر کچھ نہیں۔ اچھا اب اس طرح کرو تم جاؤ میں خود وقت نکال کر تم سے ملنے آؤں گی ٹھیک ہے" اس کے گلے لگ کر کہا۔
"مگر تم یہاں کیسے رہ سکتی ہو؟ تم بھی ہمارے ساتھ چلو تم یہاں اک پل بھی نہیں رکو گی چلو ہمارے ساتھ" رانو نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دروازے کی طرف لے جانے کی کوشش کی۔
"نہیں رانو میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی یہ میرا گھر ہے اور اب یہی میرا مقدر ہے" ایک قدم چلنے کے بعد رک گئی۔
"مگر آپی" شائستہ کے لئے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔
"ضد نہ کرو رانو بات سمجھنے کی کوشش کرو" رانو کے چہرے کو پیار سے چھوتے ہوئے وضاحت کی۔
"ٹھیک کہہ رہی ہے تمہاری آپی چل یہاں سے" جہاں آرا نے رانو کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
رانو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی ماں کے ساتھ چل دی مگر اس کا دل اپنی آپی کو اکیلا چھوڑنے کو ہرگز نہیں چاہ رہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد شائستہ کی آنکھوں سے پھر بھی آنسو رواں ہوگئے۔

......☆☆......

"آج تمہارے بیٹے نے اچھا نہیں کیا" شاہین بیگم جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئیں تو جمال الدین نے طنز کا تیر چلایا۔
"آج کیا کیا میرے بیٹے نے؟" چائے کا کپ جمال الدین کے ساتھ رکھی میز پر رکھ کر کتراتے ہوئے کہا
"یہ بھی تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کیا کیا تمہارے بیٹے نے؟" حیرت سے پوچھا۔
"یہ کیا آپ نے 'تمہارا بیٹا'، 'تمہارا بیٹا' لگا رکھا ہے۔ یہ مت بھولیے، وہ آپ کا بھی بیٹا ہے۔"
"وہ میرا بیٹا ضرور ہے مگر پرورش تمہاری ہے" چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔
"تو؟ پرورش کرنا صرف ماں کی ذمہ داری نہیں ہے، باپ کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو شر سے بچائے" کمرے میں بکھری چیزوں کو سمیٹتے ہوئے مسلسل ان کی باتوں کا جواب دے رہی تھیں۔
"دیکھو بیس سال پہلے یہ تم نے ہی طے کی تھا کہ تمہاری اولاد کی پرورش کروگی اور میں باہر کا کام سنبھالوں گا۔" چائے کا ایک سپ لیتے ہوئے کہا۔
"میرا کہنا پتھر پر لکیر نہیں تھا جو آپ ہر بار اسی بات کو پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں، یہ بات سچ ہے کہ میں نے کہا تھا کہ میں گرہستی کو ہر ممکن سمیٹنے کی پوری کوشش کروں گی مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں آپ اپنے فرائض سے ہی منہ موڑ لیں۔ ایک ماں اپنے بچوں کو اگر اخلاق سکھاتی ہے تو باپ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ معاشرے میں پھیلی برائیوں سے اپنے بچوں کو آگاہ کرتے ہوئے ان سے بچنے کی ترغیب دے۔" سب کام چھوڑ کر جمال الدین کی طرف بڑھتے ہوئے۔
"مگر آپ نے کیا کیا؟ مجھے بتائیں، کون سی ذمہ داری آپ نے پوری کی؟"
"ٹھیک ہے، ساری غلطی میری ہے۔ میں نے ہی اپنے فرائض میں کوتاہی کی مگر کیا تم اپنے فرائض سے آشنا نہیں؟" چائے کا کپ آدھا پی کر میز پر رکھ دیا اور کھڑے ہو کر سوال کیا۔ ان کی یہ بات سن کر انہوں نے منہ موڑ لیا۔
"میری طرف دیکھو جواب دو۔" ان کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔
"دیکھیے" ہکلاتے ہوئے کہا۔
"تم میری بات سنو کسی پر الزام لگانا بہت آسان ہے مگر اپنی غلطی کو قبول کرنا ہر کسی کی بات نہیں، اپنی غلطی کو

وقت پر قبول کرنے سے نہ صرف انسان کو اس غلطی کو سدھارنے کا موقع ملتا ہے بلکہ وہ آنے والے طوفان سے بھی بچ سکتا ہے۔'' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا۔

''ان باتوں کو چھوڑیں مجھے اپنا کام کرنے دیں، بہت کام باقی ہے'' چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا

''تم سے بات کرنا تو بے کار ہے'' پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''تو مت کریں'' بیزاریت محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

شاہین بیگم نے چائے کا کپ ٹرے میں واپس رکھ دیا اور صوفے پر بکھرے کپڑوں کو اٹھا کر تہہ لگانے لگیں۔ جمال الدین کی آنکھیں ٹکٹکی باندھے شاہین بیگم پر تھیں اور وہ خود بھی اس بات سے شناسا تھیں کہ جمال الدین اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھ رہے ہیں۔ وہ جلد بازی میں تہہ لگے کپڑوں کو اٹھانے لگیں تو ہاتھ سے گر گئے، انہوں گردن مار کر دوبارہ کپڑوں کو اٹھا کر صوفہ پر رکھ دیا۔

''جلد بازی میں کوئی کام ٹھیک نہیں ہوتا'' بن مانگے جمال الدین نے مشورہ دیا مگر شاہین بیگم نے اس کو نظر انداز کر دیا۔

شاہین بیگم دوبارہ کپڑوں کی تہہ لگانے میں مصروف تھیں کہ جمال الدین اس کے پاس آئے اور پیار سے ان کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا کر کہا۔

''میری بات غور سے سنو جو ہوا سو ہوا، اس کو نہ تو تم تبدیل کر سکتی ہو اور نہ ہی میں۔ جو وقت بیت گیا وہ آسمان سے گرے اس بارش کے قطرے کی طرح ہے جو واپس نہیں لوٹ سکتا مگر جو وقت ہمارے سامنے ہے، اس کو بہتر تو بنایا جا سکتا ہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' جمال الدین کی باتوں نے ان کے لہجے میں کافی نرمی شامل کر دی تھی۔

''مطلب یہ ہے ہم ماضی میں لوٹ کر اپنی غلطی کو تو سدھار نہیں سکتے مگر جو ہمارے سامنے ہو رہا ہے اس کو تو روک سکتے ہیں۔'' جمال الدین نے کہا۔

''پہیلیاں بجھانا بند کریں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، صاف صاف کہیے''

''شائستہ میں شائستہ کی بات کر رہا ہوں۔'' اپنے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ شائستہ کا نام سنتے ہی وہ وہاں سے کھڑی ہو گئیں۔

''میں اس لڑکی کا نام سننا نہیں چاہتی۔''

''مگر کیوں؟''

''کیونکہ اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔'' سفاک انداز میں کہا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ وہ ہماری بہو ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''نہ ہی یہ شادی میری مرضی سے ہوئی اور نہ ہی میں اس کو اپنی بہو مانتی ہوں'' واضح الفاظ میں کہا

''تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی''

''اور آپ کے کہنے سے میں اس کو اپنی بہو بھی تسلیم نہیں کر لوں گی'' اس نے کہا۔

''روایتی ساس مت بنو''

''ساس، ساس ہوتی ہے، چاہے کچے مکانوں میں رہنے والی ہو یا پھر ہیرے موتی کے محلات میں۔''

ابھی وہ دونوں بات کر ہی رہے تھے کہ شائستہ وہاں پر چائے کے دو کپ ٹرے میں نہایت نفاست سے رکھے پیش ہو گئی، چونکہ دروازہ پہلے ہی کھلا تھا لہٰذا وہ بغیر دستک دیے اندر آ گئی۔ جو بات شاہین بیگم پر ناگوار گزری۔

''مڈل کلاس لڑکیاں بھی اپنی خو نہیں چھوڑتیں، دوسروں کے کمروں میں تانک جھانک کرنا تو اپنی وضع سمجھتی ہیں'' اس کے سامنے آتے ہیں انہوں نے جملہ کسا، جس کا مطلب شائستہ فوراً سمجھ گئی۔

''جی میں یہ چائے لے کر آئی تھی'' لرزتے لبوں سے جواب دیا۔

''ہاں! ہاں! ہم تو تمہاری آس میں ہی بیٹھے تھے کہ کب شائستہ بیگم آئے گی، کب ہمیں چائے پینے کو ملے گی شکریہ تمہارا کہ تم آ گئیں ورنہ ہمیں تو چائے پینے کو ہی نہ ملتی'' شاہین بیگم ایک کے بعد ایک طنز کے تیر برسا رہی تھیں۔

''اگر آپ کے پینے کا موڈ نہیں ہے تو میں واپس لے جاتی ہوں'' کپکپاتے وجود کے ساتھ وہ واپس مڑ گئی۔

''سنو بہو!'' جمال الدین کے پکارنے پر اس نے مڑ

کران کی طرف دیکھا۔
"اپنی ساس کی باتوں کا برا مت مانا کرو، ان کی طبیعت ہی ایسی ہے" شائستگی کے ساتھ اس کے بوجھل دل کو ہلکا کرنے کی کوشش کی۔
"جی میں جانتی ہوں" نہایت ادب کے ساتھ جواب دیا۔
"ویسے بھی بڑوں کی بات کا برا کیا ماننا" مسکرا کر جواب دیا۔
"بہت خوب" پاس آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مزید کہا۔
"اب یہ چائے لے جاؤ، وہ تمہاری ساس نے پہلے ہی ایک کپ پلا دیا ہے اگر دوبارہ تمہارے ہاتھ سے بنایا ہوا کپ پی لیا تو" کان میں سرگوشی کی جو سن کر وہ وہاں سے مسکراتے ہوئے چلی گئی۔
"یہ کیا کہا بہو کے کان میں؟" اس کے جاتے ہی شاہین بیگم نے سوال کیا۔
"تم ماں بیٹے کو دوسروں کی عزت نفس کی ذرا بھی پرواہ ہے یا نہیں؟" پلٹ کر جواب دیا۔
"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے" گھورتے ہوئے کہا۔
"اور میں جواب دینا تمہیں مناسب نہیں سمجھتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ وہ تمہاری بہو ہے، کم سے کم اس رشتے کا ہی لحاظ کرلو"
"ہنہ" تیوری چڑھا کر وہ باہر چلی گئیں۔
آتش آئینہ کے سامنے گنگناتے ہوئے اپنی شرٹ پہن رہا تھا تب شائستہ باہر سے آ کر اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس کا یوں خاموش کھڑا رہنا اس کے لئے باعث ندامت تو تھا مگر آج اس کا موڈ کافی بہتر تھا جس کی وجہ سے اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔
"سنیئے" جب کافی دیر پاس کھڑے رہنے کے باجود آتش نے اس سے کچھ نہ پوچھا تو اس نے خود ہی کہا۔
"بولو کیا کہنا ہے" شادی کے بعد پہلی بار اس نے اس کے ساتھ نرم لہجے میں بات کی۔
"آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ کیا میں امی کے گھر جا سکتی ہوں؟" اس نے اپنی انگلیوں کو دباتے ہوئے پوچھا۔
"کیوں؟" آئینے سے دو قدم پیچھے ہٹ کر سرسری طور پر نگاہ ڈالی اور پھر الماری کی طرف چل دیا۔
"کل امی آئی تھیں، تو ان سے صحیح طریقے سے بات نہیں ہوئی بس اس لیے" اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔
"بات نہیں ہوئی یا شکایتیں؟" اس نے طنز کا تیر چلایا۔
"نہیں ایسی بات نہیں ہے وہ میں شادی کے بعد ایک بار بھی گھر نہیں گئی تھی تو بس اس لئے" وہ ہر بات کی وضاحت کر رہی تھی۔
"ٹھیک ہے جاؤ" الماری میں ہینگر رکھتے ہوئے اس نے اجازت دے دی۔ یہ سن کر اس کے ویران چہرے پر بہار آ گئی مگر ہر بار کی طرح یہ بہار بھی جلد ہی خزاں کا شکار ہو گئی۔
"مگر ایک بات یاد رکھنا کہ کمرے کی بات کمرے میں ہی رہنی چاہیے" اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"اگر یہ بات اس کمرے کی چار دیوار سے باہر گئی" اس کی عقابی نظروں نے شائستہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔
"تو تم تو جانتی ہو کہ میں کسی چیز کا لحاظ نہیں رکھتا" شائستہ اور اس کے درمیان بمشکل ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ شائستہ کی نظریں جھکتے ہوئے اس حصار سے باہر نکلنے کی ناکام کوشش میں تھیں مگر جادو تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
"تو دھیان رکھنا" دانت بھینچ کر اس نے کہا اور عقابی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چہرے کو تھپتھپایا اور طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ باہر چلا گیا۔
"ٹھیک کب تک پہنچ رہی ہیں آپ؟ او۔کے" شاہین بیگم ٹی وی لاؤنج میں کسی سے فون پر بات کر رہی تھیں۔
"صحیح۔" بات کرتے ہوئے ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں تھے۔
"ٹھیک ہے پھر کل ملتے ہیں۔ اللہ حافظ" یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا اور صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔
"کیا ہوا بیگم صاحبہ سر پکڑ کر کیوں بیٹھیں ہیں؟" جمال الدین نے سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''کیا ہوا۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔؟ دکھایئے میں دبا دیتا ہوں'' ہلکے سے تبسم کے ساتھ صوفے کے پیچھے سے ان کا سر دابنے لگے۔

''ہر وقت مذاق اچھا نہیں ہوتا'' شاہین بیگم نے ناگواری سے کہا۔

''بھئی میں مذاق نہیں کر رہا''

''چھوڑیئے آپ۔ میرے سر میں درد نہیں ہو رہا'' ان کے ہاتھوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ جمال الدین ان کے ساتھ صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔

''پھر کیا ہوا؟ پریشان کیوں ہو؟'' انہوں نے نرمی سے پوچھا۔

''امی کا فون آیا تھا کل یہاں آ رہی ہیں رہنے کے لئے'' افسردہ ہو کر کہا۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے اس میں افسردہ ہونے کی کیا بات ہے؟'' یہ خبر سن کر ان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''یہ خوشی کی بات ہے؟'' انہوں نے سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اور کیا۔'' ہنستے ہوئے کہا۔

''بس کریں آپ یہاں میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی ہوں کہ ان کے آنے سے اس گھر کا کیا حال ہوگا اور آپ خوشیاں منا رہے ہیں''

''ویسے ایک بات عرض کروں وہ میری نہیں تمہاری امی جان ہیں اس لئے حسب روایت مجھے پریشان ہونا چاہئے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے، داماد اپنی ساس کے آنے کی خوشیاں منا رہا ہے اور بیٹی سر پکڑ کر بیٹھی ہے'' ہنستے ہوئے انہوں نے طنز کیا۔

''وہ اس لئے کہ ان کی ذہنی ہم آہنگی آپ سے ملتی ہے مجھ سے نہیں ہر بات میں روک ٹوک'' ہاتھوں کے ذریعے بات کرتے ہوئے۔

''یہ نہ کرو وہ نہ کرو ایسے کھاتے ہیں ایسے پیتے ہیں پانی بیٹھ کر پیو وقت پر اٹھو توبہ پتا نہیں کیا کیا کچھ'' بات کرتے کرتے ان کا دماغ چکرانے لگا۔

''تو اس میں ہرج کیا ہے؟ صحیح تو کہتی ہیں امی جان'' میز سے اخبار اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ سے بات کرنا ہی فضول ہے پتا نہیں آتش کو معلوم ہوگا تو کیا ہوگا وہ تو انہیں ایک پل کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا'' ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوچا۔

''کچھ کہا!'' ہنستے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں'' منہ بنا کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

......☆☆......

''رانو! چل سبزی دھو کر دے۔ جب دیکھو ٹی وی کے آگے بیٹھی رہے گی۔ چل اٹھ'' کمرے میں آتے ہی جہاں آرا نے جملوں کی برسات شروع کر دی۔

''امی بس پانچ منٹ'' ریموٹ کو منہ میں دبائے ہوئے جواب دیا۔

''اٹھتی ہے یا نہیں'' پلنگ پر کپڑے رکھتے ہوئے کہا۔

''امی بس آخری وقفہ ہے اس کے بعد دھوتی ہوں'' اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

''چل اٹھ کر دروازہ کھول دیکھ کون ہے؟'' کپڑوں کی تہہ لگاتے ہوئے حکم دیا۔

''امی تم مجھے بھی چین سے بیٹھنے نہ دینا'' ریموٹ کو غصے میں کرسی کی بائی پر رکھتے ہوئے

''رانو یہ کر رانو وہ کر رانو یہ دیکھ رانو وہ دیکھ رانو یہ لا رانو وہ لا توبہ خود تو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں ہوتے سب کام مجھ سے کرواتی پھرے گی'' کمرے سے دروازے تک جاتے ہوئے مسلسل بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

''کون ہے؟ کیا'' دروازہ کھول کر بنا دیکھے ہی غصہ میں کہا مگر جیسے ہی شائستہ پر نگاہ پڑی تو اس کی زبان وہیں رک گئی۔

''آپی تم۔'' ایک دم اس کے چہرے پر خوشی کی لہر چھا گئی اور اس کے گلے لگ گئی۔

''کیسی ہو آپی؟ تمہیں پتا ہے، میں تمہیں کتنا یاد کر رہی تھی؟'' وہ ایک کے بعد ایک سوال کی برسات کرتی گئی۔

''بس بس اب اندر آنے کا نہیں کہو گی؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں اندر آؤ'' اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔

''السلام علیکم! امی'' اندر آتے ہی جہاں آرا کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام'' سنجیدگی سے جواب دیا۔

"امی ایسے جواب دیتے ہیں آپی پہلی بار گھر آئی اور آپ کا یہ برتاؤ ہے۔" رانو نے فوراً ٹوک دیا۔

"پہلی بار آئی ہے تو کیا؟ پہلے تو یہیں رہتی تھی نا!" جھڑکتے ہوئے کہا۔

"امی، تم کبھی شیریں بھی ہو جایا کرو"

"رانو!" شائستہ نے جھگڑا روکنے کی غرض سے کہا۔

"آپ کیسی ہیں امی؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے کیا ہونا ہے، ٹھیک ہوں تو تمہارے سامنے ہوں ویسے کتنی دیر کے لئے آئی ہو؟"

"امی آپی کو آئے دو منٹ نہیں ہوئے اور تم انہیں جانے کا کہہ رہی ہو" رانو نے کہا۔

"میں نے صرف پوچھا ہے، گھر سے نکال تو نہیں دیا" شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"بے فکر رہیں میں رات تک چلی جاؤں گی" اس نے افسردہ دل سے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" اس کی یہ بات سن کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور اس کے قریب آ کر مزید کہا

"میری بات کا برا نہ ماننا میں نے صرف اس لیے پوچھا تھا کہ بیٹیاں زیادہ دیر تک میکے میں رہیں، یہ اچھی بات نہیں" اس کے چہرے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"جی" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"اب بیٹھ کر رانو سے باتیں کر، میں تیرے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں" یہ کہہ کر وہ کمرے کے دروازے کی طرف چل دی۔

"ایک کپ میرے لئے بھی" دروازے پر پہنچنے سے پہلے ہی رانو کی آواز نے اس کو پیچھے مڑنے پر مجبور کر دیا

"زیادہ ہوا میں اڑنے کی کوشش مت کر دس منٹ باتیں کر اور پھر سبزی دھو کر دے" جملہ کہتے ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔

"دس منٹ باتیں کر اور پھر سبزی دھو کر دے" اپنی ماں کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"رانو۔ امی کی نقل اتار رہی ہو۔" تبسم کے ساتھ کہا۔

"امی کو چھوڑو تم اپنی سناؤ" اپنی بہن کے ساتھ باتیں کرنا شروع کر دیں۔

......☆☆......

چاہت کا پیاسا تھا برسوں سے میرا من
تیرے شرف دیدار سے بھر گیا میرا من

نازو کو دیکھتے ہوئے آتش کے لبوں سے یہ شعر خود بخود جاری ہوا۔

"آج تو جناب کے مزاج شاعروں والے ہیں" آئینہ کے سامنے اپنی زلفوں میں خم دیتے ہوئے نازو نے کہا۔

جب دیدار یار ہو جائے
تو شاعر ہم بھی بن جاتے ہیں

بیڈ کی ٹیک کے سہارے بیٹھے ہوئے نازو کی خوبصورتی کو اشعار میں ڈھالنے کی کوشش کی

"کیا خوب نوازشیں ہو رہی ہیں، آج ہم پر ذرا سنبھل کر، کہیں دل مچل نہ جائے۔" شرابی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے اس نے آتش کے خمار کو مزید بھڑکا دیا۔

"جب تنہائی ہو اور حسین چہرے کا ساتھ ہو تو دل کا مچل جانا تو بنتا ہے۔" آتش نے بیڈ کے سرہانے رکھی بوتل سے وائن گلاس میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب عرض کیا ہے مگر انسان کو اپنے حوش میں رہنا چاہیے بعض اوقات مدہوشی میں کی گئی ایک غلطی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے" ڈارک ریڈ کلر کی لپ سٹک سے اپنے لبوں کی چاشنی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اگر طوفان تم جیسا حسین ہو تو ایک رات کے لئے کیا، عمر بھر کے لئے ہم مدہوش رہنے کے لیے تیار ہیں" ڈرنک کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"اتنا حسن ہے ہم میں؟" مدہوش کر دینے والی چال کے ساتھ وہ آتش کی طرف بڑھنے لگی۔

"ارے حسن تو آپ پر ختم ہوتا ہے" ڈرنک کا گلاس ایک طرف رکھ کر نشیلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

......☆☆......

رات کی تاریکی میں کمرے کی کھڑکی سے آج بھی وہ اسی طرح چاند کو تک رہی تھی جیسے وہ بچپن سے کرتی آئی تھی۔ اپنے دل کے ارمانوں کو وہ انسانوں سے بانٹنے کی بجائے ہزاروں میل دور چاند سے بانٹا کرتی تھی۔ خاموش

لبوں سے اپنے دل کی داستان سناتی اور پھر ٹکٹکی باندھ کر اس آس سے مہتاب کو تکتی کہ شاید وہ اس پر رحم کرتے ہوئے اپنی چاندنی کو اس کی زندگی میں بکھیر دے۔اس کی تقدیر بھی اپنی پیشانی کی طرح روشن کر دے۔مگر افسوس، رات ساری بیت جاتی، چاند اپنے جھنڈ کے ساتھ ڈوب جاتا مگر وہ اکیلی اسی کھڑکی پر اپنے آفتاب کے ابھرنے کا انتظار کرتی رہتی۔

''آج کیا فریاد کر رہی ہو؟'' رانو نے کمرے میں آتے ہی اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کیا فریاد کرنی ہے کچھ بھی تو نہیں'' رانو کے سوال پر اس نے اپنے رخسار سے ان آنسوؤں کے نشانات کو صاف کرتے ہوئے کہا جو جانے انجانے میں بہہ گئے تھے۔

''تو پھر چاند کو کیوں تک رہی تھیں؟'' اس کے پاس جا کر پوچھا۔

''بس ویسے ہی دیکھ رہی تھی کہ چاند کتنا خوش قسمت ہے کہ ساری دنیا اپنے محبوب کو اس سے تشبیہ دیتی ہے۔اپنے محبوب کا چہرہ چاند کی چاندنی میں تراشتی ہے۔مائیں اپنے بچوں کو چاند پکارتی ہیں تو کبھی بچے اپنے والدین کو مہتاب کا درجہ دیتے ہیں۔یہ دیکھ کر چاند کتنا اپنی قسمت پر رشک کرتا ہوگا۔!'' خیالوں کے نہ ٹوٹنے والے تسلسل میں محو ہو کر کہا۔

''رشک تو کرتا ہے مگر اپنی قسمت پر نہیں، ہم انسانوں کی قسمت پر'' یہ سنتے ہی شائستہ نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''آپی اس چاند کو تو حسن اللہ نے بن مانگے دیا ہے اور اپنی پیدائش کے دن سے ہی اسی طرح جگمگا کر پوری کائنات کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے مگر انسان اس کی تو قسمت ایسی ہے جس پر یہ چاند بھی رشک کرتا ہے۔'' کھڑکی سے باہر چاند کی طرف دیکھتے ہوئے مزید کہا۔

''جس چاند کی قسمت پر تم رشک کر رہی ہو، شاید تم یہ بھول رہی ہو کہ وہ چاند چاہ کر بھی اپنا دکھ، اپنا کرب، اپنا اکیلا پن اور اپنی تنہائی کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا۔ہمیشہ اپنے دکھ اپنے سینے میں دفن کیے رہتا ہے اور پھر بھی دیکھو کیسے اپنی چاندنی سے پوری دنیا کو منور کر رہا ہے۔'' شائستہ کے چہرے کو اپنی طرف کرتے ہوئے کہا ''تم چاند نہیں ہو تم ایک انسان ہو، تم چاند کی طرح اپنی چاندنی بکھیر تو نہیں سکتی مگر اس درد کو جو تمہارے دل کے قبرستان میں دفن ہے اس کو تو آزاد کر سکتی ہو۔اپنے من کو جو اس قدر بوجھل ہو چکا ہے کہ مسکرانا ہی بھول گیا، کم سے کم ایک موقع تو دے سکتی ہو۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' نظریں چراتے ہوئے بیڈ کے سرہانے جا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''سمجھ نہیں آرہا یا پھر سمجھنا ہی نہیں چاہتی'' اس کے پہلو میں بیٹھ کر کہا۔

''رانو کیا بے کار باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو یہاں میں یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ وہ مجھے لینے کیوں نہیں آئے اور تم بے کار باتوں کو لے کر بیٹھ گئی ہو'' پیشانی کے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''وہ تمہاری منزل نہیں ہے بلکہ وہ شخص تمہاری منزل ہو ہی نہیں سکتا اور تمہاری کیا کسی بھی ایسی لڑکی کی منزل نہیں ہو سکتا جس کا وجود آب ہو۔وہ آگ ہے اور تم آب اور یاد رکھو آب اور آتش کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ان دونوں کو ایک کرنا، دونوں کی موت کے مترادف ہے ورنہ ایک کی موت تو یقینی ہے اور مجھے تو یوں نظر آرہا ہے کہ وہ آگ تمہارے وجود کو جھلسا کر راکھ کر دے گی۔'' فقرے تراشتے ہوئے رانو نے اس کو آنے والے حالات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

''اور کتنا جھلسائے گی یہ آگ مجھے کتنا میرے وجود کو مسمار کرے گی۔۔'' باریک سی آواز درد سے بھرے دل سے نکلی۔

''جب تک تم اپنے حق کے لیے نہیں لڑو گی!'' رانو نے بے ٹوک کہا۔

''لڑ کر بھی کیا ہوگا؟'' بجھے دل سے پوچھا۔

''اپنے حق کے لیے''

''ہنہ'' طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

''آپی تمہارے اندر بہت بڑی خامی پتا ہے کیا ہے؟ تم کبھی اپنے بارے میں نہیں سوچتی'' جب شائستہ اس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی تو غصہ میں آکر رانو نے کہا۔

''جب دیکھو دوسروں کی آس پر پڑی رہتی ہو کبھی

اپنے بارے میں بھی سوچ لیا کرو یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ جب کوئی آسمان سے اترے گا اور تمہارے لئے کوئی مدد کی سبیل لائے گا، زمانہ بدل گیا ہے۔ تمہیں اپنی مدد آپ کرنا ہوگی۔ تمہیں خود اس جہنم سے نکلنا ہوگا۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے زمانہ کبھی نہیں بدلتا'' سنجیدگی سے کہا۔

''آپی تم کس دھوکے میں ہو؟'' اونچی آواز میں کہا۔

''دھوکا نہیں یقین'' شائستگی سے کہا۔

''کونسا یقین'' بیزار ہو کر پوچھا۔

''کہ کوئی آئے جو مجھے ان مصیبتوں سے دور لے جائے'' نرم لہجے میں شائستہ نے جواب دیا۔

''آپی آپی تم کونسی دنیا میں جی رہی ہو یہ آج کی دنیا ہے یہاں کوئی کسی کے حق کے لئے نہیں لڑتا، کسی پر کیا بیت رہی ہے کوئی نہیں سمجھتا، ہر طرف نفسا نفسی کا بول بالا ہے۔''

''مگر مجھے یقین ہے کہ میں اکیلی نہیں ہوں'' لمحہ بھر خاموشی کے بعد کہا۔

''کبھی تو میرے در پر خوشیوں کی دستک ہوگی۔''

''کون دے گا دستک؟۔ موت؟'' بیزار ہو کر پوچھا۔

''شاید'' اس نے جواب دیا۔

جمال الدین اور شاہین بیگم ٹی وی لاؤنج میں چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ شائستہ ٹرے میں دو کپ رکھے وہاں حاضر ہوئی اور میز پر ٹرے رکھ کر ایک کپ شاہین بیگم کے ہاتھوں میں تھمایا اور دوسرا جمال الدین کے ہاتھوں میں۔ وہ دونوں ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہوئے چائے پینے لگے۔

''باہر کا دروازہ کیوں کھلا ہے؟'' ایک نظر باہر کے دروازہ پر پڑی تو شاہین بیگم نے شائستہ سے پوچھا۔

''صبح آتش باہر گئے تھے، شاید انہوں نے کھلا چھوڑ دیا ہوگا میں ابھی بند کیے آتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے شائستہ نیچی نگاہوں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ ابھی وہ دروازہ بند کرنے والی تھی کہ ایک خوش شکل نوجوان وہاں آموجود ہوا۔ شائستہ کی نگاہیں اوپر اٹھیں۔ وہ ایک بیس سالہ نوجوان تھا۔ سیاہ جینز، سفید شرٹ اور سیاہ کوٹ میں ملبوس تھا۔ بائیں ہاتھ میں ایک امپورٹڈ برانڈ کی واچ پہنی تھی۔ ہوگو باس پرفیوم کی دلفریب خوشبو ماحول کو اپنے سحر میں جکڑ رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا جسے وہ دیوار کے سہارے رکھ چکا تھا۔

''السلام علیکم!'' اس آنے والے نے نہایت ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔ جی آپ کون؟'' سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''جی میں۔'' وہ ابھی اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ ایک بزرگ خاتون بھی آموجود ہوئی۔ ہاتھوں میں ایک تسبیح تھامے مسلسل اپنے لبوں کو حرکت دے رہی تھی۔ ان کو دیکھتے ہی وہ نوجوان خاموش ہو گیا اور ان کو سہارا دے کر ایک سٹیپ چڑھنے میں مدد کی۔

''خیال سے دادی جان'' شفقت سے بازوؤں کا سہارا دیتے ہوئے کہا وہ اب شائستہ کے بالکل سامنے تھیں۔

''کیا ہوا؟ اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے؟'' ٹی وی لاؤنج سے شاہین بیگم کی آواز آئی۔

''بیٹھی بس حکم دینا کبھی خود نہ آنا ماں کے استقبال کے لئے'' اس سے پہلے کہ شائستہ کچھ بول پاتی انہوں نے ان کی بات کا جواب دیا۔

''آپ نانی جان ہیں نا!'' شائستہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہاں میں ہی ہوں اب سارے سوال یہیں دروازے پر ہی کرو گی یا اندر بھی آنے کا کہو گی''

''کیوں نہیں اندر آئیے۔ السلام علیکم!'' پیچھے ہٹ کر ان کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

''السلام علیکم!'' اس نوجوان نے شائستہ کو خوش اسلوبی سے دوبارہ سلام کیا۔

''وعلیکم السلام'' دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے جواب دیا اور پھر ان کے پیچھے ٹی وی لاؤنج میں چلی گئی جب وہ وہاں پہنچی تو نانی جان شاہین بیگم سے گلے مل رہی تھیں۔

''کیسی ہیں آپ؟ سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' جبراً مسکراتے ہوئے شاہین بیگم نے پوچھا۔

''ارے تکلیف کیسی؟ عبدالرحمٰن تھا تو سہی میرے ساتھ اللہ بھلا کرے اس کا بہت خیال رکھا پورے سفر میں ہر منٹ بعد مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت ہے تو

بتائیں۔"
"آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھیں اور بیٹا تم بھی بیٹھو" جمال الدین نے عبدالرحمٰن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"جی" تبسم کے ساتھ اس نے جمال الدین کی طرف دیکھا۔
"بہو ان کے لئے چائے ناشتے کا بندوبست کرو" جمال الدین نے صوفے کے پاس کھڑی شائستہ سے کہا۔
جی میں ابھی انتظام کرتی ہوں۔" کہتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔
"بہو؟" سوالیہ انداز میں نانی جان نے پوچھا۔
"آپ کی دعا سے آپ کے نواسے نے شادی کر لی ہے" جمال الدین نے وضاحت کی۔
"بس جلدی میں ہوئی تھی ورنہ تو پورے خاندان کو اکٹھا کرنے کا پروگرام تھا" شاہین بیگم نے افسردہ لہجے میں کہا۔
"ارے کیوں؟ جو ہوا اچھا ہوا شادی ایسے ہی کرنی چاہیے۔ شادی میں جتنی بھیڑ بھاڑ کم ہو، اتنی ہی برکت ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے، پورے خاندان کو اکٹھا کر لو شادی میں اور پھر ان کی باتیں بھی سنو" نانی جان نے وضاحت کی۔
"جی بالکل ٹھیک کہا جتنا شور شرابا کم ہو شادی میں، اتنی ہی برکت ہوتی ہے" جمال الدین نے کہا۔
"لیکن یہاں تو نہ ہی شور شرابا ہوا اور نہ ہی برکت" شاہین بیگم نے زیرلب کہا۔
"کچھ کہا تم نے؟" ان کے ہلتے لبوں کو دیکھ کر نانی جان نے پوچھا۔
"نہیں کچھ بھی تو نہیں" نانی کے اچانک سوال پر بوکھلا کر کہا۔
"ویسے بھابھی دیکھنے میں تو بہت خوبصورت ہیں۔" عبدالرحمٰن نے بھی گفتگو میں حصہ ڈالا۔
"دیکھنے میں ہی نہیں ہماری بہو تو سیرت میں بھی ہزاروں میں ایک ہے" جمال الدین کے جملہ مکمل کرنے سے پہلے وہاں پر شائستہ ٹرے میں بسکٹ، کیک اور چائے رکھ کر آ موجود ہوئی اور سلیقے سے چائے نانی جان اور عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں تھمائی۔
"اب دیکھنا! کیسے اس کے پر نکل آتے ہیں" ایک بار پھر شاہین بیگم نے زیرلب کہا۔
"یہ کیا تم بڑبڑائے جا رہی ہو؟ جو بھی کہنا ہے اونچا کہو" نانی جان نے انہیں پھر ٹوکا۔
"امی جان! ان کی تو عادت ہے، بس یونہی بڑبڑانے کی ان کی عادت کا برا مت مانیے" جمال الدین نے وضاحت کی۔
"وہ تو مجھے اچھی طرح معلوم ہے" نانی جان نے کہا۔
"ویسے بھابھی جان آپ کرتی کیا ہیں؟" عبدالرحمٰن نے چائے کا سپ لیتے ہوئے پوچھا۔
"جی۔" اس سے پہلے وہ کچھ کہتی شاہین بیگم نے مداخلت کی۔
"بھئی اس نے کیا کرنا۔ گھر کے کام سے فرصت ملے تو کچھ کرے گی بے چاری۔ گھر کے کام ہی پیچھا نہیں چھوڑتے" جبراً ہنستے ہوئے کہا۔
"میری بات سنو۔ بہو!" شائستہ کو اشارہ کیا تو وہ ان کے پاس گئی۔
"یہاں سے چلتی بنو اور زیادہ فری ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے" جبراً مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"مجھے کچن میں کام ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ کچن میں چلی گئی۔ شاہین بیگم کی اس مکاری کو جمال الدین فوراً سمجھ گئے مگر فی الوقت انہوں نے کچھ نہیں کہا۔
"کیوں آئی ہیں نانی جان؟" آتش نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سوال کیا۔
"مجھے کیا معلوم؟" شاہین بیگم نے کرسی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔
"پلیز مجھ سے جھوٹ مت بولیے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ انہوں نے آنے سے پہلے آپ کو خبر تو لازمی دی ہوگی آپ نے انہیں منع کیوں نہیں کیا؟" آتش نے کوٹ اتار کر پلنگ پر پھینک دیا۔
"میں کیسے منع کر سکتی تھی تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ اگر میں منع کر بھی دیتی، پھر بھی وہ آ کر ہی دم بھرتیں" پلنگ کی جانب بڑھ کر کوٹ اٹھایا۔

"تو مجھے ہی بتا دیتیں کم سے کم میں ہی کہیں چلا جاتا ان کا چہرہ تو نہ دیکھنا پڑتا" وہ غرایا۔
"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا لیکن پلیز ایک بات کا خیال رکھنا ان کے سامنے اس لڑکی کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت مت کرنا، ورنہ" کوٹ کی سلوٹیں نکالتے ہوئے آتش کو خبردار کر رہی تھیں۔
"ورنہ کیا؟"
"ورنہ تم جانتے ہو" مدھم آواز میں کہا
"ہوہ" غصے میں دروازے کو ٹھوکر مار کر چلا گیا۔
"السلام علیکم! نانی جان کیسی ہیں آپ؟" ڈائننگ ٹیبل پر آتے ہی آتش نے نانی سے پیار لیا۔ اس کا موڈ آج کافی بدلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر آج عجیب سا احساس تھا، ایک عجیب ہی خوشی۔ جسے ہمیشہ شائستہ دیکھنا چاہتی تھی۔
"وعلیکم السلام! اللہ کا شکر ہے میں تو ٹھیک ہوں تم بتاؤ کل کہاں غائب تھے؟ مجھ سے ملنے ہی نہیں آئے؟ میں ساری رات تمہاری راہ تکتی رہی" انہوں نے شکوہ کیا۔
"بس نانی جان دوستوں کے ساتھ وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور تم سناؤ۔ اے آر کیسے ہو؟" عبدالرحمٰن کو آتش اکثر اے آر کہا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں اس کا نام ضرورت سے زیادہ ہی بڑا ہے۔ اس کی اکثر یہ عادت تھی جس کا نام اس کو بڑا لگتا تھا وہ ان کو ان کے نام کے پہلے حروف سے پکارتا تھا۔ لیکن عبدالرحمٰن کو یہ بالکل پسند نہیں تھا کہ کوئی اس کو اے آر کہے، اسی بنا پر اس نے آتش کے سوال کا جواب نہیں دیا اور بریڈ کھانے میں میں مصروف رہا۔
"او ہیلو اے آر صاحب میں تم سے مخاطب ہوں۔" اس بار بھی اس نے اس کی بات پر کان نہیں دھرے۔
"بیٹا! آتش تم سے کچھ پوچھ رہا ہے، اس کی بات کا جواب تو دو" شاہین بیگم نے عبدالرحمٰن سے کہا۔
"سوری آنٹی مگر اس نے تو مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کی" شاہین بیگم کی طرف دیکھ کر کہا۔
"اتنی دیر سے پھر کیا میں جن بھوت کو بلا رہا ہوں؟" آتش نے سخت لہجے میں کہا۔
"تم اے آر کو بلا رہے ہو، مجھے نہیں اگر تمہیں مجھ سے بات کرنی ہوتی تو میرا نام لیتے۔ انسان کو جس سے بات کرنی ہوتی ہے، اس کو اس کے نام سے پکارتا ہے۔ اے بی سی وغیرہ سے تو کوئی یہی سمجھے گا کہ تم اپنا سبق یاد کر رہے ہو"
عبدالرحمٰن کے اس دانستہ جواب پر نانی جان مسکرا دیں جبکہ آتش کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔
"گوٹو ہیل" ایک زوردار مکا میز پر مارتے ہوئے اٹھا۔
"کسی کو جہنم میں بھیجنے کا اختیار کسی انسان کے پاس نہیں ہے تو تم کس بنیاد پر مجھے کہہ رہے ہو گوٹو ہیل؟" آتش کی دہکتی آنکھوں کا جواب اس نے اپنی عقابی نظروں سے دیا۔
اس سے پہلے کہ آتش اس کو کوئی جواب دیتا شاہین بیگم نے زیر لب اس کو روکا اور بیٹھنے کو کہا تو وہ فوراً بیٹھ گیا مگر اس کی آنکھیں اب بھی دہک رہی تھیں۔ اس کے اندر ٹھاٹھیں مارتا سمندر کسی بھی لمحے سونامی کی شکل اختیار کر سکتا تھا۔
"ویسے آج تو مزہ آ گیا" نانی جان نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا تو شاہین بیگم نے سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔
"ارے ناشتے کا پہلی بار اپنے نواسے کی بہو کے ہاتھ کا کھانا کھا رہی ہوں
ماشاءاللہ سے بہت ذائقہ ہے۔ بہو کے ہاتھ میں اللہ ہر بری نظر سے بچائے، ہر آتش سے بچائے" نانی جان کی اس بات پر جمال الدین کے حلق میں نوالہ پھنس گیا اور انہیں کھانسی شروع ہو گئی۔
"یہ لیجیے آپ پانی پئیں" شاہین بیگم نے ان کو گلاس اٹھا کر تھمایا۔
"بیٹا جی! کیا ہوا؟" نانی جان نے پوچھا۔
"کچھ نہیں امی جان! بس نوالہ پھنس گیا تھا اب ٹھیک ہوں" پانی پی کر جواب دیا۔
یہ سن کر آتش کو اپنے غصے پر قابو کرنا مزید مشکل ہو گیا اس کا دل چاہ رہا تھا یا تو وہ اپنے غصے کی آگ میں سب کو جلا کر راکھ کر دے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آگ ضرور تھا مگر ساتھ ساتھ بے بس بھی یا تو وہ وہاں سے چلا جائے، وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنا اس کے اگلے پلان پر پانی پھیر دیتا اسے وہیں بیٹھے رہنا تھا ان کی جلی بھنی باتیں جو در حقیقت سچ تھیں، ان کو سننا چاہے جو بھی ہو، اسے سب

کچھ برداشت کرنا تھا۔
''نانی جان! آپ مذاق اچھا کر لیتی ہیں؟''جبراً مسکراتے ہوئے آتش نے کہا۔شائستہ جواب تک کچن میں کام کر رہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر آ موجود ہوئی۔
''ادھر بیٹھو شائستہ میرے ساتھ'' شائستہ کو دیکھتے ہی اس نے نرم لہجے میں اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔یہ سن کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش نے جنم لیا۔اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ آتش نے خود اس کو اپنے پاس بیٹھنے کا کہا ہے۔وہ دھیمے قدموں سے اس کی اور بڑھنے لگی اور تصدیق کے لئے ایک بار پھر گویا ہوئی۔
''کیا میں؟''
''ہاں تم۔'' پہلے سے زیادہ نرم لہجے میں کہا۔
اسے اپنے کانوں پر واقعی یقین نہیں آ رہا تھا۔
''کیا وہ واقعی آتش تھا؟ یا کوئی اور؟ نہیں وہ آتش ہی تھا چہرہ تو وہی تھا مگر انداز کچھ اور کیا ایک فرد کے آنے سے وہ اتنا بدل گیا۔اسے اس کی فکر ہونے لگ گئی، یہ حقیقت ہے یا کوئی سپنا'' یہی سوچتے ہوئے وہ وہاں بیٹھ گئی۔
''ماشاءاللہ دیکھ کر تو یہ لگ رہا ہے کہ لہجوں میں نرمی آ گئی ہے شادی کے بعد انسان بدل جاتا ہے، پہلے تو سنا تھا، آج دیکھ بھی لیا'' مسکراتے ہوئے نانی جان نے طنز کیا۔
''نانی جان آپ یہ کیا باتیں کر رہی ہیں؟'' آتش نے کہا۔
شاہین بیگم اور جمال الدین بھی آتش کے اس رویہ کو دیکھ کر حیران تھے۔
''بالکل ٹھیک کہا آپ نے آتش دادی جان! آپ یہ کیا باتیں کر رہی ہیں؟ میں تھوڑی بدلنے والا ہوں!'' عبد الرحمن نے طنز کیا۔
''تم اپنا منہ بند ہی رکھو تو اچھا ہے'' روکھے انداز میں جواب دیا۔
''میں نے تم سے بات نہیں کی مسٹر آتش! میں اپنی دادی جان سے مخاطب ہوں،'' عبدالرحمن نے ایک بار پھر اس کو پچھاڑ دیا۔
اب سب خاموشی سے ناشتے میں مصروف ہو گئے، شائستہ بھی چپکے چپکے آتش کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ساجن کے سنگ بیٹھ کر پہلی بار کھانا کھا رہی ہے۔وہ جانتی تھی یہ دکھاوا ہے مگر یہ دکھاوا اسے پوری زندگی جینے کے لئے کافی تھا۔وہ اس لمحے کو روک دینا چاہتی تھی۔ آتش سب سے بے خبر، پر اطمینان تھا۔اس کو خبر نہ تھی کہ کوئی اس کو دیکھ رہا ہے۔داہنے ہاتھ سے کانٹا کو پکڑ کر وہ بریڈ کے ٹکڑے کر رہا تھا۔اس کے بائیں ہاتھ میں چھری تھی۔ایک پل کے لئے شائستہ کو ایسا لگا جیسے وہ بریڈ کو نہیں اپنے غصے کو کاٹ رہا ہے۔اپنی انا کو ذبح کر رہا تھا۔اس کے چار انچ لمبے بال بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔جسے وہ ہاتھوں کی ہتھیلی سے پیچھے کر رہا تھا۔اس کی سیاہ زلفیں، اس کے سرخ و سفید رنگ پر قیامت ڈھا رہی تھیں۔پہلی بار شائستہ کے دل میں آتش کے لئے ایک عجیب احساس پیدا ہوا۔ایک عجیب سی کشش نے اس کے دل میں جنم لیا۔وہ اب بریڈ کے پیس کر چکا تھا۔بس کھانا باقی تھا۔کانٹے کے ذریعے پہلا پیس اس نے منہ تک بڑھایا۔اس کا یہ انداز اس کے دل کو بھانے لگا۔وہ اس کو یونہی دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔اپنے دل کی پیاس اس کے دیدار سے بجھانا چاہتی تھی۔اپنے ساجن کے دیدار سے، اس ساجن کے دیدار سے جو اس کے وجود سے گھن کھاتا تھا مگر نہ جانے کیوں؟ آج اسے اسی ساجن پر پیار آ رہا تھا۔اسی کی طلب اس کے دل میں بیدار ہو رہی تھی۔
''شائستہ! آج تیار ہو جانا'' اچانک کھانا کھاتے ہوئے رک گیا۔
''کیوں؟'' اس کے سوال پر الٹ سوال کیا۔
''اب تمہیں میرے ساتھ باہر جانے پر بھی اعتراض ہے؟'' نرم لہجے میں کہا۔
اس کی یہ بات سن کر شاہین بیگم کے حلق میں بھی نوالہ پھنس گیا۔جمال الدین حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔شائستہ اس کے لئے تو آج کا دن کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ہر گزرتا لمحہ اس کے لئے ایک نئی خوشی کی نوید لا رہا تھا۔وہ دمکتے چہرے کے ساتھ اس کا دیدار کر رہی تھی۔پیار بھرے الفاظ جو وہ شادی کی رات سے سننا چاہتی تھی، آج اس کا مقدر بن رہے تھے۔ایک خوشی اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

"واہ کیا بات ہے بیوی کو سیر کے لئے لے جایا جا رہا ہے" ناشتہ کرتے ہوئے عبدالرحمٰن نے طنز کیا۔
"وہ میری بیوی ہے۔ میں اسے جہاں بھی لے کر جاؤں تم سے مطلب؟" اس نے جواب دیا۔
"اس کا مطلب یہ تھا کہ تم کو اتنی فکر کب سے ہونے لگ گئی رشتوں کی۔" نانی جان نے عبدالرحمٰن کے حق میں کہا۔
"انسان کو بدلنا پڑتا ہے۔ نانی جان۔" آتش نے کہا۔
اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کونسا سوٹ پہنے؟ الماری سے پلنگ اور پلنگ سے الماری تک، صرف پندرہ منٹ میں وہ سو سے زائد چکر کاٹ چکی تھی۔ اس کی نظریں الماری پر مرتکز تھیں آج پہلی بار وہ آتش کے سنگ باہر جا رہی تھی۔ وہ اس پل کو کسی بھی قیمت پر یادگار بنانا چاہتی تھی۔ مگر سب سے پہلے جس بات نے اس کو پریشان کیا ہوا تھا، وہ سوٹ کا انتخاب تھا۔
"کون سا رنگ آتش کو پسند ہے؟ اسے کس قسم کا لباس پسند ہے؟ میں کیا پہنوں، جو اسے پسند آئے؟ اس کے دل کو بھائے؟" یہ چند سوالات تھے جو اس کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔
"بھابھی! میں اندر آ سکتا ہوں؟" عبدالرحمٰن نے دروازے کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
"جی آپ! کیوں نہیں آیئے" اسے وہاں دیکھ کر چونک گئی۔
"ویسے، آپ آج بہت خوش دکھائی دے رہی ہیں؟ ایسا لگتا ہے پہلی بار آتش کے ساتھ باہر جا رہی ہیں" کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے الماری سے ٹیک لگائی۔
"جی" تبسم کے ساتھ کہا۔
"بہت خوب ویسے ایک بات پوچھوں، اگر برا نہ لگے تو "
"جی پوچھیے" شائستہ نے پلنگ پر رکھے سوٹ ہینگر کرنا شروع کر دیے۔
"کیا آتش آپ سے پیار کرتا ہے؟" سنجیدگی سے پوچھا۔
یہ سن کر اس کے ہاتھوں نے ایک پل کے لئے حرکت کرنا بند کر دیے۔ وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گئی مگر اپنے آپ کو سنبھالا دیتے ہوئے کہا۔
"یہ کیسا سوال ہے؟" الماری کی طرف بڑھی۔
"کیونکہ جو آتش کا رویہ تھا، وہ بہت عجیب سا تھا" الماری سے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا
"کیا مطلب ہے آپ کا؟" الماری میں سوٹ رکھتے ہوئے کہا۔
"کھانے کی میز پر جس طرح آتش آپ سے بات کر رہا تھا کافی حیرت ہوئی مجھے اور مجھے ہی نہیں دادی جان بھی خاصی حیران تھیں۔ وہ آدمی جو کسی سے نرم لہجے میں بات کرنا گوارا نہیں کرتا، آج کیسے نرم طبیعت کا مالک بن گیا؟ اس کے پیچھے لازمی اس کا کوئی نہ کوئی مفاد ہوگا"
"دیکھیے آپ کو حق نہیں پہنچتا کہ میرے شوہر کے بارے میں آپ اس طرح کی باتیں کریں۔ وہ کب، کس سے، کس لہجے میں بات کرتے ہیں، اس سے آپ کو کیا غرض؟" اپنے شوہر کی حمایت میں کہا۔
"دیکھیے اگر آپ کو برا لگا تو معذرت چاہتا ہوں مگر میں آپ کو الرٹ کر رہا تھا" شائستہ کے چہرے پر ناگواری کے اثرات کو بھانپتے ہوئے کہا۔
"شکریہ مگر مجھے اپنے شوہر پر پورا یقین ہے" اس نے پر اطمینان ہو کر کہا۔
"لیکن وہ شخص یقین کے قابل نہیں ہے" سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔
"کوئی شخص یقین کے قابل ہے یا نہیں، یہ دیکھنے کے لئے پہلے اس پر یقین کرنا ہوتا ہے۔ یوں پیشن گوئیاں کرنے سے کسی کے کردار پر انگلیاں اٹھانا معقول بات نہیں"
"آپ کی بات بالکل بجا ہے مگر میں وہی بیان کر رہا ہوں، جو میں جانتا ہوں میں نہیں چاہتا کہ آپ اس کا شکار بنیں"
"شکار؟ وہ میرے شوہر ہیں مجھ پر ان کا پورا حق ہے اور اگر آپ یہی باتیں کرنے آئے ہیں تو آپ جا سکتے ہیں" سفاک انداز میں کہا۔
"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں مگر ذرا سنبھل کر" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا مگر اس کی بات نے شائستہ کو سوچنے پر مجبور

کردیا۔اس کی بات میں دم ضرور تھا مگر آتش کا مسکراتا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آکر اس کے کہے گئے الفاظ کو بے معنی کر رہا تھا۔وہ عبدالرحمن کی باتوں پر سوچنا چاہتی تھی مگر دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔اس کا دل آتش کے خیالوں میں جکڑا ہوا تھا۔اس کی سوچ کا محور صرف آتش بنا ہوا تھا۔وہ چاہ کر بھی اس کے بچھائے ہوئے محبت کے جال سے نکل نہیں پا رہی تھی۔

آتش کار ڈرائیو کر رہا تھا۔سیاہ جینز پر سیاہ شرٹ ہمیشہ سے ہی اس کی شخصیت کو بھاتی تھی۔ڈائمنڈ فیس پر ہلکا سا تبسم کسی کو بھی اپنے سحر میں جکڑ سکتا تھا۔گریبان کے دو کھلے بٹن شائستہ کے دل میں ہلچل مچا رہے تھے۔شائستہ نے بھی آج سبز رنگ زیب تن کیا ہوا تھا۔وہ یہ تو نہیں جانتی تھی کہ آتش کو کون سا رنگ پسند ہے مگر اسے بھروسہ تھا کہ آج وہ آتش کا دل ضرور جیت لے گی۔پچھلے بیس منٹ سے آتش خاموشی سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہیں نکلا تھا۔اس کی نظریں سڑک پر مرتکز تھیں۔اس کے نزدیک شائستہ کا پاس ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔مگر شائستہ، اس کے لیے تو یہ لمحہ کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔اچانک آتش نے بریک لگائی جو شائستہ کو خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی۔

"آپ نے اس سنسان سڑک پر بریک کیوں لگائی؟" بن دیکھے شائستہ نے پوچھا۔

"کیوں تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں" چہرے سے زلفیں ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" طنزیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

"جب تک آپ میرے ساتھ ہیں، مجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں" تسلی بخش جواب دیا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں؟" شاطرانہ ہنسی کے ساتھ کہا۔

"مطلب؟" پچھلے بیس منٹ میں پہلی بار اس نے آتش کی طرف دیکھا۔

"باہر نکلو" چٹکی بجا کر کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" چونک کر جواب دیا۔

"جو تم سن رہی ہو تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہارے ساتھ کہیں جاؤں گا، تمہارے ساتھ باہر آنا میرا پلان تھا تاکہ تمہیں اپنی زندگی سے نکال سکوں ہمیشہ کے لئے اب خاموشی سے اتر جاؤ اور دفع ہو جاؤ میری زندگی سے"

ان لفظوں نے ایک بار پھر شائستہ کے ارمانوں کو کرچی کرچی کر دیا۔وہ اپنے وجود کو سمیٹنا چاہتی تھی مگر آتش کے وار اسے سنبھلنے کی مہلت ہی نہیں دے رہے تھے

"سنا نہیں تم نے۔اتر جاؤ گاڑی سے اور ہو سکے تو کبھی مجھے اپنی شکل مت دکھانا" لبوں کو بھینچتے ہوئے کہا

"آتش آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے" بن بلائے اشک آنکھوں سے باہر نکل آئے

"میں کیا کر سکتا ہوں تم اچھی طرح جانتی ہو" مقابل نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا

"آپ چاہیں میرے ساتھ جو مرضی سلوک کریں، میں کہیں نہیں جاؤں گی" اشک بہاتے ہوئے اس نے صاف صاف آتش کو کہا۔

"نہیں اترو گی تم؟"

"نہیں"

"ٹھیک ہے" یہ کہہ کر اس نے کار سٹارٹ کی اور کار کی سپیڈ صرف دو منٹ میں ۱۴۰ پر لے گیا۔کار کی سپیڈ اتنی زیادہ ہو گئی کہ وہ خود اس کو سنبھال نہیں پا رہا تھا

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ آہستہ کریں سپیڈ!" گھبراتے ہوئے کہا۔

"نہیں کروں گا۔آج تمہیں میری زندگی سے نکلنا ہی ہوگا" یہ کہہ کر اس نے شائستہ کے شانوں کو جھنجوڑ کر پیچھے کیا اور شائستہ کی طرف کا دروازہ کھول کر اس کی بیلٹ زبردستی کھولنے کی کوشش کی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" مزاحمت کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"چپ ایک دم چپ" اس کا دھیان اب شائستہ کی طرف مرکوز تھا جس وجہ سے کار ہچکولے کھانے لگی۔

"احتیاط سے کار ڈرائیو کریں" اس کی سسکیاں بھی اشکوں کے سنگ ہو لیں۔

"سنا نہیں تمہیں ایک دم چپ" وہ اب اس کی ڈرائیونگ بیلٹ کھول چکا تھا، کار کا دروازہ بھی آدھا کھلا تھا۔تب اس نے کار کی سپیڈ کو آہستہ کر لیا۔

"میں نے تمہیں پورا پورا موقع دیا تھا کہ تم خود اتر جاؤ مگر تم نے میرا کہا نہیں مانا، اب تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔" اس کے بازو کو بے دردی سے پکڑا۔ کار کی سپیڈ مزید سلو ہو گئی۔

"چلو تم پر ایک احسان مزید کر دیا۔ اور اب بائے بائے" شاطرانہ ہنسی کے ساتھ اس نے ایک جھٹکے سے شائستہ کو چلتی کار سے دھکیل دیا اور پھر جیت کی خوشی منانے اپنی منزل کی طرف چل دیا۔

شائستہ بل کھاتے ہوئے ایک درخت کی جڑ سے جا ٹکرائی۔ ماتھے سے لہو بہنے لگ گیا۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں بھی اس کے لبوں پر آتش کا نام جاری تھا۔ وہ ایک مسیحا کی طرح اس کو پکار رہی تھی۔ مگر سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ہوا میں ایک عجیب سا سناٹا تھا۔ پر اسراری آوازیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں جو اس کی ہمت کو توڑ چکی تھیں۔ اس کے پنکھ کتر چکی تھی۔ وہ ان آوازوں کو سننا نہیں چاہتی تھی مگر یہ آوازیں اس کا مسلسل پیچھا کر رہی تھیں۔

دس منٹ تک اس پر بے ہوشی کا عالم رہا۔ دس منٹ بعد اس کی آنکھیں ان آوازوں کے ساتھ ساتھ ان کے اجسام دیکھنے کے بھی قابل ہو گئیں۔ وہ درد سے کراہ رہی تھی مگر کوئی سننے والا نہیں تھا۔ اس کا ذہن مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ اسے بوجھل محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے سر پر ہتھوڑوں سے وار کر رہا ہو مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ سب وار ہو چکے تھے۔ صرف اس کو محسوس اب ہو رہا تھا۔ وقت گزرنے کے بعد سب کچھ اجڑنے کے بعد اکیلے رہ جانے کے بعد وہ خراماں خراماں سڑک کی طرف بڑھی۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ آتش جا چکا تھا۔ اسے تنہا چھوڑ کر، بیابان جنگل میں وہ بالکل اکیلی تھی۔ ہر طرف پر خار راستے نظر آ رہے تھے۔ انسان نام کی کوئی چیز اسے نظر نہیں آئی۔ اس کا دل خوف کے مارے بیٹھنے لگا تھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ آپ اس کا شکار بنیں" عبدالرحمٰن کی آواز اس کے کانوں میں گونجی مگر اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اس کا شکار بن چکی تھی۔

"ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں مگر ذرا سنبھل کر" ایک بار پھر سرگوشی ہوئی۔

اب سنبھلنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سنبھلنے کا وقت بیت چکا تھا۔ اب تو حقیقت سے لڑنے کا وقت تھا۔ وہ بھیانک حقیقت، جس کا اظہار عبدالرحمٰن دبے الفاظ میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ کانٹوں نے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس کے لباس کو بھی چھلنی کر دیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ چلتی رہی اچانک کچھ فاصلے پر اس کی نگاہ ایک نہر پر پڑی۔

نہر کی طرف منہ کیے ایک عورت کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اس کے قدم رک گئے۔ ایک تجسس نے جنم لیا۔ وہ آگے بڑھی۔

"اس نہر کے پانی کو دیکھ رہی ہو۔ کیسے بہتا جا رہا ہے۔ کبھی اٹھکیلیاں کرتا ہے تو کبھی ساکن تخت بن جاتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کیا ہے؟ کہاں سے آیا اور کہاں جائے گا۔ سب مسافر ہیں۔ تم بھی مسافر، میں بھی مسافر یہ بھی مسافر، وہ بھی مسافر۔ سب کو بہتے جانا ہے۔ راستے میں بہت سی رکاوٹیں آئیں گی۔ بہت سے بچے تمہارے راستے کو آلودہ کریں گے۔ مگر تمہیں تو آگے بڑھنا ہے۔ تمہیں تو اس شخص کو پانا ہے۔ جو تمہارا ہے ہی نہیں۔ جس کا وجود آگ ہے۔ بھلا وہ کیسے کسی آب کو اپنے اندر سمیٹ سکتا ہے۔ وہ چاہ کر بھی تمہیں اپنا نہیں سکتا اور اس کی وجہ تم ہو۔ صرف اور صرف تم۔ کیونکہ تم آب ہو۔ تمہارا وجود پانی ہے۔ تم عاجز ہو۔ تمہارے اندر قناعت ہے مگر وہ اس سے بالاتر ہے۔ وہ کسی کو نہیں دیکھتا۔ اس کے اندر صرف میں ہے۔ اس کی نظر صرف اور صرف آسمان پر ہوتی ہے۔ زمین پر اگرچہ اس کے پاؤں ہیں مگر اڑان اس کی فضاؤں میں ہے۔ وہ پیچھے دیکھ کر جینے کا قائل نہیں۔ وہ تمہاری طرف بھی نہیں دیکھے گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنا راستہ بدل لو جہاں سے آئی ہو، لوٹ جاؤ۔ آگے مت بڑھنا۔ آگے آگ ہے۔ نیا امتحان ہے۔ ایک نئی کسوٹی ہے۔ مگر منزل پھر بھی غائب ہے" سیاہ لباس میں ملبوس عورت درخت کے ساتھ ٹیک لگائے نہر کے پانی کو بہتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں پانی پر مرکوز تھیں۔ شائستہ اس کے عین پیچھے کھڑی تھی۔ اس کی باتیں نہایت غور سے سننے لگی۔

"کتنا درد ہوتا ہے نا! کتنی تکلیف سہنی پڑتی ہے تمہیں مگر اس کی وجہ بھی تو تم خود ہو تمہارا وجود ہے تمہارا آب

ہونا ہے۔ آخر کب تک تم بن منزل کے بھٹکتی رہو گی؟ کب تک تم اس کی چاہ اپنے دل میں رکھو گی؟ جو تمہارا نہیں ہے، اس کو بھول کیوں نہیں جاتی؟ جہاں اتنی محرومیوں کا سامنا کیا، وہاں ایک محرومی کا مزید کیوں نہیں؟ زندگی میں سب کچھ مل جائے یہ ضروری تو نہیں، اور جو ملے وہ ہمیشہ رہے ایسا سمجھنا بے وقوفی ہے۔ ایک پل کے لئے اس نے ہنس کر تم سے بات کیا کر لی، تم نے تو اسے اپنا ہی سمجھ لیا۔ اپنا ہی مان لیا۔ اتنی آسانی سے کوئی کسی کو نہیں ملتا۔ سالوں سجدے کرنے پڑتے ہیں، گڑگڑا کر دعائیں مانگنی پڑتی ہیں۔ راتوں کو جاگنا پڑتا ہے، تڑپنا پڑتا ہے، واسطے دینے پڑتے ہیں۔ اپنے آپ کو مارنا پڑتا ہے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے۔ اس کی بندگی کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کر ایک امید جنم لیتی ہے۔ ایک چراغ جلتا ہے۔ جس سے روشنی کی امید کی جا سکتی ہے مگر تم نے کیا کیا؟ کتنی راتیں جاگی ہو اس کے لئے؟ کتنی بار اس کا نام اپنی دعاؤں میں شامل کیا؟ کتنی بار اس کے لئے آہ وزاری کی؟ کتنی بار اس کو اپنے رب سے مانگا؟ یقیناً تمہارا جواب نفی میں ہوگا پھر کیسے تم اپنی قسمت کو ملامت کر سکتی ہو؟ کیسے تم اپنے مقدر کو برا بھلا کہہ سکتی ہو۔ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ جنت بھی موت کا سامنا کرنے سے ملتی ہے۔ منزل بھی پر خار راستوں پر چل کر ہی مقدر بنتی ہے۔ مگر تم تو بہت کمزور نکلیں۔ ایک بار اس نے تمہارے وجود کو کیا جھنجوڑا تم نے ہار مان لی۔ اتنا بھی کمزور ہونا اچھی بات نہیں" وہ عورت بنا دیکھے کہے جا رہی تھی۔

"مگر انسان تو پیدا ہی کمزور ہوا ہے۔" شائستہ نے دانستہ کہا۔

"وہ جو تمہارے وجود سے گھن کھاتا ہے۔ وہ بھی تو انسان ہے۔ وہ بھی کمزور ہے مگر فرق صرف اتنا ہے اسے اپنے آپ پر یقین ہے جو اس کی بھول ہے اور تمہیں اپنے رب پر یقین نہیں، جو تمہاری بھول ہے۔ تمہیں اپنے رب پر یقین کرنا سیکھنا ہوگا، تب جا کر تم اپنے وجود کو تراش پاؤ گی۔ وگرنہ تم بھی اس کی طرح بھٹکتی رہو گی۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں، وہ تمہیں ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے گا۔ تمہیں مسمار کر کے رکھ دے گا۔ تمہیں پل پل محرومیوں کا احساس دلائے گا اور تم کچھ نہیں کر سکو گی صرف اس وجہ سے کہ تم نے اس پر یقین نہیں کیا۔ جو یقین کرنے کے لائق ہے۔ ابھی بھی وقت ہے، نکال دو اس بشر کی تمنا دل سے، جو بشر کی حدود کو پار کر چکا ہے۔ لوٹ آؤ، اس راستے سے، جس پر چل کر تم کبھی اسے حاصل نہیں کر سکو گی۔"

"پھر آپ ہی بتائیں، میں کیسے اس فاصلے کو کم کروں۔ کیسے اس کی نظروں میں اپنا مقام بناؤں؟ کیسے اس کی طبیعت میں نرمی لاؤں؟ کیسے اس کو آگ سے آب بناؤں؟" اس نے ایسے اس سے سوال کیا جیسے ہر سوال کا جواب آج اس کو مل جائے گا۔

"نام۔ تمہیں اس کے نام کی تاثیر کو ختم کرنا ہوگا۔ کیونکہ انسان کا نام اس کی پہچان ہوتا ہے۔ برا نام، بری شخصیت۔ اچھا نام، اچھی شخصیت۔ تمہیں اس کی پہچان بدلنی ہوگی۔ اس کا وجود بدلنا ہوگا۔"

"اس کا نام۔؟" افسردگی سے کہا۔

"اس کا وجود پانا چاہتی ہو، مگر کسوٹی سے ڈرتی ہو۔ اس کی تمنا دل میں ہے مگر امتحان سے گھبراتی ہو۔ یہ کیسا عشق ہے تمہارا! کانٹوں پر چلنا بھی نہیں مگر منزل تک رسائی چاہتی ہو۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ انسان اتنی آسانی سے نہیں ملتا جتنی آسانی سے رب مل جاتا ہے۔ مجھے ہی دیکھ لو، نکلی تھی انسانوں کی تلاش میں مگر مل گیا رب۔ جستجو تھی انسانوں کی مگر منزل بنی اس کی بندگی۔ چاہی تھی دنیا کی محبت مگر مل گئی اس کی چاہت۔ یہی تو ہے زندگی، کب، کیا، کیسے ہو جائے۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔ تمہیں بھی اسی راستے سے گزرنا ہے، ابھی وقت ہے۔ تیاری پکڑ لو۔ تمہاری منزل بھی وہی ہے۔ جو اس کی ہے۔ تم دونوں ہو تو الگ مگر گزرنا ایک ہی پل سے ہے۔ اب کون جلے گا، کون بجھے گا، یہ سب مقدروں کے کھیل ہیں۔ نہ تم کچھ کر پاؤ گی، نہ وہ اپنے آپ کو بدلے گا۔ نہ اس کو منزل ملے گی نہ تمہیں۔ یہ سب مقدروں کے کھیل ہیں۔ مقدروں کے کھیل" اس کی آواز مدھم ہو رہی تھی۔ رات کی تاریکی ہر طرف چھا گئی تھی۔ اس کے ساتھ گزارے گئے لمحوں نے شائستہ کو دنیا سے کنارہ کر دیا۔ وہ اپنا غم بھول چکی تھی۔ وہ کون تھی؟ کیا چاہتی تھی؟ یہ خیال اس کے ذہن میں آیا ہی نہیں۔ رات کی تاریکی میں بھی وہ اس کا روشن چہرہ دیکھ سکتی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-
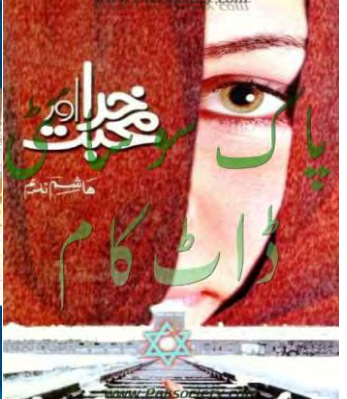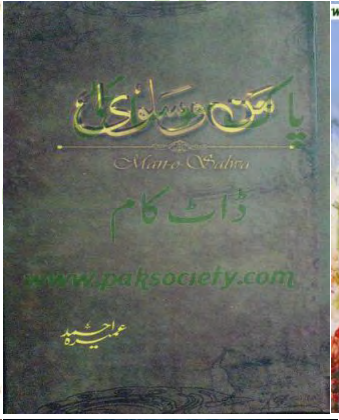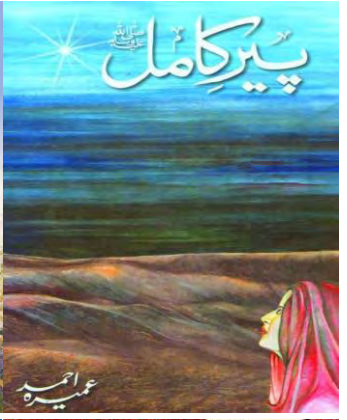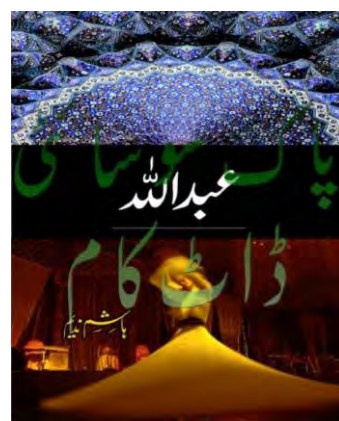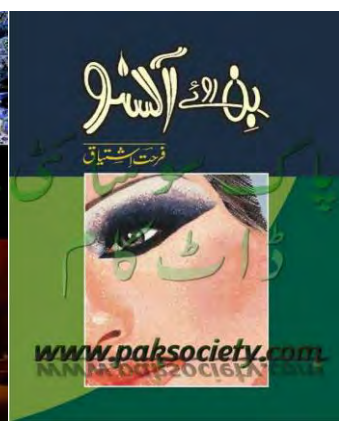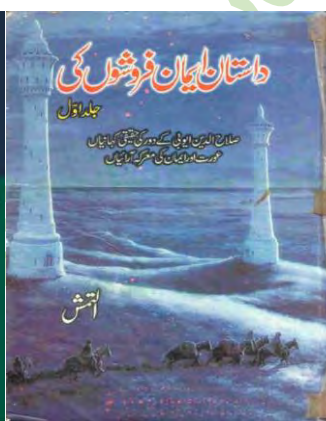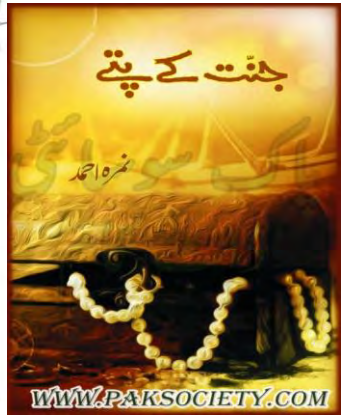
''تم مجھے دیکھ رہی ہو'' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ کھڑی ہوئی اور شائستہ کی طرف چہرہ کیا۔ شکل سے اس کی عمر کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ اس کی عمر مشکل سے ۲۵ کے قریب تھی۔ مگر اس کی باتیں درویشوں کی طرح تھی جیسے اسکی عمر کا ایک حصہ ان کے درمیان گزرا ہو۔ وہ اب اپنا تعارف کروانے لگی تھی۔

''میں کنارہ ہوں اس نہر کا کنارہ، جہاں تم کھڑی ہو۔ تم جانتی ہو میرے والدین نے بڑی چاہ سے میرا نام کنارہ رکھا تھا مگر انہیں کیا خبر تھی کہ یہ نام مجھے اپنوں سے کنارہ کر دے گا۔ رشتوں سے دور کر دے گا۔ میرے اس نام نے مجھے محروم کر دیا۔ کوئی مطلب نہیں اس نام کا مگر دیکھو پھر بھی میں خوش ہوں۔ میرے اس نام کی بدولت دنیا والوں نے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی، مگر مجھے افسوس نہیں۔ اس نام کی بدولت ہی تو مجھے یہ کنارہ ملا۔ اس نہر کا کنارہ جہاں میں نے سب کچھ حاصل کر لیا۔ سب سے کنارہ ہو کر، کنارہ بن کر تم بھی کنارہ بن جاؤ۔ میری طرح۔ میں یہ کنارہ، تم وہ کنارہ دونوں اکٹھے منزل کو ڈھونڈیں گے۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے، میرا اور تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔ تم آب ہو میں کنارہ، تمہارا مقدر جلنا ہے، جھلسنا ہے، تڑپنا ہے، منزل کو ڈھونڈنا ہے، اور ڈھونڈنا تو تمہارا مقدر ہے۔ مجھے تو منزل مل گئی ہے، چلی جاؤ یہاں سے، چلی جاؤ پیچھے پیچھے ہٹو'' اس کی باتیں شائستہ کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ وہ ان باتوں کے پیچھے مطلب کو سمجھ نہیں پائی۔ رات کی تاریکی نے اس کی زندگی کو بھی تاریک کر کے رکھ دیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس کے سامنے فریاد کرے؟ سب راستے اجنبی تھے۔ سب منزلیں ویران تھیں۔ قدم اٹھ رہے تھے مگر جانا کہاں تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔

......☆☆......

رات کی تاریکی آتش کی پیاس کو بھڑکا رہی تھی۔ جام کے دو گلاس وہ ختم کر چکا تھا۔ تیسرا اس کے ہاتھ میں تھا۔ عیان، زیب اور نازو کے ساتھ ساتھ دو خوبصورت لڑکیاں بھی اس محفل میں شامل تھیں۔ ان میں سے ایک، عیان کے پہلو میں اور دوسری زیب کے ساتھ بیٹھ کر محفل کا مزہ اٹھا رہی تھیں۔ نازو کا مدہوش چہرہ، آتش کے خمار میں اضافہ کر رہا تھا۔

''آج کی رات بھی کتنی نشیلی ہے نشہ ہے کہ اترنے کا نام ہی نہیں لیتا'' آتش نے کہا۔

''اس نشے میں ذرا اور اضافہ کیا جائے'' نازو نے آتش کے ہاتھ سے جام کا گلاس لیتے ہوئے کہا

''یہ کیوں لے لیا؟ مجھے اور پینا ہے۔'' مدہوش آواز میں کہا۔

''تمہیں اور پینا ہے۔ میں پلاتی ہوں'' نازو نے اپنے ہاتھ سے آتش کو جام پلانا شروع کیا۔ نازو کی جھیل آنکھیں، آتش کو اپنے اندر سما رہی تھیں۔ جام کے سحر کے ساتھ ساتھ وہ نازو کے سحر میں بھی جکڑ گیا۔ شرٹ کے کھلے بٹنوں کی بدولت اس کے تن سے نکلنے والی بھینی خوشبو نازو کو بھڑکا رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ پر قابو کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی۔

''چلو میرے ساتھ'' لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کھڑی ہوئی اور آتش کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی

''یہ تو گئے'' ان کے جانے کے بعد زیب نے پہلو میں بیٹھی لڑکی کی زلفوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے کہا

''تو پھر ہم بھی چلتے ہیں'' یہ کہہ کر عیان اٹھا اور اپنے پہلو میں بیٹھی خوبصورت لڑکی کو باہوں میں لے لیا۔

رات کا نشہ صبح کو بھی اس کے سر پر سوار تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوا۔ ٹی وی لاؤنج میں سب بیٹھے آتش اور شائستہ کی راہ تک رہے تھے۔ ساری رات وہ آتش کا فون ٹرائی کرتے رہے مگر فون بند جاتا رہا۔ جب انہوں نے آتش کو اس حالت میں دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ پراگندہ بال، شرٹ پر شراب کے نشانات، مدہوش آنکھیں، لڑکھڑاتے قدم۔ جمال الدین غصے میں اس کے پاس گئے

''شائستہ کہاں ہے؟'' سخت آواز میں پوچھا

''کون؟ شائستہ؟'' شراب کے نشے میں جواب دیا

''میں نے پوچھا کہ شائستہ کہاں ہے؟'' اس کا گریبان پکڑ کر اپنے الفاظ دہرائے۔

''چھوڑیے، آپ جانتے ہیں کہ یہ ابھی نشے میں ہے، اس کو خود نہیں معلوم کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔'' شاہین بیگم نے مزاحمت کی اور آتش کو اپنی ممتا کے سائے تلے لے گئیں

''مگر آنٹی، بھابھی ہیں کہاں؟ اس سے یہ تو پوچھے'' عبدالرحمن نے کہا۔

''میں یہاں ہوں'' دروازے سے شائستہ داخل ہوئی، اس کے کپڑے گرد سے آلودہ، بال بکھرے ہوئے تھے۔

''بہو یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ کہاں تھی تم ساری رات؟ تم ٹھیک تو ہو، نا!'' نانی جان نے شائستہ کو دیکھتے ہی اپنی فکر کا اظہار کیا۔

''یہ فکر کبھی اپنے نواسے کے لئے بھی دکھا دیا کریں'' شاہین بیگم نے دبے الفاظ میں کہا۔

''فکر اس کی کی جاتی ہے، جو فکر کے لائق ہوتا ہے۔'' نانی جان نے فی الفور جواب دیا۔

''تم بتاؤ بہو کہاں تھی تم؟ اور یہ حالت؟'' وہ اب ٹی وی لاؤنج میں آ چکی تھی۔ اس نے ایک نظر آتش پر ڈالی جو نشے میں مدہوش تھا۔ اس کی آنکھوں نے اشک بہانا چاہا مگر دل مضطر نے انکار کر دیا۔ اس کی بے رخی نے اس کو بھی سخت جان بنا دیا۔

''کیا ہوا بھابھی؟ آپ خاموش کیوں ہیں؟'' عبدالرحمن نے پوچھا۔

اس کے دل نے کہا کہ سب کچھ سچ بتا دوں مگر ایسا کرنے سے اسے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ الٹا اسے ہی کئی سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

''ہمارا کل ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا'' آنکھیں جھکائے صرف یہ جملہ اس کی زبان سے جاری ہوا۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ پل اکیلے رہنا چاہتی تھی۔ اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنا چاہتی تھی۔

''کیا؟ تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا؟'' جمال الدین کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ہمدردی کے کئی بول اس کے کانوں میں گونجنے لگے مگر اس کا دھیان اور آنکھیں آتش پر مرکوز تھیں۔ کوئی لفظ، کوئی بول اس کے دل کا بوجھ کم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے غم کا علاج صرف آتش کے پاس تھا۔ مگر وہ اس کا علاج کیونکر کرتا وہ تو خود اس کو ویران جنگل میں چھوڑ آیا تھا۔ اسے وہیں رہنا چاہئے تھا مگر پھر کیوں اس کے قدم دوبارہ اس دوزخ کی طرف چل پڑے؟ وہ کیوں دوبارہ، وہی اذیت سہنے اس کے پاس آ گئی؟ وہ خود نہیں جانتی تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے، اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اس کے دل میں آتش کے لئے ایک الگ مقام، ایک الگ رتبہ، الگ حیثیت، ایک الگ کشش جنم لے رہی تھی۔

''اب طبیعت کیسی ہے؟'' آنکھیں کھلتے ہی اس نے نانی جان کو اپنے کمرے میں پایا۔

''میں یہاں؟'' اپنے آپ کو کمرے میں دیکھ کر وہ حیران ہو گئی

''زیادہ دماغ پر زور مت ڈالو ورنہ تم دوبارہ۔'' ان کے لب رک گئے۔

''میں دوبارہ؟ کیا کہنا چاہتی تھیں آپ نانی جان؟'' اس نے نانی جان کے تاثرات کو بھانپ لیا۔

''تم دوبارہ بے ہوش ہو سکتی ہو۔''

''بے ہوش؟'' اس نے بیٹھنے کی کوشش کی تو نانی جان نے اس کو سہارا دیا۔

''ہاں دیکھو، شائستہ مجھے سچ سچ بتاؤ کیا ہوا تھا دو دن پہلے؟ جس کی وجہ سے تمہارا نروس سسٹم بریک ہو گیا تھا۔'' نانی جان نے اسے پانی پلاتے ہوئے پوچھا۔ دو دن کا سن کر پانی کا گھونٹ اس کے حلق میں اٹک گیا اور وہ کھانسنے لگی۔

''دو دن؟'' اس نے حیرت سے نانی جان کا چہرہ تکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں دو دن دیکھو مجھے صرف سچ سننا ہے کچھ غلط بیانی سے کام مت لینا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تمہارا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آتش تمہیں اپنی بیوی کا درجہ نہیں دینا چاہتا''

''جب آپ سب جانتی ہیں تو مجھ سے پوچھ کیوں رہی ہیں؟'' آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

''مطلب یہ سچ ہے'' ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔

''بیٹا، میں تمہارا برا نہیں چاہتی مگر میں تمہارے ساتھ برا ہوتے دیکھ بھی نہیں سکتی۔ دل پر پتھر رکھ کر میں یہ بات تم سے کہہ رہی ہوں، چلی جاؤ یہاں سے۔ ورنہ آتش کی آگ تمہارے وجود کو جھلسا دے گی۔''

''اور اگر میں یہاں سے چلی گئی تو معاشرے کی آگ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔'' درد کو دبانے کی ناکام کوشش کی۔ کچھ پل توقف کرنے کے بعد اس کو اس عورت کی

بات یاد آئی

"نانی جان! کیا واقعی انسان کی شخصیت پر اس کے نام کا اثر ہوتا ہے؟" آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا

"ہاں! انسان کا نام اس کی پہچان ہوتا ہے۔ انسان کا نام سن کر اس کے کردار کا جسم اپنے دل، دماغ کی دنیا میں بنایا جاسکتا ہے۔ مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"کیا آتش بھی اپنے نام کے زیر اثر ہے؟" سوالیہ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں! تمہیں پتا ہے جب آتش پیدا ہوا تھا تو اس کے تن سے ایک عجیب سے مہک ابھرتی تھی مگر جب اس کا نام آتش رکھا گیا تو یک دم وہ خوشبو کہیں کھو گئی۔ اس کے نازک ہاتھوں پر سیاہی چھانے لگی۔ وہ سیاہی نام کی سیاہی تھی۔ جب جب اس کا نام پکارا جاتا، سیاہی اس کے وجود پر پھیلتی جاتی اور پھر وہ وقت آیا جب اس سیاہی نے اس کے پورے وجود پر قبضہ کر لیا۔ اس سیاہی کے زیر اثر وہ انسان سے آگ بننے کی کوشش میں لگ گیا۔ اپنی شناخت بھول گیا۔ اپنا وجود بھول گیا۔ اپنی اصل بھول گیا کہ وہ کیا ہے؟ کس چیز سے بنا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر یہی بات حاوی رہتی کہ وہ آتش ہے اور آتش کا کام اوپر دیکھنا ہے نیچے نہیں۔ اس کی منزل آسمانوں پر ہے، زمین پر نہیں۔ بس اسی بھول کے زیر اثر وہ آج بھی ہے اور اس کی وجہ صرف شاہین ہے، جس نے ایک بشر کو آتش بنا دیا۔"

"مگر نام کا اتنا اثر؟ کیوں؟" اس کا تجسس بڑھ گیا۔

"دیکھو بیٹا!۔ نام کیا ہے؟ انسان کی پہچان، ایڈریس اور عنوان ہے۔ نام ہی کے ذریعے ایک انسان کی اپنے ہم جنسوں اور اپنے جیسے بقیہ انسانوں سے تمیز ہوتی ہے۔ اگر نام نہ ہو تو انسان کی شخصیت مجہول ہو جائے گی۔ اس کا تعین اور تحدید دشوار ہو جائے گی۔ نام کی مثال لباس کی سی ہے۔ اگر کسی کا لباس خوبصورت ہے، چست و درست ہے تو وہ اس کے لئے باعث زینت ہے۔ اور اگر لباس بدصورت ہے تو آدمی اپنے اندر حسین وجمیل ہونے کے باوجود عیب دار لگنے لگتا ہے۔ ایسے ہی اگر نام غلط ہے یا بے ڈھنگا ہے، یا مکروہ ناروا ہے تو ایک انسان اپنے اندر شرمندگی محسوس کرتا ہے اور اپنا نام بتاتے ہوئے معذرت والا لب ولہجہ استعمال کرتا ہے اور جہاں تک ناموں کی تاثیر کی بات ہے تو یہ جان رکھو کہ نام کا اثر لازمی جزو ہے۔ جب ہم کوئی چیز بناتے ہیں تو اس کے اندر موجود خوبیوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے ہی اس کا نام تجویز کرتے ہیں۔ تم کرسی کی مثال ہی لے لو، ہم اسے کرسی کیوں کہتے ہیں؟ میز کیوں نہیں کہتے؟ ہم جانتے ہیں کہ میز کا مطلب کچھ اور ہے اور کرسی کا مطلب کچھ اور اور سب سے بڑھ کر یہ بات مقدم ہے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے ہمیں اچھے نام رکھنے کا حکم دیا۔ برے نام رکھنے سے روکا۔ اور تم تو جانتی ہو نبی کبھی اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتا۔ نبی کا ایک ایک بول ایک ایک لفظ اللہ کی طرف سے وحی ہوتا ہے۔

اللہ نے اپنے کلام پاک میں خود ارشاد فرمایا

وما ینطق عن الھوی۔ان ھو الا وحی یوحی۔

(القرآن)

اور تم جانتی ہو کہ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے کیا ارشاد فرمایا:

آپ ﷺ نے فرمایا:

"بے شک تم روز قیامت اپنے اور اپنے باپوں کے نام سے پکارے جاؤ گے تو اپنے نام اچھے رکھو۔"

ظاہر ہے کوئی شخص یہ پسند بالکل نہیں کرے گا جب پوری دنیا میدان حشر میں ہو اور اس کو ایسے نام سے پکارا جائے جو اس کے لئے باعث ندامت و شرمندگی ہو۔ ہمارے نبی ﷺ نے تو برے ناموں کو ہی تبدیل کر دیا۔ مدینہ طیبہ کے نام سے کون واقف نہیں؟ جب آپ ﷺ ہجرت کے بعد تشریف لائے تو اس جگہ کو یثرب کہا جاتا تھا۔ جس کا مطلب ملامت کے تھا۔ مگر جب سے آپ ﷺ نے اس کا نام تبدیل کیا تو اللہ پاک نے اس جگہ کو جو عزت دی، وہ پوری کائنات میں کسی اور جگہ کو حاصل نہیں۔ یہ تو ایک مقام ہے۔ ایک جگہ ہے۔ جب آپ ﷺ کسی جگہ کا برا نام رکھنے کے قائل نہیں تو انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ اس کا برا نام رکھنا کس حد تک برا ہے اس کا اندازہ تم بخوبی لگا سکتی ہو۔"

"پھر میں کیسے آتش کے نام کی نحوست اس سے دور کر سکتی ہوں؟"

"نام کی تبدیلی ہی اس اثر کو زائل کر سکتی ہے مگر یہ کام

"اتنا آسان نہیں جتنا تم سوچتی ہو۔"
"میں جانتی ہوں مگر کوشش تو کی جا سکتی ہے۔"
"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہے۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ شائستہ ان کو جاتے دیکھ کر آتش کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اس کے نام اور اس کی شخصیت کا موازنہ کر رہی تھی۔ نانی جان کے کہے گئے ایک ایک لفظ کا اطلاق آتش پر کر رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ ایک ہنستا مسکراتا چہرہ سامنے آیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ اس کے تن کی خوشبو کستوری سے بڑھ کر تھی۔ وہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ اس کے دل کے قریب۔ اس کی سانسوں کی گرمی وہ محسوس کر سکتی تھی۔ مگر اچانک تاریکی چھا گئی۔ اس تاریکی نے اس کے وجود کو تاریک کر دیا۔ ہنستا مسکراتا چہرہ، یک دم غیض وغضب کا شکار ہو گیا۔ اس کی سانسیں صحرا کے عین درمیان میں موجود تپتی ریت سے زیادہ گرم ہو گئیں۔ وہ قہر کسی بھی وقت اس کو مٹی کر سکتا تھا۔ تب اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا جسم پسینہ میں شرابور تھا۔ ہاتھوں پر کپکپی اس طرح طاری تھی جیسے پنڈولم میں ارتعاش ہو۔ تب اس نے دل میں قصد کیا کہ وہ آتش کی شخصیت کو اس کے نام کی تاثیر سے باہر ضرور نکالے گی۔

دوستوں کی محفل سے خوب لطف اٹھا کر رات گئے وہ گھر آیا۔ سب سو چکے تھے مگر وہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتہ سے وہ آتش سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ہر بار اس کا رعب و دبدبہ اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیتا مگر آج اس نے پکا ارادہ کر رکھا تھا کہ جو مرضی ہو جائے آج وہ اس سے بات کر کے ہی رہے گی۔ صبح کے تین بج چکے تھے۔ مگر اس کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس کی نظریں دروازے پر مرکوز تھیں۔ اس کا انتظار اس کے کرب میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے دماغ میں الفاظ ڈھونڈنے لگی کہ کہاں سے بات شروع کرے، کیسے اور کس لہجے میں بات کرے؟ وہ مسلسل چہل قدمی کر رہی تھی۔

"سالوں سجدے کرنے پڑتے ہیں، گڑگڑا کر دعائیں مانگنی پڑتی ہیں۔ راتوں کو جاگنا پڑتا ہے، تڑپنا پڑتا ہے، واسطے دینے پڑتے ہیں۔ اپنے آپ کو مارنا پڑتا ہے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے۔ اس کی بندگی کرنی پڑتی ہے۔ تب جا کر ایک امید جنم لیتی ہے۔ ایک چراغ جلتا ہے۔" ایک سرگوشی ہوئی جس نے اس کی سوچ کا زاویہ بدل دیا۔

"مگر تم نے کیا کیا؟ کتنی راتیں جاگی ہو اس کے لئے؟ کتنی بار اس کا نام اپنی دعاؤں میں شامل کیا؟ کتنی بار اس کے لئے آہ وزاری کی؟ کتنی بار اس کو اپنے رب سے مانگا؟" اس کی سوچ آتش سے ہٹ کر رب کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ واش روم میں گئی، وضو کیا۔ کمرے میں آ کر جائے نماز بچھایا اور دو رکعت نماز تہجد ادا کی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے تہجد کی نماز ادا کی۔ اس کا دل جو کچھ دیر پہلے طرح طرح کے وسوسوں کے زیر اثر تھا۔ یکجا ہو گیا۔ پانچ منٹ کی نماز نے اس کو وہ سکون عطا کیا جو وہ بچپن سے ڈھونڈتی آ رہی تھی۔ اس کا دل خالصتاً اپنے رب کو پکارنے لگا۔ اس کی آنکھیں جو ہمیشہ کرب میں بہتی تھیں، آج اپنے رب کے حضور بہنے لگیں۔ ہر بہتا آنسو اس کے دل مضطر کو راحت بخش رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دل سے غم کے بادل چھٹ گئے ہوں۔ اس کے تاریک دل میں ایمان کا نور اپنی جگہ بنانے لگا۔

"اے اللہ! اے زمین وآسمان کے مالک! اے دنیا و حشر کے پروردگار! نہ مجھے مانگنا آتا ہے اور نہ ہی میری دعاؤں میں اتنی سکت ہے کہ تیرے حضور پیش ہو سکیں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ تیری رحمت بار بار مجھے دعائیں مانگنے پر مجبور کرتی ہے۔ تجھے اسی رحمت کا واسطہ، میرے دل کی مراد کو قبولیت کا شرف بخش دے۔ لوگوں کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ سب سے پہلے تیرا در کھٹکھٹاتے ہیں، تجھ سے مانگتے ہیں، تجھے راضی کرتے ہیں مگر میں کتنی بے حس تھی۔ جب امواج حوادث سے نہ لڑ پائی، ٹھنڈی یخ بستہ ہواؤں نے مجھے آگھیرا، نیلم کے بھنور میں پھنس کر رہ گئی، وحشت احساس کی پیاس ستانے لگی تو خالی دامن لے کر تیرے در پر بھیک مانگنے آ گئی۔ اگر آج تو نے بھی میری دلجوئی نہ کی، میری خواہش کو بر نہ لایا، میرے خالی دامن کو اپنی رحمت کے چشمے سے سیراب نہ کیا تو میں بکھر جاؤں گی۔ اے پروردگار! اس کالی رات میں ان لبوں کی فریاد کو سننے والے! میں تجھ سے اس شخص کے لئے ہدایت مانگتی ہوں، جو بظاہر میرا نہیں۔ جس کے وجود پر میرا حق

تعارف

عنبرین اختر

عنبرین اختر 1978ء میں پاکستان کے دل راولپنڈی شہر میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ شہر ہے جس کا تفصیلی مراقبے، ان کی کہانیوں، ناولوں اور شاعری میں دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے دریار آباد گرلز ہائی اسکول سے میٹرک اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔

عنبرین اختر ایک شاعرہ کا دل ہے کہ اردو کی گلی میں آئی ہیں علم ان کے پاس بہت ہے اور محبت سے بھی گریز نہیں لیکن وہ اس متاع کو ہتھیلی پر سجا کر بازار میں نہیں نکلیں انہوں نے اپنے عہد کے شعور کو ہنر کی کٹھائی میں رکھ کر ریاضت کی آنچ دی ہے۔

عنبرین اختر منفرد لہجے کی نہایت توانا شاعرہ ہیں البتہ وہ گزشتہ ایک دہائی سے شعروادب سے منسلک ہیں ان کی شاعری نہایت دل پذیر اور اثر انگیز ہے۔ وہ سادہ اور آسان لفظیات میں اپنی غزل کو بنتی ہیں جو قاری کے دل میں اتر جاتی ہے آج کل لاہور میں مقیم ہیں۔

نہیں۔ جو مجھے اپنانے کی خواہش نہیں رکھتا مگر میں پھر بھی اس کے لئے تیرے سامنے سوال کرتی ہوں۔ اس کی محبت میرے نصیب میں ہے یا نہیں، اس کا شکوہ اپنے لبوں پر نہیں لاتی، مگر اتنا ضرور مانگتی ہوں کہ اس کو نام کے اثر سے بچالے۔ یہ نام انسان کو عزت بخشتا ہے اور یہی ذلیل کرتا ہے۔ اے پروردگار! میرے ہمسفر کو ذلیل ہونے سے بچالے۔ اس کا نام اس کو موت کی وادی کے قریب لے گیا ہے۔ تُو تو بچانے والا ہے۔ تُو اس کو بچالے۔ اسے موت کی وادی میں گرنے سے بچالے۔ ذلالت و گمراہی کے اندھیروں سے نکال دے۔ اس کے نام نے اس کی عقل کو مفلوج کر دیا ہے، اس کے دل پر مہر لگا دی ہے۔ اسے اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا۔ اے ستاروں کے مالک! اس کی زندگی کو بھی روشنی سے منور کردے۔'' اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ اس کے لب درد کی زباں تھے۔ ایک آہٹ کی آواز آئی۔ جو اس کی توجہ پر اثر انداز ہوئی۔ اس کا دل جو کچھ دیر پہلے رب کی طرف متوجہ تھا، ایک بار پھر دروازے کو تکنے لگا۔ اسے آتش کی موجودگی کا احساس ہوا۔ دعا کو ادھوری چھوڑ کر وہ جلد بازی میں اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ آتش کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر تھی۔ دل پرسکون تھا۔ قدم بھی مضبوط تھے۔ لحہ بھر کے لئے اس نے شائستہ کی طرف نظر دوڑائی۔ پہلی بار اس نظر میں اطمینان تھا۔ ایک سکون تھا۔ شاید دعا کا اثر تھا۔ جو اس نے ابھی ابھی اپنے رب سے مانگی تھی۔ اس نے قبول کرلی۔ آتش کے دل میں رحم ڈال دیا۔ وہ واش روم گیا اور نائٹ سوٹ پہن کر واپس آیا مگر وہ ابھی بھی دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ واش روم سے آنے کے بعد وہ پلنگ پر لیٹ گیا مگر وہ ابھی بھی وہیں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ تک رہی تھی۔

''کیا ہوا تمہیں؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟'' آتش نے پوچھا۔

''آپ سے ایک بات کرنی تھی'' دروازے کی چٹکی اوپر کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں کرو'' جماہی روکتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ کو اپنا نام کیسا لگتا ہے؟'' پلنگ کے ساتھ صوفہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اونگھتے ہوئے جواب دیا

''مطلب یہ ہے کہ نانی جان کہہ رہی تھیں کہ انسان کی

شخصیت کا اندازہ اس کے نام سے لگایا جا سکتا ہے۔ انسان کا کردار بنانے میں اس کے نام کا بہت زیادہ عمل دخل ہوتا ہے اور'' اس کی زبان ہکلانے لگی تھی

'' میں یہ کہہ رہی تھی کہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو جو بات بات پر غصہ آتا ہے، شاید آپ کے نام کا اثر ہو شاید آپ ویسے نہ ہوں جیسے نظر آتے ہیں، کیا آپ ایک بار میرے کہنے سے اپنا نام تبدیل کر سکتے ہیں'' کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ آتش کے جواب کی منتظر تھی مگر اس کی تابنا کی سے باخبر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بات اس کو بھڑکا دے گی۔ مگر آتش کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے اپنی نگاہیں، جو مسلسل دیوار کو تک رہی تھیں، آتش کی طرف کیں۔ وہ سوچ چکا تھا۔ اس کی کہی گئی ایک بات بھی اس نے نہیں سنی تھی۔ شائستہ اپنی جگہ سے اٹھی اور دھیمے قدموں سے اس کی طرف بڑھی۔ سوتے ہوئے اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ اس چاند کو چھونا چاہتی تھی۔ اس کے وجود کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔ مگر ایسا نہ کر سکی اور واپس پلٹ آئی۔

......☆☆......

'' انسان کو اپنے ہوش میں رہنا چاہئے بعض اوقات مدہوشی میں کی گئی ایک غلطی ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے'' نازد کے کہے گئے الفاظ آج سچ لگنے لگے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میری زندگی میں یہ پل بھی آئے گا کہ مجھے اپنے کئے پر پچھتاوا ہوگا۔ میری انا، میرا غرور، میرا دہکتا وجود کسی کے آگے بے معنی ہو جائے گا۔ ایک بہکتا قدم، میری زندگی کا رخ تبدیل کردے گا مگر اب میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کی ہر بات کے آگے، اپنے آپ کو جھکانا پڑ رہا تھا۔ مگر ایک بات وہ شاید بھول چکا ہے، جس دن میرے اندر کا لاوا باہر آ گیا۔ وہ دن اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔

'' یہ لو پیسے آئندہ مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا'' آتش نے پیسوں سے بھرا بیگ زیب کے سامنے میز پر دے مارا۔ آتش کی پیشانی پر پسینے کو دیکھ کر ایک شاطرانہ ہنسی فضا میں گونجی۔

'' بے چارہ آتش مجھے ترس آ رہا ہے تجھ پر'' شاطرانہ ہنسی کے ساتھ وہ اس کے گرد چکر لگانے لگا۔

'' پکڑو اپنے پیسے اور مجھے وہ سی ڈی دو'' آتش غرایا۔

'' اپنی نظروں اور آواز کو لگام دو یہ مت بھولو تم میرے گھر میں ہو'' عقابی نظروں سے اس پر جھپٹا۔

'' بات کو طول مت دو تمہیں اپنے پیسے مل گئے ہیں، اب سیدھی طرح مجھے وہ سی ڈی دے دو'' اس کی آواز قدرے پست ہوگئی۔

'' اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے'' طنزیہ کہا۔

'' کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اپنے اندر ابلتے لاوا کو کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا۔

'' ذرا نرمی سے کہو، پیار سے منت سماجت کرو اور اگر چاہو تو میرے پاؤں میں بھی گر کر منتیں کر سکتے ہو'' اپنے پاؤں کو ٹیبل پر رکھ کر کہا۔

'' شٹ اپ!'' انگلی اٹھائی۔

'' یو شٹ اپ'' اس کے ہاتھ کو نیچے کرتے ہوئے غرایا۔

'' آتش نہ تو کبھی کسی کے آگے جھکا ہے اور نہ ہی اس نے کبھی کسی سے فریاد کی ہے۔''

'' چلو آج اس روایت کو بھی بدل دیتے ہیں۔ جب تک تم گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے وہ سی ڈی نہیں مانگو گے۔ میں تمہیں نہیں دوں گا'' عقابی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا پاؤں ابھی بھی ٹیبل پر تھا

'' یہ تمہاری بھول ہے'' جبراً مسکرایا مگر اس کا ڈر عیاں تھا۔

'' یہ میری نہیں تمہاری بھول ہے، اگر سی ڈی لینا چاہتے ہو تو گھٹنے کے بل بیٹھو ورنہ وہ دروازہ ہے'' باہر کی طرف اشارہ کیا۔

اس کی بات نے آتش کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جھکنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اپنی ہی انا کو چھپانے کی خاطر اسے جھکنا پڑا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ آتش کو شکست ہوئی۔ اس کو اپنا سر زیر خم کرنا پڑا مگر زیر ہونے میں بھی اس کا غرور عیاں تھا۔ اس کی گردن میں ابھی بھی تناؤ تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا مگر اس کی دہکتی آنکھوں سے نکلنے والے نفرت کے شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔

'' پلیز مجھے وہ سی ڈی دے دو'' جبراً آہستہ سے کہا۔ یہ

سنتے ہی زیب کی شاطرانہ ہنسی پورے کمرے میں گونجنے لگی۔
"آج آتش کی شکست ہوئی، اس کا غرور خاک میں مل گیا، اس کی انا اس کو لے ڈوبی بے چارہ آتش"
"تم نے جو کہا، میں نے کیا اب وہ سی ڈی دے دو"
"ٹھیک ہے" یہ کہہ کر وہ کمرے میں گیا اور ایک سی ڈی لایا مگر اس کو دینے کی بجائے ہاتھ میں گھمانا شروع کر دی۔
"ویسے کیا خیال ہے، ایک بار پلے کر کے دیکھ لیا جائے" اس کے چہرے پر شاطرانہ ہنسی غالب تھی
"تم ایسا نہیں کر سکتے" اس کے پیروں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی۔
"یار! دوست ہوں تیرا، کچھ نہیں ہی لے لوں گا۔" سی ڈی پلیر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ آتش کا غصہ عروج پر تھا۔ اندر کا لاوا اب کنارے پر تھا۔ ایک جھماکے کے ساتھ اس نے زیب پر وار کیا، مگر اس نے بھی خوب مقابلہ کیا۔
"میں نے کہا چھوڑ سی ڈی کو" تب آتش کی نظر ساتھ پڑے پانی کے جگ پر پڑی۔ وہ اس کے ساتھ تنگ و دو کرتے ہوئے پانی کے جگ کے قریب گیا اور ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے سی ڈی پانی میں پھینک دی۔ یہ دیکھ کر زیب کے چہرے پر بارہ بج گئے۔ آتش شاطرانہ ہنسا
"داؤ مجھے بھی چلنا آتا ہے کیا کہا تھا تجھے زیر کرنا مجھے بھی آتا ہے اب تو کوئی ثبوت ہی باقی نہیں رہا، اب کیسے کرے گا بلیک میل؟" اس کے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے۔
"یہ تم نے اچھا نہیں کیا آتش"
آتش کی تمسخرانہ ہنسی فضا میں گونجی۔
"اب اگر میں چاہوں تو یہ جو پیسے تیرے منہ پر مارے ہیں نا! واپس لے لوں، لیکن میں ایسا کروں گا نہیں میری طرف سے بھیک سمجھ کر رکھ لینا" طنز کرتے ہوئے واپس چلا گیا مگر زیب کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔

......☆☆......

"بس اب ایک لفظ نہیں تنگ آ چکا ہوں میں تمہاری باتوں سے اب اگر میرے نام کے خلاف ایک لفظ بھی بولا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا" شائستہ کی یہ نام بدلنے کی تمنا بھی آتش کے غصے کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ہفتہ بھر کی ریاضت اس کے کوئی کام نہیں آئی۔ سب کوششیں پانی کی طرح بہہ گئیں۔
"تم سے برا کوئی ہو بھی نہیں سکتا" عبدالرحمٰن نے کمرے کے باہر سے جواب دیا۔
"میں نے تم سے بات نہیں کی اور تمہیں شرم نہیں آتی کہ چھپ کر کسی کی باتیں سننے میں" آتش نے طنز کیا۔
"مجھے کوئی شوق نہیں ہے، تمہاری باتیں سننے کا۔ بس پاس سے گزر رہا تھا۔"
"تو پھر۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی آتش نے کہا۔
"کیا ہو رہا ہے یہاں؟ اتنی زور زور سے باتیں کیوں کر رہے ہو؟" نانی جان جو کمرے کے پاس سے گزر رہی تھی، ان کی بلند و بالا آواز سن کر کمرے میں آ گئیں۔
"خدا کے لئے اب آپ شروع مت ہو جانا" ان کو دیکھ کر آتش کی پیشانی پر شکن آ گئی۔
"دادی جان سے ایسے بات کرتے ہیں؟" عبدالرحمٰن نے سخت آواز میں کہا۔
"انہی کی تو پٹی پڑھائی ہوئی ہے جو اس دو کوڑی کی لڑکی کی اتنی لمبی زبان ہو گئی کہ مجھ سے اس انداز میں بات کرے۔"
"اس میں دادی جان کا کوئی قصور نہیں ہے" شائستہ نے دھیرے سے کہا۔
"تم چپ رہو آئی بات سمجھ میں؟؟" عقابی نظروں سے دہاڑا۔
"آتش برداشت نام کی شے کا بھی اس دنیا میں وجود ہے۔ اس برداشت نامی شے کو ایک بار اپنانے کی کوشش تو کرو" عبدالرحمٰن نے کہا۔
"اب تم مجھے سکھاؤ گے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کیا نہیں؟ بتاؤ" اس پر ہاتھ اٹھانے کے لئے آگے بڑھا مگر نانی جان نے بیچ بچاؤ کرایا۔
"بس کرو عبدالرحمٰن، جاؤ یہاں سے" نرمی سے کہا۔
اس کے جانے کے بعد بھی اس کا وجود دہک رہا تھا
"آتش ایک بار شائستہ کا کہا مان کر تو دیکھو وہ تمہاری بیوی ہے، تمہارا بھلا چاہتی ہے۔" پیار سے نصیحت کی۔
"خدا کے لئے آپ بھی چلی جائیں یہاں سے" غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا

''میری بات تو سنو!'' نرمی سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔
''میں نے کہا جائیے یہاں سے'' ایک جھٹکے سے ان کا ہاتھ نیچے پچھاڑ کر غرایا۔
اس کی اس حالت کو دیکھ کر زیر لب یہ کہتی ہوئی چلی گئیں۔
''اس کا کچھ نہیں ہوسکتا''
اپنی نئی گرل فرینڈ کے ساتھ وہ سہانی شام کے مزے لے رہا تھا۔ فلک پر سرمئی رنگ کے بادل، ٹھنڈی ہوا، پرندوں کے چہچہانے کی آواز، پھولوں کی دلفریب خوشبو اور خوبصورت حسینہ کا ساتھ آتش کا دل مچلنے کے لئے کافی تھا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اس کی صحبت میں مدہوش تھا۔ آس پاس کیا ہورہا ہے؟ اس کو کچھ خبر نہ تھی۔ آنکھوں سے اس کے وجود کی گرمی کو اپنے جسم کا حصہ بنا رہا تھا۔ وہ ایک کیفے میں بیٹھے تھے۔ جہاں دوسرے لڑکے، لڑکیاں بھی اپنی دل لگی کررہے تھے۔ پھر بھی آتش کا وجود ان سب میں منفرد تھا۔ اس کے تن سے نکلنے والی Cartier Perfume کی مہک سب سے جداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔ وہاں پر موجود دوسری لڑکیاں بھی کن انکھیوں سے بار بار اس کو دیکھ رہی تھیں۔ ہر ایک کا دل اس کی خوبصورتی پر مچل رہا تھا۔ مگر اس کی نظریں صرف ایک چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کے ہاتھوں کا جیسے ہی اس نے بوسہ لیا، وہاں پر موجود ہر لڑکی حسد کا شکار ہوگئی۔ تب ایک رنگ کی آواز نے ماحول میں خلل پیدا کیا۔
''اب کونسی نئی کتھا سنانے کا ارادہ ہے؟'' موبائل کال اٹینڈ کرتے ہی آتش نے ناگوار لہجے میں کہا۔
''اب میں کتھا سناؤں گا نہیں، تمہیں دکھاؤں گا'' دوسری طرف سے آواز آئی۔
''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' چہرے پر سنجیدگی چھاگئی۔
''مطلب تمہیں گھر جاکر معلوم ہوجائے گا''
''جو بھی کہنا ہے صاف صاف کہو، ورنہ میں فون رکھنے لگا ہوں۔ میرے پاس تم جیسے لوگوں کے لئے کوئی فالتو وقت نہیں ہے'' آتش غرایا۔
''ٹائم تو واقعی تمہارے پاس نہیں ہے'' زیب کی شاطرانہ ہنسی فون سے آئی۔
''جو کہنا ہے صاف صاف کہو پہیلیاں بجھانا بند کرو'' اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔
''سننا چاہتے ہو تو سنو سی ڈی۔'' یہ سننے کی دیر تھی کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔
''کیا ہوا؟ سی ڈی کا نام سن کر چونک کیوں گئے؟'' شاطرانہ ہنسی کے ساتھ کہا۔
''کیا بکواس کررہے ہو؟ وہ سی ڈی اس دن میں نے ضائع کردی تھی'' دانت بھینچ کر کہا۔
''مگر شاید تم یہ بھول رہے ہو، میں تمہارا بھی باپ ہوں۔ تم کیا سمجھے میں نے تمہیں اصل سی ڈی دی تھی۔ وہ کاپی تھی اور اسی کی ایک اور کاپی اس وقت تمہاری بیوی کے پاس ہے''
''وٹ؟'' یہ سن کر اس کے اوسان خطا ہوگئے، وہ کھڑا ہوگیا۔
''اتنا چونکنے کی کیا بات ہے؟ ابھی وہ سی ڈی اس کے ہاتھوں میں ہے شاید چلی نہ کی ہو''
''تم ایسا نہیں کرسکتے'' اس کی آواز میں نرمی آگئی
''میں ایسا کرچکا ہوں'' یہ کہنے کے بعد اس نے فون بند کردیا اور اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ پیچھے سے اس لڑکی نے بہت آواز دی لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ ایک عجیب سا ڈر اس پر حاوی تھا۔ اس نے کبھی شائستہ کو بیوی کا درجہ نہیں دیا تھا اور ہزار بار اس کی ذات کو ذلیل کرچکا تھا۔ اس کے سامنے اپنے افیئرز کا تذکرہ کرنا باعث فخر سمجھتا تھا مگر آج اس کے وجود میں ہلچل مچ گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ راز جو اس سی ڈی کی تہوں میں دفن ہے، اس پر آشنا ہو۔ وہ دیوانہ وار بھاگتا جارہا تھا۔ اگرچہ وہ کیفے کار میں گیا تھا۔ مگر اس سی ڈی کی وجہ سے وہ بھول چکا تھا کہ وہ کار میں بھی گھر جاسکتا ہے۔ بھاگتے ہوئے اس کا سانس پھول رہا تھا۔ زندگی میں وہ پہلی بار اتنا پریشان ہوا تھا۔ پہلی بار اس طرح دیوانہ وار دوڑ رہا تھا۔ اس کے وجود میں نہ جانے کیوں ایک عجب سا ارتعاش تھا۔ اس کی طرف اٹھنے والی سوالیہ نظریں، کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ بس بھاگتا جارہا تھا۔ بھاگتے ہوئے دو بار اس کے قدم لڑکھڑائے مگر اس کو پروا نہیں تھی۔ ایک تیز رفتار کار پاس سے گزری اور اس کے جسم پر سڑک پر موجود سیاہ پانی کو اچھالا۔ وہ چھینٹیں اس کے

لباس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کو بھی آلودہ کر گئیں مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کا مقصد صرف شائستہ کو وہ سی ڈی دیکھنے سے روکنا تھا۔ گھر پہنچا تو اس کا جسم تھکن سے ہلکان ہو چکا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی۔ دو گہرے سانس لیے۔ مگر ابھی اسے سیڑھیاں چڑھنی تھیں۔ کمرے میں جانا تھا۔ شائستہ کو سی ڈی دیکھنے سے روکنا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ شرٹ کے بٹن دیوانہ وار بھاگنے کی وجہ سے کھل چکے تھے۔ ماتھے پر مٹی اور کیچڑ کے نشانات تھے۔ بال بکھر چکے تھے۔ آج وہ کسی بھی زاویہ سے آتش نہیں لگ رہا تھا اور وہ آتش ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ آتش حسن پرست تھا جبکہ اس کا وجود پراگندہ تھا۔ اس میں انا تھی جبکہ اس کی حالت عاجزی کو ظاہر کر رہی تھی۔ دروازہ کھولا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ شائستہ سی ڈی دیکھ چکی تھی۔ بیڈ کی بائی کے ساتھ فرش پر بیٹھی اپنی قسمت کو کوس رہی تھی۔ اشک۔ اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ آتش نے دیوار کے ساتھ اس طرح ٹیک لگائی جیسے کوئی معرکہ وہ ہار چکا ہو۔ ایک ملامت اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ زندگی میں پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو نام کی شے نے جنم لیا۔ پہلی بار اسے اپنے آپ سے کوفت محسوس ہوئی۔ پہلی بار اس کی انا اس کو لے ڈوبی۔ وہ حقیقت کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں، اس شخص سے نفرت کا اظہار کر رہی تھیں جو سامنے تھا۔ اس بند مشین کے ڈبے میں، جو بظاہر بے جان تھی مگر اس کی سچائی کا ثبوت بن گئی۔ اس کی ہوس، اس کے سامنے تھی۔ نازو کے ساتھ گزاری گئی اس رات کا ایک ایک پل سی ڈی میں محفوظ تھا۔ اس رات جب وہ شائستہ کو بیابان میں چھوڑ آیا تھا۔ ایک ندامت ایک آنسو۔ ایک پچھتاوا۔ ایک احساس۔ پہلی بار اس کی نظریں شائستہ کے سامنے جھک گئیں۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اس کا سامنا کرے؟ کیسے اس سے نظریں ملائے۔

میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ آتش میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔ میں یہ تو جانتی تھی کہ وہ مجھے اپنی بیوی کا درجہ کبھی نہیں دیں گے مگر ایک آس تھی۔ لیکن وہ سی ڈی دیکھنے کے بعد جیسے وہ آس ہی ختم ہو گئی۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں نے انہیں ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ وہ کبھی میرے نہیں ہو سکتے۔ ایک عورت اپنے شوہر کا ہر ظلم خاموشی سے برداشت کر سکتی ہے۔ اس کے دیے گئے ہر زخم کو سہہ سکتی ہے مگر وہ یہ قطعاً برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا شوہر اس کے علاوہ کسی اور کا دلدادہ ہو۔ اس کے علاوہ کسی دوسری عورت کو اپنی باہوں میں پناہ دے۔ یہ مقام اس کے لئے ایک ذلت سے کم نہیں۔

''کیا ہوا؟ آج اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا؟'' جمال الدین چائے کا کپ ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ شاہین بیگم ابھی تک بستر میں تھیں۔

''کیا ہوا؟ جواب تو دیں'' انہیں صوفے پر بیٹھے چائے کا سپ لیتے ہوئے دو منٹ گزر چکے تھے۔ پہلی بار شاہین بیگم کو ان کی بات کا جواب دینے میں اتنی دیر لگی۔ انہیں شبہ ہوا۔ وہ فوراً اٹھے، چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا اور شاہین بیگم کے سر سے کمبل ہٹایا۔ ان کو چھوتے ہی انہیں حرارت کا احساس ہوا۔

''یہ کیا تمہیں تو بہت تیز ٹمپریچر ہے'' انہیں ان کی فکر ہوئی۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا میڈیسن لی؟'' وہ درد سے کراہنے لگیں

''نہیں'' مدھم سی آواز میں کہا

''چلیں اٹھیں دوائیں پہلے''

......☆☆......

اس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے۔ شبہہ کو اتنے قریب دیکھ کر اس کے لب مسکرا دیے۔ شاطرانہ ہنسی، خونخوار آنکھیں، بارعب چہرے کے ساتھ وہ صوفے پر براجمان تھا۔ اس کے سامنے زیب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کی شرٹ لہولہان تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے پیٹ میں موجود خنجر کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جو بری طرح اس کے وجود کو چھلنی کر چکا تھا۔ جبکہ اس کا دوسرا ہاتھ بے جان ہو چکا تھا۔ اس پر خنجر کے کئی نشانات زخم پیوست تھے۔

''آتش کو للکارنے کا انجام کیسا لگا؟'' اپنے پاؤں مہاراجاؤں کی طرح ٹیبل پر رکھ لیے۔

''تم کیا سمجھے تھے، تم جو چاہو وہ کرو گے اور میں خاموشی سے تمہارے ستم سہوں گا نہیں میں آتش ہوں آتش مجھ سے

ٹکرانا، اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اور تم نے تو میری توہین کی تھی۔ میرا راز افشا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب دیکھو، نہ تم رہو گے، نہ ہی وہ راز!" قہقہہ لگایا۔

"اتنا گھمنڈ۔ اچھا نہیں" آخری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

"اسے گھمنڈ نہیں وقار کہتے ہیں اور بدلہ کہتے ہیں" دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

"ایک دن آئے گا تم پچھتاؤ گے مجھے مار کر تم اتنی" موت دستک دے چکی تھی۔ الفاظ ہوا میں کھو گئے۔ وہ کیا کہنا چاہتا تھا، کہے بغیر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ ہاتھ بے جان ہو گئے۔ یک دم وہاں اندھیرا چھا گیا۔ موسم خراب سے خراب تر ہوتا جا رہا تھا۔ بادلوں کی گرج تیز ہو گئی۔ بجلی کی چمک، اندھیرا کمرے میں موجود ہر شے کو بھیانک انداز میں پیش کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ ایک درندے سے مشابہہ تھا۔ ایک زوردار قہقہے نے ہر شے پر خاموشی طاری کر دی۔

"مجھے دھمکی دینے چلا تھا آتش کو" وہ خونخوار آنکھوں سے اس کے بے جان جسم کو گھور رہا تھا۔

"آتش کو مات دینا تم جیسے دو کوڑی کے لوگوں کا کام نہیں ہے تم جیسے لوگوں کے لیے تو میرے پاؤں کی جوتی ہی کافی ہے" اس کی لاش کو لات مارتے ہوئے پلٹایا۔

"اپنے چہرے کی طرف دیکھ ذرا خون میں لال کر دیا ہے میں نے تو نے میری زندگی کے راز کو افشا کرنے کی کوشش کی تھی نا! اب اس راز کو افشا کر کے دیکھا!" وہ اس کے بے جان جسم کے گرد چکر لگاتے ہوئے مسلسل چلا رہا تھا۔

"اپنی موت کی پہیلی کو سلجھا کر دیکھا ذرا میں بھی دیکھتا ہوں کون کیسے اس بند کمرے میں ہوئے قتل کو کون دنیا کے سامنے لاتا ہے؟ کون اس جرم کا گواہ بنتا ہے؟ کون تجھے انصاف دلاتا ہے؟ افسوس کوئی نہیں ہے۔ کوئی آتش کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرا ایک بال بھی بانکا نہیں کر سکتا۔ تم بھی نہیں" ایک بار پھر قہقہے گونجنے لگے۔ بجلی کی چمک اس کے گھناؤنے فعل کو روشن کر رہی تھی۔ اس کا دہکتا ہوا چہرہ مدھم نیلی روشنی میں شیطانی لگ رہا تھا۔ اس کا وجود اس کے نام کا منہ بولتا ثبوت تھا اور رہی سہی کسر بھی اس نے پوری کر دی۔ وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتے ہوئے کچن میں گیا اور پٹرول کا کین اور ماچس لے کر باہر آیا۔

"ابھی تک تم نے مجھے باہر سے دیکھا ہے لیکن آج میں چاہتا ہوں کہ تم میرے وجود کی ذرا سی جھلک دیکھو۔" یہ کہنا تھا کہ اس نے پٹرول کو اس کے جسم پر چھڑک کر آگ لگا دی۔ بادلوں کی گرج چمک بڑھ گئی۔ نیلی روشنی اور بھڑکتی ہوئی آگ میں اس کا وجود مزید شیطانی لگ رہا تھا۔ وہ اپنی اصل بھول چکا تھا۔ خود کو اس آگ کا حصہ تصور کر رہا تھا۔ اس آگ کے شعلے اس کی آنکھوں میں صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ اس کے قہقہے، طوفانی رات میں گونج رہے تھے۔ آگ نے ارد گرد پڑی اشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے شعلے ہوا میں متحرک ہو گئے۔ سیاہ دھوئیں نے آتش کو اپنے حصار میں لے لیا مگر اس کے چہرے پر شاطرانہ تبسم تھا۔

"اب امی جان کی طبیعت کیسی ہے۔" عبدالرحمن کے گھر لوٹتے ہی شائستہ نے سوال کیا۔ جو پچھلے ایک گھنٹے سے دروازے کو تک رہی تھی۔ عبدالرحمن کے چہرے سے اس کی تھکن کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"ابھی ڈاکٹرز نے ٹیسٹ کیے ہیں۔ رپورٹ آنا باقی ہے۔" صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"میں آپ کے لیے ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئی۔ عبدالرحمن نے ایک گہرا سانس لیا۔ آنکھوں میں غنودگی کا غلبہ تھا۔ پچھلے دو دن سے وہ صحیح طرح سو نہیں سکا۔ ایک رات آتش کو ڈھونڈنے میں صرف ہوئی جو بغیر بتائے کہیں چلا گیا تھا۔ کئی بار اس کا فون ٹرائے کیا مگر جواب موصول نہ ہوا۔ آتش کا اس طرح لاپتا ہونا سب کے لیے باعث فکر تھا۔ اس کی غلط سوسائٹی کی وجہ سے سب کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ جمال الدین نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہ بات شاہین بیگم تک نہ پہنچے مگر ماں کی ممتا سے یہ بات کب تک چھپ سکتی تھی۔ کسی کے بتائے بغیر انہوں نے خود اندازہ لگا لیا کہ آتش گھر پر نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی طبیعت مزید خراب ہو گئی۔ وہ ہمیشہ اسپتال جانے سے کوفت کھاتی تھیں۔ اس بار بھی مزاحمت کی مگر جمال الدین کے آگے

ان کی ایک نہ چلی۔ نمبر بخار کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی بن گئے اور جسم پر سرخ نشانات بھی ابھر آئے۔ آتش کی غیر حاضری میں سارے فرائض عبدالرحمٰن ادا کر رہا تھا۔ شاید آتش سے زیادہ بہتر۔ اب بھی وہ انہیں اکیلا چھوڑ کر آنا نہیں چاہتا تھا مگر جمال الدین نے زبردستی اس کو گھر آرام کے لئے بھیجا۔

"یہ لیجیے چائے" شائستہ کی آواز نے اسے غنودگی سے باہر نکالا۔

"شکریہ!" چائے کا کپ ہاتھ میں لیا مگر نیند اب بھی غالب تھی۔

"چائے پی کر آپ سو جائیں، تھکان کچھ کم ہو جائے گی" اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے شائستہ نے کہا۔

"تھکان تو واقعی بہت ہے" جماہی لیتے ہوئے مزید کہا۔

"مگر مجھے ابھی واپس جانا ہے، اسپتال ڈاکٹر نے کہا ہے دو گھنٹوں میں رپورٹ آجائے گی۔"

"لیکن، آپ کو اپنی نیند بھی پوری کر لینی چاہئے اگر انسان کی ایک رات کی بھی نیند پوری نہ ہو تو سر بوجھل رہتا ہے اور آپ تو مسلسل دو راتوں سے جاگ رہے ہیں" اس نے کہا۔

"بڑوں کے لئے نیند کی قربانی دینی پڑتی ہے۔" ہلکے سے تبسم کے ساتھ جواب دیا اور چائے کے سپ لینے لگا۔

اس کے جواب نے شائستہ کو گہری سوچ میں ڈال دیا۔

"کیا سوچ رہی ہیں آپ؟" شائستہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں بس یہی کہ آتش اور آپ دونوں کزن اور ہم عمر ہیں مگر دونوں کی فطرت ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہے۔ ایک طرف آپ ہیں رشتوں کی خاطر اپنی نیند تک قربان کر رہے ہیں اور ایک طرف وہ جنہیں یہی خبر نہیں کہ ان کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آتش بھی آپ جیسے ہوتے۔" ٹھنڈی آہ بھری۔

"ضروری تو نہیں ہر انسان کی فطرت ایک جیسی ہو۔ ہر انسان کی خو مختلف ہوتی ہے اور جہاں تک آتش کی بات ہے، اب تو آپ بھی اسے اچھی طرح سمجھ چکی ہیں، وہ ایک ایسا شخص ہے جسے اپنے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں آتش کا انجام بھی اس آگ کی طرح نہ ہو جو سب کچھ جلانے کے بعد خود بھی بجھ جاتی ہے۔"

چائے کا خالی کپ میز پر رکھنے کے بعد اس نے صوفے سے ٹیک لگالی۔

"آپ کو تو ڈر لگتا ہے لیکن مجھے تو یقین ہے۔" زیر لب کہا۔

"کچھ کہا آپ نے" اس نے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں بس ایسے ہی دل اداس ہو رہا ہے" چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ سناٹے کی آواز گونجنے لگی۔

"دادی جان سو گئیں؟" اونگتے ہوئے پوچھا۔

"ان کی بھی کچھ دیر پہلے ہی آنکھ لگی ہے" شائستہ نے کہا۔

"اچھی بات ہے سو جائیں کچھ دیر وہ بھی" بوجھل ذہن سے کہا۔

"آپ کا ذہن اب سو چکا ہے اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ آپ بھی سو جائیں" شائستہ نے کہا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں بس اب چلتا ہوں پانچ منٹ میں" بمشکل آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

"میری بات مانیں آپ سو جائیں، میں آپ کو ایک گھنٹے بعد جگا دوں گی۔"

"کیوں؟ آپ نہیں سوئیں گی کیا؟"

نہیں مجھے تھوڑا سا کام ہے اور ویسے بھی میں نے آرام کر لیا تھا۔ اب آپ کریں" چائے کا کپ ٹیبل سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ مجھے سو جانا چاہئے، لیکن یاد سے ایک گھنٹہ بعد جگا دینا۔" اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو شائستہ کی آواز سے رک گیا۔

"سنیے"

"جی۔" وہ پلٹا۔

"آپ ہمارے کمرے میں جا کر آرام کر لیں۔" شائستہ نے کہا۔

"کیوں؟" حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ کے کمرے میں نانی جان سو رہی ہیں۔" وجہ بتائی۔

''لیکن۔'' اس نے کہا۔
''بے فکر رہیں، مجھے ابھی اس کمرے میں کوئی کام نہیں
'' مسکرا کر جواب دیا۔
چہرے پر مسکراہٹ کے ساتھ وہ چل دیا۔
''ڈاکٹر صاحب! آپ بتائیں تو سہی ہوا کیا ہے؟''
جمال الدین نے پوچھا۔
''انہیں ڈینگی ہوا ہے۔'' چلتے ہوئے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی جمال الدین کو ایک جھٹکا لگا مگر ساتھ ہی کھڑے عبد الرحمٰن نے انہیں سہارا دیا۔
''انکل سنبھالیے اپنے آپ کو'' ان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا
''دیکھیے میں آپ کو کسی قسم کے اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں، یہ مرض اب قابل علاج ہے بس آپ کو علاج کے ساتھ ساتھ ان کی احتیاط بھی کرنا ہوگی کیونکہ یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ دوا اتنی اثر نہیں کرتی جتنی احتیاط۔ انسان دوا کھانے سے شفا تو حاصل کر لیتا ہے مگر صحت صرف احتیاط سے ہی ملتی ہے۔'' انہیں حوصلہ دیتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔
''تو کیا ہم آنٹی کو گھر لے جا سکتے ہیں؟'' عبد الرحمٰن نے پوچھا۔
''مگر کیوں؟''
''آنٹی کو اسپتال سے کوفت ہوتی ہے میں نہیں چاہتا کہ یہاں موجود دوسرے مریضوں کو دیکھ کر ان کی طبیعت مزید خراب ہو''
''لیکن''
''آپ بے فکر رہیں، ہم وہاں ان کا اچھی طرح دھیان رکھیں گے اور علاج بھی جاری رکھیں گے''
''جیسے آپ کی مرضی آپ چند پیپرز پر سائن کر دیں، پھر لے جا سکتے ہیں مگر اپنی ذمہ داری پر''
''ٹھیک میں کر دیتا ہوں۔ انکل آپ ادھر رکیں، میں ابھی آتا ہوں'' یہ کہہ کر وہ ڈاکٹر کے ساتھ چل دیا۔
آتش نے دہلیز پر کھڑے ہو کر پورے گھر کا سرسری طور پر جائزہ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ دیر بعد اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو جائے گی۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح ان کو ہینڈل کرنا جانتا تھا۔ شائستہ کو کام کرتا دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا مگر اس نے کوئی پروا نہیں کی۔ اپنے کام میں مصروف رہی۔
''باقی سب کہاں ہیں؟'' سخت لہجے میں پوچھا۔
''امی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، ابو جان اور عبد الرحمٰن انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں جبکہ نانی جان اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔'' بے دھیانی سے جواب دیا۔
''ٹھیک'' بے رخی سے جواب دیا۔
''اگر برا نہ مانیں تو یہ بات پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کہاں تھے دو دن؟'' کام چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔
''آج ابو نے سوال نہیں کیے تو تم کر رہی ہو، کس حق سے کر رہی ہو؟''
''آپ کی بیوی کے حق سے''
''بکواس بند کرو اور میرے لیے چائے بنا کر لاؤ'' یہ کہہ کر وہ کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی مگر کچھ الگ سا تھا۔ ایک الگ سی خوشبو اس کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اس خوشبو کو پہچانتا تھا۔ وہ پلنگ کی طرف بڑھا، مہک میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ اس نے کمبل اٹھایا اور اسے سونگھا۔ اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا۔ یہ خوشبو صرف عبد الرحمٰن استعمال کرتا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔
''شائستہ'' وہ چلایا اور غصے میں کمبل پلنگ سے کھینچ کر پھینکا۔ اس کے بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ٹیبل لیمپ کو اٹھایا اور آئینہ پر اپنا نشانہ باندھا۔ آئینہ کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ اپنا غصہ کمرے میں موجود ہر شے پر اتارنے لگا۔
''شائستہ'' وہ آگ بگولا ہو کر وہ چلایا۔
شائستہ بھاگتی ہوئی وہاں آئی اور کمرے کی یہ حالت دیکھ کر اس کے قدم دروازے پر ہی رک گئے۔ ہر شے بکھری پڑی تھی۔ آتش کا غصہ ساتویں آسمان پر تھا۔ جس کی تپش وہ کمرے کے باہر سے محسوس کر سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود چائے کا کپ گر گیا۔ کپ کے ٹوٹنے کی آواز جیسے ہی آتش کے کانوں میں گئی، اس نے دہکتی آنکھوں سے شائستہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک خوفناک درندے کی مانند وہ اس کی طرف لپکا اور اس کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے پلنگ پر پٹخ دیا۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" وہ کچھ سمجھ نہیں پائی کہ وہ اس کو کس غلطی کی سزا دے رہا تھا۔
"مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ یہ بتاؤ تم نے کیا کیا؟" عقابی نظروں سے غرایا۔
"کیا کیا میں نے؟" اس نے اپنے بالوں کو جو چہرے کے سامنے آگئے تھے، ہٹاتے ہوئے پوچھا۔
"مجھ سے پوچھتی ہو اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں کسی اور کے ساتھ رنگ رلیاں منا کر مجھ سے پوچھتی ہو" دانت بھینچتے ہوئے اس کا چہرہ بری طرح نوچا۔ اپنی ذات پر لگے بے بنیاد الزام کو سن کر اس کی آنکھوں سے اشک بہہ نکلے۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"وہی کہہ رہا ہوں جو سچ ہے تمہیں شرم نہیں آتی، شادی شدہ ہوتے ہوئے، کسی دوسرے کی باہوں میں جاتے ہوئے" اس کے چہرے کو نوچتے ہوئے اس کا سر پلنگ کی بائی پر پٹخ دیا۔ اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا" اشک بہاتے ہوئے کہا۔
"اب انجان بن رہی ہو جب میں نے تمہیں دھتکار دیا تو کسی اور کے ساتھ راتیں بتانا شروع کر دیں" غصہ میں وہ بالکل پاگل ہو چکا تھا۔ اس کو بازوؤں سے بری طرح نوچ کر کھڑا کیا۔
"رنگ رلیاں منانے کا زیادہ شوق ہے تمہیں؟ بتاؤ" دانت بھینچتے ہوئے پوچھا۔
"خدا کے لئے مجھ پر اتنا گھناؤنا الزام مت لگائیں" وہ اشک بہاتے ہوئے اس کے آگے منت سماجت کرنے لگی۔
"میں الزام لگا رہا ہوں میں یہ دیکھو کیا ہے یہ" پلنگ کی چادر کو اٹھایا اور اس کو ہاتھوں میں تھماتے ہوئے مزید کہا۔
"سونگھو اس کو، کس کی خوشبو آرہی ہے اس سے سونگھو" وہ چلایا مگر وہ سسکیاں بھرتی رہی۔
"یہ ہوگو باس کی خوشبو ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو میں یہ خوشبو استعمال نہیں کرتا، میں کیا پورے گھر میں کوئی استعمال نہیں کرتا سوائے ایک انسان کے" اس کو دھکیلتے ہوئے دیوار تک لے گیا۔
"اے آر کے" وہ ننگے پاؤں تھی۔ اس دھکم پیل میں اس کے پاؤں شیشے کے ٹکڑوں سے زخمی ہو گئے۔ خون نے اس کے پاؤں رنگ دیئے۔ کمرے میں ہر جگہ اس کے پاؤں کے نشانات پیوست ہو گئے مگر آتش کو سب سے انجان تھا۔ اس کے نزدیک صرف اپنی انا پیاری تھی۔
"نہیں آپ غلط سمجھ رہے ہیں" سسکیاں بھرتے اس نے جواب دیا۔
"میں غلط سمجھ رہا ہوں میں آتش غلط سمجھ رہا ہے" اس نے کچھ فاصلہ پر جا کر ایک گہری سانس لی اور پھر قدرے آہستہ پوچھا۔
"وہ اس کمرے میں آیا تھا یا نہیں" ہاتھ سے اشارہ کیا۔
"میری بات" وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پائی۔
"ہاں یا ناں" اس نے مداخلت کی۔
"مگر" سسکیاں بھرتے کہا۔
"ہاں یا ناں" وہ غرایا۔
"ہاں" اشک بہاتے جواب دیا۔
"اس بیڈ پر وہ سویا تھا یا نہیں" اس کی نظریں پہلے سے زیادہ خونخوار ہو گئیں۔
"میری بات تو" ایک بار پھر وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پائی۔
"ہاں یا ناں میں جواب دو" دہکتی آنکھوں سے اس کے وجود کو دیکھا۔
"ہاں ہاں ہاں وہ اس کمرے میں بھی آیا تھا اور اس بیڈ پر بھی سویا تھا مگر" اس نے پہلی بار آتش کے سامنے اونچی آواز میں کہا مگر اس بار پھر اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی آتش نے مداخلت کی۔
"اب بس ایک لفظ بھی اور نہیں وہ اس کمرے میں آیا میرے بیڈ پر سویا۔ اس کے پرفیوم کی خوشبو میری چادر میں سمائی ہوئی ہے اور تم کہتی ہو کہ تم نے کچھ نہیں کیا" وہ چلایا۔
"خدا کے لئے آپ ایک بار میری بات تو سنیں" وہ اس کے آگے منت سماجت کرنے لگی۔ اس کے قدموں میں گر کر عاجزی کا مظاہرہ بھی کیا۔ اشکوں سے اس آگ کی تپش کو کم کرنے کی بھی کوشش کی مگر وہ آگ تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ تب آتش کی نظر سرہانے

کے قریب لال رنگ کی چوڑیوں کے ٹکڑوں پر پڑی۔ وہ آگ بگولا ہو چکا تھا۔ اس کے قریب گیا اور ان ٹکڑوں کو اٹھایا اور شائستہ کے قریب لایا۔

''تم کبھی ہونا کہ تم بے قصور ہو تو پھر یہ چوڑیوں کے ٹکڑے سرہانے کیا کر رہے ہیں'' اس نے پوچھا۔ ایک پل کے لئے وہ خیالوں کی دنیا میں گم ہو گئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ جس وقت وہ عبدالرحمن کو اٹھانے آئی تھی تو اس کے جانے کے بعد بیڈ کی چادر جھاڑتے ہوئے اس کا ہاتھ بائی سے ٹکرایا اور چوڑیاں ٹوٹ گئیں

''جیسا آپ سمجھ رہے ہیں، ویسا کچھ نہیں ہے یہ تو'' سسکیاں پہلے سے کم ہو گئیں۔

''کتنا جھوٹ بولو گی تم مان کیوں نہیں لیتی کہ تم اس کے ساتھ ساری رات رنگ رلیاں مناتی رہی اور اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے یہ کمبل جس سے اس منحوس شخص کی خوشبو آرہی ہے، اور اس سے بھی بڑا ثبوت ہے یہ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں یہ چوڑیاں ویسے ہی نہیں ٹوٹتی، جب تک کہ کوئی کسی کے ساتھ'' وہ اس پر ایک سے بڑھ کر ایک الزام لگاتا جا رہا تھا۔ اس کے وجود کو پامال کیا جا رہا تھا۔ اس پر وہ عیب لگا رہا تھا جو اس میں موجود ہی نہیں تھا۔ وہ ایسا کرتا تو دور کی بات سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک خاوند چاہے اپنی بیوی سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ کر لے مگر ایک عورت بھی دوسرے مرد کا خیال اپنے ذہن میں نہیں لاتی۔ وہ دنیا کے طعنے تو سہہ سکتی ہے مگر ایک عورت کے نزدیک وہ وقت قیامت صغریٰ کے مترادف ہوتا ہے جب اس کا شوہر اس کی پاکدامنی پر انگلی اٹھائے۔ اس کے کردار پر شک کرے۔ اسکی نیت پر شک کرے۔

''مجھے تو یہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ تم'' اس کو دیوار کی طرف دھکیلتے ہوئے غرایا۔

''بس بہت الزام تراشی کر لی آپ نے، بہت سن لی میں نے آپ کی من گھڑت کہانیاں، سچ کا ایک پہلو جان کر آپ کیسے میرے کردار پر انگلی اٹھا سکتے ہیں؟ کیسے میرے کردار کو شک کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں؟ شرم آپ کو مجھ پر نہیں، اپنے آپ پر آنی چاہیے۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی کیسے دوسری عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں۔ کیسے ان کے پہلو میں اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ جب آپ کا اپنا کردار ٹھیک نہیں تو مجھ پر انگلی اٹھانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔'' اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اب اس کے طعنے جو حقیقت میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے تھے، مزید نہیں سہہ سکتی تھی۔ اسی لئے اس نے اس کے ہر الزام کو غلط قرار دے دیا۔

''شائستہ'' اس کا دہکتا وجود اپنے خلاف ایک لفظ بھی سننے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ جب شائستہ نے اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔

''کیوں سچ کڑوا لگا کیا؟ آج تک میں خاموش رہی۔ میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں کہا۔ آپ میرے ساتھ کیا رویہ رکھتے ہیں، کبھی کچھ نہیں کہا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ میرے کردار کو بھی داغ دار کر سکتے ہیں۔ ایک عورت سب الزام سہہ سکتی ہے مگر وہ یہ الزام نہیں سہہ سکتی کہ کوئی اس کے کردار کو نشانہ بنائے، اس میں چاہے اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔'' وہ اپنی پاکدامنی کی گواہی دے رہی تھی۔

''بہت زبان نکل آئی ہے تمہاری اب ایک لفظ بھی بولا تو زبان نکال کر پھینک دوں گا'' اس کے شانوں کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

''اب آپ میری جان بھی لیں نا تب بھی مجھے سچ بولنے سے نہیں روک سکتے'' اشک بن بلائے مہمان کی طرح بہتے جا رہے تھے۔

اس کا وجود آگ بگولہ ہو چکا تھا۔ شائستہ کا اسے آئینہ دکھانا اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس کی آنکھیں اس رات کی طرح دہک رہی تھیں، جس رات اس نے زیب کا قتل کیا تھا۔ وہ اسے بھی قتل کر دینا چاہتا تھا مگر یہ سزا اس کے لئے بہت کم تھی وہ اس سے بھی بڑھ کر سزا دینا چاہتا تھا۔ اس کی ابھرتی سسکیاں، اس کے اندر کی درندگی کو ہوا دے رہی تھیں۔ نام کا اثر اس پر غالب ہو چکا تھا۔ وہ نفرت کی آگ میں اسے جھلسانا چاہتا تھا۔ اسے تڑپتا دیکھ کر اپنے من کی آگ کو بجھانا چاہتا تھا مگر اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیسے تکلیف پہنچائے، کیسے اپنے اندر ٹھاٹھیں مارتے آگ کے سمندر کو راحت پہنچائے۔ وہ غیر دانستہ طور پر واش روم میں

گیا اور تیزاب کی بوتل اٹھا کر اس کے پاس لایا۔
''یہ آپ کیا کر رہے ہیں پیچھے ہٹئے'' وہ دروازے کی طرف لپکی مگر اس کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت نے اسے وہیں روک لیا۔ وہ چیخ چیخ کر مدد کے لئے پکارتی رہی مگر گھر میں کوئی نہیں تھا۔ نانی جان بھی اُس وقت بازار چلی گئی تھیں جب وہ آتش کے لئے چائے بنا رہی تھی۔ آنسوؤں کا نہ رکنے والا تسلسل شروع ہو گیا۔ اسے یوں تڑپتا دیکھ کر اس کے دجود کو ٹھنڈک ملنے لگی۔ اس کے آنسو اس کی آگ کو بجھا رہے تھے مگر آگ بہت پھیل چکی تھی۔ یہ آنسو ناکافی تھے۔ اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا تو اس کا دھواں شائستہ کو چبھنے لگا۔
''پلیز ایسا مت کریں پلیز'' کھانستے ہوئے اس کی آنکھوں سے اشک مسلسل رواں تھے۔ وہ مسلسل آہ وزاری کر رہی تھی۔ مگر اس بے حس انسان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے ایک بوند تیزاب اس کے نرم و نازک ہاتھوں پر گرایا۔ جو کچھ دیر پہلے خون میں رنگے ہوئے تھے۔ اس آگ کی لپیٹ میں آگئے۔
''آتش۔'' درد بھری آواز اس کے حلق سے نکلی۔ آنسو بھی یک بعد دیگرے اپنا راستہ بنا رہے تھے۔ اسے یوں تڑپتا دیکھ کر وہ پاگلوں کی طرح ہنستا جا رہا تھا۔ کمرے میں ماتم سا سماں تھا مگر وہ اپنی شیطنیت میں مست تھا۔ وہ مسلسل مزاحمت کر رہی تھی مگر اس کی گرفت سے نکلنا محال ہو چکا تھا۔ اس نے دوسری بوند گرانے کے لئے بوتل کو ترچھا کیا۔
''نہیں آتش نہیں۔'' وہ مسلسل مزاحمت کر رہی تھی۔ مگر اسے ترس نہ آیا مگر شاید قدرت کو اس پر ترس آ گیا۔ مسلسل مزاحمت میں اچانک اس کا ہاتھ بوتل سے ٹکرایا اور ساری بوتل نیچے گر گئی اور چند قطرے اُچھل کر آتش کے پاؤں پر پڑے۔ کرب کی وجہ سے وہ چلایا۔
''آتش آپ ٹھیک تو ہیں نا!'' ایک بار پھر بیوی کے ہاتھوں ایک عورت ہار گئی۔ کچھ دیر پہلے جو شخص اس کے وجود کو تکلیف پہنچا رہا تھا، اس کو تکلیف میں دیکھ کر وہ اپنے زخم بھول گئی۔ کچھ دیر پہلے جو اپنے زخموں کی وجہ سے تڑپ رہی تھی، اب اپنے سہاگ کے تڑپتے ہوئے وجود کو دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے واش روم میں گئی اور ایک بالٹی میں ٹھنڈا پانی لے کر آئی اور اس ٹھنڈے پانی کے ذریعے اس کے وجود کی تڑپ کو کم کرنے کی کوشش کی۔
''بھابھی! یہ ہاتھ کیسے جلا آپ کا؟'' وہ شاہین کے لئے سنگترے کا جوس لے کر آئی تو اس کا دوپٹہ اس کے ہاتھوں سے سرک گیا اور جلے کا نشان عبدالرحمٰن پر عیاں ہو گیا۔
''بس ویسے ہی کھانا۔ پکاتے۔ ہوئے جل گیا تھا'' لرزتے لبوں سے جواب دیا۔
''یہ نشان آگ سے جلنے کا تو نہیں ہے'' عبدالرحمٰن نے کہا۔
''مجھے دکھاؤ ذرا!'' نانی جان نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
''نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے، بس تھوڑا سا جلا ہے۔ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا'' اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔
''مجھے کچن میں کچھ کام ہے۔ میں چلتی ہوں'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی مگر عبدالرحمٰن کو شک ہو چکا تھا۔
''دادی جان کچھ تو ہوا ہے، آتش اور بھابھی کے درمیان، صبح آتش بھی لڑکھڑاتے ہوئے چل رہا تھا اور اب بھابھی بھی کچھ چھپا رہی ہیں'' اس کے جانے کے بعد کہا
''تم پریشان مت ہو سب ٹھیک ہے'' شاہین بیگم نے تسلی دیتے ہوئے آتش کی حمایت کی۔
''اللہ کرے ایسا ہی ہو'' دادی جان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
آتش کے لئے اس کے دل میں جو احساس جنم لے رہا تھا۔ آج وہ پوری طرح ختم ہو چکا تھا۔ جس طرح آتش اس کے وجود سے گھن کھاتا تھا بالکل اسی طرح اسے بھی اس کے وجود سے گھن آنے لگی تھی۔ آتش کے ساتھ زندگی گزارنا اب صرف ایک مجبوری تھی۔ جسے وہ اب ہمیشہ نبھائے گی۔ مرتے دم تک۔
''رکو، مجھے تم سے بات کرنی ہے'' جیسے ہی جمال الدین کمرے سے باہر نکلے تو آتش کو دیکھ کر کہا۔
''جی کہیے'' بے رخی سے جواب دیا۔
''تمہارے اندر شرم نام کی چیز بھی ہے یا نہیں تمہاری ماں پچھلے تین ہفتوں سے بیمار پڑی ہے مگر تم نے ایک بار بھی اس کے پاس جا کر اس کی خیریت دریافت کی؟''

دھیرے الفاظ میں وہ اس کی سرزنش کر رہے تھے، اس غرض سے کہ شاید ان کی بات اس پر اثر کر جائے۔

"Come on, Dad, just chill, mom will be fine soon!" اس نے مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"تمہارے لہجے کو کیا ہوا ہے؟ کس طریقے سے بات کر رہے ہو" انہیں اس کے چہرے پر تسلی بخش اثرات ناگوار محسوس ہوئے۔

"انگلش سمجھ میں نہیں آتی کیا؟ ؟" اس نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔

"میں تمہاری زبان کی نہیں تمہارے لہجے کی بات کر رہا ہوں۔ تم بے حس تو تھے مگر اتنے مصروف کب سے ہو گئے کہ تمہارے پاس اپنی ماں کے لئے ہی وقت نہیں ہے۔ اس ماں کے لئے جس نے تمہاری ہر چھوٹی سے چھوٹی غلطی کو معاف کیا۔ اس ماں کے لئے آج تمہارے پاس ٹائم نہیں ہے؟" انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"پلیز اب اپنا بھاشن شروع مت کر دینا۔ میں کسی بھاشن سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"آتش آتش سنبھل جاؤ خدا کے لئے سنبھل جاؤ ہم بیگانے نہیں ہیں، تمہارے اپنے ہیں۔ تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔" ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

"پلیز اب آپ رونا مت شروع کر دینا۔ ویسے بھی مرد کی آنکھ میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔" ناگوار لہجے میں کہا۔

"کاش تم ان آنسوؤں کے پیچھے چھپے ڈر کو پہچان پاتے کاش کاش تم ہماری حالت کو سمجھ پاتے، اگر سمجھ لیتے تو تم یہ الفاظ بھی نہ بولتے۔ ایک باپ کی آنکھ سے آنسو صرف اسی صورت میں نکلتے ہیں جب اس کی اولاد اس کے سامنے ہوتے ہوئے بھی اس کی نہیں ہوتی۔ ایک باپ ہر غم کو اپنے دل میں دفنا سکتا ہے مگر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک اس کا بیٹا اپنی ماں کی توہین کرے یہ برداشت نہیں کر سکتا" درد بھرے لہجے میں کہا۔

"میں نے کون سی توہین کر دی اب میں سات، آٹھ سال کا بچہ نہیں ہوں جو ہر وقت آپ مجھ پر نصیحتوں کی پوٹلی نچھاور کرتے رہتے ہیں۔" شانے اچکاتے ہوئے چلایا۔

آتش کی آواز اس قدر بلند تھی کہ شاہین بیگم کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کمرے میں بھی آتش اور جمال الدین کی آواز صاف سن سکتی تھی۔

"والدین کی نظر میں اولاد کبھی بڑی نہیں ہوتی۔ تم ہمارے لئے جیسے پچیس سال پہلے تھے، ویسے ہی آج ہو۔ تم کل بھی ہماری روح کا حصہ تھے، آج بھی ہو" قدرے پیار سے کہا۔

"تو؟ میں کیا کروں؟" پیشانی پر شکن آ گئے۔

"کچھ تو ہماری حالت پر رحم کرو لوگوں کے جب بیٹے جوان ہوتے ہیں، تو ان کے اندر ایک آس پیدا ہو جاتی ہے کہ اب ان کے بڑھاپا سکون کا ساتھ گزر جائے گا۔ ان کا بیٹا ان کے لئے شفقت کے بازو ہمیشہ پھیلا کر رکھے گا۔ ان کی ہر ضرورت کو بالکل اسی طرح بن کہے بجا لائے گا جیسے وہ ان کے بچپن میں بجا لاتے تھے۔ خدا کے لئے اگر تم ہمارا اس طرح خیال نہیں رکھ سکتے تو کم سے کم ہماری زندگی کو پہاڑ بھی مت بناؤ"

"آپ چاہتے کیا ہیں مجھ سے؟ یہی کہ میں دن رات آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہوں۔ بکریوں کی طرح میں میں کرتا رہوں؟؟" منہ بنا کر مزید کہا۔

"مجھ سے یہ سب فارمیلیٹیز نہیں پوری کی جاتیں۔ میں جیسا ہوں، ویسا ہی نظر آتا ہوں۔ دوسروں کی طرح نہیں، اندر کچھ باہر کچھ"

"تمہیں یہ سب فارمیلیٹیز لگتی ہیں؟ والدین کے لئے دو بول پیار کے" ان کا انداز استفہامیہ تھا۔

"ہاں اور پلیز آئندہ میرے راستے میں آکر مجھے ٹوکیے گا مت" وہ جیسے ہی جانے لگا تو کچھ سوچتے ہوئے پلٹا۔

"اور جہاں تک امی کی طبیعت کا سوال ہے۔ میرے تیمارداری کرنے سے وہ ٹھیک تو ہو نہیں جائیں گی مرض اپنے ٹائم پر ہی جائے گا اور ویسے بھی اگر ان سے ڈینگی مجھے ہو گیا تو" شانے اچکاتے ہوئے باہر چلا گیا۔

اس کے آخری بول جمال الدین کے دل پر تیر کی طرح لگے۔ ایک بیٹا اپنی ماں کے لئے ایسا بول سکتا ہے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے مگر ان کو ضبط کرتے ہوئے پلٹتے تو

دروازے کے ساتھ شاہین بیگم کو کھڑا پایا۔ پہلی بار انہوں نے شاہین بیگم کی آنکھوں کو پرنم دیکھا وہ بھی اس بیٹے کے لئے جو شاید ان کا بھی تھا ہی نہیں۔ اس کو دیکھتے ہی جمال الدین کی آنکھیں بھی اپنا ضبط کھو بیٹھیں۔

لان میں وہ چہل قدمی کرتے ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ فضا میں ایک خاموشی طاری تھی جو بیل کی آواز نے متاثر کر دی۔ وہ چہل قدمی کرتے ہوئے دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور پھر اسے نیچے پھینک کر پاؤں سے کچل دیا۔ اس کے منہ سے ابھی بھی دھوئیں کے بادل فضا میں شامل ہو رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہاں ایک نوجوان لڑکا ریڈ کلر کی ہاف بازو ٹی شرٹ پہنے کھڑا تھا۔ جس کے عین وسط میں انگلش کے تین الفابیٹ لکھے تھے۔ ٹی سی ایس۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا جنہیں وہ فوراً سمجھ گیا۔

”آتش کے لئے ایک لیٹر ہے“ اس نے تبسم کے ساتھ کہا۔

”جی۔ میں ہی ہوں آتش“ اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی اس نے کہا۔

”یہاں سائن کر دیں“ اپنے ہاتھ میں موجود ایک کاغذ اور ایک چھٹی اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ آتش نے اس سے دونوں چیزیں لیں اور کاغذ پر اپنے سائن کرنے کے بعد واپس کر دیا اس سے پہلے کے وہ کچھ مزید کہتا آتش نے دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند کر دیا۔ وہ پلٹا اور حیرت سے اس لیٹر کو دیکھنے لگا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ چھٹی کس نے بھیجی۔ دیکھنے میں صرف ایک کاغذ تھا۔ کوئی ڈاکومنٹس تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کا اضطراب بڑھتا گیا۔ مزید کچھ سوچنے کی بجائے اس نے لفافے کو کنارے سے پھاڑا۔ اندر سے ایک کاغذ باہر نکالا۔ بالکل صاف شفاف کاغذ تھا۔ اسے وہاں کچھ لکھا ہوا نظر نہیں آیا۔ اس کی حیرت میں اضافہ ہو گیا مگر جونہی اس نے کاغذ کو پلٹا اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کے چہرے کے تاثر یک دم تبدیل ہو گئے۔ وہ کاغذ اس کے ہاتھوں سے نیچے گر گیا۔ وہ کاغذ ہوا کے پروں پر سوار ہو کر زمین پر آنے لگا۔ مگر اس کے ہاتھ ابھی بھی ہوا میں معلق تھے۔ کاغذ نے ایک پل کے لئے اس کے قدموں کا بوسہ لیا اور پھر پلٹ کر زمین بوس ہو گیا۔ نیلی روشنائی سے خوشخطی سے اس پر لکھا ہوا تھا۔

”اب تمہارا کھیل ختم ہونے والا ہے آتش“

شائستہ کچن میں شاہین بیگم کے لئے انڈا بنانے کے لئے داخل ہوئی۔ ریفریجریٹر سے دو انڈے نکالے اور چولہے کے پاس لا کر رکھ دیے۔ الماری کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اپنے بکھرے بالوں کو باندھا اور وہاں سے ایک پیالی نکال کر شیلف پر رکھی۔ اتنے میں وہاں عبدالرحمٰن پانی پینے آیا اور شیلف کے اوپر بیٹھتے ہوئے پانی مانگا۔ شائستہ نے خاموشی سے پانی لا کر دیا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”آپ ہمیشہ سے اتنی کم گو ہیں؟“ اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”شاید“ روایتی جواب دیا۔

”اگر برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟“ پانی پینے کے بعد گلاس شیلف پر رکھ دیا اور بچوں کی طرح ٹانگیں ہلانے لگا۔

”جی پوچھیں“ تیل کے گرم ہونے کی آواز آنے لگی۔

”آتش اور آپ کے درمیان کچھ ان بن چل رہی ہے نا“ یہ سننے کی دیر تھی کہ اس کے ہاتھ میں موجود پانی کا جگ گر گیا۔

”خیال سے بھابھی“ شیلف سے اترا اور جگ اٹھایا۔

”میں ٹھیک ہوں آپ چھوڑ دیں، میں کر لوں گی“ اس کے لب ہکلانے لگے۔

”پہلے تو مجھے شک تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو چل رہا ہے آپ دونوں کے درمیان۔ بتایئے مجھے، کیا کہا آتش نے آپ سے“ جگ کو شیلف پر رکھ دیا۔ وہ انڈہ پھینٹنے لگی۔

”کچھ بھی تو نہیں سب ٹھیک ہے“ اس نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن مجھے ایسا نہیں لگتا، میں آپ کی نظروں میں صاف صاف اس شخص کے لئے ڈر دیکھ سکتا ہوں۔ آپ کیوں اس سے ڈرتی ہیں، وہ انسان ہے کوئی جلاد نہیں۔ جو آپ کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ کوئی بات ہے تو مجھے بتایئے، ہو سکتا ہے اس کا حل میرے پاس ہو۔“ اس کی

طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''نہیں کہانا'' اس کے بال اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔
''یہی بات میری طرف دیکھ کر کہیں'' اس نے شائستہ کو شانوں سے پکڑ کر اپنی طرف کیا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے دروازے کو تکنے لگی۔ عبدالرحمٰن نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں آتش کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ شائستہ کے شانوں سے پیچھے کیے۔ آتش غصے میں آگے بڑھا
''تمہاری ہمت کیسے ہوئی، میری بیوی کو چھونے کی؟
''جبڑے بھینچتے ہوئے آگے بڑھا۔
''دیکھو آتش'' اس سے پہلے کے وہ کچھ کہہ پاتا آتش نے نے اس کو جھٹکا دیا۔
''ذلیل انسان، میری بیوی کو چھونے کی ہمت کیسے ہوئی تیری؟'' دیوار کی طرف جھٹکا دیا۔
''آتش چھوڑیے انہیں'' شائستہ نے مداخلت کی۔
''تم اپنی بکواس بند کرو تمہیں تو میں بعد میں دیکھتا ہوں'' اسے شیلف کی طرف دھکیل دیا۔
''پہلے اسے تو دیکھ لو، بے غیرت انسان کو اپنی بھابھی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے شرم نہیں آئی اسے
''اس دن کا غصہ وہ اپنے اندر دبائے ہوئے تھا اور موقع کی تلاش میں تھا کہ کب وہ اپنے اندر ٹھاٹھیں مارتے لاوا کو باہر نکالے۔ آج اسے موقع مل گیا تھا۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس اپنے ہاتھوں اور لفظوں کے ذریعے باہر نکال رہا تھا
''بس آگے ایک لفظ نہیں'' اپنے اوپر لگا بے بنیاد الزام اسے طیش میں لے آیا۔ اس نے عقابی نظروں سے آتش کی طرف دیکھا۔
''مجھے آنکھیں دکھاتا ہے مجھے آتش کو تو جانتا نہیں ہے مجھے'' اس کا گریبان پکڑتے ہوئے جھپٹا۔
''تمہیں جاننا بھی نہیں چاہتا میں اتنی پچ سوچ تم جیسے گھٹیا انسان کے دل میں ہی آسکتی ہے۔''
''مجھے گھٹیا کہتا ہے مجھے'' اسے دیوار کے ساتھ دے مارا۔
''گھٹیا میں نہیں گھٹیا تو ہے'' اس کے گریبان کو پکڑ کر نوچا۔

''پہلے میری بیوی کے ساتھ رات رات بھر رنگ رلیاں مناتا ہے اور پھر دن دھاڑے اس کے ساتھ رومانس کرتا ہے'' جبڑے بھینچتے ہوئے کہا۔
یہ سن کر عبدالرحمٰن کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔
''دیکھو، میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں وہ آپ کی غلط فہمی تھی۔'' ایک بار پھر اس نے مداخلت کی مگر آتش نے اس کی بات سننے کی بجائے اسے چولہے کی طرف دھکیل دیا اس کا ہاتھ گرم پین سے جا ٹکرایا۔
''آہ'' دردبھری آواز نکلی۔
''آتش'' عبدالرحمٰن نے اس کو پیچھے جھٹکا دیا اور نبی الفور شائستہ کا ہاتھ پکڑا۔
''بہت درد ہو رہا ہے، اپنی محبوبہ کو یوں سسکتے دیکھ کر'' غصے میں غرایا۔
جمال الدین اور نانی جان شور وغل کی آواز سن کر کچن میں آموجود ہوئے۔
''کیا ہو رہا ہے یہاں؟ اتنا شور کیوں مچا رکھا ہے'' جمال الدین نے پوچھا۔
نانی جان اور جمال الدین کو وہاں دیکھ کر شائستہ نے اپنا حلیہ درست کیا۔ عبدالرحمٰن نے بتانے کے لئے اپنے لب ہلائے۔
''انکل'' مگر شائستہ نے مداخلت کی۔
''کچھ نہیں ابو جان بس، انڈا ابناتے ہوئے ہاتھ جل گیا تھا۔'' عبدالرحمٰن کو ہاتھ کے اشارے سے سچائی بتانے سے روکا۔
''اور تم کیا کر رہے ہو آتش یہاں'' نانی جان نے پوچھا مگر اس کی آنکھیں اب بھی دہک رہی تھیں۔ اس کے اندر کا لاوا اب بھی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔
''عجیب لڑکا ہے۔ بیوی کا ہاتھ جلا اور اسے کچھ پرواہی نہیں'' نانی جان نے کہا۔
''اگر پرواہوتی تو آج وہ آتش نہ ہوتا'' بے بسی سے جمال الدین نے کہا۔
''بیٹا تم بہو کو کریم لا کر دے دو کچھ فرق پڑ جائے گا'' جمال الدین اور نانی جان کچن سے باہر آگئے۔ ان کے جانے کے بعد عبدالرحمٰن نے استفہامیہ انداز میں شائستہ کی

طرف دیکھا۔

"آپ جائیے۔ میں خود مرہم لگالوں گی" یہ کہہ کر اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھنے کی ناکام کوشش کی۔

"اتنا سب کچھ ہوگیا اور آپ نے کسی کو بتایا ہی نہیں اور اب آپ نے انکل اور دادی جان کو سچائی بتانے سے کیوں روکا؟" وہ گویا۔

"سچائی بتانے سے کیا ہوتا؟ آتش کے غصے میں مزید اضافہ ہوجاتا" بنا دیکھے جواب دیا۔

"مگر وہ آپ کے کردار پر بے بنیاد الزام لگا رہا تھا کم سے کم آپ کو اپنی عزت نفس کے لیے تو لڑنا چاہیے تھا نا یوں خاموش رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" اسے اس کی حالت پر ترس آرہا تھا۔

"ہنہ اب تو عادت ہوگئی ہے۔ بے بنیاد الزام سہنے کی" طنزیہ کہا۔

"وہ شخص آپ کی پاک دامنی پر الزام لگا رہا تھا" اس نے بات پر زور دیا۔

"شاید آپ کو اس لیے برا لگ رہا ہے کہ آتش نے آپ کے کردار پر بھی انگلی اٹھائی۔ ان کی طرف سے میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معذرت کرتی ہوں۔" اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں آپ کو نہ ہی ہاتھ جوڑنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی معافی مانگنے کی" اس کے ہاتھوں کو نیچے کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے اپنی کوئی پروا نہیں۔ میں تو ایک دو دن کا مہمان مزید ہوں۔ اس کے بعد چلا جاؤں گا مگر آپ اس کے ساتھ کیسے ساری زندگی گزار سکتی ہیں؟"

"جیسے شادی کی پہلی رات سے گزار رہی ہوں۔" طنزیہ کہا۔

آتش فریش ہونے کے بعد سفید بنیان اور ٹراؤزر پہنے واش روم سے باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تولیہ تھا۔ پانی کے قطرے اب بھی اس کے گیلے بالوں سے ٹپک رہے تھے جنہیں وہ تولیہ سے صاف کر رہا تھا۔ آئینہ کے سامنے آکر اس نے تولیہ کو بیڈ پر دے پھینکا اور کچھ دیر آئینے میں خود کو دیکھنے کے بعد وہ الماری کی طرف بڑھا۔ ابھی اس نے الماری کھولنے کے لیے ہاتھ ہی بڑھایا تھا کہ موبائل کی رنگ اس کے کانوں میں گونجی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے موبائل کو اٹھانے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ فون کٹ ہوگیا۔ وہ آگے بڑھنے کی بجائے واپس پلٹا اور الماری سے بلیو ٹی شرٹ نکالی، ہینگر کو دوبارہ الماری میں رکھ کر الماری لاک کی اور آئینہ تک جاتے ہوئے وہ ٹی شرٹ پہن چکا تھا۔ ایک بار پھر موبائل کی رنگ ہوئی اس بار میسج کی ٹون تھی۔ وہ آگے بڑھا اور موبائل اٹھا کر میسج ریڈ کیا۔ ایک بار پھر اس میسج کو پڑھنے کے بعد اس کے کھلے چہرے پر بارہ بج گئے۔ اس نے دوباری میسج ریڈ کیا۔ unknown نمبر سے میسج آیا تھا۔

"کون بھیج سکتا ہے؟ کون ہے یہ؟" اپنے آپ سے کہا۔

رات کی سیاہی نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا مگر اس سیاہی میں بھی اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو چاند کی روشنی میں ہیرے کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ خیالوں کی دنیا میں ایسی محو تھی کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے، اس کو کچھ خبر نہ تھی۔ اپنے چہرے کو کرسی کی ٹیک سے ٹکائے وہ مسلسل چاند کو گھور رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں آتش کے بے بنیاد الزام محو رقص تھے۔

"پہلے میری بیوی کے ساتھ رات رات بھر رنگ رلیاں مناتا ہے اور پھر دن دھاڑے اس کے ساتھ رومانس کرتا ہے" مبہم سی تصویر اس کی آنکھوں کے گرد چھا گئی۔ وہ ان باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ الفاظ اسے اندر سے اتنا گھائل کر چکے تھے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے پیچھا چھڑانا محال ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں موجود موبائل پر آر جے کی آواز بھی اس کے غم کو ہلکا کرنے میں ناکام رہی۔ ایک سوچ اسے دنیا سے کنارہ کر رہی تھی تو دوسری اسی دنیا کی طرف دھکیل رہی تھی۔ جب دل مسلسل آنسو بہا کر ہلکان ہوگیا تو اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے دوبارہ موبائل پر آر جے کی گفتگو پر دھیان کیا۔

"ان آنسوؤں کو بہا کر ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ آنسوؤں کے بہانے سے خود کو تکلیف پہنچتی ہے۔ آنسو بہانے سے ان لوگوں کا کچھ نہیں جاتا جو اس کی وجہ بنے اگر انہیں آپ کے آنسوؤں کی قدر ہوتی تو وہ بھی آپ کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دیتے۔" آر جے کی باتیں ایک

بار پھر اشکوں کے بہنے کا موجب بنیں۔
"باتیں تو کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ انسان ختم ہو جاتا ہے مگر اس کی باتیں، اس کی یادوں کی طرح زندہ جاوید رہتی ہیں۔ شاید انہوں نے آب حیات پی رکھا ہے یا پھر ان کا فنا سے کوئی تعلق ہی نہیں۔" مدھم سا میوزک فضا میں اپنی تاثیر بکھیرنے لگا۔
"جانے کا وقت ہو چکا ہے مگر جانے سے پہلے آج کی نظم آپ کے حضور پیش خدمت ہے۔

اس دنیا میں
خواب نہ دیکھو
گر جو دیکھے
توڑ دو ان کو
دن کی باتیں
چبھے مجھ کو
رات کی یادیں
ستائیں مجھ کو
تیری آنکھیں
رلائیں مجھ کو
تیری سانسیں
ستائیں مجھ کو
آگ پہ چل کے
پاؤں تجھ کو
درد کے ساحل
پر دیکھوں تجھ کو
میں آب ہوں
یہ لگے تجھ کو
میرا وجود ایک پل
بھی نہ بھایا تجھ کو
میں جاؤں بھی،
تو جاؤں کہاں
چھوڑ کر تجھ کو۔"

پوری نظم جیسے اس کی زندگی کی عکاسی کر رہی تھی۔ ایک ایک لفظ اس کے دل پر نقش کر گیا۔ وہ نظم پوری ہونے کے بعد بھی اس کے سحر میں گرفتار تھی۔
شاہین بیگم کی آنکھیں پرنم تھیں۔ آتش اور جمال الدین کی گفتگو رات کی تنہائی میں بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ آتش کی باتیں ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھیں۔ کروٹ کی آواز سے جمال الدین کی آنکھ کھل گئی۔
"تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟" ٹیبل لیمپ جلایا۔
"بس ویسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔" آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔
جمال الدین نے ٹھنڈی آہ بھری۔
"آتش کے بارے میں سوچ رہی ہو نا!" دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ لیمپ بند کر دیں، رات کافی ہو گئی ہے۔" لحاف کو چہرے پر سرکایا۔
"تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتیں، میں تمہارا شوہر ہوں۔ زندگی کا ایک عرصہ تمہارے ساتھ گزارا ہے۔ تمہارے چہرے کی لکیروں کو بن دیکھے پڑھ سکتا ہوں۔ تمہارے دل میں اس وقت کیا چل رہا ہے، مجھ سے بہتر بھلا کون جان سکتا ہے؟" ایک نظر شاہین بیگم پر ڈالی۔
"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی" مصنوعی انداز میں کہا۔
"لیکن مجھے تمہارے آنسو صاف دکھائی دے رہے ہیں۔ جتنا تمہیں آتش کی باتوں سے تکلیف پہنچی، اتنی ہی مجھے بھی پہنچی ہے لیکن فرق صرف اتنا ہے تم نے کبھی اس کی کڑوی باتوں کو دل پر نہیں لیا ہمیشہ اس کی باتوں کو اگنور کرتی رہی اور آج تم نے پہلی بار اس کی باتوں کو دل میں جگہ دی ہے۔ پہلی بار اس کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔" اس کے شانوں کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا۔
شاہین بیگم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
"کیا وہ مجھ سے ملنے بھی نہیں آئے گا؟ کیا میں اس کے لئے اتنی غیر اہم ہو گئی کہ اس کے لئے اپنی ماں کے لئے بھی وقت نہیں۔" درد جو دل میں چھپا ہوا تھا، آنسوؤں کی شکل میں واضح ہو گیا۔
"اس کے نزدیک صرف تمہارے لئے ہی نہیں بلکہ کسی رشتے کے لئے کوئی وقت نہیں۔ تم خود سوچو جو انسان اپنی ماں کو بھول سکتا ہے وہ باقی رشتے کیا نبھائے گا؟ جو انسان اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے عاجز ہو وہ بھلا

رشتوں کی ڈوری کو کیسے جوڑے گا؟ جیسے تم آج اس کے لئے تڑپ رہی ہو، سوچو شائستہ کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اس کی زندگی کیسے پل پل آگ میں جلتی ہوگی؟''

''مجھے معاف کردیجیے۔ پلیز معاف کردیجیے'' جمال الدین کی باتیں سن کر آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ان کی سسکیاں خاموش کمرے میں گونجنے لگیں۔

''ارے روکیوں رہی ہو اور میرے لئے یہی کافی ہے تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔'' پیار سے ان کا سر اپنے شانوں پر رکھتے ہوئے تھپتھپایا۔

وہ تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کررہا تھا۔ وہ جلد از جلد اس مقام تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں اسے آنے کا کہا گیا تھا۔ کار زگ زیگ طریقے سے سیدھی سڑک پر بل کھا رہی تھی۔ ہارنز کی آوازیں اس کی برق رفتار کار کے آگے بے معنی تھیں۔ آج صبح جب وہ رات کی محفلوں سے لطف اندوز ہوکر گھر لوٹا تو دروازے پر ایک نوجوان اس کا انتظار کررہا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ وہ آنے والا ہے۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھا، اس نے ایک کاغذ اس کے ہاتھوں میں تھمایا اور پھر چل دیا۔ آتش نے آواز دے کر روکنے کی کوشش کی مگر اس نے ایک نہ سنی۔

''عجیب لڑکا ہے'' شانے اچکاتے ہوئے کاغذ پر لکھے گئے پیغام کو پڑھا۔

''آج تو اس کو نہیں چھوڑوں گا!'' گھر میں داخل ہوتے ہی کار اسٹارٹ کی اور پھر کاغذ پر لکھے پتہ کی طرف چل دیا

یہ زیب کا گھر تھا۔ وہی گھر جہاں اس نے اپنا گھناؤنا کام سرانجام دیا تھا۔ لمحہ بھر کے لئے اس کے قدم رکے۔ اوپر سے نیچے گھر کا جائزہ لیا۔ وہی شان وشوکت، وہی جلال مگر خاموش۔ اس اندھیری رات میں صرف یہ پتھر ہی اس کے گواہ تھے، اس کے جرم کے گواہ۔ زیب کی موت کے گواہ مگر منہ میں زبان نہ رکھنے کی وجہ سے خاموشی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنے ہوئے تھے۔ اس کے گھناؤنے فعل کو دنیا سے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کررہے۔ مضبوط قدموں سے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ پہلے سے کھلا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہاں کوئی موجود ہے۔ اس کے آنے سے پہلے کوئی اس گھر میں داخل ہوچکا تھا۔ وہ قدم اٹھانے کے بعد وہ گھر کے اندر تھا۔ ہر شے پر سکوت طاری تھا۔ ایک عجیب سی خاموشی اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

''کوئی ہے؟'' اس کی آواز پلٹ آئی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ صوفے کی طرف جارہا تھا۔ اس کے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ہر شے عجیب تھی۔ خون کے نشانات مٹ چکے تھے۔ مگر وہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کی گرمائش محسوس کرسکتا تھا۔

''اتنا گھمنڈ۔ اچھا نہیں''

''اسے گھمنڈ نہیں وقار کہتے ہیں اور بدلہ کہتے ہیں'' دو مبہم سائے اس کے سامنے محو گفتگو تھے۔ پہلا فرش پر لہولہان تھا جبکہ دوسرا صوفے پر بیٹھا اپنی قسمت پر رشک کررہا تھا۔

''ایک دن آئے گا تم پچھتاؤ گے مجھے مار کر تم آتش'' وہ دم توڑ چکا تھا۔ مگر اس کی آواز ایک بار پھر گونجنے لگی۔ وہ آگے بڑھا صوفے کو چھوا، ایک آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

''اپنے چہرے کی طرف دیکھ ذرا خون میں لال کردیا ہے میں نے تو نے میری زندگی کے راز کو افشا کرنے کی کوشش کی تھی نا! اب اس راز کو افشا کرکے دکھا!'' یہ الفاظ جیسے اس کے جسم کی روح کو ہتھوڑے مار رہے تھے۔

''اپنی موت کی پہیلی کو سلجھا کر دکھاؤ ذرا میں بھی دیکھتا ہوں کیسے اس بند کمرے میں ہوئے قتل کو کون دنیا کے سامنے لاتا ہے۔ کون اس جرم کا گواہ بنتا ہے۔ کون تجھے انصاف دلاتا ہے؟ افسوس کوئی نہیں ہے۔ کوئی آتش کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرا ایک بال بھی بانکا نہیں کرسکتا۔ تم بھی نہیں'' اس رات کی ایک ایک بات اسے سنائی دینے لگی۔ اس کی نظر آس پاس کی چیزوں کو ٹٹولنے لگی مگر کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

''کون ہے؟ سامنے کیوں نہیں آتا کوئی؟ ہمت ہے تو سامنے آکے بات کر'' پاگلوں کی طرح پکارنے لگا۔ اس کا جسم خوف کے سائے میں ڈوب چکا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کون اس کے اندھیرے کمرے میں کیئے گئے جرم کا گواہ ہے۔ کون اس رات کی ایک ایک بات اس کو یاد کرا رہا تھا؟

''پیٹھ کے پیچھے سے وار کیوں کرتا ہے؟ ہمت ہے تو مردوں کی طرح سامنے آ'' ایک بار پھر اس نے انجان آدمی کو پکارا۔ ایک سایہ نمودار ہوا۔ وہ شخص سیڑھیوں کے اوپر کھڑا تھا۔

''لو آ گیا میں'' ایک بھاری بھرکم آواز نے ہوا کو چیرتے ہوئے اس کے کانوں کا راستہ لیا۔

''کون ہو تم؟'' مبہم سائے کو پہچاننے کی ناکام کوشش کی مگر روشنی اس کی آنکھوں کو چبھ رہی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس کے چہرے کو دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

''اتنی جلدی بھول گئے مجھے'' قدموں کی آواز مسلسل بڑھ رہی تھی۔ مبہم چہرہ اب روشنی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے قدم روشن ہو چکے تھے۔ سر دس برانڈ کے شوز اپنے اوپر پڑنے والی روشنی کو منعکس کر رہے تھے۔

''کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو تم؟'' گھور کر اس کی طرف دیکھا

''دشمن نہ کرے دوست نے وہ کام کیا ہے'' تمسخرانہ کہا۔ وہ ایک قدم مزید نیچے آ گیا۔ روشنی اس کے گھٹنوں پر تھی۔ سیاہ جینز واضح ہوئی۔

''دشمن نہ کرے دوست نے وہ کام کیا ہے'' ایک بار پھر وہی جملہ دہرایا گیا۔ وہ ایک قدم مزید اتر چکا تھا۔ روشنی اس کے سینے تک پہنچ چکی تھی۔ سفید شرٹ اور آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر تھا۔ آتش دو قدم آگے بڑھا۔

''تمہیں آگے آنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں خود آ جاتا ہوں۔'' وہ آخری سٹیپ پر تھا۔ روشنی اس کے شانوں پر تھی۔ چہرہ اب بھی مبہم تھا مگر مسکراہٹ دھندلی طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ آخری قدم وہ اٹھا چکا تھا۔ اب روشنی اس کے پورے وجود کو گھیر چکی تھی۔ اس کا چہرہ واضح تھا۔ آتش کی آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک دوست اس کا رقیب بن رہا تھا۔ پہلے زیب اور اب عیان وہ عیان تھا مگر وہ یہ سب کیسے جانتا تھا؟

''تم؟؟'' اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

''ہاں! میں کیوں مجھے یہاں دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی کسی اور کو دیکھنا چاہتے تھے یہاں؟'' تمسخرانہ کہا۔

''مگر تم؟'' ایک بار پھر وہی انداز تھا۔

''ایک تو تم سوال بہت کرتے ہو کچھ دیر صبر رکھو، سب بتاتا ہوں۔'' اس کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''کیا جانتے ہو تم اور تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟'' انجان بنتے ہوئے کہا۔

''چچ چچ چچ کتنے معصوم بن رہے ہو تم لیکن افسوس تم ایسے ہو نہیں اگر ایسے ہوتے تو کیا ہی بات تھی۔ لیکن تم تو اس ہاتھی کی طرح ہو جس کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور'' اس کے گرد چکر لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟؟'' جبڑے بھینچتے ہوئے کہا۔

''سی ڈی۔ مرڈر مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا'' طنزیہ کہا۔

''ک ک ک کون سی سی ڈی؟ اور م م مرڈر؟ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اس کی ہوائیاں اڑ گئیں۔

''یہ کیا تم ہکلانے لگے ہکلاتے وہ لوگ ہیں جنہوں نے کوئی جرم کیا ہوتا ہے'' وہ پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔

''کیا تم نے بھی کیا ہے؟'' اچانک پلٹ کر بر ملا کہا۔

''ک ک ک کیا بکواس کر رہے ہو تم؟'' وہ بوکھلا گیا۔

''بکواس میں نہیں، بکواس تم کر رہے ہو سنا تم نے'' وہ غرایا۔

''وٹس یور پرابلم'' وہ پلٹا۔

''یو یو آر مائے پرابلم'' انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ مٹھیاں بند کر چکا تھا۔ لاوا اندر ہی اندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''ویسے تم بھی کتنے لکی ہو۔ ایک طرف گھر والی تو دوسری طرف باہر والی۔ کبھی بیوی کے ساتھ، تو کبھی باہر ناز کے ساتھ اپنی پیاس بجھاتے ہو'' اس کا انداز تمسخرانہ تھا۔

''شٹ اپ بے ہودہ باتیں کرنا بند کرو۔'' دہکتی آنکھوں سے دیکھا۔

''بے ہودگی میں نے نہیں، بے ہودگی تو نے پھیلا رکھی ہے۔ بیوی کے ہوتے ہوئے بھی بازاروں میں منہ مارتے پھرتا ہے۔ شرم تمہیں آنی چاہیے'' وہ ماضی کی غلطیوں کو اس پر آشکار کر رہا تھا۔

وہ اس کی باتوں کو برداشت کر رہا تھا۔

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟'' اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

''ثبوت مانگتے ہو سی ڈی بھول گئے کیا جو زیب نے

بنائی تھی؟'' اس کا انداز شاطرانہ تھا۔

''مگر وہ تو۔'' گھبرا کر کہا۔

''وہ مرنے سے پہلے اور تمہارے قتل کرنے سے پہلے مجھے دے چکا تھا'' قہقہہ کمرے کی خاموشی کو چیرتا ہوا اس تک پہنچا

''اچھا تو تم سب جان چکے ہو؟ پھر تو یہ بھی جان چکے ہو گے کیسے میں نے اسے قتل کیا؟ کیسے میرے سامنے زیب اپنی زندگی کی بھیگ مانگ رہا تھا؟'' عیان کی باتوں نے اس کو سچ اگلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اب اس کے گرد گھومتے ہوئے اپنے کالے کارناموں کا ذکر کر رہا تھا۔

''سب جانتا ہوں میں تمہارے ایک ایک کرتوت میرے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہیں۔'' ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔

''بہت خوب اچھی بات ہے، تم نے مجھے خود سچائی بتا دی۔ اب تمہارا حال بھی زیب کی طرح ہی ہوگا'' اپنی تیوری چڑھاتے ہوئے آگے بڑھا۔

''آہا ایسا کرنے کی کوشش تو در کنار سوچنا بھی مت میں زیب کی طرح بے وقوف نہیں ہوں۔ جس گھر میں تم کھڑے ہو، میں نے پہلے سے ہی اس پورے گھر میں سی۔سی۔ٹی۔وی۔ کیمرے نصب کر دیئے ہیں۔ تمہاری ایک ایک حرکت، ایک ایک بول تمام کیمروں میں ریکارڈ ہو رہا ہے۔'' وہ شطرنج کی طرح ہر داؤ سوچ سمجھ کر چل رہا تھا۔ آتش کو اپنی شکست صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ چہرہ آگ بگولا تھا۔ مگر وہ اپنی ہی لگائی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے ہر بازی اپنے نام کرے۔ وہ بری طرح ہار چکا تھا۔

''کیا چاہتے ہو تم؟'' طویل خاموشی کے بعد اس کے لب ہلے۔

''یہ ہوئی نہ بات اسے کہتے ہیں، کام کی بات پر آنا۔ میں زیادہ کچھ نہیں چاہتا، بس ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔ جسے تم آسانی سے پورا کر سکتے ہو۔ بلکہ تم تو ہامی بھی بھر چکے ہو۔''

''کیا مطلب؟'' اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

''وہ رات بھول گئے کیا؟ جس رات تم نے شرط لگائی تھی''

تم

ملنے کی آس بنو تم
میرے بے تاب دل کی دھڑکن بنو تم
اک دن چرا لیں گے تم کو
اپنا بنائیں گے تم کو
کسی پل ملنے کا اقرار کر لو
محبت کی باس کو دل کے پار کر لو
جاں سپاری کروں گی
التفات کی کلیاں بچھاؤں گی
ہوں تشنہ تقریر تیری
اختر شماری میں نگاہیں میری
کہتی ہیں تجھے جاناں
بس میری محبت کی ڈھارس بن جاؤ
تم......!

☆☆

انتظار

انتظار کے جاں گسل لمحات میں
روئے نین میرے
اس پر تیری یادوں کے
بے تاب تیری باتوں کے
حنائی انگشت اٹھائے
پلکوں کی کلیاں سجائے
جھلمل کرتی احمریں چنریا
ڈھونڈتی ہے تیری وید کو بانسریا
بس اک بار
آس کے دیپ جلانے آ جاؤ
میری پیاس بجھانے آ جاؤ

عنبرین اختر ...... لاہور

''ارے سارے شوہر ہوتے ہی ایسے ہیں۔ شادی سے پہلے دوستوں کے ساتھ مزے اڑاتے ہیں اور شادی کے بعد تو کون اور میں کون'' ماضی کی باتوں نے دستک دینا شروع کی۔

''یاد کرنے کی کوشش کر یار تو نے ہم سے ایک شرط لگائی تھی'' اس کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''میں شادی کروں گا اور دیکھ لینا مجھے کوئی بدل نہیں سکتا، میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا۔'' اسے سب یاد آچکا تھا۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلنے لگے۔ وہ جانتا تھا کہ عیان کیا کہنے والا تھا۔ آخر وہ بھی انہی میں سے ایک تھا۔

''تو پھر''

''تو پھر یہ کہ اب وقت آگیا ہے۔ تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔'' ہواؤں نے اپنے پر پھیلا کر ان الفاظ کو آتش تک پہنچنے میں مدد کی۔

''آتش جمال الدین کو اپنے کہے گئے الفاظ پر عمل کرنا ہوگا۔'' آواز پہلے سے زیادہ بھاری تھی۔

''شٹ اپ جسٹ شٹ میں ایسا کچھ بھی نہیں کرنے والا وہ میری بیوی ہے۔ تم نے سوچ بھی کیسے لیا''

''بیوی۔'' عیان نے مداخلت کرتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ آتش خاموش ہوگیا۔

''یار کیوں مذاق کرتا ہے۔ یہ بیوی وغیرہ کے الفاظ تیرے منہ سے اچھے نہیں لگتے۔ یہ باتیں شریف زادوں کے منہ سے اچھی لگتی ہیں۔ تم جیسے حرام''

''اے منہ سنبھال کے گالی دی تو زبان نکال کر ہاتھ میں پکڑا دوں گا'' عقابی نظروں سے شکار کرتے ہوئے کہا۔

''اور اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو برسوں کا سورج تم سلاخوں کے پیچھے گزارو گے۔'' چالباز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بھی دیکھتا ہوں کہ تم کیا کر سکتے ہو؟'' اس نے چیلنج کیا۔

''تم جانتے نہیں ہو، میں کیا کر سکتا ہوں۔ تمہارے پاس صرف کل رات تک کا وقت ہے۔ بیوی یا پھر جیل کی سلاخیں فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

......☆☆......

''بچاؤ بچاؤ'' ایک آواز مسلسل اس کے کانوں میں آرہی تھی۔ آواز شناسا تھی مگر کون مدد کے لئے پکار رہا تھا اسے سمجھ نہیں آرہی تھا۔ وہ کمرے میں تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

''رانو! رانو!'' وہ مسلسل اپنی بیٹی کو پکار رہی تھی مگر نہ جانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔ گرج چمک کی وجہ سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

''خدا کے لئے مجھے بچاؤ'' وہی آواز دوبارہ اس کے دل کو بوجھل کرنے لگی۔ وہ آواز واضح ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اس آواز کو پہچاننے کی کوشش میں تھی۔

''اماں'' یہ اس کی بیٹی کی آواز تھی۔ شائستہ کی آواز تھی۔ وہ چلا رہی تھی۔ موسلا دھار بارش اور گرج چمک میں بھی اس کی درد بھری آواز وہ آسانی سے سن سکتی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی برآمدے میں آموجود ہوئی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ زور و شور سے ابر کرم برس رہا تھا۔ ہر جلتی شے خود بخود بجھ رہی تھی۔ مگر اس کا وجود دہک رہا تھا۔ وہ آگ میں جھلس رہی تھی۔ اس بارش میں بھی اس کے وجود کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا تھا۔ ہر گرتی بوند اس آگ کے شعلوں پر تیل کا کام کر رہی تھی۔ وہ مدد کے لئے چلا رہی تھی۔ مگر کوئی سن نہیں سکتا تھا۔

''شائستہ'' چلاتے ہوئے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا وجود پسینے میں شرابور تھا۔ اس آگ کی تپش وہ محسوس کر سکتی تھی۔

''کیا ہوا اماں؟'' پاس لیٹی رانو نے سوال کیا

مگر وہ کیا جواب دیتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب بھی آب اور آتش کے شعلے تھے۔

......☆☆......

عبدالرحمٰن کروٹیں بدل بدل کر ہلکان ہوگیا تھا۔ نیند تو جیسے اس سے خفا ہی ہوگئی۔ اس نے موبائل اٹھا کر ٹائم دیکھا۔ رات کے ایک بج چکے تھے۔ وہ موبائل کو گھورتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سکون چاہتا تھا مگر وہ تو کہیں غائب ہی ہوگیا تھا۔ اس نے بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں مگر شائستہ کا چہرہ اس کی بند آنکھوں کے سامنے آگیا۔

''نہیں'' جھماکے کے ساتھ اس نے آنکھیں کھولیں اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ سفید کرتے اور

پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ چاند کی نیلی نیلی روشنی اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس دینے کی بجائے یادوں کو اس کی طرف دھکیل رہی تھی۔ وہ شائستہ کو یاد کرنا نہیں چاہتا تھا مگر نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اس کا چہرہ آ رہا تھا۔ ایک پل کے لئے اسے ایسا لگا کہ کوئی اس کو چھو رہا ہے۔ وہ پلٹا تو اسے شائستہ کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بھی سفید لباس میں ملبوس تھی۔ چہرے پر ہلکی سی کسک، لہراتی زلفیں۔ وہ اس کو وہاں دیکھ کر چونک گیا مگر نظریں اب بھی اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر مجبور تھا۔ مگر کیوں؟ کیسی مجبوری؟ وہ خود نہیں جانتا تھا۔ ہوائیں فضا کو مہکا رہی تھیں۔ وہ اس کے حسن میں مکمل طور پر کھو چکا تھا۔ اس کی جھیل آنکھیں، جو ہر پل پرنم رہتی تھیں، آج اس میں ڈوبنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس کو چھونا چاہتا تھا۔ اپنا ہاتھ اس کے چہرے کی طرف کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس کے وجود کو محسوس کر پاتا، وہ وجود غائب ہو گیا۔ وہ اِدھر اُدھر اس کے وجود کو تراشنے لگا۔ بھاگ کر دروازے کا لاک کھولا۔ باہر جھانکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ عکس تھا۔ شائستہ کا عکس۔ جو اس کے دل کی دنیا سے نکل کر اس کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھیں پل بھر کے لئے نم ہو گئیں۔ دروازہ بند کیا اور واپس بیڈ پر جا بیٹھا۔

''اے خدایا! یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔'' اپنے وجود کو جھنجوڑ رہا تھا۔

''ایسا کیوں ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ مجھے ہر جگہ اس کا چہرہ کیوں دکھائی دے رہا ہے؟'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''نہیں اب نہیں مجھے جلد سے جلد یہاں سے جانا ہوگا ہاں مجھے جانا ہوگا، یہی ٹھیک رہے گا'' وہ فیصلہ کر چکا تھا مگر دل میں ایک کسک باقی تھی جو اسے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کے لئے ابھار رہی تھی۔

وہ مہاراجوں کی طرح سگریٹ کے کش لگا کر اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ رات کا کیا وقت ہو چکا ہے۔ اس کے دل دماغ پر عیان کے الفاظ دستک دے رہے تھے۔

''تمہارے پاس صرف کل رات تک کا وقت ہے۔ بیوی یا پھر جیل کی سلاخیں فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

سگریٹ کا دھواں اس کے گرد اپنا حصار قائم کر چکا تھا۔ اس کی نظریں سامنے صوفے پر لیٹی شائستہ کے چہرے کی طرف گئیں۔ وہ صوفے سے اٹھا۔ اس کے پاس گیا۔ اس کا چہرہ اپنی نظروں سے ٹٹولنے لگا۔

''پھر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟'' شادی کی پہلی رات شائستہ کے کہے گئے الفاظ آج اس کے کانوں تک پہنچے۔

''آتش چھوڑیے مجھے پلیز۔'' اس کی آہیں آج اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

''تو تم تو جانتی ہو کہ میں کسی چیز کا لحاظ نہیں رکھتا'' سگریٹ کا ایک اور کش لیا۔

''ادھر بیٹھو شائستہ۔ میرے ساتھ'' دھوئیں کے بادلوں کو فضا کے سپرد کیا۔

''جب تک آپ میرے ساتھ ہیں، مجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں'' دھوئیں کی کثرت سے شائستہ نے کھانستے ہوئے کروٹ بدلی۔ وہ اب بھی سوئی ہوئی تھی مگر وہ پیچھے ہٹ گیا اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ کر اس کے چہرے کو تکنے لگا۔

''آتش آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے'' اس کا اشک بہاتا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے منت سماجت کر رہا تھا۔

''میں نے تمہیں پورا پورا موقع دیا تھا کہ تم خود اتر جاؤ مگر تم نے میرا کہا نہیں مانا، اب تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' دو مبہم چہرے اس کے سامنے تھے۔

''چلو تم پر ایک احسان مزید کر دیا۔ اور اب بائے بائے'' وہ اسے دھکیل چکا تھا۔

''شائستہ'' اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا مگر وہ ایک خیال تھا، شائستہ سامنے لیٹی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے لیکن اس کے وجود میں ہلچل کیوں مچ گئی تھی۔ وہ خود نہیں جانتا تھا۔ سگریٹ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

''ہاں ہاں وہ اس کمرے میں بھی آیا تھا اور اس بیڈ پر بھی سویا تھا مگر'' اس کی آنکھوں میں یقین غالب ہو گیا۔

''شرم آپ کو مجھ پر نہیں، اپنے آپ پر آنی چاہئے۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی کیسے دوسری عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں۔ کیسے ان کے پہلو میں اپنی

پیاس بجھاتے ہیں۔ جب آپ کا اپنا کردار ٹھیک نہیں تو مجھ پر انگلی اٹھانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔" جیت کی کوشش صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"آتش آپ ٹھیک تو ہیں نا!" الفاظ اس کے دل و دماغ میں یکے بعد دیگرے دستک دے رہے تھے۔

"میں جو کہتا ہوں وہ کرتا ہوں یہ تو تم بھی جانتے ہو" وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے کیا کرنا ہے۔ اس کی آنکھوں کی کسک، اس کے لبوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے کام (کی تہمت) سے، جو انہوں نے نہ کیا ہو ایذا دیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔"

(سورہ الاحزاب: آیت ۵۸)

نانی جان نے شائستہ کو دیکھ کر مدہم آواز میں تلاوت شروع کر دی اور اشارے سے اسے پاس بیٹھنے کو کہا مگر وہ اس آیت مبارکہ کی تشریح کرنے کی کوشش میں تھی۔ وہ اپنے آپ کو ٹٹول رہی تھی کہ آیا وہ بھی مومن عورتوں میں شمار ہوتی ہے۔ کیا اس میں بھی وہ خوبیاں پائی جاتی ہیں، جو اس کو مومن عورت بننے میں مدد کرے تاکہ وہ بھی اپنے حق کا دفاع کر سکے۔ اس بہتان کو جو آتش نے اس پر لگایا تھا، ہٹا سکے۔

"کیا ہوا؟ وہاں کیوں کھڑی ہو میرے پاس آؤ" نانی جان تلاوت مکمل کر چکی تھیں۔ انہوں نے قرآن پاک کو بوسہ دیا اور پھر سینے سے لگا کر الماری میں رکھ دیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی اور پھر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"آپ کچھ دن اور رک نہیں سکتیں کیا؟" اس نے بجھے دل سے کہا۔

"آج نہیں تو کل جانا تو ہوگا اور ویسے بھی یہ دنیا کا دستور ہے، جو بھی آیا اسے جانا ہے۔" اس کے پاس بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مزید کہا۔

"اور تم اداس کیوں ہو رہی ہو؟ میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔ جہاں رہو خوش رہو۔" وہ ان کے گلے لگ گئی۔

بجھے دل سے عبدالرحمن پیکنگ کر رہا تھا۔ وہ ایک ایک سوٹ کی بیسیوں بار تہہ لگا چکا تھا۔ اس کا جسم تو اس کمرے میں تھا مگر روح کہیں اور۔ کہاں؟ وہ خود نہیں جانتا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا؟ ابھی تک پیکنگ نہیں کی، جانا بھی ہے۔" نانی جان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"جی، دادی جان، بس تھوڑی سی رہ گئی بلکہ ہو ہی گئی" جلدی سے سوٹ کیس بند کیا۔

"کیا ہوا تم اداس لگ رہے ہو؟ اس بار جانے کو دل نہیں چاہ رہا؟" بیڈ پر بیٹھ کر پوچھا۔

"پتا نہیں دادی جان، کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ ایک عجیب سا ڈر ہے، اس دل میں۔ ایک عجیب سی لہر دوڑ رہی ہے اس دل میں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے ایک طوفان آنے والا ہے۔ ایسا طوفان جو سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ کچھ بھی نہیں چھوڑے گا۔ ایک ایک ذرہ اپنے ساتھ لے جائے گا۔" ان کے پاس بیٹھ کر دل مضطر کا حال بتانے لگا۔

"آج کل کچھ زیادہ ہی فلموں کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ ذرا کم دیکھا کر فلمیں" اس کی باتوں کو ہلکا لیتے ہوئے اس کا سر پیار سے تھپتھپایا۔

"دادی جان، میں مذاق نہیں کر رہا، واقعی ایک عجیب سا خوف جنم لے رہا ہے" اس کا انداز سنجیدہ تھا۔

"اچھا۔ چلو تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں، لیکن ایک بات یاد رکھو یہ جو زندگی میں طوفان اٹھتے ہیں نا، ان کی خاص وجہ ہوتی ہے، کوئی مقصد ہوتا ہے۔"

"مقصد؟" اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

"ہاں! مقصد یہ انسان کو پارس بنا دیتے ہیں۔ جب انسان ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے تو وہ اپنے اندر موجود ان خوبیوں سے آگاہ ہو جاتا ہے جو قدرت نے اس میں رکھی تھیں مگر وہ اس سے ناواقف تھا۔"

"کیا واقعی انسان میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ہوتی ہیں؟" ایک بار پھر سوال کیا۔

"ہاں، قدرت نے ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور رکھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی وقت سے پہلے جان لیتا ہے اور کوئی وقت کے بعد۔" ایک پل کے لئے خاموشی نے آ گھیرا۔

"چلو اب جلدی کرو دیر ہو رہی ہے۔" نانی جان نے اٹھتے ہوئے کہا مگر وہ اب بھی خیالوں میں گم تھا۔

"دادی جان، کیا شائستہ میں بھی قدرت نے خوبیاں رکھی ہیں؟" اس نے پہلی بار انجانے میں شائستہ کا نام لیا

تھا۔ دادی جان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
''ہاں'' یہ کہتے ہوئے وہ باہر چلی گئیں، کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بھی کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ نانی جان سب سے مل رہی تھیں۔ جمال الدین اور شاہین بیگم بھی وہاں موجود تھے۔ شاہین بیگم کی صحت بھی پہلے سے خاصی بہتر ہوگئی تھی۔
''آپ کو حیرت تو بہت ہوگی لیکن یہ بات میں آج دل سے کہہ رہی ہوں کہ آپ مجھے بہت یاد آئیں گی۔'' شاہین بیگم کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔
''ویسے یقین تو نہیں آ رہا'' ان کے انداز میں مزاح تھا۔
''میں نے پہلے ہی آپ سے کہا تھا کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا لیکن سچ ما یہ ہے، آپ یہاں سے جائیں، یہ سوچ کر ہی دل کو پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔'' وہ ہر بات کی وضاحت کر رہی تھیں۔
''امی جان آج تو میں ان کے ساتھ ہوں، یہ بالکل سچ کہہ رہی ہیں'' جمال الدین نے شاہین بیگم کا ساتھ دیا۔
''واہ بھئی، آج میرے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا شاہین'' ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔
''امی'' ہنستے ہوئے شاہین بیگم ان کے گلے لگ گئیں۔
''جیتی رہو ہمیشہ خوش رہو'' پہلی بار جاتے ہوئے وہ دعا دے رہی تھیں۔
''بھابھی نظر نہیں آ رہیں؟'' عبدالرحمٰن کی نظریں جو کافی وقت سے شائستہ کی متلاشی تھیں۔ لبوں نے بھی ان کا ساتھ دے دیا۔
''میں یہاں ہوں'' کچن سے نکلتے ہوئے اس نے جواب دیا، شائستہ کا چہرہ دیکھنے کے بعد عبدالرحمٰن کے بجھے چہرے پر ایک بہار آ گئی۔ اس کا چہرہ بھی دمکنے لگا۔
''نانی جان آپ کو میرے ہاتھ کا ساگ بہت پسند تھا نا! اس لئے سوچا، آپ کے لئے بنا دوں۔'' ٹفن ان کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔
''جیتی رہو'' اس کے ماتھے کو بوسہ دیا۔
''اچھا اب چلتے ہیں'' نانی جان نے کہا۔
''اللہ حافظ'' عبدالرحمٰن کی نظریں شائستہ کے چہرے کو

غزل

روتے میں ہنستے رہنا اچھا لگتا ہے
روٹھے یار کو مناتے رہنا اچھا لگتا ہے
بہار آنے کے بعد گلستاں میں
کلیوں کا چٹکتے رہنا اچھا لگتا ہے
کئی برس کی شناسائی کے بعد
دلوں کا اچانک ٹوٹنا اچھا لگتا ہے
جب دل کے موسم پر خزاں چھا جاتی ہے
تمہاری یاد کو سینے سے لگانا اچھا لگتا ہے
دن رات کسی کی یاد میں موتی بکھیرنا
عنبرین ہمیں دل کا جلنا اچھا لگتا ہے

......☆☆......

غزل

خورشید کی کرنوں سے اک ربط بنا رکھنا
دہلیز پہ راتوں کی خوابوں کا دیا رکھنا
بے نور ہوئے انجم، بے موت ہوئی بستی
اس لمحہ ساکت میں اک حرف دعا رکھنا
موسم ہے نمو کا یہ شاید وہ شجر نکلے
پانی میں شرر رکھنا، مٹی میں ہوا رکھنا
اک رسم بھی نکلی اک رنگ نیا ابھرے
تپتی ہوئی دھرتی پر اک برگ حنا رکھنا
ہر موج ہوس اٹھ کر تم تک نہ پہنچ جائے
ساحل سے ذرا پہلے اک دشت قضا رکھنا
شاید کہ ضرورت ہو تپتی ہوئی راہوں کی
چھالوں کو بھرا رکھنا، زخموں کو ہرا رکھنا
تنہا بھی عنبرین اپنی مت ہیچ سخن لاؤ
وادی طولیٰ ہے یہ نعلین جدا رکھنا

عنبرین اختر...... لاہور

تک رہیں تھی۔

ایک منٹ کے بعد نانی جان اور عبدالرحمن جا چکے تھے۔ جمال الدین گیٹ تک ان کے ساتھ گئے تھے۔ دہلیز پر شاہین بیگم اور شائستہ کھڑی تھیں۔ ایک ویرانی چھا چکی تھی۔ پہلی بار اس ویرانی کو شاہین بیگم نے محسوس کیا تھا۔ شاہین بیگم نے شائستہ کی طرف دیکھا۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں'' شاہین بیگم نے کہا۔

''جی کہیے'' مسکرا کر جواب دیا۔

''میں تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں'' ہاتھ جوڑ کر کہا

''معافی کسی بات کی؟ امی جان'' ان کے ہاتھوں کو نیچے کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ساتھ نہ دینے کی وجہ سے، تمہیں ہر پل ذلیل کرنے کے لئے، تمہاری عزت نفس کو ٹھیس پہنچانے کے لئے'' وہ اپنی غلطیاں گنوا رہی تھیں۔

''نہیں نہیں امی جان۔ آپ کو معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''لیکن مجھ سے بہت بڑی بھول ہوگئی'' ان کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

''تو کیا ہوا؟؟ بھول ہی ہوئی کوئی گناہ ہوا اور ویسے بھی جب بچے بھول کرتے ہیں تو بڑے بھی تو معاف کر دیتے ہیں، مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔'' شاہین بیگم نے پہلی بار شائستہ کو بہو کے روپ میں گلے لگایا تھا یا شاید آخری بار

''اچھا اب میں کچن میں کچھ کام نمٹالوں'' ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں'' پیار سے چہرے کو تھپتھپایا، یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ کچھ دیر اسی جگہ پر گھر کی ویرانی کو بغور دیکھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی، انہیں کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پر تھیں کہ وہاں آتش آموجود ہوا۔ اسے دیکھ کر ایک بار پھر ممتا اللہ آئی مگر اس کی کڑوی باتیں بھی گونجنے لگیں۔

''بیٹا! کیسے ہو؟'' پیار بھرے انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہوں تو تمہارے سامنے ہوں'' آستینیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس لہجے میں کیوں بول رہے ہو'' اس کا لہجہ جارحانہ تھا۔

''ایکسکیوزمی میرا لہجہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھا لگتا ہے ڈینگی کچھ زیادہ ہی آپ کے دماغ پر چڑھ گیا ہے'' تمسخرانہ کہا۔

''آتش'' یہ الفاظ ان کے دل پر تیر کی طرح جا کر لگے، انہوں نے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی مگر آتش نے ہاتھ پکڑ لیا۔

''اپنے ہاتھ کو قابو میں رکھیے۔ آئی بات سمجھ میں'' عقابی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''آتش تم'' اس کو گھورتے ہوئے کہا

''چلتی بنیں، یہاں سے'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک جھٹکا دیا۔ شاہین بیگم اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکیں اور سیڑھیوں سے نیچے گر گئیں۔ ان کے سر سے خون بہنے لگا مگر اس بے حس انسان کے سر پر ایک جوں تک نہیں رینگی۔

''شاہین بیگم'' جمال الدین گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی طرف لپکے۔

جمال الدین، شاہین بیگم کو اسپتال لے کر چلے گئے۔ پیچھے سے شائستہ آتش کے ساتھ اکیلے گھر میں موجود تھی۔ اسے آتش سے وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے تئیں کوشش میں تھی کہ آتش سے دور رہے۔ کبھی کچن میں کام کا بہانہ کر کے چلی جاتی تو کبھی لان میں ٹہلتے ہوئے جمال الدین اور شاہین بیگم کی واپسی کی راہ تکتی۔ اسے آج آتش کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ آتش کی عجیب نظریں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ وہ لان میں ٹہل رہی تھی کہ اس کے ہاتھوں میں موجود موبائل کی رنگ ہوئی

''السلام علیکم! امی جان کیسی ہیں آپ؟'' فون ریسیو کرتے ہی اپنی فکر کا اظہار کیا۔

''وعلیکم السلام پہلے سے بہتر ہیں، مگر ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آرام کی ضرورت ہے۔ ہم رات تک گھر آجائیں گے'' فون سے آواز آئی۔

''رات تک'' استفہامیہ انداز میں کہا۔

''ہاں اچھا اب میں فون رکھتا ہوں، اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کال کر لینا۔''

''جی ٹھیک'' اس نے فون بند کر دیا اور پیچھے پلٹی تو آتش کو دیکھ کر چونک گئی۔

"آپ" وہ گھبرا گئی۔
"ابو سے بات کر رہی تھی؟ کب آ رہے ہیں وہ؟" اس کی آنکھوں میں ایک الگ کشش تھی۔
"ابو جان نے کہا کہ وہ رات تک آ جائیں گے مجھے کچن میں کام ہے، میں چلتی ہوں۔" وہ وہاں سے کھسکنا چاہتی تھی مگر آتش نے پیچھے سے اس کی کلائی پکڑ لی۔
"چھوڑیے مجھے" اس نے دوٹوک کہا۔
"آج اتنے دنوں بعد ہم اس گھر میں اکیلے ہیں۔ میرے ساتھ دو پل نہیں گزارو گی؟" اس کی باتوں میں بھی کشش تھی۔
"کس حیثیت سے؟" عقابی نظروں سے پلٹی۔
"میاں بیوی کی حیثیت سے" اس نے اسے اپنی باہنوں میں لینا چاہا مگر شائستہ نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔
"لیکن ہمارے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے اور نہ ہی کبھی بن سکتا ہے سمجھے مسٹر آتش" اس کی باتوں نے اس کو پچھاڑ دیا، وہ کچن میں چلی گئی مگر اس کے چہرے پر تمسخرانہ ہنسی تھی۔
"تم چاہو بچو جتنا ہم تم کو چرالیں گے" ایک قہقہہ لگایا۔
کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ کمرے کی طرف جانے لگی۔ شام کے چار بج چکے تھے۔ کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ حیران رہ گئی۔ پورے کمرے میں گلاب کی پنکھڑیاں بکھری پڑی تھیں۔ دیواروں نے سرخ لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ بیڈ بھی احسن انداز میں سجا ہوا تھا۔ بالکل ویسے، جیسا وہ شادی کی پہلی رات دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے۔ کمر کے پیچھے سے ایک احساس ہوا۔ کوئی اس کو اپنی باہنوں میں لے رہا تھا۔ وہ چونک گئی اور پلٹی۔
"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔
"اپنی بیوی کو اپنی آغوش میں لے رہا ہوں۔" خوش اسلوبی سے کہا۔
"بہت ہو گیا ڈرامہ۔ مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔" وہ باہر جانے لگی مگر آتش نے دروازے کی چٹخنی اوپر کر دی۔
"دروازہ کھولیے" دروازے کی چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو آتش نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔
"میری بات سنو شائستہ" نرم لہجے میں کہا۔
"مگر مجھے کوئی بات نہیں سننی" نظریں چراتے ہوئے کہا۔
"شائستہ میں جانتا ہوں تم مجھ سے ناراض ہو اور مجھ سے ناراض ہونے کا تمہیں پورا پورا حق ہے۔ میری حرکتیں ہی ایسی تھیں۔" آنکھوں میں آنسو لانے کی ناکام کوشش کی
"ہو گیا اب میں جا رہی ہوں" ایک بار پھر دروازے کی چٹخنی نیچے کرنے کی ناکام کوشش کی۔
"آج تم اس وقت تک اس کمرے سے باہر نہیں جا سکتیں، جب تک مجھے معاف نہ کر دو۔" اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔
"میرے ہاتھوں کو چھوڑیے میں نہیں چاہتی کہ آپ کے ناپاک ہاتھ میرے جسم کو چھوئیں۔" اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔
"کیا مجھے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ کیا میری غلطیاں، میرے گناہ اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی تلافی ممکن نہیں۔ کیا میں تم سے اتنا دور ہو چکا ہوں کہ تمہیں چاہ کر بھی اپنا نہیں سکتا۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ آج میری حالت بھی اس بھولے ہوئے آدمی کی طرح ہے۔ میں سب کچھ ہار چکا ہوں۔ سب کچھ گنوا چکا ہوں۔ اب تمہیں کھو نہیں سکتا۔ کیا تم مجھے اس رشتے کو بچانے کے لئے آخری موقع نہیں دو گی؟" اس کا لہجہ عاجزانہ تھا، اس کے لہجے میں انکساری تھی۔ یہ حقیقت تھی یا ایک چھل؟ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کی بات کا یقین کرے یا نہیں۔
"میری بات کا یقین کرو میں نادم ہوں، شرمندہ ہوں، اپنی کی ہوئی ایک ایک غلطی پر تم سے معافی مانگتا ہوں، مجھے معاف کر دو" اس کے داہنے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔
"یقین اس پر کیا جاتا ہے، جس پر اعتماد ہو مگر مجھے تم پر اعتماد نہیں" اس نے دوٹوک کہا۔
"تمہیں اس پیار کا واسطہ جو تم مجھ سے کرتی ہو" اس نے کہا۔
"کون سے پیار کی بات کر رہے ہو؟ پیار نامی لفظ

تمہاری زبان سے اچھا نہیں لگتا۔" استہزائیہ انداز میں کہا
"ٹھیک ہے تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے نا! تو پھر یہ دیکھو" وہ بک شیلف کی طرف بڑھا اور دو پیکٹ لا کر اس کے ہاتھوں میں تھما دیے۔

"کیا ہے یہ؟" اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

"تمہیں میری محبت فریب لگ رہی ہے تو کیا یہ بھی فریب ہے؟ یہ بھی دھوکا ہے؟ ایک بار کھول کر ضرور دیکھ لینا" یہ کہہ کر اس نے دروازے کی چٹخنی نیچے کی اور باہر چلا گیا۔ شائستہ کو ایک سوچ نے آ گھیرا۔ وہ حیرت سے اپنے ہاتھوں میں موجود پیکٹ کو گھور رہی تھی۔ کیا یہ حقیقت تھی؟ کیا وہ واقعی سدھر گیا تھا؟ وہ دو قدم چل کر آئینے کے پاس گئی۔ دوسری طرف ایک لڑکی اپنے پیا کی طرف سے دیئے گئے تحفہ کو لئے کھڑی تھی۔ وہ اس کو کھولنا چاہتی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کے پیا نے اس کے لئے کیا پسند کیا ہے؟ وہ اسے کھول رہی تھی۔ اس کے اندر سے نہایت نفیس سرخ رنگ کا لباس نکلا۔ وہ لباس جو کوئی دلہن پہلی رات زیب تن کئے ہوتی ہے، اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک کشش اس کے چہرے پر تھی۔ وہ خاموش تھی مگر دل بول رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟ وہ سننا نہیں چاہتی تھی مگر سن رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں اسے ایک موقع دینا چاہیے۔ اپنے قریب آنے کا، اپنے وجود کو اپنانے کا۔ اپنی شناخت دینے کا، اپنی پہچان دینے کا۔ وہ پکار رہا تھا اپنے ساجن کو، اپنے بھوا کو، اپنے دلبر کو، اپنے ہمراز کو۔ وہ مانگ رہا تھا ایک پل محبت کا، ایک بول پیار کا۔ وہ کیا کرے؟ کس کی سنے؟ دل کی یا دماغ کی۔ کسے حقیقت سمجھے ماضی کو یا حال کو؟ کسے موقع دے، اپنے آپ کو یا اپنے ساجن کو؟ سوچ و بچار کے بعد وہ ہار گئی۔ ایک عورت ہار گئی مگر بیوی جیت گئی۔ ایک شوہر کا اعتماد جیت گیا۔ اس کا پیار جیت گیا۔ وہ واش روم میں گئی اور وہ سرخ لباس زیب تن کر لیا۔ وہ بالکل نئی نویلی دلہن لگ رہی تھی۔ آنکھوں سے حیا واضح تھی۔ یوہی کپکپی اس کے ہاتھوں میں ایک اضطراب پیدا کر رہی تھی۔

وہ دلہن کی طرح بیڈ پر بیٹھی تھی۔ مدھم روشنی اس کی بے چینی کو چھپانے میں ناکام تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔ آتش کمرے میں داخل ہوا۔ آف وائٹ کلر کی شیروانی پر سرخ رنگ کی دھاریاں، مدھم نیلی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔ اس نے دھیرے سے دروازہ بند کیا۔ چہرے پر کسک تھی۔ آنکھوں میں شادابی اور لبوں پر تبسم۔ وہ پلنگ کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے شائستہ کے پہلو میں براجمان تھا۔ شائستہ کا چہرہ گھونگٹ کے پیچھے تھا۔ وہ پانچ منٹ تسلسل کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا۔

"مجھے معلوم ہے، آج کا دن تمہارے لئے بہت خاص دن ہے۔ آج کے دن کے لئے تم نے بہت انتظار کیا اور سچ مانو تو میں بھی آج بہت خوش ہوں۔" اس نے پیار سے اس کے ہاتھوں کو تھام کر بوسہ لیا۔ اس کے لبوں کی چاشنی اس کے ہاتھوں پر نقش کر گئی۔ اس کی آنکھیں مسلسل اس کے چہرے پر تھیں۔ اس نے گھونگٹ اٹھانے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو ایک آواز کمرے کے باہر سے آئی۔

"میں دیکھتا ہوں" وہ باہر گیا، صرف ایک منٹ بعد اسے بیڈ پر بیٹھنے کا احساس ہوا۔ وہ اس کے قریب تھا۔ اسے شانوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور آئینے کے پاس لے گیا۔ پہلی بار اسے یہ احساس ہوا کہ وہ آتش کے لئے کیا ہے؟ وہ اسے بیوی کا درجہ دے رہا تھا۔ وہ درجہ جو وہ ہمیشہ سے پانا چاہتی تھی۔ ایک پل محبت کا، جو وہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ایک پل احساس کا، جو وہ محسوس کرنا چاہتی تھی۔ آج بن کہے، سب مل رہا تھا۔ وہ احساس، وہ پیار، وہ وجود ایک ہاتھ نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا مگر اس بار یہ ہاتھ اس کے دل میں ارتعاش پیدا کر گیا۔ یہ ہاتھ وہ نہیں تھا، جو کچھ دیر پہلے تھا۔ تن کی مہک وہ نہیں تھی، جو کچھ دیر پہلے تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ ہاتھ پہلے سے زیادہ سخت تھے۔ اس کی درمیانی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی مگر آتش نے آج تک کبھی انگوٹھی نہیں پہنی تھی۔ پھر آج کیسے؟ وہ پلٹی، روشنی مدھم تھی۔ چہرہ مبہم تھا۔ کپڑے وہی تھے۔ جسامت ویسی ہی تھی مگر کچھ ضرور بدلا تھا۔

"آتش یہ آپ ہیں؟" اس نے پوچھا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس شخص نے اس کے ہاتھوں کا بوسہ لینا چاہا مگر اس نے جھٹک دیا اور سوئچ کی طرف بڑھی۔ لائٹ آن کی۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔ آنکھیں سامنے کھڑے شخص کو پہچاننے سے انکار کر رہی تھیں۔ دوپٹے سے اپنے وجود کو چھپایا۔

"کون ہو تم؟ میرے کمرے میں کیا کر رہے ہو؟" وہ غرائی۔

"وہی، جواب کرنے والا ہوں" وہ عیان تھا۔ آتش اپنا وعدہ وفا کر چکا تھا۔ وہ سب فریب تھا جو کچھ دیر پہلے آتش نے کہا تھا۔ ایک حسین دھوکا، جس کے ذریعے اس نے شائستہ کو اپنے اعتماد میں لیا۔ اس نے صرف ایک کھیل رچایا تھا۔ باتوں کا جال بچھایا تھا، جس میں شائستہ بری طرح پھنس چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایک عورت چاہے کتنی ہی اپنے شوہر سے نفرت کا اظہار کر لے مگر جب دو بول پیار کے سنتی ہے تو برف کی طرح پگھل جاتی ہے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ کچھ کہا، جو وہ سننا چاہتی تھی۔ صرف پانچ منٹ میں وہ اپنے کھیل میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کمرے سے نکلنے کے بعد اس نے عیان کو کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ وہ اب شائستہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹ رہا تھا۔

"دور ہو جاؤ میں نے کہا میرے قریب آنے کی کوشش مت کرنا" وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ اس آس میں کہ آتش اس کو بچالے گا۔ وہ اس کی نیت کو بھانپ چکی تھی۔

"آتش آتش دیکھو اگر میرے شوہر کو معلوم ہو گیا نا، وہ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔" وہ اسے دھمکی دے رہی تھی۔ وہ دھمکی جو بے معنی تھی۔ جس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ تمسخرانہ ہنسا۔

"کس کو بلا رہی ہو اپنے شوہر کو بلاؤ چلو میں بھی تمہاری ہیلپ کر دیتا ہوں آتش آتش بچاؤ اپنی بیوی کو ورنہ میں اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں" طنزیہ کہا، چہرے پر شاطرانہ ہنسی تھی۔ شائستہ پیچھے ہٹ رہی تھی جبکہ وہ مسلسل اس کے تعاقب میں تھا۔ اس نے زبردستی اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ وہ اس کے سینے سے جا ٹکرائی۔

"چھوڑو مجھے" وہ مزاحمت کر رہی تھی اور وہ اس کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے بیڈ پر دھکیل دیا اور دروازے کی طرف لپکی۔

"آتش آتش" وہ آگ کو پکار رہی تھی مگر جانتی نہیں تھی کہ وہ آگ میں جھلسنے والی ہے۔ اس حقیقت سے آشکار ہونے والی ہے جو ایک عورت کے لئے موت کے مترادف ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی ٹی وی لاؤنج میں گئی۔ بھاگتے ہوئے اس کا دوپٹہ نیچے گر چکا تھا۔ اس کے بال بکھر چکے تھے۔ وحشت کے آنسوؤں نے اس کے حسین چہرے کو بری طرح مسمار کر دیا تھا۔ آنسوؤں کے ساتھ کاجل بھی اس کی خوبصورتی کو متاثر کر چکا تھا۔ کچن سے آتش پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے باہر آیا۔

"آتش دو دو دوہ" وہ ہکلانے لگی اور آتش کو دیکھتے ہی اس کو مدد کے لئے پکارا۔

"کیا ہوا؟ تم ہکلا کیوں رہی ہو؟" آتش نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

عیان بھی اس کے سامنے آ چکا تھا۔ چہرے پر شاطرانہ ہنسی تھی۔

"یہ یہ" وہ اس کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور عیان مسلسل اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟ تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو مجھ سے؟" شائستہ کے ہاتھ کو چھونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"آتش دیکھو اسے آپ روکتے کیوں نہیں اسے؟" آتش کی طرف دیکھتے ہوئے استفہامیہ انداز میں کہا۔

"دیکھو ڈرنے کی بات نہیں جو تم مجھ سے توقع کر رہی تھی۔ وہ یہ کر رہا ہے۔ بس اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے جسٹ چل" بے رخی سے کہا اور صوفہ پر براجمان ہو گیا۔ وہ حیرت سے اس کے وجود کو تک رہی تھی۔ ان الفاظ پر غور کر رہی تھی جو ابھی ابھی اس کے کانوں نے سنے تھے۔

"چلو اب باہر آ ہی گئے ہو تو یار مجھے بھی دیکھا دو تم کیا کیا کرنے والے ہو؟" شائستہ کا ہاتھ عیان کی گرفت میں تھا۔ اس نے مزاحمت بند کر دی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آتش نے اس کے اعتماد کو توڑ دیا۔ اس کو دھوکا دیا۔ اس کے وجود کو ایک بار پھر ذلیل کیا۔ ایک بار پھر اس کے وجود کو پاؤں میں روند دیا۔ آنکھیں اشک بہانے لگ گئیں۔ عیان کھسیانی ہنسی کے ساتھ اس کو گھسیٹتا ہوا آتش کے سامنے لے گیا۔

"واہ یار دوست ہو تو تیرے جیسا وعدے کا ایک دم پکا ہے" اسے زبردستی اپنی باہوں میں لیتے ہوئے کہا۔ وہ مزاحمت کر رہی تھی۔ بے بسی نے اسے آگھیرا تھا۔ وہ مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ ان بے جان در و دیوار کو جو اس کی مجبوری کو تو سمجھ رہے تھے مگر خاموش تھے۔ اس شوہر کو جو

صرف نام کا تھا، جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بیوی کے وجود کا سودا کر دیا۔ جسے لفظ بیوی کا مطلب ہی نہیں پتا۔ وہ انجان بنتے ہوئے، اس کے وجود کو تڑپتا دیکھ رہا تھا۔ اس کی بے بسی، اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ دونوں کی حرکات سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"شائستہ" ایک بارعب آواز ہواؤں میں گونجنے لگی، شائستہ نے دروازے کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ وہاں جمال الدین اور شاہین بیگم تھے۔ ان کو دیکھتے ہی شائستہ نے عیان کو صوفے پر دھکیلا اور جمال الدین کی پناہ میں دوڑتے ہوئے آ گئی۔

"ابو" اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

جمال الدین کو اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان کی آنکھیں، آتش کی مثل دہک رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھے اور عیان کے چہرے پر ایک طماچہ رسید کیا۔

"ذلیل انسان تجھے شرم نہیں آئی، میری بہو کے ساتھ ایسی بیہودہ حرکت کرتے ہوئے؟" ایک بار پھر اس کے چہرے پر طماچہ رسید کیا۔

"مجھ پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لیں۔ جب خود کا سکہ کھوٹا ہو تو دوسروں پر انگلی اٹھانے کا جواز نہیں بنتا۔" پلٹ کر جواب دیا

"تجھے تو ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں" فون کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"خبردار اگر پولیس کو بلانے کی کوشش کی تو اگر مجھے جیل ہوئی تو یہ جو آپ کا نواب زادہ ہے نا وہ بھی بچے گا نہیں سیدھا پھانسی کے تخت پر چڑھے گا"

"شٹ اپ آگے ایک لفظ نہیں" آتش جو اتنی دیر سے خاموش تماشائی بن کر پورا کھیل دیکھ رہا تھا، اپنا راز افشا ہوتے دیکھ کر گویا ہوا۔

"تو پھر سمجھا لے اپنے باپ کو پولیس کو فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ورنہ میرے ساتھ ساتھ تو بھی جائے گا حوالات میں" آتش کو صاف صاف کہہ دیا۔

"جو بات کرنی ہے مجھ سے کر اس سے کیا کرتا ہے" فون اٹھا کر نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے جو کھیل بھی رچایا ہے، آپ کے اپنے بیٹے آتش کا ہے" گھبراہٹ میں سب کچھ اگلنے لگا۔ یہ سننے کی دیر تھی کہ فون نیچے گر گیا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" شاہین بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنی بکواس بند کرو ورنہ" آتش نے دھمکی دی۔

"ورنہ کیا؟ کیا کر لو گے تم؟" اس نے للکارا۔

"میں جو کر سکتا ہوں وہ تم سوچ بھی نہیں سکتے" للکار کا جواب دیا۔

"دھمکی دے رہا ہے مجھے عیان کو دھمکی دیتا ہے" اسے گریبان سے پکڑ کر پچھاڑتے ہوئے مزید کہا۔

"یہ جو آپ کا بیٹا ہے نا آستین کا سانپ ہے سانپ ارے یہ تو بیٹا کہلانے کے لائق ہی نہیں ہے، جس جرم کی پاداش میں آپ مجھے پولیس کے حوالے کرنے لگے ہیں، اس جرم کا اصل کھلاڑی تو یہ ہے، جو آپ کے سامنے کھڑا ہے مسٹر آتش" اس کی آواز ہوا میں گونجنے لگی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ صرف اس کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کے خاموش ہونے کے بعد بھی ایک وقت تک اس کے کہے گئے الفاظ سنے جا سکتے تھے۔ شائستہ کی سسکیاں بھی اس گونج کو سن رہی تھیں۔

"اور یہ لڑکی جسے آپ نے بہو کا درجہ دے رکھا ہے، آپ جانتے بھی ہیں اس کی بیوی کیسے بنی۔ آپ لوگوں کو تو یہی لگتا تھا کہ شادی کرنا اس کی ضد تھی نہیں وہ ایک شرط تھی۔ جسے پورا کرنا اس کی ضد تھی اور وہ شرط آپ جانتے بھی ہیں کیا تھی؟ چلو وہ بھی میں ہی بتا دیتا ہوں۔ وہ شرط یہ تھی کہ شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کا حسن ہم پر نچھاور کرے گا۔ اپنے دوستوں کے ساتھ" یہ بات جمال الدین کی برداشت سے باہر تھی۔ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے عیان کے چہرے پر طماچہ رسید کیا۔ شاہین بیگم کو ایک جھٹکا لگا۔ ان کی آنکھیں، ٹکٹکی باندھے آتش کے چہرے پر تھیں۔

"ابھی اس کی کارستانیاں ختم کہاں ہوئی ہیں، ابھی تو مزید سنیے" وہ ایک ایک کر کے اس کے ایک ایک کرتوت سب کے سامنے رکھ رہا تھا۔

"رات رات بھر یہ جو گھر سے باہر رہتا ہے نا، آپ جانتے ہیں وہ کیوں رہتا ہے وہ اس لئے تا کہ اپنی پیاس بجھا سکے رنگ رلیاں منا سکے اور جب اس کی حرکتیں زیب

سب کو بتانے چلا تو اس آتش نے اسے قتل کر دیا خون کر دیا اس نے" انگلی اٹھاتے ہوئے چلایا۔

"خونی ہے یہ آتش خونی اس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں" یہ الفاظ شاہین بیگم کے لئے زہر سے کم نہ تھے۔ ان کی جان پر بن رہی تھی۔ ان میں مزید سکت نہیں تھی کہ اور سن سکیں۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ آتش کو کچھ نہ کہا۔ یہ ممتا تھی یا پھر پچھتاوا شائستہ بکھر چکی تھی۔ اس کا وجود داغ دار ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ ایک لمحہ میں اس پر قیامت ٹوٹ گئی تھی۔ موت سے پہلے وہ اپنی زندگی کا حساب دے رہی تھی۔ دوزخ میں جل رہی تھی۔ آگ میں جلس رہی تھی۔ یہ آگ آتش کی آگ تھی۔ یہ آگ نظر تو نہیں آ رہی تھی مگر اس کے شعلے اسے اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ وہ آہیں بھرتی فرش پر بیٹھی تھی۔ جس ساجن کے لئے اس نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اس نے ہی اسے دنیا کے سامنے بے لباس کر دیا۔ اس کے وجود کو دنیا کے ساتھ بانٹنا چاہا۔ وہ مر جانا چاہتی تھی۔ ان آنسوؤں میں ڈوب کر، جو وہ بہا رہی تھی۔ مگر موت بھی اس سے خفا تھی۔ اس کی تڑپ دیکھ کر بھی آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس کی سسکیاں، اس کے غم کی ترجمان تھیں۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے" جمال الدین نے عیان کو گھر سے جانے کا کہا۔ وہ آتش کے پاس گیا۔

"کہا تھا نا، تمہارا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ اب تم بھی جلو، اپنی بھڑکائی آگ میں" اس کے کانوں میں سرگوشی کی اور پھر تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ چلا گیا۔ گھر میں ماتم کی سی فضا تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی کا جنازہ اٹھا ہو اور جنازہ تو اٹھ رہا تھا شائستہ کی خوشیوں کا۔ شائستہ کے ارمانوں کا۔ شائستہ کی زندگی کا یا پھر خود شائستہ کا۔ جمال الدین شائستہ کا غم بانٹنا چاہتے تھے، اسے تسلی دینا چاہتے تھے مگر ہر غم کی دوا ہو، ایسا ممکن نہیں۔ کچھ غم ایسے ہوتے ہیں جو انسان چاہ کر بھی کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا۔ اسے اکیلے ہی اس غم سے لڑنا پڑتا ہے۔ شفقت کا ہاتھ چاہ کر بھی وہ اس کے سر پر رکھ نہیں پا رہے تھے۔ آنکھوں میں نمی سما گئی۔ آتش اپنی انا میں چٹان کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس کا دل پگھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ یا پھر اس کے سینے میں دل ہی نہیں تھا۔

غزل

ستم پر ستم تم بھی ڈھاؤ گے کب تک
میرا صبر یوں آزماؤ گے کب تک
میں شمس و قمر میں تمہیں ڈھونڈتی ہوں
کرن بن کے دل میں سماؤ گے کب تک
ستا لو ستا لو مگر سوچ لو تم
مجھے اس طرح تم ستاؤ گے کب تک
مجھے چاہتے ہو مجھے مانتے ہو
میرے پاس آ کر بتاؤ گے کب تک
خزاں نے پکارا ہے آواز دی ہے
کلی میرے دل کی کھلاؤ گے کب تک
یہ فرقت کے شعلے نہیں کھیل جاناں
بھڑکتے رہیں گے بجھاؤ گے کب تک

☆☆

غزل

دھیرے دھیرے دسمبر پھر آنے لگا ہے
دل میں اداسیوں کا موسم پھر چھانے لگا ہے
تیری سانسوں کی مہکتی گرم خوش بو سے
تازگی کا اک رنگ پھر بکھیرنے لگا ہے
درختوں کے زرد پتے یوں گرنے لگے ہیں
جیسے کوئی تیری زندگی سے پھر جانے لگا ہے
حسین چہرے تشنہ آرزوئیں برفانی لہجے
نازک بدن سرد ہواؤں میں پھر مچلنے لگا ہے
سرد راتیں تیرے ہجر میں برستی آنکھیں
عنبرین خوشی کا اک پل یاد پھر آنے لگا ہے

عنبرین اختر ...... لاہور

''آپ میں سے آتش کون ہے؟'' دروازے پر پولیس آموجود ہوئی اور آتش کا پوچھنے لگی مگر جمال الدین نے تو ابھی فون ہی نہیں کیا تھا پھر پولیس کیسے آئی؟ جمال الدین سوچ رہے تھے۔ آتش پر دحشت طاری ہوگئی۔

''یہ ہے آتش'' شاہین بیگم نے سیڑھیوں سے اترتے ہوئے جواب دیا۔ ان کی آنکھیں خشک تھیں۔ آنسو تھم چکے تھے۔ چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ آگے بڑھیں اور آتش کے بالکل سامنے آکر ٹھہر گئیں۔

''یہ ہے آتش جس نے میری بہو کی زندگی کو برباد کر دیا۔ اس کے وجود کو پامال کر دیا اور اپنے ہاتھوں کو خون میں رنگ لیا'' عقابی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے کالے کارناموں سے آگاہ کیا۔

''امی'' پہلی بار آتش کے لہجے میں معصومیت تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ شاہین بیگم اسے پولیس کے حوالے کر رہی تھیں۔ اگر جمال الدین ایسا کرتے تو شاید اسے اتنی حیرانی نہ ہوتی۔

''مت پکارو مجھے امی مر گئی ہے تمہاری امی'' سخت لہجے میں کہا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ امی؟'' اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

''سنا نہیں تم نے مسٹر آتش میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں سنا نہیں'' ان کے الفاظ میں اب لرزش آگئی۔ وہ ہکلانے لگی تھیں۔

''مجھے معاف کر دیں'' وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

''بند کرو اپنا ناٹک اب تمہارے یہ ہتھکنڈے، میرے دل کو نہیں پگھلا سکتے'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''بچپن سے آج تک تمہاری ایک ایک غلطی کو میں نے نظر انداز کیا۔ تمہارے لہجے کی ذرا پروا نہیں کی۔ تم مجھ سے کیسے بات کرتے ہو، اس کی ذرا پروا نہیں کی۔ ہمیشہ تمہاری طرف داری کی۔ اپنے شوہر سے تمہارے لئے لڑی اپنے بیٹے کے لئے مگر آج مجھے افسوس ہو رہا ہے، میں نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں ہمیشہ تمہاری سپورٹ کی؟ مجھے گھن آرہی ہے اپنے آپ سے۔'' پلٹ کر اس کا گریبان پکڑ کر کھینچا۔

''کیوں ہو تم میرے بیٹے؟ کیوں پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئے''

''یہ سب اس لڑکی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس کو تو میں'' وہ ابھی بھی باز نہیں آیا تھا۔ اپنی غلطی اسے نظر نہیں آرہی تھی۔ ابھی بھی وہ شائستہ کو غلط سمجھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر شائستہ کو بالوں سے گھسیٹنے لگا۔

''آہ'' درد بھری آواز اس کی روح سے نکلی جو پہلی بار شاہین بیگم نے سنی۔ وہ آگے بڑھیں اور ایک زوردار طمانچہ آتش کے چہرے پر رسید کیا۔

''خبردار اگر شائستہ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی۔ اب وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس کی ماں اس کے ساتھ ہے۔'' انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اب شائستہ کے ساتھ تھیں۔

''ایس۔ایچ۔او۔ صاحب۔ لے جائیے اسے اور سخت سے سخت سزا دیجئے گا۔'' شاہین بیگم نے دوٹوک کہا

''آپ ایسا نہیں کر سکتیں میرے ساتھ۔ میں بیٹا ہوں آپ کا'' وہ اب بھی اپنی انا میں تھا۔ ہتھکڑیاں اس کے ہاتھوں میں پہنائی جارہی تھیں۔

''بیٹے ہو نہیں تھے اب ہمارا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں'' آنسوؤں کا انبار آنکھوں میں ذخیرہ ہو گیا

''کتنا سمجھایا امی جان اور جمال الدین نے کہ تمہارا نام آتش نہ رکھوں۔ بشر ہے آتش نہ بناؤں مگر میں نے کسی کی ایک نہیں سنی۔ تمہیں منفرد بنانا چاہتی تھی۔ چاہتی تھی کہ تمہارا وجود سب سے الگ ہو۔ میرا بیٹا، سب میں الگ لگے اور دیکھو میری دعا قبول بھی ہوگئی۔ آج تمہارا وجود سب سے الگ ہے۔ تم سب سے مختلف ہو۔ تم آگ بن چکے ہو۔ اپنے نام کی وجہ سے۔ تمہارے اندر اس آگ کی خصوصیات پیدا ہوگئیں جو جہنم کی حق دار ہے۔ جسے اپنے علاوہ کچھ نہیں نظر نہیں آیا۔ جس نے ہمیشہ اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا مانا۔ اس دن بھی اس آگ نے تکبر کا اظہار کیا تھا تو جنت سے نکال دیا گیا اور آج تم بھی اپنے نام کی وجہ سے اس جنت سے دھتکارے جا رہے ہو۔ نہ وہ کبھی اب جنت میں داخل ہوگا اور نہ تم اب اس جنت کے حق دار ٹھہر سکتے ہو۔ تم دونوں کی قسمت میں اب صرف رسوائی ہے، صرف رسوائی'' آنکھیں بند کیے شاہین بیگم کے

لبوں سے یہ الفاظ جاری تھے۔ آتش اب جارہا تھا۔ ہمیشہ کے لئے اس جنت سے نکالا جاچکا تھا۔ اپنے ماں باپ کی جنت سے۔ اس کی انا کو اب بھی اپنی غلطی تسلیم کرنا گوارا نہیں تھا۔ آنکھیں دہک رہی تھیں۔ مگر اب وہ لوٹ نہیں سکتا تھا۔ جمال الدین نے شاہین بیگم کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا۔ وہ دونوں اب شائستہ کی طرف بڑھ رہے تھے، جو پوری طرح بکھر چکی تھی۔

''بیٹا'' شاہین بیگم نے پہلی بار اس کے لئے یہ لفظ استعمال کیا مگر اب بہت دیر ہوگئی تھی۔ ان الفاظ کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کھڑی ہوئی

''معاف کیجیے۔ مگر اب میں یہاں نہیں رک سکتی''نظریں چراتے ہوئے کہا اور پھر وہ بھی ان کو اکیلا چھوڑ کر دہلیز پار کرگئی۔

''بہو'' شاہین بیگم نے ہاتھ بڑھایا مگر جمال الدین نے شانوں پر ہاتھ رکھ کر روکا۔

''مت روکو اسے جانے دو'' بے بسی سے کہا وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسے زبردستی یہاں روکے رکھیں کیونکہ ایسا کرنا اس کو ماضی کی یادوں سے باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دے گا۔ وہ دونوں اب اکیلے تھے۔ مگر اب بھی تنہائی ان کے ساتھ تھی۔

رات کی مدھم روشنی میں جہاں آرا اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ آنکھیں پرنم تھیں۔ رانو کمرے سے باہر آئی تو حیران ہوگئی۔

''اماں تم اداس ہو؟ کیوں؟''

''دل اچاٹ ہورہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔'' اس نے کہا۔

''غلطی تو ہوئی ہے تم سے آپی کو جہنم میں دھکیل کر مگر اماں ابھی بھی وقت ہے، آپی کو واپس بلالو دیکھو ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا آپی کو اس جہنم سے آزاد کردو کہیں ایسا نہ ہو بہت دیر ہوجائے۔'' وہ اماں کے پہلو میں بیٹھ کر انہیں سمجھا رہی تھی۔

''مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے کہ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی اور تم ہمیشہ مجھ سے یہی پوچھتی تھی نا کہ میں نے شائستہ کی شادی میں جلدی کیوں کی؟ اس کی وجہ صرف اور صرف غربت تھی۔ یہ غربت انسان کو بہت مجبور کردیتی ہے۔ انسان کے لہجوں میں سفاکیت پیدا کردیتی ہے۔ اسی غربت نے میری ممتا کو بھی ماردیا۔ میں بے بس ہوگئی۔ غربت کے آگے۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ میری بیٹی وہ خوشیاں حاصل کرلے جو میں اسے نہیں دے سکی اور شاید کبھی دے بھی نہیں سکتی تھی۔'' دروازے پر دستک ہوئی۔ رانو اٹھی، دروازہ کھولا۔ وہاں شائستہ اپنے بکھرے وجود کے ساتھ کھڑی تھی۔ چہرے پر آنسوؤں کے خشک راستے تھے۔

''آپی تم یہاں؟ اس وقت؟'' ایک خوف کی لہر اس کے جسم میں سرایت کرگئی۔ جہاں آرا بھی دروازے کی طرف لپکی۔

''بیٹا تم؟'' پیار سے اس کے چہرے کو چھونا چاہا مگر شائستہ نے روک دیا۔

''مجھے ہاتھ مت لگایئے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ مجھے چھوئیں'' اس کا انداز سفاک تھا۔

''بیٹا یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ اور باہر کیوں کھڑی ہو اندر آؤ''

''اس دہلیز سے تو تم نے خود نکالا تھا مجھے اور اب کیوں اندر آنے کا کہہ رہی ہو۔ آج میں تمہاری اس دہلیز پر تم سے رحم کی بھیک مانگنے نہیں آئی، بس ایک سوال کا جواب پوچھنے آئی ہوں۔''

''کیا؟؟'' رانو نے کہا۔

''کیا ہر بیٹی کا مقدر میرے جیسا ہی ہوتا ہے؟'' اس کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ اور اندر کیوں نہیں آتی تم چلو اندر'' جہاں آرا نے کہا۔

''بس کیجیے میں تھک چکی ہوں بار بار ذلیل ہوتے ہوئے۔ میں بھی انسان ہوں۔ میرا بھی دل ہے۔ میرے بھی ارمان ہیں۔ مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ مگر آپ کو اس سے کیا۔ کبھی آپ نے دھتکار دیا تو کبھی آتش نے آپ جانتی ہیں، آج اس شخص نے میری زندگی کو برباد کردیا۔ میرے وجود کو پامال کرکے رکھ دیا۔ مجھے کہیں بھی منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا'' یہ الفاظ جیسے جہاں آرا پر بجلی بن کر گرے۔ وہ دبے الفاظ میں کہے گئے الفاظ کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ آنکھوں سے اشک بہنے لگے۔ ہمدردی جتلانے

کی ناکام کوشش کی مگر ہمت نہیں بنی۔

"میری خدا سے ایک ہی دعا ہے کہ اگر بیٹیاں غریب ماں باپ پر بوجھ ہوتی ہیں تو خدا کبھی کسی غریب کے گھر بیٹی پیدا نہ کرے اور اگر پیدا کر دے تو اس کا نصیب کبھی میرے جیسا نہ لکھے۔" آنکھوں سے اشک بہاتے ہوئے وہ وہاں سے چلی گئی۔ آوازوں نے روکنا چاہا مگر اس کے قدم اٹھ چکے تھے۔ ایک انجان منزل اس کا ٹھکانہ تھی۔ رات کا اندھیرا اس کی روح کو سیاہ کر چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو پہچاننے سے قاصر تھی۔ عیان کے الفاظ اس پر بجلی بن کر گر رہے تھے۔ وہ راکھ ہو چکی تھی مگر پھر بھی مجسم تھی۔ وہ پناہ چاہتی تھی مگر پناہ کھو چکی تھی۔ وہ اطمینان چاہتی تھی مگر بے چینی اس کا مقدر تھی۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ آنکھیں اشک بہا رہی تھیں۔ رات کے اندھیرے نے اس کی زندگی کو بھی اندھیر کر دیا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کاروں کی چمچماتی روشنی اس کی آنکھوں کو بے نور کر رہی تھیں۔ ہارنز کی آوازیں اس کی سماعت کو متاثر کر چکی تھیں۔ نہ سے سن سکتی تھی، نہ دیکھ سکتی تھی مگر اس کے باوجود وہ سن بھی رہی تھی اور دیکھ بھی رہی تھی مگر ان آوازوں کو جو اس کو پامال کر رہی تھیں۔ ان چہروں کو جو اس کے وجود کو مسمار کر رہے تھے۔ وہ اکیلی تھی۔ اس تاریک دنیا میں۔ اس تاریک رات میں۔ کوئی اس کے دل کے بوجھ کو ہلکا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ایک مسیحا کی تلاش تھی مگر شاید اب دیر ہو چکی تھی۔ ایک ایک کر کے سب مسیحا اس کی زندگی سے جا چکے تھے۔ وہ اشک بہاتے ہوئے سڑک کے عین وسط میں چل رہی تھی۔ ایک تیز رفتار کار ہارن بجاتی ہوئی اس کے قریب آ رہی تھی مگر وہ سننے سے قاصر تھی۔ اگلے ہی لمحے ایک چیخ فضاؤں میں گونجی۔ خون کے نشانات، سیاہ رات میں بھی دیکھے جا سکتے تھے۔

"آج چھ ماہ گزر گئے ہیں۔ تم بھول کیوں نہیں جاتے اس حادثے کو؟ وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ جس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی۔ یہ سب قسمت کا کھیل تھا" دادی جان اس کو حوصلہ دے رہی تھیں۔

"میں کیسے بھول جاؤں اس رات کو؟ اس اندھیری رات کو، میری وجہ سے، میری غلطی کی وجہ سے وہ حادثہ ہوا تھا۔ اگر میں کار تیز نہ چلاتا تو شاید وہ حادثہ نہ ہوتا" عبدالرحمٰن نے کہا۔

"لیکن اس میں صرف تمہاری ہی تو غلطی نہیں تھی"

"لیکن ہوا تو سب کچھ میری وجہ سے آج میری وجہ سے شائستہ" اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ اس میں مزید کچھ کہنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ اتنے میں وہیل چیئر پر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی ٹانگوں پر سفید چادر تھی۔ ہاتھوں میں کپکپاہٹ مگر چہرے پر ہلکا سا تبسم۔ شاید وہ اپنا ماضی بھول چکی تھی۔ یا پھر بھولنے کی کوشش میں تھی۔

"شائستہ۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تھی تو مجھے آواز دے دیتیں میں آ جاتا۔" عبدالرحمٰن نے فوراً اس کی طرف بڑھ کر کہا۔

"نہیں بس ویسے ہی آپ دونوں کے پاس آنے کا دل چاہا اس لئے آ گئی" مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ وہ ماضی بھول چکی تھی۔ اس رات کے ایک حادثے نے اس کے ماضی کو کچل دیا تھا۔ اس رات شائستہ نے ایک نیا جنم لیا تھا۔ وہ بھی عبدالرحمٰن کی بدولت شاید وہ اپنا ماضی کبھی بھلا نہ سکتی مگر عبدالرحمٰن کی دن رات کی انتھک محنت اور احتیاط کی بدولت وہ واقعی سب کچھ بھول چکی تھی۔ پچھلے چھ ماہ میں اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کورٹ کے ذریعے عبدالرحمٰن نے شائستہ کو آزاد کروا لیا۔ وہ اب مکمل آزاد تھی۔ کھلی فضا میں سانس لے سکتی تھی۔ آزاد پنچھی کی طرح اڑ تو نہیں سکتی تھی مگر فضاؤں میں جھوم ضرور سکتی تھی۔ وہ عبدالرحمٰن کو اپنا مسیحا، اپنا سب کچھ مان چکی تھی۔ ایک اچھا دوست جو پچھلے چھ ماہ سے ایک سائے کی طرح اس کے ساتھ رہا۔ اس کا خیال رکھا۔ اس کی ضرورت کو بن کہے پورا کیا۔ وہ اسے دوستی سمجھتی تھی مگر عبدالرحمٰن کے دل میں شاید کچھ اور تھا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ مگر اظہار سے گھبراتا تھا۔

"جب آپ یہاں پر آ ہی گئی ہیں تو آپ کے لئے ایک سرپرائز تھا" اس نے چیئر کو پکڑتے ہوئے کہا

"سرپرائز؟ کیسا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ دیکھیے" کمرے کے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں جمال الدین اور شاہین بیگم کھڑے تھے۔ ان کو دیکھ کر شائستہ خوشی سے مسکرا دی۔

"امی جان ابو جان" وہ دوڑ کر ان کے پاس جانا چاہتی

تھی مگر مجبور تھی۔ وہ چل نہیں سکتی تھی۔ وہ حادثہ اس کی ٹانگوں کی جان اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

"السلام علیکم! شائستہ بیٹا! کیسی ہو؟" شاہین بیگم نے اس کے ماتھے کو بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام بہت اچھی آپ سنائیں؟ اتنے دنوں بعد؟" وہ اب عبدالرحمٰن کے گھر رہتی تھی۔ جمال الدین اس بات سے متفق تھے کیونکہ اگر وہ واپس اس گھر میں آتی تو ماضی ایک بار پھر دستک دیتا۔ شروع میں شاہین بیگم نے مخالفت کی۔ وہ شائستہ کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی مگر پھر سمجھ گئیں۔

"بس کیا کریں۔ ہماری بیٹی نے ہمیں یاد ہی نہیں کیا لیکن پھر بھی دیکھو ہم آگئے" جمال الدین نے مزاح میں کہا۔

"ابو جان میں تو ہمیشہ آپ کو یاد رکھتی ہوں" پیار سے شاہین بیگم نے اس کے رخسار کو چھوا۔

"دیکھو کتنی خوش نظر آرہی ہے، ہماری بیٹی بس اب اللہ کرے یہ خوشی ہمیشہ قائم رہے" حسرت سے کہا۔

"کیوں نہیں اب یہ خوشی ہمیشہ ہماری بیٹی کے چہرے پر قائم رہے گی اور اسی لئے تو ہم یہاں آئے ہیں" جمال الدین نے کہا۔

"مطلب؟" شائستہ کو کچھ سمجھ نہ آیا۔

"دیکھو بیٹا! آج تک ہم نے تم سے کچھ نہیں مانگا مگر آج مانگتے ہیں، کیا جو مانگو گی دو گی؟" گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے جمال الدین نے پوچھا۔

"کیوں نہیں؟ آپ جو مانگیں گے میں سب کچھ آپ پر نچھاور کر دوں گی" ان کے ہاتھوں کو پیار سے بوسہ دیا۔

"ہمیں تمہاری ہاں چاہیے" جمال الدین نے کہا

"ہاں؟" اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

شاہین بیگم نے بائیں ہاتھ میں عبدالرحمٰن کا ہاتھ پکڑا اور دائیں ہاتھ سے شائستہ کا ہاتھ تھاما۔

"ہمیں اس رشتے کے لئے ہاں چاہیے" مسکراتے ہوئے کہا۔ عبدالرحمٰن نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کئی سوال تھے۔ شائستہ خود حیران تھی۔ اسے اس بات کی توقع نہیں تھی۔

"دیکھو عبدالرحمٰن ہم جانتے ہیں کہ تم شائستہ سے محبت کرتے ہو اور جتنی محبت تم شائستہ سے کرتے ہو اتنی شاید کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ شائستہ کو تمہاری ضرورت ہے۔ ایک اچھے ہمسفر کی ضرورت ہے اور ہمارا نہیں خیال کہ تم سے بہتر اسے کوئی اچھا جیون ساتھی ملے گا" جمال الدین نے عبدالرحمٰن کی سوالیہ نظروں کا جواب دیا۔

"لیکن میں شائستہ کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا" اس نے سب کچھ شائستہ پر چھوڑ دیا۔

"دیکھو شائستہ" جمال الدین اب شائستہ سے گویا ہوئے۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں شاید ٹھیک نہ لگے مگر یہی صحیح وقت ہے تمہیں عبدالرحمٰن سے بہتر پیار کرنے والا شوہر نہیں ملے گا" انہوں نے کہا اور پھر شاہین بیگم نے مداخلت کی

"صحیح کہتے ہیں جمال الدین اس بات کی ضمانت میں دیتی ہوں اور سب سے بڑھ کر اس کا نام خود اس کی ضمانت ہے۔ یہ عبدالرحمٰن ہے۔ رحمٰن کا بندہ۔ وہ رحمٰن جو ہر کسی پر مہربان ہے۔ جو کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا" ایک لمحے کے توقف کے بعد مزید کہا۔

"انسان کا نام اس کی شخصیت کو کتنا متاثر کرتا ہے۔ اس کا اثر تو ہم دیکھ چکے ہیں اور مجھے امید ہے اس نام کا اثر بھی اس کی شخصیت سے ضرور واضح ہوگا" ان آنکھوں میں نمی آگئی مگر ضبط کرتے ہوئے پلٹیں۔

"دیکھو اگر تم ناں کرنا چاہو تو یہ تمہارا پورا پورا حق ہے مگر ہو سکے تو اپنی امی جان اور ابو جان کی آخری بات مان کر دیکھ لو" ان کے لہجے میں عاجزی تھی۔

"امی جان آپ کا ہر فیصلہ مجھے منظور ہے" زیر لب مسکرا دی۔ اسے وہ وقت یاد آیا جب اس کی سگی ماں نے اس کی مرضی جانے بغیر اس کی شادی کی بات پکی کر دی مگر آج اس کی مرضی کو اہمیت دی جا رہی تھی۔ آج اس کے وجود کی قیمت تھی۔ اس کی عزت تھی اور یہی تو چاہتی ہے ایک عورت تھوڑی سی عزت تھوڑا سا پیار۔

میلے ہاتھ

محمد سلیم اختر

میاں بیوی یک جان دو قالب ہوتے ہیں انہیں ایک گاڑی کے دو پہیے بھی قرار دیا جاتا ہے اگر ایک پہیہ پنکچر یا خراب ہو جائے تو اس گاڑی کا چلنا محال ہو جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں تین لفظ انہیں ایک ایسے اٹوٹ بندھن میں باندھ دیتے ہیں کہ بعض اوقات موت کے بعد بھی وہ ایک دوسرے سے بندھے رہتے ہیں۔

تخیل کی دنیا میں رہنے والی ایک خاتون کا فسانہ اس کا سفر زندگی ختم ہوتے ہوتے ہو گیا تھا۔

روبی اپنی عمر کی اٹھارہ بہاریں دیکھ چکی تھی شباب نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے کئی اچھے گھرانے اسے اپنی بہو بنانے کے لیے بے تاب تھے مگر اس کے والدین ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے۔ روبی خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ چلبلی اور تعلیم یافتہ تھی۔ اس کی طبیعت شاعرانہ اور تخیل پسند تھی۔ وہ عام طور پر خیالات کے گورکھ دھندے میں کھوئی رہتی تھی۔ شاداب رومانوی افسانے اس کی پیاسی روح کے لیے سرمایہ تفریح تھے۔ اس کے خیالات عام طور پر تصورات کی بلندیوں پر پرواز کرتے رہتے اگرچہ وہ اس دکھ بھری دنیا ہی کی باسی تھی مگر اس نے اپنے دل میں ایک نئی دنیا بسا رکھی تھی جہاں صرف سدا بہار پھول کھلتے تھے شفاف پانی کے چشمے ابلتے تھے مسرت کی خس مکھ پریاں دن رات پرواز کرتی تھیں اور ہر شے سے خوشی ہویدا تھی۔ روبی جب گھر میں اپنی شادی کے متعلق کوئی بات سنتی تو وہ تخیلات کے گورکھ دھندے میں کھو جاتی اس کے خیال میں اس کا سسرال جنت کا ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ جہاں خزاں کا گزر نہیں تھا غم کی رسائی نہیں تھی اس کا شوہر گورا چٹا سرو قامت خوب صورت اور شاعرانہ طبیعت کا جوان تھا جو فرصت کے وقت محبت کے گیت گاتا خوب صورت تصویریں بناتا اور روبی کو دل و جان سے چاہتا تھا اس نے سوچ رکھا تھا وہ اپنے شوہر کو اتنا پیار دے گی کہ جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔

بالآخر روبی کی نسبت پکی ہو گئی وہ ایک متمول گھرانہ تھا مگر روبی بدستور اپنے حسین خیالات میں کھوئی رہی شادی کا دن آ گیا اور وہ دلہن بن کر پیا دیس سدھار گئی وہ اپنے شوہر کو پہلی بار دیکھ رہی تھی جواد اگرچہ بے پناہ مردانہ حسن نہیں رکھتا تھا مگر پھر بھی خوب صورت اور خس مکھ جوان تھا مالی طور پر مضبوط اور خوش تھا۔ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ایک سرکاری ادارے میں گریڈ سترہ کا افسر تھا۔ جواد کے والدین اپنے آبائی گاؤں میں رہتے تھے مگر شہر میں بھی ان کا ذاتی مکان تھا جس میں ہر قسم کی سہولت موجود تھی اور اس میں ننھا سا حسین و جمیل باغیچہ حسین قدرت کا ایک دل کش نمونہ تھا روبی کو وہ باغیچہ بہت ہی اچھا لگا مگر جواد اس کی طرح تخیلات کا بندہ نہ تھا اسے رومانی شاعری سے قطعی لگاؤ نہ تھا اور نہ ہی موسیقی اور مصوری سے کوئی دلچسپی تھی وہ

ہر کام وقت پر اور قاعدے سے کرتا تھا وہ پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا اور اپنے تمام فرائض کمال تندہی سے سرانجام دیتا تھا البتہ فرصت کے وقت وہ مذہبی کتابیں پڑھ لیتا۔

گھر میں ایک نوکر اور خادمہ موجود تھی مگر اسے بچپن ہی سے اپنے ذاتی کام خود کرنے کی عادت تھی اور اس کی یہ عادت اب پختہ ہوچکی تھی اس کے علاوہ اسے بچپن ہی سے میکینکل کام سے بہت دلچسپی تھی وہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، بجلی کے پنکھے اور موٹریں بوقت ضرورت خود ہی ٹھیک کرلیتا تھا گھروں میں اکثر بجلی کی چیزیں خراب ہوتی رہتی ہیں اور ان کی درستی کے لیے الیکٹریشن یا پلمبر کو ہی بلانا پڑتا ہے مگر جواد اس قسم کی تمام مشکلات سے بخوبی عہدہ برا ہوسکتا تھا اور وہ ان کاموں کو ایک مشغلہ تصور کیا کرتا تھا گھر میں کوئی چیز خراب ہوجاتی اور وہ اس کو چالو کر کے ہی چھوڑتا۔ ان کاموں میں اکثر اس کے ہاتھ سیاہ ہوجاتے مگر پروانہ کرتا اور ایک طرح کی خوشی اور راحت محسوس کرتا۔ مگر روبی یہ سب کچھ دیکھ کر ناک چڑھاتی اور اس کام میں اس کی ذرہ بھر بھی مدد نہ کرتی وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر اس کی مانند ایک خیالی مگر حسین اور رومانی دنیا کا باشندہ ہو مگر جواد ایسا نہیں تھا۔

ایک دن رات کے کھانے کے لیے وہ دونوں میاں بیوی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے روبی اس وقت اپنے البم میں چند تصویریں لگا رہی تھی کیونکہ اسے شاعری کے علاوہ فن مصوری سے بھی دلچسپی تھی اور اس نے ماہرین فن کے شاہکار سیکڑوں کی تعداد میں اپنے البم میں سجا رکھے تھے جواد اس وقت اخبار پڑھ رہا تھا اور گاہے بگاہے نظر اٹھا کر روبی کے چاند جیسے چہرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔

''اف کیا سوچا تھا اور کیا ہوگیا۔'' جواد نے گھبرا کر کہا۔

''میری شادی ایک ایسے نوجوان سے ہونے والی تھی جو ایک اچھا شاعر ہے۔'' روبی نے کہا۔

''شاعر۔'' جواد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں وہ ایک کامیاب مصور بھی ہے اور اس کی تصاویر قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔'' روزی نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''خوب۔'' جواد نے آہستہ سے کہا۔

''اور آپ ایک اچھے میکینک ہیں۔'' روبی نے البم میں ایک نئی تصویر لگاتے ہوئے کہا۔

''میں ایک میکینک ہوں۔'' جواد نے قدرے ترش لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں دیکھیے ناں کل آپ نے بگڑا ہوا واٹر پمپ کس طرح منٹوں میں درست کرلیا۔'' روزی نے جواب دیا۔

''مگر میں میکینک کو بلاتا تو بلاوجہ کا خرچ تھا۔'' جواد نے کہا۔

''مگر جس آدمی سے میری شادی ہونے والی تھی وہ اس قسم کے خیالات سے کوسوں دور تھا۔''

''خوب۔''

ڈرائنگ روم میں کچھ دیر ناخوشگوار خاموشی طاری رہی۔

''اس خوش بخت کا اسم گرامی۔'' جواد نے حقارت سے پوچھا۔

''رفعت...... ہاں رفعت۔'' روبی نے رک رک کر کہا۔

''رفعت......رفعت تو لڑکیوں کا نام ہوتا ہے۔'' جواد نے کہا۔

ڈرائنگ روم میں ایک بار پھر خاموشی طاری ہوگئی، صرف ان دونوں کی سانس لینے کی مدہم سی آواز سنائی دیتی تھی جواد نے پھر اخبار کے ورق الٹنے شروع کر دیے وہ کسی خبر میں الجھا ہوا تھا بلکہ کھویا ہوا تھا۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں۔'' روبی نے جواد کو کھویا ہوا سا پا کر پوچھا۔

جواد کو ایک دھچکا سا لگا اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں ہی تھا اور روزی اپنے البم میں ابھی تک تصویریں لگا رہی تھی۔

❁......☆☆......❁

کچھ دن گزر گئے روزی گم صم رہی جواد بھی پریشان تھا وہ انگاروں پر لوٹ رہا تھا روزی کے کہے ہوئے الفاظ اس کے دماغ میں خنجر کی نوک کی مانند چبھ رہے تھے وہ اپنے آپ کو بھول گیا راتوں کی نیند اڑ گئی مگر وہ اس معمے کو حل نہ کر سکا روزی کسی اور کو چاہتی ہے تو پھر اس نے اس کے ساتھ شادی کیوں کی دفتر میں بھی اسے چین نہ ملا وہ کھویا کھویا اور پریشان سا رہا شام کو دفتر سے وہ تھکا ماندہ گھر آیا اور دھم سے صوفے پر گر پڑا۔

❁......☆☆......❁

''بجلی کی رو میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔'' روبی نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

''میں الیکٹریشن کو بلاتا ہوں۔'' جواد نے کہا۔

''اب تو بہت دیر ہوگئی اس وقت کسی الیکٹریشن کا ملنا مشکل ہوگا۔'' روبی نے کہا۔

''میں کیا کروں، میں مجبور ہوں۔'' جواد نے کہا اور سر جھکا لیا۔

''آپ کو کیا ہوگیا ہے؟'' روبی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''خدانخواستہ کسی سے لڑائی تو نہیں ہوگئی۔''

''نہیں۔''

''پھر کیا ہوا ہے۔'' روبی بولی۔

''کچھ نہیں ہوا۔'' جواد ذرا سا تلخ لہجے میں بولا۔

روبی نے مزید گفتگو بے کار سمجھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی، تھوڑی دیر بعد اندھیرا چھا گیا جواد نے اٹھ کر بے خیالی میں کئی بار بلب روشن کرنے کے لیے بٹن دبایا مگر تاریکی کا غلبہ بدستور رہا اچانک اسے خیال آیا کہ بجلی کی رو میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی اس نے موم بتی روشن کی اور الیکٹریشن کا فون نمبر تلاش کرنے لگا تھوڑی دیر بعد میز پر کھانا چنا گیا اور وہ ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

''میرا بہنوئی تبدیل ہو کر اسی شہر میں آ گیا ہے۔'' روبی نے جواد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپا نصرت کا شوہر ریاض۔''

''جی ہاں۔'' روزی نے جواب دیا۔

''کہاں ٹھہرے ہیں؟'' جواد نے پوچھا۔

''گلشن کالونی میں اپنے بھائی کے یہاں۔'' روزی نے کہا۔ ''ابا جان نے فون پر اطلاع دی تھی میں نے ان کو کل کھانے پر مدعو کیا ہے۔''

''کسی چیز کی ضرورت۔''

''کل بتاؤں گی۔'' روبی نے جواب دیا۔

اس کے بعد دونوں خواب گاہ میں چلے گئے چونکہ بجلی کا نظام خراب تھا اس لیے موم بتیوں سے کام چلایا گیا اور ان کی مدہم روشنی میں روزی کے حسن میں اور بھی اضافہ

ہو گیا۔

''روبی۔'' جواد الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں تم سے اس آدمی کے متعلق دریافت کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس آدمی کے متعلق۔'' روبی نے گھبرا کر پوچھا۔

''رفعت...... ہاں رفعت۔'' روبی کانپ گئی مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ جواد کے سامنے اپنی تخیل پسند اور رومانی طبیعت کو بے نقاب کر سکے۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی اسی دوران ایک بار اس کے ہونٹوں پر ایک دلفریب تبسم بھی ظاہر ہوا اس نے جواد کی پریشانی کی وجہ جان لی تھی مگر اچانک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپ ٹپ گرنے لگے اور ہچکیاں بندھ گئیں، اگر اس وقت حقیقت ظاہر ہو جاتی تو عین ممکن تھا جواد مطمئن ہو جاتا مگر روبی نے سر پر چادر اوڑھ لی اور روتے روتے سو گئی۔

⊛......☆☆......⊛

جواد کے افق حیات پر بدستور تشویش اور پریشانی کے جھکڑ چلتے رہے اور بے پایاں فکر کی بجلیاں کوندتی رہیں اگلے روز اس نے دفتر سے چھٹی کر لی جواد صبح سویرے دعوت کے انتظام میں مصروف ہو گیا دوپہر کے قریب نصرت اور اس کا شوہر آئے ایک دو گھنٹے خوب گہما گہمی رہی جب نصرت واپس جانے لگی تو روبی سے کہنے لگی۔ ''اگر رفعت کے متعلق کوئی اطلاع ہو تو مجھے بھی خبر دینا۔''

نصرت چلی گئی مگر جواد پاگلوں کی طرح دروازے پر کھڑا رہا۔؟

''رفعت...... رفعت۔'' یہ لفظ اس کے دماغ کو گرم لوہے کی طرح داغ رہا تھا وہ بوکھلایا ہوا واپس ڈرائنگ روم میں آیا اور صوفے پر گر پڑا روبی ملازمہ کی مدد سے برتن سنبھال رہی تھی۔

اتنے میں ڈاکیہ آیا وہ ڈاک لایا تھا ایک لفافہ پر لفظ رفعت بڑے نمایاں حروف میں لکھا ہوا تھا روبی نے جھک کر وہی لفافہ اٹھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' جواد جوش میں اٹھ کھڑا ہوا جذبات کی شدت سے اس کا تمام جسم لرز رہا تھا۔

''میرے نام...... ایک خط۔'' روبی نے حیران ہو کر کہا۔

''میں...... میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

روبی نے خاموشی سے لفافہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جواد نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔

''رفعت عورتوں کا ایک ادارہ ہے جہاں انہیں ایسی ہدایات دی جاتی ہیں کہ وہ اپنے گھر کو ایک چھوٹی سی جنت بنا سکیں۔''

جواد نے شرمسار نگاہوں سے روبی کی طرف دیکھا اور روبی کی آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے۔

''میں تخیلات کے بندھنوں میں گرفتار رہتی ہوں۔'' روبی نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''اس روز میں نے آپ سے مذاق کیا تھا میری زندگی کے مالک اور میری محبت کے معبود صرف آپ ہیں۔'' جواد یہ سن کر مردوں سے زندوں میں آ گیا اور اس کے دل سے تمام بوجھ اتر گیا۔

''روبی۔'' اس نے کہا۔ ''رات کو پھر وقت ہو گی اب لگے ہاتھوں بجلی کو بھی درست کر دوں۔''

تھوڑی دیر کے بعد اس کے ہاتھ سیاہ ہو چکے تھے اور وہ ہمہ تن بجلی کی رو کو درست کرنے میں مصروف تھا مگر آج روبی کو اس کے میلے ہاتھوں میں بھی بے پناہ حسن دکھائی دے رہا تھا۔

احمقوں کا ٹولہ

ریاض بٹ

مجرم چاہے کتنا بھی چالاک کیوں نہ ہوں وہ جرم کے بعد اپنا کوئی نہ کوئی سراغ ضرور چھوڑ جاتا ہے اگر قانون کے محافظ چست و چالاک ہوں تو وہ ایک معمولی نکتے کو لے کر مجرم تک پہنچ جاتے ہیں۔

نئے افق کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے صفحات ایک دیہاتی پولیس انسپکٹر کی ڈائری کا ایک ورق

کہتے ہیں میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ازدواجی زندگی کی گاڑی اسی وقت صحیح معنوں میں چلتی ہے جب دونوں میں مکمل ذہنی ہم آہنگی ہو ورنہ...... یہ ایک کہانی کی ابتدا تھی اور یہ سب میں ایک کتاب میں پڑھ رہا تھا۔ ابھی میں یہاں تک ہی پہنچا تھا کہ اچانک کانسٹیبل وزیر کی شکل داخلی دروازے میں نظر آئی۔

''سر...... میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''آ جاؤ' بھئی۔'' میں نے کتاب کو ایک طرف میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''سر میں ذرا گھر جانے کی اجازت چاہتا ہوں' ڈیڑھ دو گھنٹوں میں آ جاؤں گا۔''

میں نے دیکھا کہ اس نے ہاتھ میں کپڑے کا ایک چھوٹا سا تھیلا پکڑا ہوا ہے۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سب خیریت ہے نہ...... اور بھئی اس تھیلے میں کیا ہے؟''

''سر کیا بتاؤں ان اشتہاروں نے شوہروں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''سر اس تھیلے میں تین چار قسم کی کریمیں ہیں۔''

پھر اس نے تھیلے میں سے چار قسم کی کریمیں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

''یہ کریمیں کیوں اٹھائے اٹھائے پھر رہے ہو؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''یہ بیگم کی فرمائش ہے' کہتی ہے ان سب کو خوبصورتی کے لیے ضروری دکھایا گیا ہے۔ اشتہاروں میں۔''

سپاہی قدیر بازار جا رہا تھا' میں نے اس سے منگوائی ہیں اور اب گھر دینے جا رہا ہوں۔''

میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ کریمیں دوبارہ تھیلے میں ڈال کر چلا گیا۔ ان دنوں میرے پاس کوئی کیس نہیں تھا۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ میں نے کانسٹیبل وزیر سے کہا تھا۔ کہ وہ سپاہی قدیر کو بھیج دے۔

چند لمحوں بعد وہ میرے سامنے موجود تھا۔ میں اس وقت ہنسی مذاق کے موڈ میں تھا۔

''قدیر سنا ہے آج کل تم بیوٹی کریمیں سپلائی کر رہے ہو؟''

''سر وہ تو میں وزیر صاحب کے کہنے پر لایا تھا۔ ویسے ایک بات ہے' سر اگر آپ جان کی امان دیں تو چھوٹے منہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سے بڑی بات نکال دوں۔"
میری ہنسی نکل گئی۔ میں نے دیکھا اس نے چہرہ ایسے بنایا ہوا تھا' جیسے کوئی خادم کسی بادشاہ کے روبرو حاضر ہو۔
"بھئی اجازت ہے۔"
"سر' یہ جوزیر صاحب ہیں نہ' بس نام کے وزیر ہیں' لگتا ہے بیگم سے ڈرتے ہیں۔"
"وہ تو ہر شریف آدمی ڈرتا ہے۔ دوسرے تمہیں پتا نہیں ہے کہ وزیر کی بیگم پوری ملکہ ہیں اور اس تھانے کے لیے مخبری اور تفتیش کرتی ہے۔ یعنی ہماری تفتیش میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ خیر یہ بات تو برسبیل تذکرہ نکل آئی تم بتاؤ یہ عورتیں خوبصورت ہونے کے باوجود بیوٹی کریموں کا سہارا کیوں لیتی ہیں؟"
"دراصل یہ چاہتی ہیں کہ ان کے میاں صرف ان کے ہی ہو کر رہیں اور وہ دنیا کی سب سے خوبصورت عورت نظر آئیں۔ ابھی ہماری یہ گپ شپ جاری ہی تھی کہ سپاہی انور نے آ کر اطلاع دی۔
"سر' مین بازار میں واقع ایک پرائیویٹ بینک میں ڈکیتی اور قتل کی واردات ہوگئی ہے۔ بینک سے دو بندے اطلاع لے کر آئے ہیں۔"
میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلالیا۔ یہ دونوں بینک میں ملازم تھے۔
ایک کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی' اس نے بالوں کو خوب تیل لگا کر گویا اپنے سر پر چپکایا ہوا تھا' رنگ اس کا گندمی تھا۔ دوسرا بندہ ادھیڑ عمر تھا۔ صحت اچھی تھی' ہاتھ پیر مضبوط تھے۔
دونوں شکل سے گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔
انہوں نے بتایا کہ ایک گھنٹہ پہلے دو ڈاکو' جن کو پہلے پہچانا نہیں گیا' کیونکہ انہوں نے موسم کے لحاظ سے گرم چادریں اوڑھی ہوئی تھیں۔ بینک میں داخل ہوئے' اچانک انہوں نے کیشیئر کے پاس پہنچ کر چادروں سے ہاتھ نکالے ان میں ریوالور دبے ہوئے تھے۔ ایک نے کیشیئر سے کہا سارے پیسے نکال کر میز پر رکھ دو' دوسرے نے باقی لوگوں کی طرف ریوالور تانتے ہوئے کہا۔
اگر کسی نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو......
پھر اس نے ایک ہوائی فائر کیا تھا۔ ریوالور میں سائیلنسر لگا ہوا تھا' کیشیئر' جس کا نام طارق تھا نے سارا کیش نکال کر میز پر رکھ دی۔ ڈاکو نے پتہ نہیں کہاں سے ایک تھیلا نکالا اور سارا کیش اس میں ڈال لی۔
پھر اس نے اچانک کیشیئر کے سینے میں گولی اتار دی۔
ڈاکو بینک کا عقبی دروازہ کھول کر فرار ہوگئے۔ یہ دروازہ ایک گلی میں کھلتا تھا۔ جہاں شاذونادر ہی کوئی بندہ نظر آتا تھا۔
لگتا تھا' ڈاکو پوری پلاننگ کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں سے کچھ باتیں ہمیں بینک میں جا کر تفتیش کرنے پر پتہ چلی تھیں۔
جہاں میں اور سپاہی انور گئے تھے۔
ایک سوال کا جواب کوئی بھی نہ دے سکا' کہ جب کیشیئر (طارق) نے سارا کیش ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا تھا تو پھر انہوں نے اسے گولی کیوں ماری؟
میں نے جب طارق کا (جو اس وقت تک ایک لاش میں تبدیل ہو چکا تھا) معائنہ کیا' تو مجھے پتہ چلا کہ گولی اس کے دل میں لگی ہے جس نے آناً فاناً اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔
بہرحال ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے قریبی سرکاری اسپتال روانہ کر دی تھی۔ میں نے گارڈ کے متعلق استفسار کیا تو پتہ چلا کہ گارڈ اس وقت اپنی گن رکھ کر ضرورت کے تحت واش روم میں گیا ہوا تھا۔ ایک ڈاکو نے سب سے پہلے اس کی گن پر قبضہ کیا تھا۔
اور کیشیئر کے پاس پہنچ کر اس نے گن اس کے سامنے پڑی ہوئی میز کے ساتھ لگا دی تھی۔ یہ سب باتیں مجھے ایک ذرا دلیر قسم کے شخص نے بتائی تھیں۔ میں اسے ایک طرف لے گیا تھا اور سوال و جواب کیے تھے۔
اس نے ایک بات یہ بھی کہی تھی کہ تھانے دار صاحب

میرے دل نے کہا تھا کہ میں ڈاکوؤں کے ساتھ بھڑ جاؤں لیکن پھر دماغ نے کہا کہ مفت میں جان گنوانے کا کیا فائدہ؟ بہر حال کچھ تفصیلات لے کر میں تھانے میں واپس آ گیا۔

یہاں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ گارڈ سے جب ہم نے سوال و جواب کیے تو وہ اچانک بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے انور کے ساتھ اسے قریبی سرکاری اسپتال بھیج دیا تھا۔ بات تو حیرانگی والی تھی...... اگر وہ اتنے ہی کمزور دل کا مالک تھا تو اسے گارڈ رکھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اب اندر خانے کیا معاملہ تھا' کیا کہانی تھی۔ یہ تو فی الفور معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہی آفس بوائے کو بلا کر کانسٹیبل وزیر کے متعلق استفسار کیا۔

کچھ دیر کے بعد کانسٹیبل میرے سامنے تھا۔

میں نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا' تو وہ جھینپ گیا اور اس کے ہونٹوں پر ایک خجل سی مسکراہٹ آ گئی۔

"کیوں بھئی اس قدر شرمندہ شرمندہ کیوں ہو؟"

"سر کیا بتاؤں میں نے بیوی سے کہا کہ تم پہلے ہی اتنی خوبصورت' حسین اور سندر ہو تمہیں ان کریموں کی کیا ضرورت ہے' کہنے لگی' تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"چلو چھوڑو' اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔" پھر میں نے اسے بینک میں ڈکیتی کے متعلق سب کچھ بتایا تھا۔

"سر...... یہ بات واقعی حیرانگی والی ہے کہ جب ڈاکوؤں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا تو پھر کیشیئر کو گولی مارنے کی کیا ضرورت تھی اور گارڈ کے رویے پر بھی ایک سوالیہ نشان ہے؟" کانسٹیبل وزیر نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہی سوال تو میرے ذہن میں بھی کھلبلی مچائے ہوئے ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔"

"لیس سر"

نظم

اداس بانہیں
تاریک راہیں
ٹھنڈی ہوائیں
بارش کی جھنکار
ہاتھ میں چائے کی مہکار
بلاتی ہیں تجھے جاناں
سپنوں کو لوری دینے
ہاتھ میرے کو حنا سے رنگنے
خوباں کی مورت ہے
ٹھہر جاؤ پلکوں پر میری
کیونکہ
دیکھے بنا تجھے
نہیں آتی نیند مجھے

☆☆

نظم

جی اداس ہے کچھ ایسے
ٹوٹے ہوں دو دل جیسے
بات چھیڑی اس نے کچھ ایسے
جھلمل کرتے آنسو بہتے ہیں جیسے
کچی عمر کی ہوں پکی یادیں
کہتی ہیں کاجل آنکھیں کچھ باتیں
روٹھ کر منا لیتا ہے وہ
اداس دل کو سنبھال لیتا ہے وہ
بس یہی بات من کو بھائے میرے
ساتھ اس کا ہو
دیدار اس کا ہو

عنبرین اختر...... لاہور

"ایک بات اور بھی ہے وزیر......" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کونسی سر۔"

"کیشیئر کے گھر والوں کی طرف سے ابھی کوئی سامنے نہیں آیا۔"

"کیا مطلب!" اس نے حیران نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"بالکل' بینک میں بھی کوئی نہیں تھا اور ابھی تک تھانے میں بھی کوئی نہیں آیا۔"

"سر یہ تو واقعی اچنبھے والی بات ہے۔"

"تم سپاہی قدیر کو ساتھ لے جاؤ اور اس کے گھر جا کر پتہ کرو کہ کیا معاملہ ہے۔"

پھر میں نے اسے کیشیئر طارق کا پتہ بتایا تھا اور وہ اپنے مشن پر چلا گیا تھا۔

یہاں ایک دو باتوں کی وضاحت کردوں' سپاہی انور تو گارڈ کے ساتھ اسپتال چلا گیا تھا کیونکہ یہ معاملہ اچانک ہوا تھا۔ یہ بات تو پہلے ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔

اس لیے مجھے بینک سے ٹیلی فون کر کے سپاہی نواز کو بلانا پڑا تھا۔ جو لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے گیا تھا۔

ہمارے تھانے سے تقریباً دو کلو میٹر دور ایک فلور مل تھی وہاں نزدیک ہی فیملی کوارٹر اور اکیلے رہنے والے مردوں کے لیے ایک ایک کمرے کے کوارٹر تھے۔

طارق (مقتول) کا جو پتہ ہمیں بینک سے ملا تھا' وہ انہی کوارٹروں میں سے کسی ایک کا تھا۔

تین گھنٹے بعد کانسٹیبل وزیر واپس آیا لیکن وہ اکیلا واپس نہیں آیا' بلکہ اس کے ساتھ ایک درمیانے جسم کا چوبیس سالہ جوان بھی تھا۔ یہ مقتول کا روم میٹ تھا۔

جوان کی آنکھیں اسے ایک ذہین اور وفادار انسان کے روپ میں پیش کر رہی تھیں۔

کانسٹیبل وزیر کو باہر بھیج کر میں نے اسے اپنے سامنے بٹھالیا۔ میں نے اس کے ذہن سے تھانے کا خوف دور کرنے کے لیے ہلکی پھلکی گفتگو سے آغاز کیا۔

"جوان تمہارا نام کیا ہے؟"

"جناب' وکیل۔"

"اچھا' تو تم وکیل ہو۔"

"بس تھانیدار صاحب نام کا وکیل ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"تمہیں پتہ تو چل چکا ہوگا' کہ تمہارے روم میٹ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آچکا ہے۔"

"جی۔" اچانک وہ اداس ہوگیا۔

"تم طارق کے متعلق جو جانتے ہو وہ میرے علم میں لے آؤ۔"

"تھانیدار صاحب' طارق نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ میں آپ کے گوش گزار کردیتا ہوں۔ چند لمحے وہ دیوار پر لگی بابائے قوم کی تصویر کو دیکھتا رہا' شاید ذہن میں الفاظ کو ترتیب دے رہا تھا اور پھر جب وہ بولا تو اس کی آواز غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"تھانیدار صاحب' طارق ایک شریف اور مظلوم انسان تھا۔ ہم دونوں کا تعلق ایک ہی گاؤں سے ہے بلکہ آپ ہمیں پڑوسی سمجھ لیں۔ طارق کی ماں اسے دس سال کی عمر میں داغ مفارقت دے کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملی تھی۔ باپ نے اسے پالا پوسا' اعلیٰ تعلیم دلوائی...... ایک دفعہ ماں نے اس کی کسی بات پر خوش ہو کر اسے دعا دی تھی' کہ جا بچہ ہمیشہ دولت میں کھیلو...... وہ واقعی دولت میں کھیل رہا تھا۔ میرا مطلب ہے' لاکھوں روپے اس کے ہاتھوں سے گزر رہے تھے۔ تھانیدار صاحب دعائیں تو ایسے بھی قبول ہوتی ہیں' پھر ماں تو ماں ہی ہوتی ہے' باپ جتنا بھی خیال کرے' پیار کرے' ماں کی کمی تو پوری نہیں کرسکتا' بہرحال اس کے دل میں تشنگی تو تھی' اگر اس کی اگلی زندگی ٹھیک گزرتی تو شاید وہ اتنا دکھی نہ ہوتا' ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوتا۔"

میں غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی طرف سے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں

نے محسوس کرلیا تھا کہ اس کی پلکیں بھیگ چکی ہیں۔
اس کے بعد اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ بتانا ابھی مناسب نہیں لیکن چند سوال وجواب آپ کی نذر کردیتا ہوں۔
"وکیل...... تمہارے خیال میں ڈاکوؤں نے کیشیئر (طارق) کو گولی کیوں ماری؟ جبکہ بینک میں موجود گواہوں کے بیانات سے یہ بات میرے علم میں آئی تھی کہ اس نے سارا کیش ڈاکوؤں کے حوالے کردیا تھا۔
"میں اس کے متعلق یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہوسکتا ہے طارق نے دونوں یا کسی ایک ڈاکو کو پہچان لیا ہو......" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔
"نقطہ تو تم نے وکیلوں والا نکالا ہے' بہرحال یہ بات بھی ہوسکتی ہے...... اس کے علاوہ بھی کوئی بات تمہارے ذہن میں آرہی ہے۔"
"تھانیدار صاحب' آپ خود سمجھدار ہیں۔ میں اس معاملے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"
اب کہنے سننے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ ایک بات کی وضاحت کردوں کہ وہ گاؤں طارق کی بیوی کو اطلاع دینے جارہا تھا۔
جی ہاں' طارق کی بیوی گاؤں میں اپنے سسر کے ساتھ رہتی تھی۔
میں یہ چاہتا تھا کہ پوسٹ مارٹم کے بعد لاش آنے تک لاش لینے کوئی نہ کوئی آجائے۔
پھر ہوا یہ کہ لاش' پوسٹ مارٹم رپورٹ اور مقتول کا باپ (کرامت) ایک ہی وقت آگئے اور میں کافی الجھنوں سے بچ گیا۔
میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش کرامت کے حوالے کردی جو دو بندوں کے ساتھ آیا تھا۔
گاؤں کا پتہ تو میرے پاس آہی گیا تھا۔ میں نے کرامت سے کہا میں دو تین دنوں کے بعد تمہارے گاؤں آؤں گا۔
میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں بہت سے سوال

اجنبی

کتنا اچھا ہوتا
ہم اجنبی ہی رہتے
کتنا اچھا ہوتا
نگاہوں سے اوجھل ہی رہتے
دل بستگی میں سکوں بھی گنوادیا
عجز ہمت میں خود کو بھی ہرادیا
رنجور لمحوں میں وہ تیرا
آغوش وداع یاد آنا
سپاس میرا یوں کرنا
اک دم سرد یوں بھرنا
جب یاد کرنا مجھے
بوسہ پیار کا دینا مجھے
خفا جب مجھ کو کرنا
قرار نہ خود کو آنا
پھر کہاں تھا
وہ اک اجنبی
تھا وہ اپنا اپنا سا

......☆☆......

نظم

عجیب چاہتوں کا اک جہاں
پھول نگری اجڑی وہاں
چنچل گلاب کلیاں
گلابی شاموں میں
سوکھے پتوں جیسی گلیاں
ہر حرف مٹ جائیں
ساتھ تیرا نہ چھوڑ پائیں
پہروں انتظار تیرا
ملیں اس حیلے سے
تو بھی ہو بے قرار میرا

عنبرین اختر ...... لاہور

ہیں لیکن وہ خاموشی سے چلا گیا تھا اور اپنی سوالیہ آنکھیں میرے ذہن میں نقش کر گئی تھیں۔

قارئین پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے میرے اندازے کی تصدیق کردی...... گولی نے دل کے پرخچے اڑا دیئے تھے اور چند لمحوں میں ہی طارق اس دنیا سے اس دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ جب اس قسم کی واردات ہوتی ہے تو لامحالہ ہمارے ذہن میں ایک تو......؟ بدمعاشوں کا خیال آتا ہے دوسرے پیشہ ور ڈاکوؤں کی طرف دھیان جاتا ہے۔

ان دنوں پیشہ ور ڈاکوؤں کا کوئی گروہ ہماری لسٹ پر نہیں تھا' پھر لے دے کے......؟ بدمعاش ہی رہ جاتے تھے۔ اس لیے میں نے انہیں ہی تختہ مشق بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں بے گناہوں پر تشدد کا قائل نہیں تھا۔

لیکن......!

یہ......؟ بہت ڈھیٹ' جھوٹے اور اپنی دھن کے پکے ہوتے تھے۔

سپاہی قدیر ان کے متعلق کہتا تھا کہ سر چور چوری سے جاسکتا ہے لیکن ہیرا پھیری سے نہیں۔

شام تک تھانے میں کافی رونق ہوگئی۔

سپاہی انور اور قدیر نے آکر مجھے ان کے متعلق بتایا کہ کون کون آیا ہے' اور کون غیر حاضر ہے۔

ایسی واردات کے بعد ہمیں غیر حاضروں پر بڑا غصہ آتا تھا' کیونکہ ہم نے ان کو پابند کیا ہوتا تھا کہ وہ تھانے میں بتائے بغیر کہیں نہ جائیں لیکن وہ کبھی کبھی ہیرا پھیری کر جاتے تھے۔

بہر حال میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا اور رات بھر کے لیے......؟ بدمعاشوں کو رات والے عملے کے حوالے کر گیا اور ان کو یہ تاکید کر گیا کہ ہتھ ذرا ہولا رکھیں۔

خیر یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ پولیس والوں کا ہتھ اتنا بھی ہولا نہیں ہوتا۔ اگلی صبح جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو رپورٹ دینے شبینہ ڈیوٹی والا اے ایس آئی شاہد آیا۔

یہاں یہ بات بھی بتا تا چلوں کہ اے ایس آئی ابرار آج کل کسی کیس کے سلسلے میں کوہ جٹ میں مصروف تھا۔

''شاہد کیا نتیجہ نکلا۔ کیا کوئی پاس بھی ہوا یا سارے نالائق ہی نکلے۔''

''سر یہ اتنے بھی نالائق ثابت نہیں ہوئے......'' وہ ذرا رکا تو میں ہمہ تن گوش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب؟''

''سر ان میں سے تین نے چھوٹی موٹی وارداتوں کا اقرار کر لیا۔''

''اچھا کون سی وارداتیں بھئی۔''

''سر! نادر یہ بات مانا کہ اس نے چاقو دکھا کر کچھ دن پہلے ایک سیٹھ کو لوٹ لیا تھا جبکہ شرافت اور ساجد نے اقرار کیا کہ انہوں نے مار کٹائی میں دو بندوں کو زخمی کر دیا تھا۔

قارئین' آپ حیران ہو رہے ہوں گے' کہ بات تو بینک ڈکیتی اور کیشیئر کے قتل کی تھی یہ نیا چرخہ کیا معنی رکھتا ہے۔ تو جناب' آپ کی یہ حیرت رفع کر دیتے ہیں۔

دراصل جب اس قسم کی واردات کی ہم بستہ ب بدمعاشوں سے تفتیش کرتے تھے تو ان کو بغیر تکلف رکھے یہی کہتے تھے کہ تم ہی اس واردات میں ملوث ہو' اس طرح وہ اگر واردات میں ملوث نہیں بھی ہوتے تھے تو اپنی چھوٹی موٹی وارداتوں کا اقرار کر لیا کرتے تھے۔

اگر ان کی رپورٹ درج نہیں ہوتی تھی تو ہم ان کو سخت سست کہہ کے چھوڑ دیتے تھے یہ ہماری مجبوری ہوتی تھی اور ہماری مجبوری کو وہ سمجھتے تھے۔

لیکن ہم اتنے بھی مجبور نہیں ہوتے تھے ہم کسی نہ کسی طرح ان کو استعمال کر ہی لیتے تھے۔ میں نے اپنے کمرے میں بلا لیا اور ساتھ ہی کانسٹیبل وزرا اور سپاہی قدیر کو بھی اس کے دائیں اور بائیں کھڑا کر دیا۔

میرے سامنے کاغذ پر غیر حاضر بستہ ب بدمعاشوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔

یہ نصیر عرف نصیرو' لیاقت عرف چندہ' اور رفیق عرف فیکا تھے۔

میں نے نادر کی مکارانہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! تم نے بہت بڑا کام کیا ہے.......؟"

"جناب! مائی باپ ان دنوں ذرا کڑکی تھی، اس لیے سیٹھ کو دوڑ دینی پڑی تھی۔ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"او جل ککڑی کی اولاد! تم کسی قابل رہو گے تو کچھ کرو گے نہ۔ سپاہی قدیر نے اس کے کاندھے پر ایک دھول جماتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"ہائے میں مرگیا۔ جناب آپ انہیں روکیں۔ ان کا ہاتھ تو ان سے بھی بھاری ہے۔ جنہوں نے رات......"

"تمہاری خاطر تواضع کی تھی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں اس کا ادھورا فقرہ پورا کر دیا۔

وہ بھیگی بلی بنا کھڑا رہا۔ جانتا تھا کہ اگر اس نے زیادہ زبان کھولنے کی کوشش کی تو ہم اسے مرغا بنا کر آٹھ دس اینٹیں اس کی پیٹھ پر رکھ دیں گے۔

حالانکہ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم تو اسے تفتیش کی بھٹی میں ڈال کر نرم کرنا چاہتے تھے تاکہ جس طرف چاہیں موڑ سکیں اور اس وقت وہ ہماری حسب منشا نرم ہو چکا تھا۔

نادر! تمہاری صرف ایک صورت میں جان چھوٹ سکتی ہے کہ تم ہمیں نصیر، چندہ اور فیکا کا پتہ بتا دو۔" میں نے اس کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب جناب! آپ کے پاس ان کا پتہ نہیں ہے؟ اس نے معصومیت سے کہا۔

"اوہ بے وقوف! اگر وہ اپنے موجودہ پتے پر ہوتے تو رات کو تمہارے ساتھ نہ دعوت اڑا رہے ہوتے۔"

"جناب! آپ بالکل فکر فاقہ نہ کریں۔ میں بہت جلد آپ کو ان کے متعلق بتا دوں گا۔ آپ صرف مجھے تین دن دے دیں۔" نادر نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے......" میں نے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔

اب مجھے امید تھی کہ وہ اپنی سی پوری کوشش کرے گا۔ ویسے مجھے صرف شک تھا اور ان پر غصہ بھی کیونکہ وہ تھانے میں بتائے بغیر غائب تھے۔

بادل

برستے ان بادلوں میں
تلاش تیرا عکس کروں
آنچل اڑاتی ان ہواؤں میں
ساتھ تیرے رقص کروں
اشک بہاتے ان نینوں میں
وفا تیری نقش کروں
جو سرشام غمازی تیری کھاتے ہیں
تحریر میری کو جو گیلا کر جاتے ہیں
روک لیتے ہیں قلم میرا
کہاں لکھتے ہیں نام تیرا
کیسے کہوں ہر شے پکارتی ہے تجھے
اور گیت ملن کے سناتی ہے تجھے
امرت میرے پیار کا نقش تیرے دیدار کا
سونی ان آرزوؤں کو
پلکوں کی ان باڑوں کو
جو کہتی ہیں مجھے
برستے ان بادلوں میں
تلاش تیرا عکس کروں

عنبرین اختر...... لاہور

نادر نے تین دن مانگے تھے لیکن اس دوران ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے، ہر طرف تفتیش کے گھوڑے دوڑائے تھے۔ اگلے دن میں کانسٹیبل وزیر کو لے کر مقتول کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں کے تھانے میں بتانا ضروری تھا۔ وہاں کے تھانے دار چوہدری لہراسپ نے اپنا ایک کانسٹیبل بھی ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ پتہ مجھے وکیل سمجھا گیا تھا۔

جو گھر ہماری منزل تھا وہ کھلا کھلا گھر تھا۔ صحن میں جامن، آلو بخارے کے درخت لگے ہوئے تھے۔

حجرہ ٹائپ بیٹھک میں مقتول کے باپ نے ہمیں بٹھایا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود چائے وغیرہ لے آیا۔ ہم چائے وغیرہ پینے کے بعد اصل موضوع کی طرف

آ گئے۔

''ہاں تو کرامت صاحب' جس دن آپ میرے پاس تھانے میں اپنے بیٹے کی لاش لینے آئے تھے' اس دن میں نے آپ کی آنکھوں میں کچھ سوال پڑھ لیے تھے۔ اس وقت دیکھیں' میں خود چل کر آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ آپ کھل کے میرے ساتھ بات کریں اور چھوٹی سے چھوٹی بات بھی میرے گوش گزار کر دیں۔''

''تھانیدار صاحب میں تو سراپا سوال ہوں۔ میں نے طارق کو ماں اور باپ کا پیار دینے کی کوشش کی تھی' اس کی خاطر میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ جس فیلڈ میں جانا چاہتا تھا' میں نے اسے وہاں پہنچا دیا۔ اس کی خوشی میں' میں خوش تھا۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ طارق نے سب کچھ ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا تھا پھر انہوں نے اسے کیوں مارا۔ ظلم کی یہ داستان کیوں رقم کی۔ ان کو ذرا ترس نہ آیا۔''

وہ ایک دکھی باپ تھا اس کا جوان جہان بیٹا اس سے چھن گیا تھا۔

میں نے اسے بولنے دیا' دل کا دکھ پانی بن کر اس کی آنکھوں سے رواں دواں ہو گیا۔ یہ پانی بھی عجیب شے ہے۔ اگر آنکھوں سے رواں نہ ہو تو انسان کا دل پھٹ جائے۔ جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو میں نے اس دکھی باپ کے زخمی اور غموں سے چور چور دل پر ہمدردی کے پھائے رکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں...... کرامت صاحب' میں ایک تھانے دار ہونے کے علاوہ انسان بھی ہوں۔ مجھے آپ کے دکھ کا پورا پورا احساس ہے' میں آپ کے بیٹے کو تو واپس نہیں لا سکتا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے قاتلوں کو ضرور قانون کے کٹہرے میں لا کر دم لوں گا' انشاء اللہ۔

وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جن میں دکھ' غم اور تشکر شامل تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ بوجھل دل سے بولا۔

''تھانیدار صاحب' ڈاکو تو بینک لوٹنے آئے تھے لیکن میں نے آپ کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ آپ اس معاملے کو کسی اور رنگ میں دیکھ رہے ہیں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

''آپ کے خیال میں وہ رنگ کونسا ہو سکتا ہے؟''

''یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ البتہ مجھے محسوس یہی ہو رہا ہے کہ آپ ڈاکوؤں کے علاوہ بھی کچھ سوچ رہے ہیں۔''

اس کی بات بالکل صحیح تھی لیکن میں خود کلیئر نہیں تھا۔ کوئی نہ کوئی بات تھی جو مجھے کھٹک رہی تھی۔

خیر اسے آپ میری چھٹی حس کا کرشمہ کہہ لیں یا تھانیدارانہ حس کا کمال سمجھ لیں بہرحال جو بھی تھا اسے ابھی کوئی معنی نہیں پہنائے جا سکتے تھے۔

میں نے اسے کہا کہ وہ اپنی بہو کو بھیج دے۔

''جناب وہ تو سکتے کی حالت میں ہے اور اسپتال میں داخل ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سچ ہے' تھانیدار صاحب جب سے اس کو پتہ چلا ہے کہ اس کے خاوند کو بینک ڈکیتی کے دوران ڈاکوؤں نے مار دیا ہے اس وقت سے وہ سکتے کی حالت میں ہے۔''

''اوہ بڑا افسوس ہوا۔ کرامت صاحب' دراصل میں نے اس سے چند باتیں کرنی تھیں۔''

''جناب فی الحال تو یہ ممکن نہیں رہا۔'' کرامت نے زخمی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بہرحال جو پلان ہم لے کر آئے تھے وہ فیل ہو گیا تھا۔

واپسی میں ہم نے طارق (مقتول) کی بیوہ فردوس کو اسپتال میں جا کر دیکھا تھا۔ اس کا علاج کرنے والی لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ فردوس کی کیفیت کے متعلق کچھ نہیں جا کہا سکتا کہ کب تک ایسی رہے گی' ہم مختلف ٹیسٹ وغیرہ کر رہے ہیں۔

وکیل نے جو باتیں بتائی تھیں ہم نے ان کی تصدیق فردوس سے کرنی تھی۔

لیکن!

یہاں تو حالات ہی اور تھے۔

تھانے واپس آکر میں نے سپاہی نواز سے کہا کہ وہ اسپتال جاکر گارڈ کو دیکھ آئے' وہاں اس کی نگرانی کے لیے سپاہی انور موجود تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہاں سے سپاہی نواز کا فون آیا کہ گارڈ کی حالت اب کافی حد تک ٹھیک ہے وہ بیان دینے کے قابل ہے۔

میں نے محرر کو ساتھ لیا اور وہاں پہنچ گیا۔ گارڈ جس کا نام عبدالقیوم معلوم ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی پریشان نظر آنے لگا۔

میں نے اسے جھوٹی تسلی دلاسے دیئے' کیونکہ اس کی بیماری کے پیش نظر وقت کا یہی تقاضا تھا۔

اس نے اٹک اٹک کر جو بیان محرر کو لکھوایا' وہ اس کی زبانی سنیے۔

''تھانیدار صاحب' ایک دن ایک آدمی میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ تم فلاں بینک میں سیکیورٹی گارڈ ہو؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا تم ہمارا ایک کام کرو...... میں حیران و پریشان تھا کہ میں اس بندے کو جانتا تک نہیں' یہ مجھ سے کون سا کام لینا چاہتا ہے؟

پھر جب اس نے مجھے کام بتایا تو میں پریشان ہوگیا...... اور اس وقت تو میں تھر تھر کانپنے لگا جب اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

ہم نے بینک میں ڈاکہ تو ہر صورت میں ڈالنا ہے' اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون نہ کیا تو سب سے پہلے ہم تمہیں شوٹ کریں گے اس کے بعد اپنا کام کریں گے...... اور اگر تم نے کسی کو بتانے کی کوشش کی تو ہم تمہارے بچے کو اٹھا کر لے جائیں گے۔

اگر تم نے ہمارا کام کردیا تو تمہیں ہم پانچ ہزار روپے دیں گے بولو منظور ہے یا......؟''

میں خوف اور لالچ کی وجہ سے مجبور ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک ٹائم بتایا تھا کہ اس وقت تم باتھ روم میں چلے جانا۔''

قارئین آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ واردات کرنے والے کتنے اناڑی تھے' اس قسم کی بچکانہ باتیں اور حرکتیں پیشہ ور ڈاکو کسی صورت میں نہیں کرتے۔ بہرحال میں نے عبدالقیوم کی نگرانی کرنے والے سپاہی کو ایک طرف لے جاکر خصوصی ہدایات دیں کہ کوئی شخص اسے ملنے نہ پائے۔ اس پر کڑی نظر رکھے' اس کے علاوہ میں نے سیکیورٹی گارڈ سے اس شخص کا حلیہ پوچھا تھا' جو اس کو ملا تھا۔ محرر نے علیحدہ کاغذ پر حلیہ نوٹ کرلیا تھا۔

تھانے میں واپس آکر میں نے سپاہی قدیر کو اپنے کمرے میں بلالیا۔

''یس سر اس نے مجھے سلیوٹ جھاڑتے ہوئے کہا۔

یہ کاغذ لے جاؤ' اور اس کے اوپر جو حلیہ لکھا ہوا ہے' اس کا خاکہ بنوا کر لے آؤ' ویسے حلیے نے مجھے چونکا دیا تھا۔

اسے پتہ تھا کہ اس نے کس سے خاکہ بنوانا ہے' اپنی کسی تفتیشی کہانی میں' میں نے اس شخص کا ذکر کیا تھا۔ بہرطور شام کو سپاہی قدیر خاکہ بنوا کر لے آیا۔ خاکہ دیکھ کر میں اچھل پڑا' اور مجھے پتہ چلا کہ میں چونکا کیوں تھا؟ یہ خاکہ تو نادر کا تھا جی ہاں وہی نادر جس نے کسی سیٹھ کو لوٹنے کا اعتراف کیا تھا اور جس نے تین دن میں مفرور بستہ ب بدمعاشوں کو ڈھونڈ کر لانے کا وعدہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔

یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا نظر آرہا تھا۔ یہ تو جلیبی کی طرح لگ رہا تھا' اور لگتا تھا اس نے مجھے ابھی جلیبی کی طرح بل دینے ہیں۔ میرے دماغ کی چولیں ہلانی ہیں' او رقارئین......!

میرے اندیشے' وسوسے' اور خیالات حقیقت کا روپ دھار کر اس وقت سامنے آگئے جب میں دوسری صبح تیار ہو کر تھانے پہنچا۔ مجھے اطلاع دی گئی کہ لاری اڈے کے پچھواڑے کسی شخص کی لاش پڑی ہے۔ یہ لاش نادر کی تھی۔ میں نے موقع پر جاکر لاش کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ میرے ساتھ کانسٹیبل وزیر اور سپاہی قدیر بھی تھے۔

ظاہر ہے میں نے ضروری کاغذی کارروائی کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی تھی۔

کانسٹیبل وزیر کو لاش کے ساتھ بھیج کر میں سپاہی قدیر کو لے کر لاری اڈے پر آکر لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ لیکن آدھے گھنٹے کی مغز کھپائی کے بعد بھی کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوسکی۔

کوئی بھی نہ بتاسکا کہ نادر کی لاش کوئی کب' اور کس طرح لاری اڈے کے پچھواڑے پھینک گیا۔ البتہ ہمیں وہاں سے یعنی لاش کے نیچے سے چاندی کی ایک انگوٹھی ملی تھی جس میں کوئی قیمتی پتھر جڑا ہوا تھا۔ پتھر کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ بہرحال یہ ایک اہم سراغ تھا۔

زیادہ امکان یہی تھا کہ جس نے وہاں لاش پھینکی تھی۔ اس کی انگلی سے یہ انگوٹھی گری ہوگی۔

ابھی حتمی طور پر کوئی بات نہیں کہی جاسکتی تھی۔

جب میں تھانے میں واپس آیا' تو اے ایس آئی ابرار میرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا......وہ کورٹ سے فارغ ہو کر آیا تھا۔

''سر...... مجھے پتہ چلا ہے کہ لاری اڈے کے پچھواڑے سے نادر کی لاش ملی ہے۔''

''تمہیں ٹھیک پتہ چلا ہے لیکن اب تمہیں پتہ یہ چلانا ہے کہ نادر کو کس نے مارا ہے۔ مخبروں کو متحرک کرنے کا وقت آگیا ہے۔ یہ کیس تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہی ہوگیا ہے۔

پھر میں نے اسے اس کیس کی اب تک ہونے والی تفتیش سے آگاہ کرنے کے بعد نادر کی لاش کے نیچے سے ملنے والی انگوٹھی اس کے حوالے کی تھی۔

اس کے جانے کے بعد میں میز پر رکھے ہوئے کاغذات کو نمٹانے میں لگ گیا تھا۔

اس دن اس کیس کے سلسلے میں مزید کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ اگلے دن نادر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سنسنی خیز کہانی سنا رہی تھی۔

رپورٹ کے مطابق نادر کی موت رات ایک اور دو

بجے کے درمیان ہوئی تھی، اس کے معدے میں زہریلی شراب کی وافر مقدار پائی گئی تھی۔

نادر کو مجرموں نے ایک مہرے کی طرح استعمال کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ یہ سارا گورکھ دھندا کیا تھا؟ کیا یہ صرف ڈاکہ زنی کی واردات تھی یا.....؟ اس کے اندر کوئی اور کہانی پوشیدہ تھی۔

سب سے بڑا جو سوال بچھو کی طرح میرے دماغ پر ڈنگ مار رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ آخر ڈاکوؤں نے کیشیئر طارق کو کیوں مارا؟

کیا وہ مجرموں کو واقعی پہچان گیا تھا؟

یہ کیس صحیح معنوں میں میرے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا۔

ویسے میرا تجربہ یہ کہہ رہا تھا...... کہ مجرم اناڑی ہیں۔ انہوں نے حماقتیں کر کے اپنا اناڑی پن ظاہر کیا تھا۔ ادھر میں طارق کی بیوہ کی پل پل کی رپورٹ لے رہا تھا۔ جس اسپتال میں اس کا علاج ہو رہا تھا وہاں میرا ٹیلیفونک رابطہ تھا۔

اس کا سکتہ تو ٹوٹ چکا تھا' لیکن وہ کسی کو پہچانتی نہیں تھی۔

میں نے اگلے دن سپاہی قدیر کو ساتھ لیا' اور اسپتال میں پہنچ گیا۔

میں اسے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا..... سپاہی قدیر کو میں نے کمرے کے باہر ہی ٹھہرنے کے لیے کہا۔

میں نے اسے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اور خود کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگی...... میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم کو ڈاکٹروں نے پاگل ڈیکلیئر کر دیا ہے..... اب تمہارا اگلا ٹھکانہ پاگل خانہ ہے..... وہاں پاگلوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا ہے۔''

یہ مصلحت کے پردے میں لپٹا ہوا وہ جھوٹ تھا' جس

سے میں اس کی موجودہ کیفیت سے آگاہی حاصل کرتا تھی۔
کبھی کبھی ایسے حربے ہمیں استعمال کرنے پڑتے تھے۔حالانکہ کسی ڈاکٹر نے مجھے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔
''میں پاگل نہیں ہوں۔ڈاکٹر جھوٹ بولتے ہیں۔'' وہ چیخ اٹھی۔
''اچھا......'' میں ہنس پڑا...... چند لمحے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا...... پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''پھر یہ ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی؟''
''دراصل تھانے دار صاحب' میں مجرم ہوں' لیکن آپ کے قانون میں میرے لیے کوئی سزا نہیں ہے' اگر آپ ایسی باتیں نہ کرتے تو......وہ خاموش ہوگئی۔
''تو تم' پاگل بنی رہتیں۔'' میں نے اس کا ادھورا فقرہ پورا کردیا۔
''پتہ نہیں' میں کیا چاہتی ہوں؟'' وہ اپنے بال نوچنے لگی۔
میں نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
''کم از کم میں تو نہیں چاہتا' کہ تم یہ سب کچھ کرو۔''
اسے نارمل ہونے میں کچھ وقت لگا۔
پھر!
اس نے اپنی کہانی سنائی تھی۔اس میں سے زیادہ تر کہانی مجھے مقتول کیشیئر کا دوست وکیل سنا گیا تھا۔باقی کہانی قیاس آرائیوں پر مشتمل تھی۔
لیکن قارئین یقین کریں' بعد کے حالات نے یہ ثابت کیا تھا کہ تقریباً اسی طرح ہوا تھا۔
ساری کہانی تو آگے آئیگی' یہاں یہ بتا دیتا ہوں' کہ اس کے بعد میں نے ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ اسے اسپتال سے فارغ کردیں۔
یہ بھی حقیقت تھی...... کہ میں اسے گرفتار نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کا جرم قابل دست اندازی پولیس نہیں تھا۔
ادھر تھانے میں میرے لیے ایک اور خوشخبری منتظر تھی۔ابھی مجھے اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ لیاقت عرف چندہ کو میرے سامنے پیش کیا گیا۔
وہ گھبرایا ہوا تھا...... اسے کانسٹیبل وزیر لے کر آیا تھا۔ساتھ اے ایس آئی ابرار بھی تھا۔
''سر...... اس نے ایک بڑی حماقت کی...... اور پکڑا گیا۔'' اے ایس آئی نے لیاقت عرف چندہ کو گھورتے ہوئے کہا۔
''حماقت......'' میں نے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔
''جی ہاں' سر...... یہ اس جیولر کو منع کرنے آیا تھا کہ وہ ہمیں یہ نہ بتائے کہ اس نے یہ انگوٹھی اس سے بنوائی تھی۔یعنی نام ظاہر نہ کرے' اس راز کو چھپانے کے لیے پانچ ہزار دے رہا تھا۔
''اوہ...... کیا اس نے بینک میں ڈکیتی کا اقرار کرلیا ہے؟''
''بالکل...... سر' اگر یہ اس حماقت کے بعد بھی اقرار نہ کرتا تو میں اس کی کھال اتروا کر اس میں بھس بھروا دیتا۔''
''بہت خوب۔'' میں نے اے ایس آئی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔
''اس کے ساتھی کون ہیں؟''
''سر...... ان تینوں' بلکہ نادر سمیت چاروں نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔''
''اوہ...... میں نے اپنے سامنے حاضر لیاقت عرف چندہ کو خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔
''چندہ ماموں......تمہارے باقی دونوں بھانجے کہاں ہیں؟''
اس نے میرے تیور دیکھ کر اپنے دونوں بستہ ب ساتھیوں کا ٹھکانہ بتا دیا تھا۔
جن کو ہم نے چوبیس گھنٹوں کے اندر گرفتار کرلیا تھا۔
لیجیے قارئین ذرا دل تھام کر بیٹھ جائیں' اب پردے اٹھتے ہیں۔دراصل مقتول طارق کی بیوی شوباز اور حد سے زیادہ فضول خرچ تھی۔طارق اکثر اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ چادر کے اندر پاؤں رکھے' لیکن اس پر کسی بات کا اثر نہیں

ہوتا تھا' اس کا سسر بھی اسے اس بارے میں سخت سست کہتا رہتا تھا۔ لیکن کرتی وہ اپنی مرضی تھی' انجام سے بے خبر وہ آگے ہی بڑھتی گئی' دوسری طرف قرضوں کا ایک پہاڑ کھڑا ہوگیا...... اس بارے میں طارق حد سے زیادہ پریشان رہتا تھا۔ وہ اپنے دکھڑے اپنے گاؤں کے پڑوسی وکیل سے کہتا رہتا تھا۔ بقول وکیل وہ ذہنی اور نفسیاتی مریض بن گیا تھا۔ ایسے میں ازدواجی زندگی تلخ ہوکر رہ جاتی ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ جب ڈھول گلے میں پڑ جائے تو اسے بجانا پڑتا ہے۔ فردوس اس کی بیوی تھی۔ قرض خواہوں نے سخت لہجے میں طارق سے قرض مانگنا شروع کردیا تھا۔ نادر طارق کا دوست بنا ہوا تھا۔ ایک دن طارق نے اسے کہا کہ میرے اوپر بہت زیادہ قرض چڑھ گیا ہے (اس نے اسے یہ نہیں بتایا کہ بیوی کی وجہ سے قرض چڑھا ہے) نادر جس ذہن اور فطرت کا مالک تھا' اس کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں' اس نے تاڑ لیا کہ اس وقت طارق موم کی ناک بنا ہوا ہے اسے حسب منشاء موڑا جاسکتا ہے۔ اس کے شیطانی ذہن میں ایک منصوبہ آ گیا...... اس نے طارق سے کہا کہ وہ دو دن بعد اسے کوئی مشورہ دے سکے گا' دراصل وہ اپنے ساتھیوں نصیر عرف نصیر' لیاقت عرف چندہ اور رفیق عرف فیکے سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

دو دن بعد وہ طارق سے ملا اور اسے کہا کہ اگر وہ راضی ہوجائے تو ہم بینک میں ڈاکے کا پروگرام بنالیتے ہیں۔ طارق کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں زنگ آلود ہوچکی تھیں اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی' ٹھیک ہے کہہ دیا...... وہ اس سے بے خبر تھا کہ نادر اور اس کے ساتھیوں کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ سارا کیش حاصل کرنے کے بعد طارق کو گولی ماردیں گے' اس طرح سارا پیسہ ان کا ہوتا۔ انہوں نے ایسے ہی کیا۔ جس طرح واردات ہوئی اس کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہاں صرف اس بات کی وضاحت کردوں کہ بینک کے اندر لیاقت عرف چندہ اور رفیق عرف فیکا گئے تھے۔ نادر اور نصیر بینک کے عقبی دروازے کے باہر ان کی مدد کے لیے موجود تھے۔ اب بات رہ جاتی ہے' نادر کی' ایک تو نادر نے زیادہ چالاک بنتے ہوئے باقی تینوں کی طرح روپوشی اختیار نہیں کی تھی۔ اس طرح وہ ہمارے جال میں آ گیا' دوسرے اس نے باقی تینوں کے مشورے کے بغیر گارڈ سے ڈیل کی تھی...... تیسرے باقی تینوں اس کا حصہ خود ہضم کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح کے کاموں میں اسی طرح تو ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک دن اپنے خفیہ ڈیرے پر نادر کو شراب میں زہر ملا کر پلا دیا اور لیاقت عرف چندہ نے راتوں رات اس کی لاش لاری اڈے کے پچھواڑے لاکر پھینک دی۔ وہ اس طرح اپنی انگوٹھی کی صورت میں ہمارے لیے ایک اہم سراغ بھی پھینک گیا۔ اس کے بعد جب اسے پتہ چلا کہ وہ لاش کے ساتھ اپنی انگوٹھی بھی پھینک آیا ہے' (یہ بات صبح اسے پتہ چلی) تو اس نے اپنی دانست میں اپنے بچاؤ کے لیے وہ حماقت کرڈالی جس کا ذکر آچکا ہے۔ جب ہم نے چاروں سے پوچھا کہ انہوں نے بستہ بدمعاش ہوتے ہوئے یہ منصوبہ کیوں بنایا...... تو چاروں نے یک زبان ہو کر کہا۔ جناب ہم نے یہ سوچا کہ آپ کا دھیان اس طرف نہیں جائے گا۔

یہ بھی ایک احمقانہ بات تھی۔ دراصل وہ پولیس کو بے وقوف اور اپنے آپ کو عقل مند سمجھتے تھے۔ میرے خیال میں وہ احمقوں کا ٹولہ تھا۔ قارئین آپ کا کیا خیال ہے؟ ہاں ایک بات اور ہم نے گارڈ کو بھی حوالہ عدالت کردیا تھا۔

عشنا کوثر سردار

یہ ناول 1947ء کی ایک کہانی پر مبنی ہے اس ناول کا پلاٹ، اس کے تمام کردار تقریباً 69 سال قبل کے یہ محبت کی ایک کہانی ہے جس نے Partition سے ایک سو سولہ دن قبل جنم لیا، انڈو پاک کی تقسیم جب ہونے جا رہی تھی اس محبت کی کہانی دوران اپنا سفر شروع کیا، جہاں ایک پاک سرزمین کی تاریخ رقم ہوئی ہمیں ایک آزاد مملکت کا احساس ملا وہیں محبت نے دلوں میں گھر بھی کیا، یہ سفر تب شروع ہوتا ہے جب ناول کے دو کردار پہلی بار 18 اپریل 1947ء کو پہلی بار ملے۔ اس سے آگے کی ایک سو سولہ راتیں ان کی ان کہی محبت کا ایک سفر ہے۔ جب تاریخ رقم ہو رہی تھی زمین ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی تب خاموشی میں کہیں محبت دلوں کو جوڑ رہی تھی۔ زمین کی تقسیم نے دلوں کو تقسیم نہیں کیا تھا دلوں کو جوڑ دیا تھا اس تقسیم کی جو صعوبتیں ہماری ان نسلوں نے سہی تھیں ان کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے مگر میں نے اس تکلیف کو اپنے اندر محسوس کیا ہے۔ میرے ناول کے کردار ان مصائب سے گزرے ہیں اور ان کے ساتھ میں نے بھی ان مصائب کی تکلیف کو محسوس کیا ہے وہ ڈر...... وہ خوف...... تمام احساسات میرے اندر کہیں مجھے محسوس ہوتے رہے ہیں۔

عین النور بہت ناگواری اور غصے سے اسے دیکھ رہی تھی اور تیمور اتنے ہی پرسکون انداز میں مسکرا رہا تھا اور فتح النساء حیرت سے ان دونوں کو کھڑی دیکھ رہی تھی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ عین کو پہلے سے جانتے ہیں؟'' فتح النساء نے پوچھا تھا۔ تیمور مسکرایا تھا۔

''آپ نواب زادی سے پوچھیے۔ جن زاد سے کوئی رشتہ یا جان پہچان تو ہوگی ان کی؟ جبھی تو ان کو اس قدر الجھن ہو رہی ہے۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر مسکرایا تھا۔

''مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں نہ میں آپ کو جانتی ہوں۔'' عین النور نے واضح طور پر نفی میں سر ہلایا تھا۔

''عین ٹھیک کہتی ہیں۔ یہ آپ کو نہیں جانتی مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ یہ جن زادہ ان نواب زادی کو کیسے جانتا ہے؟'' فتح النساء مسکرائی تھیں۔

''فتح النساء آپ ان کی باتوں میں آ رہی ہیں؟ یہ ٹھیک نہیں۔'' عین النور نے اپنی خاص تمکنت سے فتح النساء کو گھورا تھا اور پلٹ کر آگے بڑھ گئی تھی۔

''خفا کر دیا آپ نے ہماری نواب زادی کو۔'' فتح النساء نے تیمور بہادر یار جنگ کو خفگی سے دیکھا تھا۔

''ویسے آپ ہیں کون؟ یہاں اس محل میں کیا کر رہے ہیں؟ کہیں آپ کو ہماری نواب زادی سے عشق تو نہیں ہو گیا جو اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے محل تک پہنچ گئے؟'' فتح النساء نے تیمور بہادر یار جنگ کو دیکھا تھا۔

وہ مسکرا دیا تھا۔

''آپ کو لگتا ہے کہ کسی عقل مند انسان کو جو کہ فہم و فراست رکھتا ہو، اسے بھولے سے بھی آپ کی ان دوست سے کوئی لگاؤ ہو سکتا ہے؟ کٹ کھنی بلی ہیں۔ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ میں تو یہاں اپنے دوست سے ملنے آیا تھا۔ اندازہ نہیں تھا کہ ان نواب زادی کا ان سے کوئی واسطہ ہے۔'' تیمور بہادر یار جنگ گویا ہوا تھا۔ فتح النساء چونکی تھی۔

''کن کی بات کر رہے ہیں آپ؟ نواب جلال پٹوڈی کی بات تو نہیں کر رہے آپ؟'' فتح النساء نے قیاس کیا تھا۔ تیمور بہادر یار جنگ نے سر اثبات میں ہلایا تھا اور مسکرا دیا تھا۔ فتح النساء نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔

''نواب جلال الدین پٹوڈی کے دوست ہیں آپ؟''

''اس میں کیا عجب ہے؟'' تیمور نے اطمینان سے پوچھا تھا۔

''نہیں عجب تو کچھ نہیں مگر ان کا مزاج اور آپ کا مزاج اگر یکساں ہے تو ضرور تشویش ہوگی ہمیں۔'' فتح النساء مسکرائی تھی۔

''چھوٹے نواب کے مزاج کے بارے میں اتنی خبر؟ کہیں عشق تو نہیں ہو گیا آپ کو چھوٹے نواب سے؟'' تیمور مسکرایا تھا۔ فتح النساء بوکھلا کر نگاہ پھیر گئی تھی۔ ان آنکھوں میں کوئی راز تو تھا کہ تیمور نے اسے بغور دیکھا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟ سچ میں جن زادے معلوم ہوتے ہیں آپ۔ ہماری نواب زادی کی قیاس آرائی بالکل بجا تھی۔'' وہ بوکھلاہٹ میں الزام دیتی ہوئی پلٹنے لگی تھی جب تیمور نے اسے دیکھتے ہوئے پکارا تھا۔

''سنئے۔'' تیمور کے پکارنے پر وہ رک گئی تھی اور پلٹ کر حیرت سے بھری پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

''نواب جلال الدین پٹوڈی کو اطلاع کر دیں کہ ہم تیمور بہادر یار جنگ ان سے ملنے تشریف لائے ہیں۔ ویسے عشق پوچھ کر نہیں ہوتا مگر آپ جیسی سلجھی ہوئی لڑکی کو ایسے بندے سے عشق کا ہونا واقعی عجیب ہے۔ آپ جتنی سلجھی ہیں نواب جلال اتنے ہی الجھے ہیں۔'' تیمور مسکرایا تھا۔

فتح النساء حیرت سے اسے گھورنے لگی تھی مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر آداب کیا تھا اور پلٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ فتح النساء اسے بہت حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

''انہیں کیسے خبر ہوئی کہ ہم نواب ہیں...... !واقعی عجیب ہیں یہ۔ کسی جن زادے کا مزاج رکھتے ہیں۔ نواب زادی پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتیں۔ ایسے تیکھے ہیں کہ نظر میں ہی پڑھ لیتے ہیں۔ تیمور بہادر یار جنگ...... نام تو کہیں سنا لگتا ہے۔ شاید چھوٹے نواب نے ہی کبھی ذکر کیا ہوا۔ خیر ہمیں کیا، ہم اطلاع کر دیتے ہیں۔ جن زادے ہیں تو کیا ہوا۔ ہیں تو مہمان اور مہمان چاہے کوئی جن زادہ یا پری زاد ہی کیوں نہ ہو اس کا خیال کرنا پڑتا ہے۔'' وہ پلٹ کر چھوٹے نواب کے کمرے کی طرف بڑھی تھی۔

......☆☆☆......

چھوٹے نواب نیند میں کچھ بڑبڑا رہے تھے جب فتح النساء نے قدم رکھا تھا۔

"آپ کے حسن کے تیور کمال ہیں خاتون حاکم۔ ایسا خوابیدہ حسن کبھی نہیں دیکھا۔ آپ نے تو دیکھتے ہی گرویدہ کر دیا۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ نشہ کس شے کا زیادہ ہوا۔ آپ کے حسن کا یا......!"

فتح النساء نے دو قدم کے فاصلے پر رک کر نواب جلال دین کو دیکھا تھا۔

"نواب صاحب!" اس نے دھیمے سے آواز دی تھی۔

مگر وہ نیند میں بڑبڑاتے رہے تھے۔

"سمجھ نہیں پائے ہم آپ کی آنکھیں وار زیادہ کرتی ہیں یا کاٹ آپ کی باتوں میں زیادہ ہے؟ مگر کچھ ہے جو کاٹتا ہے اور بہت سکون دیتا ہے۔"

"چھوٹے نواب؟" فتح النساء نے اس بڑبڑاہٹ کے معنی نا سمجھتے ہوئے حیرت سے انہیں پکارا تھا۔

"چھوٹے نواب نے آنکھیں کھول کر بمشکل اسے دیکھا تھا۔

"آ گئیں آپ خاتون حاکم......!"

"خاتون حاکم......؟" فتح النساء چونکی تھی۔ "یہ بیگم جان کون ہیں؟ آنکھیں کھول کر دیکھئے۔ یہ ہم ہیں فتح النساء۔ کیا عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ چھوٹے نواب...... کہیں آپ؟" اس نے بات مکمل کیے بنا چونکتے ہوئے کہا تھا اور چھوٹے نواب کو بغور دیکھا تھا۔

وہ اس سے عشق میں مبتلا تھی۔ جانے کب سے مگر اسے کس سے عشق تھا وہ بس جانتی تھی اور وہ کس کا نام لے رہے تھے؟

"خاتون حاکم کون ہیں؟" فتح النساء چونکی تھی۔ تبھی اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے چھوٹے نواب نے آنکھیں بمشکل کھول کر اسے دیکھا تھا۔

"فتح النساء؟ آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" وہ حیرت سے اسے دیکھ کر بولا تھا اور اٹھ بیٹھا تھا۔ فتح النساء غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔ دل میں جانے کس شے کا خوف آ بیٹھا تھا۔ دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔ شدید تکلیف کا احساس ایسے ہوا تھا جیسے کوئی انی سی کھب گئی ہو۔ وہ چھوٹے نواب کی بات کا جواب دیے بنا پلٹی تھی اور چلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ چھوٹے نواب اسے دیکھتے ہوئے اٹھ بیٹھے تھے تبھی ایک ملازمہ نے آ کر باادب انداز میں بتایا تھا کہ تیمور بہادر یار جنگ تشریف لائے ہیں۔ تبھی اس نے سر کو ہلایا تھا۔

"انہیں آپ احترام سے بٹھائیے اور مطلع کیجیے کہ ہم کچھ ہی دیر میں ان سے ملنے آ رہے ہیں۔" چھوٹے نواب نے رکھ رکھاؤ کا پاس رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے بے ہوشی کی حالت میں کہے گئے الفاظ معصوم فتح النساء کے دل کو ایک دھچکا لگانے کا باعث بنے ہیں۔ ملازمہ پلٹ کر جانے لگی تھی تبھی چھوٹے نواب نے اسے پکارا تھا۔

"سنئے۔ آپ سے قبل یہاں میرے کمرے میں کون آیا تھا؟ یا ہمارا وہم تھا؟"

ملازمہ نے انہیں حیرت سے دیکھا تھا۔

"ہم نہیں جانتے نواب صاحب، ہم سے پہلے تو یہاں کوئی نہیں تھا۔" ملازمہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ تبھی چھوٹے نواب نے انہیں جانے کا اشارہ کیا تھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

مرزا سراج الدولہ نے ایک سیر در میں خاتون حاکم کا نام پکارا تھا۔ وہ ایک ادا سے مسکرائی تھیں۔

"مرزا صاحب ہم جانتے ہیں آپ دل ہار بیٹھے ہیں۔ مگر آپ کو ایک بات سمجھ لینا چاہئے کہ یہ عشق آسان نہیں ہے۔ ہم چاہ کر بھی آپ سے عشق نہیں کر سکتے۔" خاتون حاکم کی نرم آواز سن کر وہ بے چین ہو اٹھے تھے۔

"کیوں نہیں خاتون حاکم؟ کیا چاہئے آپ کو؟ ہمیں مطلع کریں۔ جان و دل نثار کر دیں گے مگر خدارا یہ مت کہیں کہ آپ ہم سے عشق میں مبتلا ہونے سے قاصر ہیں۔ ہم آپ کی زلف کے اسیر ہو چلے ہیں۔ آپ کے چہرے کے علاوہ ہمیں کوئی چہرہ دکھائی نہیں دیتا اور آپ کے نام کے سوا کوئی نام نہیں پکارتے ہم اور آپ اس طرح دامن کھینچ رہی ہیں؟ اس کا باعث کیا ہے خاتون بیگم؟ خدارا ہمیں آگاہ کیجیے۔" مرزا سراج الدولہ تڑپ کر گویا ہوئے تھے اور خاتون حاکم مسکرا دی تھیں۔ پھر ادا سے پوچھنے لگی تھیں۔

"عشق کیا ہے مرزا صاحب؟ براہ کرم وضاحت کیجئے۔"

"عشق دل کی آواز ہے سوز ہے!" مرزا صاحب نے بغور اس خاتون حاکم کو دیکھا تھا۔ اس کے حسن بے پایاں کے وہ گرویدہ ہو گئے تھے۔ جن کی آواز ان کا سینہ چیرتی تھی۔ وہ ایک ادا سے مسکرائی تھیں۔ تب مرزا صاحب نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"ہم نہیں جانتے خاتون حاکم مگر ایک تڑپ سی ہے جو ہم دل میں محسوس کرتے ہیں اور یہ تڑپ بہت بے بس کرتی ہے۔ کہئے ہم کیا کریں آپ کے لئے؟" وہ بے چین ہو کر بولے تھے اور خاتون حاکم مسکرا دی تھیں۔

"مرزا صاحب...... کاش ہم آپ سے عشق کرنے کے پابند ہوتے تو آپ کے علاوہ ہم کسی اور کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتے مگر یہ کم بخت دل کسی ایک کے لئے ہی دھڑک سکتا ہے اور وہی اس دل پر حکومت کرسکتا ہے سو ہم یہ مفتوح علاقہ آپ کے حوالے نہیں کرسکتے۔" خاتون بیگم بولی تھیں اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔ مرزا صاحب بے بسی سے انہیں دیکھتے رہ گئے تھے۔

......☆☆☆......

"آپ اتنی بے چین کیوں ہو رہی ہیں فتح النساء؟ ہمیں بتائیے؟ ماجرا کیا ہے؟ صبح تو آپ کے مزاج کافی خوشگوار تھے۔ پھر اب یہ اچانک کیا ہوا؟ کسی سے خفا ہیں آپ؟" نواب زادی عین النور نے پوچھا تھا مگر فتح النساء نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"فی الحال ہم آپ کو کچھ نہیں بتا سکتے۔"

"بتا دیتیں تو اچھا تھا۔ ہم آپ کو تسلی تو دے سکتے ۔کیونکہ آپ ہماری پیاری سہیلی ہیں اور آپ کی پریشانی ہمیں بھی متواتر پریشان رکھے گی۔ بہر حال آپ سے ایک بات کہنا تھی گھر میں ہمارے بھائی چھوٹے نواب جلال الدین پٹوڈی کی رسم نکاح ہونے والی ہے کیونکہ سنا ہے ابا جان ان کے لئے اپنے دوست کی کسی بیٹی کے لئے پوچھ چکے ہیں۔" عین النور پٹوڈی نے بنا اس کے دل کی پروا کیے بتایا تھا اور فتح النساء چونکتے ہوئے اپنی سہیلی کو دیکھنے لگی تھیں۔

"ہم یہ بات آپ کو بتاتے ہیں چھوٹی نواب زادی مگر یہ بات نہیں بتا سکتے۔" وہ کہہ کر چہرہ پھیر گئی تھیں۔ ان کی کالی سیاہ پھیلی ہوئی آنکھیں بہت بے چین اور دھواں دھواں سی لگی تھیں۔

"آپ کی آنکھیں بہت عجیب ہو رہی ہیں فتح النساء۔ آپ اتنی بے چین کیوں لگ رہی ہیں؟" عین نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا تھا۔

"ہماری آنکھیں آپ کو عجیب کیوں لگ رہی ہیں عین النور؟" وہ چونکی تھیں۔

"پتہ نہیں مگر عجیب بجھی بجھی سی ہیں جیسے کسی نے ان آنکھوں کی روشنیاں بجھا دی ہوں یا ساری روشنی چرائی ہو۔" وہ بولی تھیں تو فتح النساء نے ان کی طرف سے نگاہ چرائی تھی اور پھر نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ عین النور انہیں دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

......☆☆☆......

نواب سیف الدین پٹوڈی نے شطرنج کی چال چلتے ہوئے اپنے عزیز دوست حکمت بہادر یار جنگ کو دیکھا تھا۔

"میاں آپ نے ذکر کیا تھا کہ ہمارے سمدھی مرزا افثار سراج الدولہ آجکل کانگریس میں شمولیت کے لئے پر تول رہے ہیں تو ہمیں یقین نہیں آیا تھا مگر کل ان سے بات ہوئی تو آپ کی بات کی صداقت کا یقین آ گیا۔ ہمیں عجیب لگا۔ جب تحریک زور پکڑ چکی ہے اور قرارداد بھی منظور ہو چکی ہے تو پھر مرزا صاحب کا یہ اقدام کس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بہر حال ہمیں یہ بات مایوس کن لگی۔ اگر ہم ان کی جگہ ہوتے تو ہم مسلم لیگ میں شمولیت کے لئے بات کرتے۔ مسلمانوں کی اگر کوئی نمائندہ جماعت ہے تو وہ مسلم لیگ ہی ہے اور مسٹر جناح جس طرح اپنے موقف پر ڈٹے دکھائی دیتے ہیں ہم ان کا موازنہ اگر گاندھی کے موقف سے کرتے ہیں تو بات واضح محسوس ہوتی ہے۔ آپ نے ایک بیان کا تذکرہ کیا تھا۔ نہرو صاحب کی حمایت میں انہوں نے ایک بیان دیا تھا کہ یہ حقیقت حیران کن نہ تھی انگریز حکومت نے یہ نظام ہم پر مسلط کیا تھا۔ حیران کن بات تو یہ تھی ہم یا ہماری اکثریت نے انگریزوں کے اس ڈھانچے کو قدرتی اور ناگزیر طور پر اپنی زندگی کا طریقہ اور قسمت تسلیم کر لیا تھا۔ ہندوستان میں برطانوی

راج کی یہ نفسیاتی فتح دنیا کی کسی بھی فوج یا سفارتکاری کی کامیابی سے بڑھ کر ہے۔ نہرو کا یہ اعتراف بہت معنی رکھتا ہے۔ ہمارے سیاسی رہنما بھی اسی نفسیاتی فتح کا حصہ بن رہے ہیں۔ ان کے ذہنوں پر یہ غلبہ طاری ہے کہ مسلم لیگ ایک اکثریتی جماعت ہے جو فتح مند نہیں ہوسکتی سو ہمارے سیاسی رہنما ایک بڑی سیاسی جماعت کانگریس کا حصہ بننا چاہتے ہیں۔'' نواب صاحب بہت افسوس سے بولے تھے۔

''ہاں مگر وہ جماعت ہمارے خیالات کی ترجمان نہیں۔ ویسے کیا سوچا ہے آپ نے نواب صاحب اگر ہماری مسلم لیگ کو کامیابی ملتی ہے تو آپ یہیں رہنا پسند کریں گے یا یہاں سے کوچ کرکے اس ویس کوچ کرنا چاہیں گے جہاں مسلمانوں کی نو آبادیات بنائی جائیں گی؟'' حکمت بہادر یار جنگ نے دریافت کیا تھا۔ نواب سیف الدین پٹوڈی نے کچھ لمحے کو سوچا تھا۔ وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے اور پھر شانے اچکا دیے تھے۔

''نہیں معلوم بھیا ابھی تو اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا یہ ہی پتہ نہیں۔ انگریزوں کے منہ سے نوالہ چھیننا آسان نہیں ہے۔ برطانوی راج نے جو نفسیاتی فتح حاصل کی ہے وہ اسے برقرار رکھنا چاہیں گے۔ مجھے نئے ملک کا وجود فی الحال مشکل دکھائی دیتا ہے۔'' نواب صاحب یقین سے خالی تھے۔ سیف صاحب مسکرائے تھے۔

''نواب صاحب کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ نئے ملک کی داغ بیل رکھی جا رہی ہے۔ قرارداد پاس ہوگئی ہے اور نئے ملک کا تصور واضح ہوگیا ہے۔ پھر بھی اس ناامیدی کی باتیں؟ آپ تو بہت پرجوش ہوا کرتے تھے۔ اب اتنے متفکر اور ناامید کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟'' سیف صاحب کی فکرمندی دیکھ کر حکمت صاحب بولے تھے۔ نواب سیف الدین مسکرا دیے تھے۔

''میاں کیا کہہ سکتے ہیں۔ برطانوی راج بہت فریبی ہے۔ ان کے اور زبان کا اعتبار نہیں۔ ان کی نفسیاتی فتح کا زوال بہرحال آسان دکھائی نہیں دیتا۔ ہم پر مسلط کیا گیا نظام وہ اتنے آرام اور سکون سے تو ختم نہیں کرنا چاہیں گے۔ جب کہ دوسری طرف کانگریس بھی اپنے داؤ پیچ لڑا رہی ہے۔ وہ نہیں چاہیں گے ان کی اکثریت ہوتے ہوئے ایک اقلیت پر مبنی جماعت فتح حاصل کرلے اور اس برتری کی نفسیاتی جنگ پر غلبہ پالے۔'' نواب صاحب صاف گوئی سے بولے تھے۔

''آپ برطانوی راج کی نفسیاتی طاقت پر متفکر دکھائی دیتے ہیں نواب صاحب۔ مگر آپ کا خدشہ کسی قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ کانگریس برطانوی راج کو اپنی طرف کرلے اور وہ نئی ریاست کا وجود ہی نقشہ پر ابھرنے سے قبل ہی مٹا ڈالیں۔ یہاں خدشہ یہ بھی ہے کہ کانگریس ایک مضبوط جماعت ہے اور ہندوؤں کے ساتھ ان کے موقف کی برطانوی حکومت زیادہ قائل دکھائی دیتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ کانگریس فتح یاب ہونے کے لئے کئی سیاسی داؤ پیچ بھی لگا سکتی ہے اور کئی فیصلوں پر اثرانداز بھی ہوسکتی ہے۔'' حکمت بہادر یار جنگ گویا ہوئے تھے اور سیف صاحب نے متفق ہو کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''ہونے کو تو 23 مارچ والی قرارداد بھی منظور ہو چکی ہے اور تحریک کی شدت بھی بہت عروج پر دکھائی دے رہی ہے۔ اس کو دیکھو اور دیگر حقائق پر غور نہ کرو تو لگتا یہی ہے کہ ہماری نئی ریاست اب بنی یا تب بنی۔ مگر میاں پتہ بھی تو تبھی چلے گا جب برطانوی حکومت کا واضح موقف سامنے آئے گا۔ بھی انگریز راج کا کچھ اعتبار نہیں۔ بہت چالاک قوم ہے۔ ان کو وہاں بھی کاٹنا آتا ہے جہاں انہوں نے بویا نہیں ہوتا۔ وہ فصل کاٹنے کو اس نگری بھی جا دھمکتے ہیں جہاں انہوں نے نہ بیج بویا ہوتا ہے نہ پانی ڈالا ہوتا ہے۔'' نواب صاحب مسکرائے تھے اور حکمت صاحب نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

''بہرحال برطانوی راج کا دماغ سیاسی داؤ پیچ آزمانے میں مہارت رکھتا ہے مگر ہمارے مسٹر جناح بھی خاصے ڈٹے دکھائی دیتے ہیں۔'' حکمت صاحب بولے تھے۔ نواب صاحب نے تب سر ہلایا تھا۔

''ہندوؤں کے دماغ اڑے ہوئے ہیں میاں۔ ان کے خیال کی رو سے مسلمان وہ قوم ہے جو حکمرانی کا مزا پہلے ہی چکھ چکی ہے۔ برصغیر پاک و ہند پر مسلمانوں کا حکمران رہنا ان کے دلوں میں زہر کے بیج بوتا رہا ہے سو اب ان کو لگتا ہے باری ان کی ہے اور وہ برطانوی راج کو ہر صورت قائل کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہیں گے کہ مسلمان

اب یہ فتح نہ لے جا سکیں کیونکہ وہ مسلمانوں کو دوبارہ حکومت بنانے پر قائل دکھائی نہیں دیتے اور نہ ان کی حکومت دوبارہ قائم ہوتے دیکھنا، ان سے برداشت نہیں ہوگا۔ ان کے دلوں میں نفرت کا وہ بیج جو اگا تھا وہ تناور درخت بن چکا ہے۔" نواب صاحب مدلل لہجے میں بولے تھے۔

"A key reason is that the Muslims enjoyed sovereignty in pre-British India and this was in the form of large dynastical kingdom, monarchies, and smaller principalities."

نواب سیف الدین کے کہنے پر حکمت یار بہادر جنگ نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"I agree, therefore Muslims were use being the sovereign power although they were a numerical minority in pre-British India."

حکمت صاحب نے سر ہلایا تھا تبھی سیف الدین نے سر ہلایا تھا اور بولے تھے۔

"Under the British, the Muslim minority did struggle for a while, but eventually they got organized. And the All-India Muslim League became the political vehicle for the Muslims of British India. That is being the cause of fear for other political parties."

"یہی خدشہ مجھے بھی ہے سیف صاحب۔ مگر ہم خدا سے دعا کریں گے کہ ہمارے خدشات فقط خدشات ہی رہیں اور حقیقت میں ان کی کوئی وقعت نہ رہے۔" حکمت صاحب نے کہا تھا تو نواب صاحب نے سر ہلایا تھا۔

......☆☆☆......

نواب صاحب کی طرف سے دی جانے والی ضیافت میں بہت سے مہمان مدعو کیے گئے تھے۔ پنک غرارے میں بڑی سج دھج سے چلتی ہوئی فتح النساء محل کے اندر بڑھی تھی جب کسی پر نگاہ نہ پڑنے کے نتیجے میں بے طرح ٹکرائی تھی۔ سنبھل کر دیکھا تھا تو مرزا حیدر سراج الدولہ کی خشمگیں آنکھیں انہیں گھور رہی تھیں۔

"خاتون سنبھل کر نہیں چل سکتیں آپ؟" بے طرح ڈپٹتے ہوئے کہا تھا۔ مگر ان کی سیاہ چمکیلی ہوئی آنکھیں اور ان پر لرزتی جھکی دراز پلکوں پر نگاہ پڑی تھی تو وہ ان کے چہرے پر سے نگاہ ہٹائے بنا نہیں رہے تھے۔ فتح النساء سنبھل کر کھڑی ہوئی تھیں اور ان کی آنکھوں میں پھوٹتی روشنی سے خوفزدہ ہو کر کچھ قدم دور جا ہٹی تھیں مگر مرزا حیدر سراج الدولہ کی نگاہ ایسی تھی کہ ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ فتح النساء کو عجیب محسوس ہوا تھا۔ وہ کس قدر بے باکی سے انہیں دیکھتے رہے تھے۔ وہ انہیں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ دوسرے معنوں میں کھری کھری سنانا چاہتی تھیں مگر پھر ارادہ ترک کر کے آگے بڑھ گئی تھیں۔

اسے یقین نہ ہوا تھا۔ مرزا حیدر سراج الدولہ تھے۔ اس کی سب سے خاص سہیلی کے منگیتر خاص۔ نظروں میں ایسی کاٹ اور چھیڑ چھاڑ کرنے کی صلاحیت تھی کہ انہیں بہت عجیب محسوس ہوا تھا۔ وہ چلتی ہوئی چھوٹے نواب کے قریب آن رکی تھیں۔

"مزاج بخیر ہیں فتح النساء صاحبہ؟" چھوٹے نواب جلال الدین پٹوڈی ملائمت سے مسکرائے تھے۔ فتح النساء بچپن سے اس گھر میں آ جا رہی تھیں۔ ان کی دوستی اگر عین النور سے تھی تو ان کے بھائی نواب جلال الدین پٹوڈی سے بھی تھی۔

"جی بالکل۔ آپ کے مزاج گرامی کیسے ہیں؟ سنا ہے آج کل آپ سوتے جاگتے میں عجیب و غریب خواب دیکھتے ہیں۔" اس نے طنز فرمایا تھا۔ نواب جلال نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"اوہ اب ہماری سمجھ میں آیا اس صبح آپ درحقیقت اس کمرے میں ہمیں جگانے آئی تھیں۔ ہمیں لگا تھا وہ ہمارا واہم تھا۔" وہ مسکرایا تھا۔

"چار جماعتیں ولایت سے کیا پڑھ کر آ گئے آپ تو

نظریں ہی پھیرنے لگے نواب جلال الدین پٹوڈی۔ اپنی اقدار کی بھی نفی کرنے لگے۔'' وہ طنز کرنے لگی تھیں۔ وہ ان کا مزاج جانتے تھے تبھی برا مانے بنا مسکرا دیے تھے۔

''اگر اقدار بھولے ہوتے تو گوری میم کو بیاہ کر ساتھ نہ لے آتے۔ ایسا نہیں ہے فتح النساء بی بی۔ ہم ولایت جا کر اپنی اقدار بھولنے والے نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے نرمی سے بولا تھا۔

''ہاں جانتی ہوں۔ نواب کے قول و فعل میں جو تضاد ہوتا ہے وہی بس آپ کے مزاج میں ہے۔'' وہ جل کر بولی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک واضح کاٹ تھی۔ ان آنکھوں میں کیا شکوہ تیر رہا تھا کہ نواب جلال اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ وہ چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی تھی جب جلال نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ فتح النساء کا سر ان کے فراخ سینے سے آن ٹکرایا تھا اور وہ کئی لمحوں تک ان کے سینے پر سر رکھے اسی طرح گہری سانس اور اوسان بحال کرنے میں لگی رہی تھیں۔

''فتح النساء......!'' نواب جلال الدین نے نرم لہجے میں پکارا تھا۔ تب فتح النساء نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں بے طرح بھیگی ہوئی تھیں اور لانبی پلکوں پر کئی شکوے موتیوں کی مانند اٹکے ہوئے تھے۔ اس چہرے میں کچھ تھا یا آنکھیں اس قدر سحر رکھتی تھیں کہ نواب جلال الدین پٹوڈی انہیں ساکت سے دم بخود دیکھنے لگے تھے۔

وہ آنکھیں کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں اور اس چہرے پر ایک داستان درج تھی۔ جلال بغور دیکھتے گئے تھے۔

''آپ کی آنکھیں فتح النساء؟ فتح النساء۔ آپ اتنی افسردہ کیوں ہیں؟ کیا ہوا؟'' وہ مدھم لہجے میں کچھ جاننے کا ارادہ باندھ کر اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ فتح النساء نے خاموشی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتی تھیں تبھی پلٹ کر خاموشی سے آگے بڑھ جانا چاہا تھا مگر ان کا بھاری کام والا دوپٹہ جو دبکے کا مہین کام رکھتا تھا وہ نواب جلال الدین پٹوڈی کے کوٹ کے کسی بٹن سے ہی الجھ کر رہ گیا تھا۔ فتح النساء بے چین ہو کر مڑی تھی۔ بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

جلال نے ان کے آنچل کے سرے کو آہستگی سے تھاما تھا اور اپنے کف کے بٹن سے ان کا آنچل آزاد کرتے دکھائی دیتے تھے مگر اس کوشش میں کئی ثانیے گزر جانے کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی تو الجھ کر فتح النساء کی طرف دیکھتے گئے تھے۔ تب فتح النساء چلتی ہوئی ان کے قریب آئی تھیں۔ ان کی طرف ہاتھ بڑھا کر ان کے ہاتھ سے اپنے آنچل کا سرا لیا تھا۔ اس کوشش میں ان کے ہاتھ کا لمس واضح طور پر محسوس ہوا تھا۔ فتح النساء اپنے دل کو نواب جلال الدین پٹوڈی کے لئے دھڑکنے سے باز نہیں رکھ سکی تھیں اور سر جھکا کر ان کے بٹن سے اپنے آنچل کے سرے کو آزاد کرانے کے لئے تگ و دو کرنے لگی تھیں۔ جلال نے اس صبیح چہرے کو واضح طور پر دیکھا تھا۔ اس چہرے میں ایک عجیب کشش تھی۔ وہ شاید اس سے پہلے اس طرح اور اس قدر غور سے اس چہرے کو دیکھ نہیں پائے تھے۔ فتح النساء کے چہرے پر خفگی تھی۔ آنکھوں میں ان گنت شکایتیں تھیں۔ وہ اسی طور چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی اور جلال اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

عین النور تقریب کے لئے تیار ہو رہی تھی جب فتح النساء اس کے کمرے میں آئی تھی اور اسے تیار ہوتے ہوئے بغور دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟ آپ کا چہرہ کیوں پھولا ہوا ہے فتح النساء؟ خیریت؟ کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟ عین النور نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ نفی میں سر ہلایا تھا اور چلتی ہوئی آگے بڑھ آئی تھی۔

"بہت اچھی لگ رہی ہیں آپ عین النور۔ آپ کے مرزا صاحب کی خیر نہیں مگر......!"

"مگر کیا؟" اس کے رک جانے پر عین النور نے اسے دیکھا تھا۔ جانے وہ کیا کہتے کہتے رک گئی تھی۔ عین کو اس کی فکر ہوئی تھی۔ تبھی بال پیچھے کی طرف ڈال کر شانے پر رکھا فیروزی آنچل اوڑھ کر وہ اس کی سمت آئی تھی۔

"کیا ہوا؟ آپ کے چہرے پر یہ ناگواری کے تاثرات کیوں؟ کسی نے کچھ کہہ دیا کیا؟" عین نے پوچھا تھا۔ فتح النساء جانتی تھی کہ عین النور مرزا حیدر سراج الدولہ کے لئے کیسے جذبات رکھتی تھی اور کتنی لگاوٹ اس کے دل میں تھی سو اس نے کچھ بتانا مناسب خیال نہیں کیا تھا اور مرزا کی بے باکی اور نظروں کی ان کیفیات کو اپنا وہم جانتے ہوئے سر جھٹکا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" اس نے کہہ کر نگاہ پھیری تھی۔ عین نے اس کا چہرہ اپنی طرف پھیرا تھا۔

"بتایئے ہمیں...... کیا ہوا؟ آپ اس طرح پریشان اور ہراساں کیوں لگ رہی ہیں اور یہ آپ کی پلکیں کیوں بھیگی ہوئی ہیں۔ فتح النساء کس نے رلایا آپ کو؟ آپ کا دل کس نے دکھایا؟" عین النور نے پوچھا تھا۔ فتح النساء نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

"ہم اتنے نازک نہیں کہ کوئی ہمیں زک پہنچا سکے عین النور پٹوڈی۔ ہم بہت مضبوط اور بہادر ہیں۔ فولاد کا دل ہے ہمارا۔ ہمیں نہیں فرق پڑتا کسی کے کچھ کہنے سے۔ ہمیں کمزور ہونا اچھا نہیں لگتا۔" وہ تن کر بولی تھی۔ عین اس کا چہرہ تھام کر مسکرائی تھی اور اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"آپ بہت بہادر لڑکی ہیں فتح النساء۔ ہمیں آپ کی یہی بات پسند ہے۔ ہمیں بھی لڑکی کا اس قدر نازک اور کمزور ہونا پسند نہیں۔ ویسے بھی اب زمانہ بدل چکا ہے۔ تحریک کا زور بڑھ چکا ہے۔ عزت دار مسلمان گھرانوں کی بیٹیاں اور دیگر خواتین جب گھروں سے نکل کر سیاست میں حصہ لے سکتی ہیں تو پھر انہیں کمزور کہنا حماقت ہی ہوگی۔" عین النور نے کہا تھا اور فتح النساء نے سر ہلایا تھا۔

"عین آپ مرزا سراج الدولہ سے کس قدر محبت کرتی ہیں؟" فتح النساء نے اچانک پوچھا تھا۔ عین النور چونکتے ہوئے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟ اس کے پوچھنے کا جواز کیا ہے؟" عین النور نے اسے جانچتے ہوئے دیکھا تھا۔

"آپ بتایئے تو؟" فتح النساء بولی تھیں۔ عین النور مسکرا دی تھیں۔

"ہم نہیں جانتے فتح النساء۔ محبت کس ساز و آہنگ کا نام ہے۔ ہمارا نام ان کے نام سے وابستہ ہے۔ ایسا ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں اور ہمارے لئے یہ بات اہم ہے۔ ان کا نام سنتے ہیں تو دل کو دھڑکنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اب آپ اسے محبت کا نام دیں یا جو بھی کہیں مگر ایسی لگاوٹ ہونا فطری ہے۔ ہم اس رشتے کے پابند ہیں اور اس

رشتے کے وفادار بھی۔'' عین النور نے کہا تھا اور فتح النساء نے سر ہلایا تھا۔

''ہاں جانتے ہیں ہم لیکن اس قدر محبت بھی ہے تو آپ کو اپنی آنکھیں مرزا صاحب کی طرف سے کھلی رکھنا چاہئیں۔'' فتح النساء نے جتایا تھا اور عین النور مسکرا دی تھیں۔

''آپ کا ذہن ابھی تک وہیں اٹکا ہوا ہے۔ ان کے مشاعرے میں غزل پڑھنے والی بات پر؟'' عین النور فتح النساء کو دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

''اچھا سنیں فتح النساء...... مشاعرے میں غزل پڑھ دینے سے کوئی بے وفا نہیں ہو جاتا۔ لکھ دی ہو گی انہوں نے غزل۔ جوان دل ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں روسا اور امراء کی اولادیں کیسے تیور رکھتی ہیں۔ ہمارے اپنے بھائی نواب جلال الدین پٹوڈی کو ہی دیکھ لیں۔ کیا کیا نہیں کرتے۔ باہر سے تعلیم حاصل کر کے آ گئے پھر بھی مزاج بدلا نہیں۔ ابا جان کا خوب نام روشن کر رہے ہیں۔ سو آپ ان باتوں کو جانے دیں۔ روسا اور امراء کی عمارتوں میں کئی راز دفن ہوتے ہیں۔ ہم گھر میں رہنے والی مائیں بیٹیاں ان کی تربیت اپنے ڈھنگ سے کر تو دیتی ہیں مگر پھر بھی ان کے مزاج کی رنگینی کو ان کی ذات سے نکال نہیں پاتیں۔ کبھی ہم آپ سے کہتے ہیں۔ جلال بھائی سے محبت کا سلسلہ موقوف کر دینا چاہئے آپ کو۔ آپ کی اس پاکیزہ محبت کی کوئی وقعت نہیں ہوگی ان کی نظر میں۔ وہ اس محبت سے کہیں آگے کی باتوں کو دیکھنے اور جاننے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ امراء اور روسا کی بیٹیاں بہت سی باتوں پر اپنے کان اور آنکھیں بند رکھتی ہیں فتح النساء۔'' عین النور نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا اور فتح النساء اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''آپ کو مرزا سے محبت نہیں؟ یہ سچ ہے نا؟'' فتح النساء نے پوچھنا ضروری خیال کیا تھا۔ عین النور مسکرا دی تھی۔

''اس سے فرق نہیں پڑتا فتح النساء۔ ہم نواب خاندان کی بیٹی ہیں اور ہمیں صرف فیصلوں پر سر جھکانا آتا ہے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ بہر حال چلئے آپ۔ ہمارے ساتھ باہر تقریب میں چلیے۔ سب پوچھ رہے ہونگے۔ ویسے بھی اماں یا دادی اماں آ گئیں تو فضول میں ایک لمبی چوڑی تقریر سننے کو مل جائے گی۔'' عین نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اسے لے کر چلتی ہوئی باہر کی تقریب میں آ گئی تھی۔ فتح النساء اسے حیرت سے دیکھتی ہوئی اس کے ساتھ چلتی چلی گئی تھی۔

......☆☆☆......

''یہ جو ابا جان کے داہنے طرف کھڑی ہیں نا۔ یہ جنت الفردوس ہیں۔ ابا ان کا ہاتھ تمہارے لئے مانگنا چاہ رہے ہیں۔'' عین النور پٹوڈی نے مدھم آواز میں اپنے بھائی کے کان کے قریب سرگوشی کی تھی۔ جلال نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''ابا نے ہم سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا عین۔ اس سے اچھا تھا ہم انگلینڈ سے اپنے ساتھ کوئی فرنگی میم لے آتے۔ ابا جان کو ہمارے لئے یہ چپٹے ناک والی، جاپانی آنکھوں والی جنت الفردوس ہی دکھائی دی ہیں؟ سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہم اپنے بچوں کی نشاندہی کیسے کریں گے؟ کیونکہ ان جاپانی آنکھوں چپٹے ناک والی حسینہ سے شادی کے بعد ہماری اولاد بھی ایسی ہی جاپانی آنکھوں والی پیدا ہوگی۔'' جلال مسکرایا تھا۔ عین نے اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

''ایسی بات ہے تو آپ کو اپنی پسند ابا جان کو بتا دینا چاہئے۔'' عین نے بھائی کو نادر و نایاب مشورے سے نوازا تھا۔ جلال الدین مسکرا دیا تھا۔

''ابا جان کو قائل کرنا مشکل ہے۔ وہ اس دنیا کی نہیں ہیں اور ابا ان کے لئے مانیں گے نہیں۔'' وہ مسکرایا تھا۔ عین نے بھائی کو گھورا تھا۔

''بات سنئے نواب زادہ جلال الدین پٹوڈی۔ آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ آپ کافی آؤٹ آف ٹریک چل رہے ہیں اور آپ کی سوچ خاصی باغیانہ ہے۔ اس سوچ کو ہمارے محترم ابا جان اس زمانے میں اور اس وقت میں تو نہیں مان سکتے۔ شاید کسی اور زمانے کا انتظار آپ نہ کر پائیں۔'' عین مسکرائی تھی۔

''وہ بہت خوبصورت ہیں عین۔ ہم محبت کرنے سے باز نہیں رہ سکے۔ آپ ابا جان کو قائل کرنے میں ہماری مدد کریں گی نا۔'' جلال نے بہن کی مدد لینا چاہی تھی۔ عین النور نے اسے گھورا تھا۔

''اپنے ساتھ ساتھ آپ ہمیں بھی گھر سے باہر

کروائیں گے جلال بھائی۔ چپکے سے جہاں ابا جان کہتے ہیں وہیں شادی کرلیں۔ یہی مناسب ہوگا۔ آپ کو محبت بہت غلط جگہ پر ہوئی ہے۔ ایسی محبت کو ابا جان تو قبول کریں گے نہیں۔" اس نے خدشہ بیان کیا تھا تب جلال نے اپنی فیملی کے ساتھ کھڑی جنت الفردوس کو دیکھا تھا۔

"سوچ لیں آپ۔ پھر آپ کے بھتیجے بھی چپٹی ناک والے ہوں گے۔ ہم سے شکوہ مت کیجئے گا۔" جلال برا سا منہ بنا کر بولا تھا اور عین مسکرا دی تھی۔

"میرے بھتیجے کھڑی ستواں ناک والے بھی ہوسکتے ہیں اگر آپ ابا جان کے بائیں طرف کھڑی فیملی کے ساتھ موجود لڑکی پر نگاہ ڈال لیں۔" عین النور نے موقع دیکھ کر فتح النساء کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جس کا دل جلال کے لئے دھڑکتا تھا۔ مگر اس بات کی خبر اس نے کبھی جلال کو نہیں ہونے دی تھی۔

"وہ یہ بھوری آنکھوں والی بلی۔ ہاں یہ اچھی ہیں مگر مزاج کی تیز ہیں اور ہمیں ان سے محبت بھی نہیں ہے۔" جلال نے ایسے برا منہ بنایا تھا جیسے کسی نے کونین کی گولی کھلا دی ہو۔ عین مسکرائی تھی۔

"ہم نے فتح النساء کا نام لیا ہے۔ آپ کو کونین کی گولی نہیں کھلا دی۔ اچھی خاصی لڑکی ہے جلال بھائی۔ محبت بھی ہوسکتی ہے اگر آپ ان کو غور سے دیکھیں تو اچھی خاصی خوبصورت ہیں۔" عین نے بھائی کو قائل کرنا چاہا تھا۔

"محبت ایسے نہیں ہوتی عین۔ محبت ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ ہم لائحہ عمل بنا کر نیت باندھ کر محبت نہیں کرسکتے۔ محبت کی ایک بات بری ہے کہ بلا ارادہ ہوتی ہے۔ کسی بھی فرد سے جس سے چاہے ملنا ممکن ہوتا نہیں۔" جلال الدین گویا ہوا تھا جب عین النور پٹوڈی کی نظر اپنی طرف دیکھتے ہوئے تیمور بہادر یار جنگ کی طرف پڑی تھی۔ وہ جانے کب سے اس کی سمت بغور دیکھ رہے تھے۔ اسے جب نظروں کا احساس ہوا تھا تو تیمور بہادر یار جنگ نے نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

"یہ یہاں تقریب میں بھی؟ یہ کون ہے؟ کوئی ابا کے جاننے والے؟" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی۔ جلال نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟ کچھ کہا آپ نے؟" جلال اور اس کی عمر میں زیادہ گیپ نہیں تھا سو وہ جلال سے بچپن سے ہی فرینک تھی۔ تبھی بولی تھی۔

"یہ سامنے سیاہ سوٹ میں کون بندہ ہے جلال؟ کیا ابا نے اسے بھی انوائیٹ کیا ہے یا کہیں بن بلائے تو ہمارے گھر کی ضیافت میں نہیں گھس گیا؟" اس نے پوچھا تھا جب جلال اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"آپ نے تیمور بہادر یار جنگ کو نہیں پہچانا عین النور؟ کمال کرتی ہیں آپ۔ یہ انکل حکمت یار بہادر جنگ کے بیٹے ہیں۔ ہمارے ساتھ انگلینڈ میں اسٹڈی کرتے رہے ہیں اور ہم سے ملنے ہی اس روز محل میں تشریف لائے تھے۔ آپ ان کو نہیں پہچان سکیں؟ یہ تو اکثر بچپن میں بھی ہمارے گھر تشریف لاتے رہے ہیں۔ ہم ان سے بہت قریب تھے سو یہ کھیلنے کے لئے ضد کرکے ہمارے یہاں آجاتے تھے۔ حکمت انکل بھی تردد نہیں کرتے تھے کیونکہ ابا اور ان کی گہری دوستی تھی۔" جلال نے مطلع کیا تھا تو عین النور کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔

"اف.....! تو تبھی وہ اس درجہ بے تکلف ہو رہے تھے اور تبھی بلا تردد مدد کرکے گھر تک بھی چھوڑ گئے تھے۔" عین النور نے صرف سوچا تھا۔ کہا نہیں تھا۔ اسے افسوس ہوا تھا اس نے تیمور بہادر یار جنگ کو پہچانا نہیں تھا اور اس سے تختی سے بھی پیش آئی تھی۔

تیمور دور کھڑا اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ عین کی نگاہ پڑی تھی تو وہ فوراً رخ بدل گئی تھی۔ تبھی وہ اپنے پیچھے کھڑے مرزا حیدر سراج الدولہ سے بری طرح ٹکرا گئی تھی۔ مرزا نے ان کو تھامنے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ زمین پر آرہی تھیں۔ تبھی ایک لمحے میں جلال نے جھک کر بہن کو اٹھایا تھا۔

"اتنی لمبی ہیل پہننے کی کیا تک ہے جب آپ ڈھنگ سے چل بھی نہیں سکتیں؟" جلال نے بہن کو گھورا تھا۔

"آپ نے ہی انگلینڈ سے یہ ہیلو لاکر دیئے تھے۔ پھر نہ لاکر دیتے تو ہم آج اس عشایئے میں یہ نہ پہنتے نا۔" اس نے شکوہ کرتی نظروں سے بھائی کو دیکھا تھا۔ جلال اسے گھورتے ہوئے اس کا پاؤں دیکھنے لگا تھا۔

"موچ آگئی ہے۔ ویسے یہ آپ کے منگیتر صاحب مرزا حیدر سراج الدولہ خاصے ان مینرڈ ہیں۔ آپ کے

پاس سے گزر گئے آپ کو سنبھالا تک نہیں حالانکہ جس طرح وہ آپ سے ٹکرائے تھے اگر آپ کو تھام لیتے تو آپ گرنے سے بچ بھی سکتی تھیں۔" جلال کو اچھا نہیں لگا تھا۔ عین النور تھوڑی مسکرادی تھی۔

"ہمیں ہمارے اتنے مضبوط بھائی نے جو سنبھال لیا۔ اللہ ہمارے پیارے جلال کو لمبی عمر عطا کرے۔ اتنے مضبوط خوبرو لگتے ہیں آپ کہ ڈر لگتا ہے کہیں نظر ہی نہ لگ جائے۔ ابھی اماں سے کہہ کر آپ کی نظر تو ضرور اتروائیں گے ہم۔" عین نے بھائی کو دیکھا تھا۔

"ویسے بھی ہم ابھی تک تو اپنے ابا اور اپنے بھائی کی ہی ذمے داری ہیں نا۔ ہمیں کسی سے کوئی شکوہ نہیں نا ہم کسی سے کچھ توقع رکھتے ہیں۔" جلال اسے تھام کر کھڑا ہوا تھا جب اس نے کہا تھا۔

"بات توقع یا ذمے داری کی نہیں ہے عین۔ آپ کی منگنی ان سے طے ہے۔ یہ کافی عجیب لگا وہ آپ کے قریب سے ایسے گزر گئے جیسے دیکھا تک نہیں۔ ایک رشتے کا احترام اور تقدس ہی بحال رکھیں یہی بہت ہوگا۔ بہر حال ہمیں حیدر کا یہ اقدام پسند نہیں آیا۔ ہمیں نہیں لگتا وہ اچھے شوہر ثابت ہوسکیں گے۔" جلال نے فتویٰ دے دیا تھا۔ عین نے نرمی سے مسکراتے ہوئے بھائی کو دیکھا تھا۔

"جانے دیں نا۔ معمولی بات ہے۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لینے سے رشتوں کی خوبصورتی چلی جاتی ہے۔" عین نے جلال کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"مگر اس طرح احساس نہ کرنے سے رشتوں کا احساس مر جاتا ہے اور وقعت جاتی رہتی ہے۔ بہرحال ہمیں اچھا نہیں لگا۔" وہ ناگواری سے مرزا حیدر کو دیکھنے لگا تھا جو کچھ فاصلے پر کھڑے کسی سے باتیں کرتے ہوئے یکدم پلٹے تھے اور ان کے پاس آن رکے تھے۔

"آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کو دیکھا تک نہیں تھا۔ آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟" وہ جلال سے ہاتھ ملاتے ہوئے عین النور سے پوچھنے لگا تھا۔ عین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر انکار میں ہلایا تھا اور ساتھ ہی جلال کا ہاتھ دبا کر اسے کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔ جلال اسے ناگواری سے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

تبھی فتح النساء وہاں آئی تھی۔

"کیا ہوا عین؟ ہم نے سنا آپ اچانک گر گئیں؟ کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟" فتح النساء نے پوچھا تھا۔ تبھی نگاہ مرزا حیدر سراج الدولہ سے ٹکرائی تھی۔ ان کی نگاہوں میں انہیں بہت بے باکی اور عجیب ایک احساس دکھائی دیا تھا جو انہیں معیوب لگا تھا۔ تبھی وہ حیدر کو نظر انداز کر کے جلال کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"جلال آپ پریشان نہ ہوں میں عین کو سنبھالتی ہوں اور ان کے پاؤں کا مساج بھی کر دیتی ہوں۔ معمولی موچ آئی ہوگی۔ آپ جایئے آپ کو چچا جان ڈھونڈ رہے تھے۔" اس نے جلال کو پیغام دیا تھا اور حیدر کی سمت دیکھا تھا۔ جلال سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا۔

وہ فتح النساء کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔

"آپ کو کسی طرح کی مدد چاہیے تو میں موجود ہوں۔" کسی قدر معنی خیز لہجے میں بولا تھا وہ جب فتح النساء نے انہیں گھورا تھا۔

"جب آپ کی مدد کی ضرورت تھی تب تو آپ نے نگاہ تک نہیں کی عین النور پر اور دوسروں کو اب کس مدد کی پیشکش کر رہے ہیں آپ؟" فتح النساء بہت بہادر اور نڈر لڑکی تھی۔ صاف منہ پر کہنے کی ہمت وہ رکھتی تھیں۔ انہیں اس درجہ بے باکی سے دیکھا جانا اچھا نہیں لگا تھا۔ دوسرے انہوں نے دور کھڑے دیکھا تھا جس طرح حیدر عین سے ٹکرا کر بنا انہیں سنبھالے گزر رہے گئے تھے۔

وہ عین کو لے کر ایک سمت آگئی تھیں اور انہیں کرسی پر بیٹھنے میں مدد دیتے ہوئے ملازمہ کے ہاتھ سے تیل لے کر جھک کر عین کے پاؤں کا مساج کرنے لگی تھیں۔ عین انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"آپ کو حیدر اچھے نہیں لگتے؟" جانے کیا سوچ کر عین نے پوچھا تھا۔

"بات اچھا لگنے کی نہیں ہے عین۔ مگر وہ ایک رشتے میں ہیں اور ان کو اس رشتے سے وابستہ ذمے داریوں کا احساس ہونا چاہیے اور یہ تو انسانیت بھی ہے۔ وہ تو تھوڑی بہت انسانیت تو دکھا سکتے تھے۔ کیا جاتا اگر آپ کو تھام کر گرنے سے بچا لیتے۔ آپ کو یہ چوٹ تو نہیں آتی نا۔" فتح النساء نے کہا تھا۔ عین مسکرادی تھی۔

"شکوے شکایتیں کرنے سے رشتوں کا حسن اور

خوبصورتی زائل ہو جاتی ہے فتح النساء اور احساس دلایا نہیں جاتا۔ شاید مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا نہیں تھا۔ اگر وہ دیکھتے تو ضرور گرنے سے بچا لیتے۔" اس نے مرزا کی طرف داری کی تھی شاید وہ مصلحتاً اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھیں۔

فتح النساء نے انہیں دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں کئی باتیں تھیں جن کا ارادہ انہوں نے ملتوی کر دیا تھا اور عین انہیں دیکھ کر مسکرائی تھیں۔

"فتح النساء ہم آپ جیسا نڈر اور بہادر ہونا چاہتے ہیں مگر ہم میں ہمت نہیں۔ آپ بہت بڑی خصوصیت سے نوازی گئی ہیں۔ ایٹ لیسٹ آپ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار واضح انداز میں کسی کے منہ پر کر سکتی ہیں۔ ہمیں تو یہ وصف بھی نہیں آتا۔" عین نرمی سے مسکرائی تھیں۔ فتح النساء ان کو دیکھنے لگی تھیں۔

"Exactly۔ یہی کہنا چاہتے تھے ہم۔ آپ لوگوں کو خاص رعایت دینے کی عادی ہیں جو کہ غلط ہے۔ بہرحال ہمیں آج آپ کے مرزا صاحب ایک آنکھ نہیں بھائے۔ اس حرکت کو دیکھ کر آپ کے دل پر کیا گزری ہم نہیں جانتے۔ ہم ہوتے تو فوراً جا کر شادی سے انکار کر دیتے۔ ایسے بندے سے کون شادی کرنا چاہے گا جو آنکھ میں شرم......!" وہ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔ عین نے انہیں بغور دیکھا تھا۔ تبھی تیمور بہادر یار جنگ وہاں تشریف لائے تھے۔

"سنا ہے کوئی اچانک گر گیا۔ ہم خیریت معلوم کرنے آئے تھے کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" تیمور نے سینے پر ہاتھ باندھ کر پوچھا تھا۔ فتح النساء انہیں دیکھ کر مسکرائی تھیں۔ عین نگاہ پھیر کر اجنبی بن گئی تھی۔

"جن زادے آپ یہاں اس عشائیے میں کہاں؟ آپ کو اپنی دنیا کے مسائل کی کوئی پروا نہیں جو یہاں وہاں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں آپ؟" فتح النساء نے کہا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

"ہماری دنیا کے مسائل آپ کی اس دنیا سے کچھ کم ہیں فتح النساء بی بی۔ اس لئے ہم زمین پر نظر بھی کر لیتے ہیں۔ جن زادوں میں انسانیت کچھ باقی ہے ابھی۔" تیمور کے کہنے پر فتح النساء مسکرائی تھی۔ تیمور عین النور کو بغور دیکھنے لگا تھا۔

"کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔ ہم زمین کے سفر پر ہیں۔ کہکشاؤں کو اٹھا کر زمین پر لا دینے کا وعدہ تو نہیں کرتے مگر اگر آپ حکم دیں تو آپ کی خوشی کے لئے زمین کا ذرہ ضرور بن سکتے ہیں۔ پھر چاہے آپ خالی اڑا دیں اور مٹی میں ملا دیں اور چاہیں تو ستارہ بنا کر آسمان پر سجا دیں۔ یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہوگا۔" وہ فتح النساء سے بولا تھا مگر نظریں غیر ارادی طور پر عین النور کے چہرے کا طواف کرتی رہی تھیں۔ عین اس کی سمت متوجہ دکھائی نہیں دی تھی۔ فتح النساء مسکرا دی تھی۔

"جن زادے آپ کے تیور کمال کے ہیں۔ لگتا ہے ارادہ باندھ کر آئے ہیں کہ دل جیت کر جائیں گے۔ ویسے سنیں۔ کیا جن زادے واقعی اس قدر خوبرو ہوتے ہیں؟ ہمیں اگر جلال سے محبت نہ ہوتی تو سچ میں آج دل ہار جاتے مگر یہ دل کم بخت اس کے لئے دھڑکتا ہے جن کو ہماری دھڑکنوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔" فتح النساء مسکرائی تھیں اور تیل کی شیشی ملازمہ کو تھما کر جانے کا اشارہ کیا تھا اور عین کا پاؤں زمین پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ تیمور عین النور کی سمت دیکھ کر مسکرایا تھا۔ عین اس کی سمت بنا کسی تاثر کے دیکھ رہی تھی۔

"یہ جن زادے نہیں ہیں۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا یہ چاچا حکمت بہادر یار جنگ کے سپوت ہیں۔ ہمیں مشکل میں دیکھ کر یہ فقط ہماری مدد کو آئے تھے مگر اس ویرانے میں اگر آپ مل ہی گئے تھے تو اپنے بارے میں بتا دینے میں کیا قباحت تھی؟" عین نے اسے گھورا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

"اگر آپ کو بتا دیتے تو آپ جن زادے کا خطاب کیسے دیتیں؟ ہمیں یہ اعزاز ملنا ضروری تھا۔ بہرحال آپ کے پاؤں کا درد کیسا ہے اب؟ اتنی بہادر خاتون نے آپ کے پاؤں کی مالش کر دی۔ اب تو موچ بھی ڈر کر بھاگ گئی ہوگی۔" وہ فتح النساء کی سمت دیکھ کر مسکرایا تھا۔ فتح مسکرا دی تھی۔

"شکریہ۔ نوازش ہے۔ لیکن آپ کو خبر کیسے ہوئی کہ ہم بہادر ہیں؟" فتح نے پوچھا تھا۔ تیمور مسکرا دیا تھا۔

"مت بھولئے ہم بچپن سے اس گھر میں آتے جاتے رہے ہیں۔ آپ سے واقف ہیں۔"

"اوہ.....! مگر عین آپ ان کے بارے میں کیسے بھول گئیں؟ آپ کی یادداشت تو خاصی اچھی ہے نا۔" فتح النساء مسکرائی تھی۔ عین تیمور کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

"تب یہ سوکھے سڑے سے کھمبا سے تھے۔ ہمیں کیا خبر تھی۔ چند برسوں میں اتنا بدلاؤ آجائے گا۔ تب تو اتنا شرمائے گھبرائے رہتے تھے کہ ہمارے سامنے ان کی آواز بھی نہیں نکلتی تھی۔ آپ کو یاد ہے فتح ہم نے والی بال کا میچ ہارنے پر ان کے لیے جب سزا تجویز کی تھی تو ان کی کیسی گھگھی سی بندھ گئی تھی؟ تھر تھر کانپنے لگے تھے موصوف۔"

عین کے کہنے پر تیمور مسکرا دیا تھا۔ تبھی فتح النساء بولی تھیں۔

"تب کی بات اور تھی عین۔ تیمور محض بارہ تیرہ برس کے تھے۔ گھبرا گئے تھے۔ تب آپ کا مزاج بھی تو ہٹلر والا تھا نا۔ آپ خاص رعایتوں کا حقدار کچھ خاص لوگوں کو ہی سمجھتی تھیں۔ بہر حال آپ کی کم عمری میں آپ پر ہونے والے ان ظلم کے خلاف میں آواز اٹھانے کو تیار ہوں تیمور بہادر یار جنگ۔ عین نے اس وقت آپ کو کئی کڑی سزائیں دی تھیں جو کہ جائز بھی نہیں تھیں۔" فتح النساء مسکرائیں تھیں۔

تیمور مسکرا دیا تھا۔

"شکریہ فتح النساء۔ آپ انسان دوست لگتی ہیں۔" تیمور نے کہہ کر عین النور کا ہاتھ یکدم تھاما تھا اور اسے کھڑا کر کے قدم قدم چلاتا ہوا چھت کے کنارے تک لے گیا تھا۔ جہاں تاروں سے بھرا چمکتا آسمان ان دونوں کے سروں پر کسی تھال کی طرح سجا تھا۔ عین اسے حیرتوں سے بھری نظروں سے دیکھنے لگی تھی جب وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"رات میں جب کہکشاؤں سے آتی ایک روشنی جلتی بجھتی روشنیوں میں اضافہ کرتی ہوئی چمکتی ہے تو سنا ہے پلکیں جھپکتے ہوئے ہزاروں جگنوں یکدم ٹھٹک جاتے ہیں کیونکہ آپ کی آنکھوں میں حیرتوں کا جو بہاؤ ہوتا ہے اس کا شمار ممکن نہیں ہوتا۔" اس کا نازک سا ہاتھ اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں تھا جب وہ مدھم لہجے میں اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا تھا اور عین نے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہم آپ کے ساتھ کافی کا ایک کپ پینے کا شرف حاصل کر سکتے ہیں؟" وہ بولا تھا جب عین نے سر انکار میں ہلایا تھا اور اس کی سمت سے نگاہ چرا لے گئی تھی۔

"عجیب کشش تھی اس بندے میں اور وہ اس کی سمت دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

"بچپن کے دوست ہیں ہم آپ کے، جیسے فراموش کر گئی آپ۔ یاد رکھئے بہت فراخ دلی سے آپ کی ساری سزاؤں کو سہا ہے۔ یقین نہیں ہوتا آج اتنا نرم دل رکھنے والی لڑکی وہی ہے جو ہمیں ہمارے وزن کے مطابق پتھر اٹھا کر پورے میدان کا چکر لگانے پر مسکرا کر دیکھا کرتی تھیں۔ کتنی ظالم تھیں آپ عین النور پنوڈی۔" وہ شکوہ کرتے ہوئے بولا تھا اور ایک لطیف سی مسکراہٹ خود بخود اس کے لبوں پر حصار کر گئی تھی۔

"ہم نے تب ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ آپ ہر بار ہار جاتے تھے اور ہمیں آپ پر غصہ آتا تھا۔" عین بولی تھی۔ وہ حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔

"آپ کو غصہ آتا تھا کہ میں ہار کیوں جاتا تھا؟"

"نہیں عین کو غصہ اس لیے آتا تھا کہ آپ جان بوجھ کر کیوں ہار جاتے تھے۔" عقب میں کھڑی فتح النساء نے کہا تھا تب تیمور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"ہار کبھی بھی بہت لطیف احساس رکھتی ہے فتح النساء۔ آپ کو تو اس بات کا احساس بخوبی ہوگا نا؟" تیمور کے جتانے پر فتح النساء مسکرائی تھی۔

"ہمیں احساس ہے تیمور بہادر یار جنگ مگر کاش اس کا احساس اس دوسرے فریق کو بھی ہوتا۔" فتح کے لبوں پر بجھی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ پلٹی تھی اور وہاں سے چلی گئی تھیں۔

"ہمیں بھی جانا ہے۔" عین تنہا اس کے ساتھ ہونے کے خیال سے سہم کر بولی تھیں اور تیمور ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

"آپ کی آنکھوں میں یہ ڈر کیسا ہے عین النور؟ آپ چاہیں تو ہم آپ کو تقریب میں واپس چھوڑ دیتے ہیں۔" تیمور نے اس کے چہرے کو بغور پڑھتے ہوئے کہا تھا۔ عین نے اس کی سمت دیکھے بنا سر انکار میں ہلایا تھا اور ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا کر پلٹی تھی مگر مڑ کر ایک ہی قدم چلی تھی جب پاؤں میں درد کی ٹیس دوبارہ اٹھی اور وہ سسک کر رہ گئی تھی۔ تب تیمور نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اسے گرنے سے بچایا تھا۔ ایک عجیب سے احساس کے ساتھ

عین النور اسے دیکھنے لگی تھی۔
''میں نے اپنے بچپن کی دوست کو مدد دی ہے اور یہ کچھ اتنا عجب بھی نہیں ہے۔ پھر آپ اس درجہ حیرت سے میری طرف کیوں دیکھ رہی ہیں؟'' تیمور نے اسے جانچا تھا۔ وہ نگاہ پھیر گئی تھی۔
''اس دوستی کے کوئی معنی نہیں رہے تیمور بہادر یار جنگ۔ وہ بچپن کا ایک قصہ تھا۔ ہم بچے تھے۔ ہم نے جو سزائیں آپ کو دیں وہ نا سمجھی میں دیں۔ اگر ہم آپ سے اب ملتے تو ہم آپ کے ساتھ بہت اچھے سے پیش آتے۔'' وہ وضاحت دیتی ہوئی بولی تھی۔ تیمور مسکرا دیا تھا۔
''میں آپ سے ان سزاؤں کے لئے کوئی شکوہ شکایت نہیں کر رہا عین النور پٹوڈی۔ میں آپ کو صرف اس دوستی کی نوعیت اور معنی یاد دلا رہا ہوں کہ وہ دوست کتنی بے ریا اور کس قدر معصوم تھی۔ آپ اب بھی مجھے ویسی سزاؤں سے نواز سکتی ہیں اور مجھے کوئی قباحت نہیں ہوگی۔'' وہ مسکرایا تھا۔ عین اس سے ایک قدم دور ہٹی تھی۔ نگاہ اس کی طرف سے پھیر لی تھی۔ تبھی پاؤں لڑکھڑائے تھے۔ قریب تھا کہ وہ گرتی کہ تیمور نے ہاتھ بڑھا کر اسے یکدم تھام کر اپنی طرف کھینچا تھا اور اسے گرنے سے بچایا تھا مگر اس کوشش میں اس کا سر تیمور کے سینے سے آن ٹکرایا تھا اور وہ بوکھلا کر رہ گئی تھی۔
''رشتوں کو زمین پر ڈھونڈنا عبث ہے عین النور پٹوڈی کیونکہ رشتے زمین پر نہیں بنتے بلکہ آسمان پر جڑتے ہیں۔ آپ جن رشتوں کا خوف اپنے اندر اپنی دھڑکنوں میں محسوس کرتی ہیں ان کی وقعت اسی ڈر کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے کیونکہ رشتے ڈر نہیں دیتے۔ تحفظ دیتے ہیں۔ جو رشتہ نظروں میں خوف بھرے اور دھڑکنوں کو بے ربط کر دے وہ وہیں دم توڑ رہا ہوتا ہے۔ اسے ختم کرنا یا مارنا نہیں پڑتا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں درج خوف کو جیسے سطر سطر پڑھ رہا تھا۔
عین اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ پھر اس کا ہاتھ چھوڑ کر ریلنگ کو تھام کر کھڑی ہوئی تھی۔
''رشتوں کی وقعت انہیں ماننے سے ہوتی ہے تیمور بہادر یار جنگ اور جن رشتوں کو ہم مان لیں ان کی وقعت بھی جانے نہیں دیتے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جتایا تھا۔ اسے تیمور بہادر یار جنگ کے انداز میں اور آنکھوں میں ایک خاص احساس صاف دکھائی دے رہا تھا اور وہ اس احساس کو نظر انداز کر دینا چاہتی تھی۔
وہ اسے واضح کر دینا چاہتی تھی کہ وہ کسی سے منسوب ہے اور اس رشتے کے ساتھ خوش ہے۔
''جانے آپ کیا سوچ رہے ہیں تیمور بہادر یار جنگ۔ ہم آپ کو جتانا چاہتے ہیں کہ ہم کسی کے نام سے منسوب ہیں اور ہم اس احساس کو اپنے اندر مکمل گہرائی تک محسوس کرتے ہیں۔'' وہ باور کرانے لگی تھی۔
''اور یہ محبت ہے؟'' تیمور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا تھا۔ وہ کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔ تبھی وہ بولا تھا۔
''جب آپ مرزا حیدر سراج الدین سے ٹکرائی تھیں میں وہیں قریب تھا۔ چاہتا تو آپ کو تھام کر گرنے سے بچا سکتا تھا مگر میں نے آپ کو اس رشتے کو آزمانے کے لئے سہارا نہیں دیا تھا۔ کیونکہ میں چاہتا تھا آپ خود اس رشتے کے معنی سمجھیں۔'' تیمور نے جتایا تھا۔
''ہمارے بھائی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ہمیں سنبھال لیا تھا۔ ہمیں کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے ہمارے بھائی کا مضبوط سہارا کافی تھا۔'' عین النور گردن اکڑا کر مضبوط لہجے میں بولی تھی۔ تیمور اسے دیکھ کر مسکرایا تھا گویا اس کی نادانی پر افسوس کیا تھا۔
''بھائی کا رشتہ ایسا ہے جو ہمیشہ آپ کے ارد گرد نہیں رہے گا عین۔ آپ جس سلسلے سے منسلک ہیں آپ کو عمر اسی کے ساتھ گزارنا ہے۔ آپ کسی رشتے پر اس طرح اندھا یقین نہیں کر سکتیں جب کہ وہ رشتہ اس قابل نہ ہو۔ اگر آپ کو محبت ہے تو ٹھیک ہے لیکن محبت بھی اس درجہ رعایت نہیں دیتی۔'' وہ اسے کیا جتا رہا تھا۔ وہ سمجھنے کی کوشش میں اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔
''بہتر ہوگا۔ آپ ہمارے نجی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ ہم اس کی اجازت کسی کو نہیں دیتے۔ ہمارے ابا جان نے جو رشتہ طے کیا ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ محبت ساتھ رہنے سے ہوتی ہے۔ ابھی ہم کسی کے ساتھ نہیں تو کسی کی ذمے داری بھی نہیں۔ سو کسی کو اس ذمے داری کا کوئی احساس بھی نہیں۔ جب ہم ان کے ساتھ ہوں گے تو تب ان کو اپنی ذمے داریوں کا احساس بھی

بھرپور طور پر ہوگا۔ ہم اپنے ابا جان کے انتخاب پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں اور ان کے خلاف نہیں جاسکتے۔ آپ ہمیں باغی ہونے کا احساس کرانا بند کریں۔" وہ تنگ کر بولی تھی مگر اس کی تمکنت اور غصے کے باوجود وہ نرمی سے مسکرادیا تھا۔

"محبت ساتھ رہنے سے نہیں ہوتی عین النور پنڈوڑی نہ دور جانے سے ہوتی ہے۔ محبت ہوتی ہے اور بس ہوتی ہے۔ اگر ہوتی ہے تو تاابد قائم رہتی ہے۔ اگر نہیں ہوتی تو تا ابد اس کا احساس محسوس نہیں ہوتا۔ آپ کو اپنے اندر دبی ان غلط فہمیوں کا اپنے طور پر تدارک کرنا چاہئے۔ کسی پر اس درجہ بھروسہ اور اعتقاد زندگی میں کئی پچھتاؤں کا سبب بنتا ہے اور میں آپ کو بغاوت پر نہیں اکسا رہا۔ ایک رشتے کی حقیقت سمجھا رہا ہوں جس پر آپ حد درجہ یقین کررہی ہیں۔" تیمور نے جتایا تھا۔

وہ خاموش ہو کر چہرہ پھیر گئی تھی۔ تب تیمور اسے خاموشی سے دیکھنے لگا تھا۔ وہ اس کی سمت سے نگاہ پھیرے جانے کیا تلاش رہی تھی اور تیمور اس کی خاموشی پر یکدم مسکرایا تھا۔

"اور خاموشی میں اس کو سنتے ہوئے اندازہ نہیں ہو پاتا کہ لفظ کہاں آکر رکتے ہیں اور کہاں سے پھر آغاز کرتے ہیں۔ لا بیان تذکرے کرتے ہوئے کہاں اپنا تسلسل جاری رکھتے ہیں۔" وہ مدھم لہجے میں بولا تھا اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

عجب سحر باندھ رکھا تھا اس نے اس کے اردگرد جیسے ایک جادو حصار باندھے ساکت کھڑا تھا اور وہ جو حد درجہ محتاط تھی اور خود کو ایک رشتے کا پابند ظاہر کرکے خود کو ثابت قدم رہنے کا یقین دلاتے رہنا چاہتی تھی جانے کیوں ایک انچ بھی اپنی جگہ سے سرک نہ پائی تھی۔ اسرار ان لمحوں میں تھا یا اس شخص کی موجودگی میں؟ وہ سمجھ نہیں پائی تھی مگر وہ اس شخص یا اس کی موجودگی کو کوئی اہمیت دینا نہیں چاہتی تھی مگر وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ ستاروں بھرا آسمان اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ تیز ہوا کا شور اس کی خاموشی پر حیران تھا۔ ہوا اس کی لٹوں سے الجھتے ہوئے جانے کوئی سرگوشیاں کرکے اسے جتانے کی لگن میں تھی جب اس نے خاموشی سے تیمور بہادر یار جنگ کو دیکھا تھا۔ وہ اس کی خاموشی پر جانے کیوں مسکرایا تھا۔

"میں نہیں جانتا کہ جہاں ربط نہیں ہوتا وہاں کوئی رشتہ کیسے جڑتا ہے۔ میں غیب کے کلیوں اور مفروضوں کے اعداد و شمار کو سمجھنے کی سعی نہیں کرسکتا مگر مجھے ایک الہام ہوتا ہے۔ جیسے آپ کا ہاتھ تھامنا اور قدم قدم آپ کے ساتھ چلنا اور اس سفر میں آپ کو محفوظ کرنا جیسے میرا حق ہے اور اولین فرض بھی۔ سو آپ چاہیں بھی تو اس سفر میں آپ کا ہاتھ پکڑ کر چلنے سے مجھے نہیں روک سکتیں۔" وہ مدھم لہجے میں کہتے ہوئے مسکرایا تھا۔ عین النور اس کی سمت دیکھ نہیں پائی تھی اور چہرہ پھیر کر لنگڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی اس سے دور نکلنے لگی تھی۔ موچ کے باعث اس سے چلنا بھی دشوار تھا سو تیمور نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دے کر چلنے میں مدد دی تھی۔

عین النور اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ مگر اس کو چلنے میں مسئلہ تھا سو وہ اس کے ہاتھ کو فوری طور پر جھٹک نہیں سکی تھی۔ تیمور اس کی سمت خاموشی سے دیکھنے لگا تھا اور جانے کیوں عین کو وہ نظریں شکوہ کرتی دکھائی دی تھیں۔ وہ آنکھیں کیا کہہ رہی تھیں؟

"جانتا ہوں امانتوں کو سنبھال کر رکھنا شرط ہے مگر عقل و خرد کو جب یہ باتیں سمجھ میں نہ آرہی ہوں تو دل کو بات کرنے دینا چاہئے۔ جو اعداد و شمار عقل کے دائروں میں ناممکنات میں شمار ہوتا ہے۔ دل کے لئے ممکن ہے بشرطیکہ کوئی تمام شرائط و ضوابط کو کالعدم قرار دے دے۔"

ان لفظوں میں کیا بھید تھے وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ مگر وہ ہاتھ جو اس کے ہاتھ میں تھا اس میں ایک خاص حدت تھی۔ اگر اس کا ہاتھ تھام کر چلنا اس وقت عین النور کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ پل میں اس کا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ چکی ہوتی۔ وہ اس کی باتوں کے اسرار نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ بھید اسے سنائی نہیں دے رہے تھے۔ مگر وہ ایک خاص حصار اپنے گرد محسوس کررہی تھی۔

یہ حصار کس بات کی طرف نشاندہی کررہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

مگر ان لمحوں میں کوئی خاص بات تھی جسے وہ سمجھتے ہوئے بھی نظر انداز کردینا چاہتی تھی۔ تیمور بہادر یار جنگ اس کا ہاتھ تھامے قدم قدم اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ

رشتوں کے ان احساسات سے جیسے قطعی نابلد تھی مگر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

''کیسی ہیں آپ عین النور پٹوڈی؟ ہمیں افسوس ہے آپ کو ہماری وجہ سے یہ چوٹ لگی۔'' مرزا حیدر سراج الدولہ جیسے ایک رکھ رکھاؤ کے تحت اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ وہ سر اٹھا کر خاموشی سے اس کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

''مرزا حیدر سراج الدولہ ہم مروت کے تحت جن کاموں کو انجام دیتے ہیں ان میں کوئی واضح دلیل نہیں ہوتی۔ نہ احساس کی کوئی رمق باقی ہوتی ہے۔ آپ جیسے ہیں ویسے رہیے۔ یہ مروت کچھ عجیب لگتی ہے۔'' عین النور پٹوڈی نے صاف گوئی سے کہا تھا اور مرزا حیدر اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

وہ اپنی جگہ کسی قدر شرمندہ دکھائی دیا تھا مگر فوری طور پر کچھ بولا نہیں تھا۔ پھر مروت کے ہی تحت غالباً کچھ کہنے کو منہ کھولا تھا جب وہ بولی تھی۔

''ہم بچپن سے ایک رشتے میں منسوب ہیں حیدر...... جو فکرمندی آپ نے تب سے نہیں دکھائی اس کا اب احساس جتانا عجیب ہی تو ہے۔'' وہ مسکرائی تھی۔ وہ شرمندہ ہوا تھا۔ عین کی طرف دیکھ نہیں پایا تھا۔ بس مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''ہم ایسے ہی ہیں عین۔ آپ ہمیں اچھے سے سمجھتی ہیں۔ پھر آج شکوہ کیوں؟'' وہ اس کے شکوہ کرنے پر گویا حیران ہوا تھا۔ عین مسکرادی تھی۔

''نہیں ہم شکوہ نہیں کر رہے حیدر۔ ہم آپ کو جتا رہے ہیں کہ آپ مروت کا سہارا نہ لیں۔'' وہ بولی تھی تو حیدر اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

''ہم جس رشتے میں ہیں وہاں توقعات اور شکوؤں کا وجود ہونا عبث نہیں عین۔ مگر ہم وہ لگاؤ محسوس نہیں کرتے یہ درست ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم آپ کو ناپسند کرتے ہیں۔ ہماری رضا اس رشتے میں ہے۔ شاید ہم رشتوں کو لے کر کچھ سرد ہیں۔ اماں بھی یہی کہتی ہیں کہ ہم رشتوں سے اس درجہ قریب نہیں۔ ہم اپنے سے وابستہ رشتوں کو وہ لگاوٹ دکھا نہیں پاتے شاید مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان رشتوں کی قدر نہیں کرتے۔ ان رشتوں کا کوئی احساس نہیں۔'' حیدر نے وضاحت دی تھی۔ اس کی سرد مہری میں کیسا اسرار تھا۔ یہ تو عین سمجھ نہیں پائی تھی مگر وہ اس کے لفظوں پر غور کر رہی تھی۔

''آپ نے کبھی اس رشتے اور ہمارے بارے میں وضاحت سے سوچا؟'' عین نے جانے کیا سوچ کر کہا تھا۔ مرزا حیدر انہیں خاموشی سے دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلانے لگے تھے۔ عین کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی تھی۔

''اگر آپ ہمارے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہم سے کوئی لگاؤ نہیں تو پھر یہ رشتہ کس کام کا ہے؟'' عین اس رشتے کی الجھنوں کے سرے ڈھونڈنے میں لگی تھیں اور مرزا حیدر انہیں خاموشی سے دیکھنے لگے تھے۔ ان کی سماعتوں میں ابا جان کے الفاظ گونجے تھے جہاں وہ مرزا حیدر سے حد درجہ خائف تھے۔

''مرزا حیدر اگر آپ نے اپنے تیور نہ بدلے تو ہم آپ کو اپنی جائیداد سے عاق کر دیں گے۔ بہت شکایتیں سن رہے ہیں آپ کی۔ ہمیں تو ڈر ہے کہ بات نواب صاحب کے کانوں تک نہ پہنچ جائے اور کہیں وہ رشتہ ختم نہ کریں۔ سوچ لیں آپ۔ نواب صاحب سے رشتے کے ختم ہونے کے بارے میں ہم سوچ نہیں سکتے۔ سو آپ شرافت سے اپنے تیور بدل لیجیے۔ ورنہ انجام سے آپ خود نقصان اٹھائیں گے۔ آپ کی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے کوئی رشتہ نہیں دے گا۔ شکر کرو ابھی تک نواب صاحب کو آپ کی حرکتوں کی خبر نہیں پہنچی۔ ان کی اکلوتی بیٹی کی زندگی تم سے جڑی ہے۔ کوئی بھی قدم اٹھائیں تو سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔'' ابا جان نے سمجھایا تھا اور وہ سر جھکائے سنتا رہا تھا۔ وہ عین کو اپنے ارادوں کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ ان میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

ان کا حسن......ان کی دلکشی...... کسی میں دلچسپی نہیں تھی انہیں۔ اگر وہ اس رشتے کو نبھانے پر مجبور تھا تو صرف اس لئے کہ اسے ابا جان کی دھمکی کا ڈر تھا۔ اگر عاق کیے جانے کا خوف نہ ہوتا تو وہ رشتے کو ختم کر چکا ہوتا۔ وہ اپنی سوچوں میں الجھا ہوا تھا جب عین بولی تھی۔

''آپ کو یاد ہے بچپن میں ایک بار آپ ہمارے گھر آئے تھے۔ بارش ہو رہی تھی اور ہم آپ کو ملنے کے لئے

بے اختیار باہر آ گئے تھے۔" عین بولی تھی جب اس نے سر اٹھایا تھا۔

"ہاں ہمیں یاد ہے۔ آپ کو بخار تھا اور آپ بارش کی پروا کیے بنا باہر آ گئی تھیں ہم سے ملنے۔ ہمیں تب افسوس ہوا تھا ہم آپ کو اس بارش میں بھیگنے سے روکنا چاہتا تھا مگر تب تک آپ مکمل طور پر بھیگ چکی تھیں۔ ہمیں افسوس ہوا تھا کہ آپ بھیگ کر بیمار پڑ گئی تھیں اور اگلا پورا ہفتہ آپ بستر سے اٹھ نہیں سکی تھیں اور ہمیں آپ کی فکر ہوتی رہی تھی۔"

مرزا حیدر سراج الدولہ نے اس سے لگاوٹ جتانا ضروری خیال کیا تھا اور عین النور آسودہ سی مسکراہٹ کے ساتھ حیدر کو دیکھنے لگی تھی۔

"ہم جانتے ہیں آپ کو ہمارا خیال رہتا ہے چاہے آپ اس کا اظہار کریں یا نہ کریں۔ ہم جانتے ہیں کچھ لوگ کسی رشتے سے محبت یا لگاوٹ کا اظہار نہیں جانتے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ربط جڑا ہوا نہیں۔" وہ ملائمت سے مسکرائی اور حیدر نے اس کی طرف دیکھا تھا پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آپ اپنا خیال رکھیے گا۔ ہم پھر بات کریں گے آپ سے۔" کہہ کر وہ پلٹا تھا اور چلتا ہوا باہر نکل گیا تھا اور عین اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

فتح النساء کسی کام سے باہر آئی تھی جب حیدر چلتا ہوا اس کے سامنے آن رکا تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی مگر سیڑھی کے آخری قدم پر جا کر اس کا پاؤں غرارے کے الجھاؤ میں بے طرح الجھا تھا اور وہ دھڑم سے زمین پر جا پڑی تھی۔ سراج حیدر اس کے قریب آیا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا اور پھر سہارا دے کر اسے کھڑا ہونے میں مدد دی تھی۔ فتح النساء کو اس کی آنکھیں نظروں کی بے باکی بہت بری لگی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک کر سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے اسے ناگواری سے دیکھا تھا۔

"مرزا حیدر سراج الدولہ بہت بری نظر ہے آپ کی۔" وہ تنک کر بولی تھی مگر حیدر مسکرا دیا تھا۔

"نظر تو انتخاب کی بہت خاص ہے فتح النساء۔ دیکھیں کہاں جا کر رکتی ہے۔ آپ کا حسن لاجواب ہے۔ اب بندہ کیا کرے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کو چھونے

امام غزالیؒ فرماتے ہیں

نفس وہ بھوکا کتا ہے جو انسان سے غلط کام کرانے کے لیے اس وقت تک بھونکتا رہتا ہے جب تک انسان وہ غلط کام کر نہ لے اور جب انسان وہ کام کر لے تو یہ کتا سو جاتا ہے مگر سونے سے پہلے انسان کے ضمیر کو جگا جاتا ہے۔

ایم فاطمہ سیال...... محمود پور

اچھی باتیں

- صرف انسانوں سے حوصلہ افزائی کی امید رکھو گے تو ضرور مایوس ہو جاؤ گے اور جو محنت اپنے رب سے اجر پانے کے لیے کرتے ہیں وہ مایوس نہیں ہوتے۔
- انسان کی دو ہی کمزوریاں ہیں بنا سوچے عمل کر دینا اور سوچتے رہنا عمل نہ کرنا۔
- مطلب پرست انسان اپنا مقصد حاصل کرنے کے باوجود بھی تنہا اور بے سکون رہتا ہے۔
- کچھ باتوں کا جواب صرف خاموشی ہوتی ہے اور خاموشی بہت ہی خوب صورت جواب ہے۔
- عاجزی یہ ہے کہ انسان دوسروں کے اندر ایک برائی دیکھے تو اسے اپنی دس برائیاں یاد آ جائیں۔
- انسان کا سب سے بڑا مسیحا وہ خود ہوتا ہے۔

کشف فاطمہ...... سرگودھا

حجاب

حجاب محض عورت کا پردے میں چھپ جانا اور سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کی ایڑی تک اپنے آپ کو ڈھانپ لینا ہی نہیں نہ حجاب یہ ہے کہ عورت کو گھر کے کسی کونے میں بند کر دیا جائے جہاں سے نکلنے کی اسے اجازت ہی نہ ہو بلکہ حجاب دراصل یہ ہے کہ عورت باعزت طریقے سے خود کو ڈھانپے۔ باوقار اور لباس پہنے اور اپنی عزت خود کرائے اپنی زینت اور زیب و آرائش کو غیر محرموں سے چھپائے۔

ارم وڑائچ...... شادیوال، گجرات

لگا تھا۔ جب فتح النساء نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"بہت عجیب آدمی ہیں آپ۔ رشتوں کی پہچان نہیں آپ کو۔ عین اتنی تعریف اور اتنا تذکرہ کرتی ہے ہر گھڑی آپ کا۔ ہمیں لگا آپ اچھے آدمی ہیں مگر آپ تو......!" وہ سخت بولتے بولتے رہ گئی تھی۔ اس کے غصے کے باوجود مرزا حیدر مسکرادیا تھا اور پھر آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھنے لگا تھا۔

"چاند کی ضیاء اور آپ کے چہرے سے پھوٹتی روشنی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ہم چھو کر یقین کرنا چاہتے تھے کہ یہ ہوش اڑاتا چاند ہمارا خواب وخیال تو نہیں؟" حیدر نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ فتح النساء اس کی نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی تبھی پلٹ کر دوبارہ محل کے اندر جانا چاہا تھا مگر حیدر نے بہت سرعت سے ان کی کلائی کو تھام لیا تھا۔ فتح النساء ان کی اس درجہ بے باکی اور گستاخی پر انہیں حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

"ہمارا ہاتھ چھوڑیئے۔ آپ کی ہمت کیسے ہوئی کہ ہمارا ہاتھ تھامیں؟ چھوڑیئے؟" وہ غصے سے گویا ہوئی تھی مگر حیدر اس کی سمت دیکھتے ہوئے مسکرادیا تھا۔

"چاند کا ہاتھ تھامنے کا تصور کیا تھا آج چاند زمین پر آگیا ہے تو پھر تردد کیسا؟ آپ کا چہرہ...... آپ کی آنکھیں...... ہمیں بے خود کررہی ہیں فتح النساء۔ ہمیں خبر نہیں تھی کہ عین النور کی سہیلی اتنی خوبصورت ہوگی۔ تذکرہ بہت سنا تھا مگر آج اس ضیافت میں دیکھ کر ہم اپنے ہوش گنوا بیٹھے۔ ایسا بے مثل حسن ہے کہ ہوش گنوادے۔ آپ عین النور سے قبل کیوں نہیں ملیں ہمیں؟" وہ اس کے چہرے کو بے باک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ جب فتح النساء نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اسے ناگواری سے دیکھا تھا اور ان کی اس درجہ بے باکی پر ایک تھپڑ انہیں رسید کردیا تھا۔

وہ جس قدر قریب آرہے تھے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا۔

وہ اپنی حدود نہیں رکھتے تھے مگر فتح النساء اپنی حدود جانتی تھی تبھی انہیں غصے سے دیکھتی ہوئی گویا ہوئی تھی۔

"ہمیں افسوس ہے ہماری اتنی پیاری دوست آپ سے جڑی ہیں۔ آپ ان کے لائق نہیں ہیں مگر!" وہ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

مرزا حیدر الدولہ ڈھٹائی سے مسکرادیئے تھے۔

"آپ چاہتے ہوئے بھی اس ملاقات کا ذکر عین النور سے نہیں کرسکتیں۔ انہیں آگاہ نہیں کرسکتیں اور اگر کر بھی دیں گی تو عین النور آپ کی بات کا یقین نہیں کریں گی کیونکہ وہ ہم سے محبت کرتی ہیں اور ہمارا یقین کرتی ہیں۔" فتح النساء کو حیرت ہوئی تھی۔ ان کی پیاری سہیلی کا منگیتر ایک گرا ہوا انسان تھا۔ جس کی حقیقت عین النور نہیں جانتی تھیں۔ فتح النساء کو افسوس ہوا تھا۔

"شعلوں سے بھری کوئی آگ ہیں آپ مگر آپ کی تلخی کے باوجود ہم آپ پر فریفتہ ہورہے ہیں۔ اپنا ہوش کھو رہے ہیں۔ ہماری مانیئے۔ عین کو بتانے سے بہتر ہم سے تعاون کریں۔ ہم آپ کو خوش کردیں گے۔ جتنا مال ودولت آپ چاہیں گی آپ کو ملے گا اور......!" حیدر سراج الدولہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا جب وہ بولی تھی۔

"اپنی گندی زبان بند رکھیے آپ۔ عزت کرنے کے قابل نہیں ہیں آپ۔ مجھے عین کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ جیسوں کا دماغ ٹھکانے لگانے کے لئے فتح النساء خود آپ کافی ہے۔ بزدل انسان ہیں آپ جو مرد رات کی تاریکی میں ایک لڑکی کے سامنے کھڑا ہوکر کمزور لہجے میں بات کرے وہ مرد کسی طور پر بھی مرد کہلائے جانے کے قابل نہیں۔ عین کی قسمت پھوٹنے والی ہے اور وہ بے خبر ہیں۔ جس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔ ہم بکاؤ مال نہیں ہیں۔ آپ نے ہماری توہین کی ہے۔ ہم نواب زادی نہ سہی مگر رؤسا کی اولاد میں شمار ہوتے ہیں اور......!" وہ بولی تھی جب وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے ہنسنے لگا تھا اور پھر اسے کلائی سے تھام کر جھٹکے سے قریب کرلیا تھا۔

"رؤسا کی اولاد، جن کا تذکرہ وہ کسی سے برملا کرنا گوارہ نہیں کرتے؟ امراء اور رؤسا کی ایسی کئی اولادیں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ فتح النساء ہم آپ کو عزت دے رہے تھے۔ آپ کے خاندان کا اعدوشمار جانتے ہیں۔ آپ تو واقف بھی نہیں آپ کے باپ کا نام کیا ہے اور ماں کا نام کیا۔ مگر ہم جانتے ہیں۔ ہم آپ کو عزت دینے چلے تھے مگر آپ کو منظور نہیں تو نہ سہی۔ گمنامی میں بہت کچھ دفن ہے فتح النساء اور اس میں سے ایک آپ کا نام بھی ہے۔ پاکر تو ہم آپ کو رہیں گے کہ مرزا حیدر نے آج تک جس شے کی

خواہش کی ہے اسے پا ضرور لیا ہے۔ مگر آپ نے ہمیں تھپڑ رسید کر کے اچھا نہیں کیا۔ ہم آپ کو معاف نہیں کریں گے۔ آپ کو آپ کے حسن کا گمان ہے اور نواب زادی پٹوڈی کے قریب ہونے کا مگر ایک دن وہ ہی آپ کو دھتکار دیں گی اور تب آپ کو آپ کی اصلیت اور مقام دونوں پتہ چلیں گے۔ آج جو ہمیں سر اٹھا کر گھور رہی ہیں آپ اس دن نگاہ اٹھا کر ہم سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں رہیں گی آپ اور اس حسن کا گمان زیادہ مت کیجئے۔ یہی حسن آپ کی بدنامی کا باعث بنے گا اور آپ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گی۔ مرزا حیدر سراج الدولہ آپ کو سبق سکھا کر رہے گا۔'' اس کی کلائی پر اس کی گرفت بہت سخت تھی کہ کئی چوڑیاں ٹوٹ کر کلائی میں پیوست ہوتی چلی گئی تھیں۔

اس کی نگاہیں ساکت تھیں اور وہ حیرت سے سامنے کھڑے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ جب حیدر سراج الدولہ نے ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا تھا۔ فتح النساء یکدم مڑی تھیں اور چلتی ہوئی تیزی سے محل کے اندر داخل ہوگئی تھیں۔

اندر آ کر ان کا دل بہت دیر تک معمول پر نہ آسکا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھیں مرزا حیدر سراج الدولہ ان کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جان پائے تھے؟ جب کہ وہ خود بھی اپنے بارے میں اتنا نہیں جانتی تھیں۔

ان کی رشتے کی ایک بوا نے انہیں پالا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں دراصل ان کا ان سے رشتہ کیا تھا مگر وہ بہت ضعیف تھیں اور فتح النساء انہیں احترام سے بوا کہہ کر پکارتی تھیں۔ اس ایک رشتے کے علاوہ انہوں نے اپنے گرد کسی اور رشتے کو نہیں دیکھا تھا۔ بوا نے بتایا تھا کہ ان کے والدین ان کے بچپن میں ہی گزر گئے تھے۔

''کیسے؟'' جب فتح النساء نے پوچھا تھا تو بوا نے بتایا تھا کہ وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ تھا۔ وہ نواب صاحب کے اچھے دوست تھے اور وہ نواب صاحب کی طرف ایک دعوت میں شرکت کے لئے جا رہے تھے جب ان کی کار کو یہ حادثہ پیش آ گیا تھا اور دونوں میاں بیوی موقع پر ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ تب سے نواب سیف الدین پٹوڈی نے فتح النساء کی تمام ذمے داری اٹھائی تھی۔ ان کی پڑھائی کے اخراجات سے ان کی گزر اوقات کی تمام ذمہ داری نواب صاحب پوری کرتے تھے۔ اس عمل میں اسے ایک بیٹی کا درجہ دیا جاتا تھا۔ ایک بیٹی کی طرح عزت اور مان دیا جاتا تھا۔ سارے ملازمین اور افراد اسے گھر کی ایک بیٹی کی طرح محبت کرتے تھے اور وہی مقام دیتے تھے جو عین النور پٹوڈی کو حاصل تھا۔ وہ عین النور کی بچپن کی دوست تھیں۔ بچپن سے اس گھر میں آنا جانا تھا۔ مگر ان کی رہائش کا انتظام وہیں تھا جہاں نواب صاحب کی ایک پرانی عمارت تھی۔ بتایا گیا تھا کہ فتح النساء کے والدین کے گزر جانے کے بعد ان کے رشتے داروں نے ان کی جائیداد کے حصے بانٹ لئے تھے اور تب ان کے پاس جب رہنے کو بھی کوئی جگہ نہیں بچی تھی تو نواب صاحب نے اپنی جگہ کی پیشکش کر دی تھی۔ تب سے وہ نواب صاحب کی ایک پرانی حویلی میں ہی قیام پذیر تھیں۔

زندگی پرسکون انداز میں گزر رہی تھی اور ان کو کبھی کسی شے کے بارے میں سوال اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ سو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا مگر آج مرزا حیدر کی باتوں نے ان کے اندر کئی سوال اٹھا دیئے تھے۔ سب مہمان دی جانے والی ضیافت میں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف تھے۔ روسا اور امراء اپنے اپنے مطلب کی باتیں کرتے ہوئے کئی اہم امور پر تبادلہ خیال کرتے ہوئے کئی باتوں کی گتھیاں سلجھا رہے تھے جب فتح النساء کی نظر سامنے کھڑے نواب سیف الدین پٹوڈی پر پڑی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھرے کھڑے تھے۔ اس لمحے وہ ان کے قریب جا کر کچھ دریافت نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر ان کے ذہن میں کئی سوال بھرے تھے جب وہ پلٹی تھیں اور جلال الدین سے ٹکرائی تھیں۔ وہ ایسی کھوئی سی تھیں کہ ان کی قربت ان کے ٹکرانے کا انہوں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ ورنہ تو جلال کا نام سن کر ہی ان کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتی تھیں۔ کہاں وہ اس وقت قریب کھڑے تھے تو وہ ان کی طرف ڈھنگ سے متوجہ بھی نہیں تھیں۔ انہیں گرنے سے بچانے کے لئے جلال نے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا اور اس بات کا انہیں احساس بھی نہ تھا۔

''کیا ہوا فتح النساء؟ آپ اتنی سہمی اور پریشان دکھائی کیوں دے رہی ہیں؟ خیریت ہے؟'' نواب زادہ جلال الدین پٹوڈی نے پوچھا تھا۔ جب وہ اجنبی نظروں سے انہیں دیکھنے لگی تھی تب جلال اسے دیکھ کر مسکرائے تھے۔

''لگتا ہے آج کی اس دعوت سے آپ کو کوئی خاص سروکار نہیں۔ جانے کہاں کی فکریں لئے آپ اپنی سوچوں میں بھٹکتی پھر رہی ہیں۔ مگر اس طرح ایک عجیب کھوئی ہوئی سی روح لگ رہی ہیں آپ۔'' جلال نے اسے چھیڑا تھا مگر وہ تب بھی اسی طور کھڑی ہوئی اس کی سمت کھوئے کھوئے سے انداز میں دیکھتی رہی تھی۔ تب وہ سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا تھا۔

''آپ ٹھیک ہیں فتح النساء؟'' جلال الدین نے پوچھا تھا۔ تب اس نے سر ہلا دیا تھا۔

''کسی نے کچھ کہا ہے؟ آپ ہمیں بتایئے۔'' جلال کو اس کی فکر ہوئی تھی۔ فتح النساء نے سر انکار میں ہلا دیا تھا۔

''ہم چچا سیف سے بات کرنا چاہتے تھے مگر وہ مصروف ہیں۔ کیا ہمیں گھر چھوڑ آئیں گے؟ ڈرائیور جانے کب گاڑی لے کر آئیں۔ ہمیں گھر واپس جانا ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی تھی۔ جلال اسے دیکھ کر چونکا تھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟ کیا ہوا؟ ابا جان سے کیا بات کرنا تھی آپ کو؟ لگتا ہے عین کے پاؤں کی موچ کے ساتھ آپ کی دلچسپی اس دعوت سے رخصت ہوگئی ہے۔ آیئے میں آپ کو عین کے کمرے تک چھوڑ دوں تاکہ آپ دونوں سہیلیاں مل کر خوب اوٹ پٹانگ باتیں کرلیں اور آپ کا موڈ بحال ہو جائے۔'' جلال نے کہا تھا۔ مگر اس نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

''نہیں۔ ہمیں گھر جانا ہے۔ اگر آپ ہمیں چھوڑ آئیں تو؟'' فتح النساء نے درخواست کی تھی۔ دور کھڑے نواب صاحب نے ان دونوں کو بغور دیکھا تھا اور ملازم کو بھیج کر کہلوایا تھا۔

''چھوٹے نواب صاحب، نواب صاحب فرمارہے ہیں اس وقت کہیں مت جایئے گا۔ وہ آپ کا تعارف کسی خاص مہمان سے کروانا چاہ رہے ہیں۔'' ملازم نے ادب سے کہا تھا۔ تبھی وہ بولا تھا۔

''ابا جان سے کہہ دیں کچھ دیر کی بات ہے، ہم فتح النساء کو ان کے گھر چھوڑ کر جلد لوٹ آئیں گے۔ سو پھر آ کر ان مہمان سے مل لیں گے۔ یوں بھی دعوت ابھی تو عروج پر ہے۔'' جلال نے مسکراتے ہوئے پیغام دیا تھا مگر تب ملازم اس کا پیغام لے کر نواب صاحب کے پاس لے کر گیا تھا اور جواب کے ساتھ فوراً پلٹا تھا۔

''نواب صاحب نے فرمایا ہے فتح النساء صاحبہ کو ہمارے ملازم خاص رستم چھوڑ آتے ہیں۔ آپ دعوت میں رہیں۔'' ابا جان کے پیغام کو پا کر وہ الجھتے ہوئے فتح النساء کو دیکھنے لگا تھا۔

''معذرت چاہتے ہیں فتح النساء۔ ہم آپ کو چھوڑ کر نہیں آسکیں گے۔ آپ حمایت کے ساتھ جائیں وہاں رستم آپ کے منتظر ہوں گے۔ وہ آپ کو بہت احترام کے ساتھ گھر پہنچا دیں گے۔ ہماری تو خواہش تھی آپ دعوت ختم ہونے تک یہاں رکیں مگر خیر اب آپ کی مرضی آپ کو جانا ہے تو ہم روک نہیں سکتے۔'' جلال نے مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا اور جلال ایسے الفاظ کہتے تو فتح النساء دل و جان سے فدا ہو جاتیں مگر اب اس لمحے جیسے انہوں نے کوئی نوٹس بھی نہیں لیا تھا اور حمایت کی ہمراہی میں باہر نکل گئی تھیں۔ جلال ان کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔ انہیں فتح النساء بہت عجیب لگی تھیں۔ مگر اس وقت وہ اس بارے میں زیادہ سوچ نہیں سکتے تھے کیونکہ ابا جان نے انہیں کسی خاص دوست سے ملنے کے لئے بلوالیا تھا۔

اور پھر وہاں انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

......☆☆☆......

''کیا ہوا بھائی؟ فتح النساء اتنی جلدی کیسے چلی گئی؟'' عین نے باہر آ کر فتح النساء کو نہ پا کر پوچھا تھا۔ جلال نے سر انکار میں ہلایا تھا۔

''میں نہیں جانتا مگر وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ مجھے کہہ رہی تھی گھر چھوڑ دو مگر مجھے ابا جان نے روک لیا وہ جنت الفردوس کی فیملی سے مجھے ملوانا چاہتے تھے۔'' جلال نے کہہ کر بہن کی طرف دیکھا تھا۔

''اوہ...... ایک تو ابا جان بھی نا۔ آپ کی شادی جنت الفردوس سے کروا کر دم لیں گے۔ سول لئے آپ جنت الفردوس اور ان کی فیملی سے؟ ہم آپ سے پوچھنا چاہتے تھے کیا واقعی آپ جنت سے شادی کرنا چاہتے تھے؟ کیا یہی وہ ایک لڑکی ہے جس کے لئے آپ نے سوچا تھا؟'' عین

نے بھائی کو کریدا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔
”تم جانتی ہو ابا جان ٹھان لیں تو کر کے چھوڑتے ہیں اور میں ان کو خفا نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ مصلحت بھرے لہجے میں گویا ہوا تھا۔ عین نے بھائی کو دیکھا تھا۔
”مگر بھائی ہمیں فتح النساء آپ کے لئے بہت پسند ہیں۔ فتح النساء کے دل میں بھی آپ کے لئے خاص گنجائش ہے اور......!“ وہ فتح النساء کا ذکر کر رہی تھیں جب وہ بولا تھا۔
”عین اگر ہمیں اپنی من مانی کرنی ہوتی تو ہم باہر سے میم بیاہ کر لے آتے۔ مگر ابا جان کے خلاف نہیں جانا۔ ابا جان جو کر رہے ہیں انہیں کرنے دو۔“ وہ مسکرا کر پرسکون لہجے میں بولے تھے اور عین انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ تب جلال نے اسے دیکھا تھا اور شانوں سے تھاما تھا۔
”عین فتح النساء اچھی لڑکی ہیں مگر سچ مانو ہم نے کبھی ان کے لئے دل سے کچھ محسوس ہی نہیں کیا۔ اگر وہ ہمارے بارے میں اچھے جذبات رکھتی ہیں تو ہم اس کی قدر کرتے ہیں مگر اس سے زیادہ ہم ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان سے دوستی اسی حد تک قبول ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے خیر سگالی کا پیغام دے سکیں۔ مگر اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔“ جلال نے واضح طور پر انکار کیا تھا۔
”فتح النساء بہت اچھی ہے بھائی ان کا دل اچھا ہے۔ ہماری بچپن کی سہیلی ہیں اور......!“ عین نے اسے ازسرِ نو قائل کرنا چاہتا تھا۔ وہ مسکرا دیا تھا۔
”آپ ابا جان سے بات کرلیں اگر آپ میں ہمت ہے تو۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن ایک بات ہم جانتے ہیں۔ ابا اپنے دوست کی ان بیٹی کے لئے کچھ ٹھان چکے ہیں۔ سو اب وہ ہماری منگنی ان سے کروا کر دم لیں گے۔ آپ کو معلوم ہے ہم فتح النساء کو چھوڑنے کے لئے وقت لینا چاہتے تھے اور ابا جان کو ہمیں جنت سے ملوانے کی اتنی جلدی تھی کہ انہوں نے ہمیں جانے ہی نہیں دیا۔“ جلال مسکرایا تھا۔ عین نے سر ہلا دیا تھا۔
”ہم جانتے ہیں ابا جو ٹھان لیتے ہیں سو کرتے ہیں مگر ہمیں وہ چپٹی ناک والی جنت نہیں پسند تو بس نہیں پسند۔ اب ہم بہن ہیں۔ کچھ ارمان بہن کے دل کے بھی ہوتے ہیں اپنی اکلوتی بھابھی کو چننے کے لئے اور فتح النساء ہمیں

اس کے عین مطابق لگتی ہیں۔ بہر حال آپ خاموش ہی رہیے۔ ہم ابا جان سے خود بات کرلیں گے۔ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ اگر ہم بات کرلیں گے تو پھر تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا؟ یہ نہ ہو کہ ہم ادھر ابا جان سے بات کریں اور ادھر آپ اعتراضات اٹھا کر مخالفت کردیں۔ آپ کا ارادہ بھی تو بدلتے دیر نہیں لگتی نا۔'' وہ بولی تھی تو جلال مسکرا دیا تھا۔

''ہماری مرضی پوچھی جاتی تو ہم تو ایک ہی نام لیں۔ ایسا حسن کہ کبھی دیکھا نا سنا۔ پورا ولایت گھوم لیا مگر ان جیسا چہرہ کبھی نہیں پڑھا۔ عجیب لفظوں سے بھرا ہے کہ پڑھتے جاؤ اور نظر تھکے نہ۔'' وہ مسکرایا تھا اور عین انہیں حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

''یہ کون ہیں؟''

''ہیں کوئی......!'' وہ مسکرایا تھا۔

''ان کا ذکر ابا سے نہیں کرسکتے آپ؟'' وہ قائل کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

''ابا جان دو کانوں میں سر کردیں گے۔ آپ چاہتی ہیں ابا آپ کے پیارے جلال بھائی کو گھر سے نکال دیں؟'' جلال مسکرایا تھا اور اس کی ناک کو دبا دیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کو سوچا تھا اور پھر نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

''ابا آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ آپ کو گھر سے نکال دیں مگر...... یہ ہیں کون؟ کچھ ہمیں بھی بتائیے۔''

''اس دنیا کی نہیں ہیں سو ان کا نام بھی نہیں لے سکتے ہم۔''

''اف...... بھائی حد کرتے ہیں آپ۔ کس دنیا کی ہیں اگر اس دنیا کی نہیں تو؟'' عین نے الجھن سے بھائی کو دیکھا تھا۔

''اب آپ سے کیا کہیں۔ پھر کبھی بتا دیں گے۔ فی الحال آپ آئیے آپ کی ساس صاحبہ کئی بار آپ کا پوچھ چکی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کو دیکھے بنا ان کو دعوت کا کھانا بھی ہضم نہیں ہونے والا۔ اتنی محبت؟ یہ واقعی محبت ہے یا محبت کا کوئی جال؟'' جلال مسکرایا تھا اور سہارا دے کر اسے لے کر چلتا ہوا باہر آیا تھا جہاں تمام مہمان دعوت کے لئے موجود تھے۔

''آپ کو زیادہ درد ہو رہا ہے تو اٹھا لیتے ہیں ہم؟'' جلال نے آفر دی تھی۔ عین نے سر انکار میں ہلا دیا تھا اور چلتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔

نواب صاحب کھڑے ہوئے تھے اور مسکراتے ہوئے اہم اعلان کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

''ہم ایک اہم اعلان کرنا چاہتے ہیں۔''

''ایک اہم اعلان ہم بھی کرنا چاہتے ہیں چاچا جان۔'' مرزا حیدر مسکرائے تھے۔ سب نے انہیں حیرت سے دیکھا تھا۔

''بیٹا آپ اہم اعلان پہلے کرلیں۔ ہم اپنا اعلان بعد کے لئے اٹھا رکھتے ہیں۔'' نواب سیف الدین مسکرائے تھے۔ سب ہنسنے لگے تھے۔ تبھی حیدر کچھ خجل سے ہوگئے تھے۔ تبھی حکمت صاحب مسکرائے تھے۔

''آپ اعلان کریں نواب صاحب بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ اعلان کے بعد ڈنر بھی کرنا ہے۔'' ان کے کہنے پر سب مسکرائے تھے اور تائید کی تھی۔ تبھی نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنے پیارے بیٹے کو دیکھا تھا مگر عین نے تبھی انہیں ہاتھ ہلا کر روک دیا تھا۔

''ابا جان پلیز فی الحال کوئی اعلان مت کریں۔ ہمیں آپ سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔'' عین نے ابا کو نجح النساء کے بارے میں قائل کرنا چاہا تھا تبھی وہ ان کو جنت کے بارے میں کوئی بھی باقاعدہ اعلان کرنے سے روکنا چاہتی تھی۔ نواب صاحب نے بیٹی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

''بیٹا ہم اہم اعلان یہ کرنا چاہتے تھے کہ آج رات کا ڈنر کچھ ہی دیر میں کھلنے والا ہے سو شائستگی کا مظاہرہ کریں۔'' وہ کہتے ہوئے مسکرائے تھے اور تمام مہمان مسکرا دیئے تھے۔

''کیا یار نواب صاحب۔ ہمیں لگا آپ کوئی اہم سیاسی اعلان کریں گے۔ کہیں مسلم لیگ سے تو نہیں جڑ گئے آپ؟'' حکمت کے مسکرانے پر نواب صاحب نے سر تائید میں ہلایا تھا۔

''حکمت صاحب ہم تو دل سے مسلم لیگی ہیں اور مسٹر جناح کے ساتھ ان کی مکمل حمایت میں کھڑے ہیں۔ اس کے لئے جتانا ضروری نہیں۔'' نواب صاحب نے مسکراتے

ہوئے کہا تھا۔ تبھی مرزا سراج الدولہ نے کہا تھا۔

"کہیں یہ ہم پر کوئی طنز تو نہیں نواب صاحب؟ سننے میں آیا تھا کہ آپ کو ہمارا کانگریس کا حصہ بننا پسند نہیں آیا۔" مرزا صاحب مسکرائے تھے۔

"ارے میاں ہمیں ناپسندیدگی ظاہر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ نے بہت اچھا کیا جو کانگریس سے جڑ گئے۔ سیاسی گٹھ جوڑ تو ایسے ہی ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس کے لئے کوئی قید نہیں۔ آپ کو جو مناسب لگا آپ نے وہ کیا اور ہم اس کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ سمدھی ہونے کا مطلب مخالفت برائے مخالفت کرنا نہیں ہے۔" نواب صاحب مدلل انداز میں بولے تھے تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ نواب صاحب بلا کا حس مزاح رکھتے تھے اور یہ بات سب جانتے تھے۔ سو ان کی گفتگو کو سب انجوائے کر رہے تھے۔

مرزا صاحب مسکرا دیئے تھے۔

"بہر حال ہماری طرف سے اہم اعلان یہ ہے کہ ہم یہیں قیام کرنا چاہیں گے اور پاکستان جانا نہیں چاہیں گے۔ آپ کو اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے سرحد پار آنا ہوگا۔" مرزا صاحب مسکرائے تھے۔

"جیسے آپ کی رضا مرزا صاحب ہم تو آپ کی رضا میں خوش ہیں۔ بیٹی تو اب آپ کی ہے۔ ہم تو زبان دے چکے ہیں۔ چاہے یہاں رہے یا پاکستان ہم اپنی بیٹی سے واسطہ اور تعلق تو ہمیشہ رکھیں گے۔ چاہے سرحد پار کر کے یہاں آنا پڑے۔ لیکن اچھا ہوا مرزا صاحب آپ نے یہ طے کر لیا۔ یہ فیصلہ بھی ضروری تھا۔ ہم تو پاکستان جانا چاہیں گے جس ریاست کے لئے اتنی جدوجہد ہو رہی ہے۔ اس کے بنانے کا کیا فائدہ اگر ہم سب اس زمین کے ہو کر رہ گئے تو۔ ہم تو اس نئی ریاست میں قدم ضرور رکھیں گے اور پہلے پہل جھک کر سجدہ کریں گے اور اس سرزمین کو چوم لیں گے۔ اس زمین پر ہمارا پورا حق ہوگا۔ اس زمین کا اس زمین سے مقابلہ ممکن نہیں مرزا صاحب۔" نواب صاحب مسکرائے تھے۔

"ارے نواب صاحب زمینیں سبھی ایک سی ہیں۔ اس زمین میں کچھ خاص نہیں ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد کی قبریں اور نشانیاں اس ملک میں ہیں سو ہماری [illegible] کے ہو رہے۔ جانے دیجئے اس نئی زمین اور اس کے خواب کو۔" مرزا صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور نواب صاحب نے تحمل سے سر انکار میں ہلایا تھا اور مسکرا دیئے تھے۔

"غلامی غلامی ہے مرزا صاحب۔ انگریزوں کی ہو یا ہندوؤں کی اور ہم فرنگیوں کی اس غلامی کے ساتھ ہندوؤں کی نفسیاتی فتح کے خلاف ہیں۔ ہم اس قوم کی غلامی نہیں کر سکیں گے۔ ہم سے یہ نہیں ہوگا۔ سو جیسے ہی پاکستان بننے کا اعلان ہوتا ہے ہم وہ پہلے فرد ہوں گے جو اپنی جائیدادیں چھوڑ کر اس سرزمین کی سمت روانہ ہوں گے۔" نواب صاحب مسکرائے تھے۔

"ابا جان ٹھیک کہتے ہیں چچا مرزا صاحب۔ ہم بھی ابا کے ساتھ اس نئی زمین کی طرف روانہ ہونا چاہیں گے۔" جلال مسکرایا تھا۔

"اس معاملے میں ہم بھی آپ کے ہم خیال ہیں جلال، ہمیں بھی پاکستان میں رہنے کا شوق ہے۔ سوری ابا جان ہم آپ کی مخالفت میں بول رہے ہیں مگر ہمیں بھی پاکستان جانا ہوگا۔" حیدر نے کہا تھا تو مرزا صاحب نے بیٹے کو حیرت سے دیکھا تھا۔

حیدر عین النور کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے۔

"ہم اتنے ظالم نہیں ابا جان کہ رشتوں کو بانٹ دیں۔ ہم چاہیں گے عین النور اپنے ابا جان کے قریب رہیں۔ دوسرا ہم خود بھی اس سرزمین کے لئے دل میں کچھ اہمیت اور قدر رکھتے ہیں۔ وہ زمین مسلمانوں کے لئے بنائی گئی ہے اور اس ریاست میں کچھ تو خاص ہوگا۔ ہم اس کے باسی ضرور بننا چاہیں گے۔" مرزا حیدر کے کہنے پر عین نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا جبکہ مرزا سراج الدولہ نے بیٹے کو ناگواری سے قدرے غصے سے دیکھا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

حسب جوا علی

سوچ جب جنون کی شکل اختیار کرلے تو انسان ایک مشین کی صورت اختیار کر لیتا ہے اس کی حرکات وسکنات کمپیوٹرائزڈ ہو جاتی ہیں وہ وہی کرتا ہے جو میموری میں فیڈ کیا جاتا ہے۔ یہ سوچے بنا کہ اس کے عمل سے اس کے اردگرد رہنے والوں پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ایک جنونی کی روداد اس کے ذہن میں جہادی سوچ پیدا ہو گئی تھی

مبین میاں ایک بار پھر واپس آ گئے لیکن اس بار اکیلے نہیں بلکہ پورے کنبے کے ساتھ یعنی ایک عدد بیوی اور تین گورے چٹے نیلی آنکھوں والے بچے۔ کسی افغان شہید کی بیوہ سے ان کی شادی کردی گئی تھی یا انہوں نے خود ہی کرلی اپنے چچازاد بھائی کے گھر ملنے آئے پتا چلا کہ وہ عورت ایک شہید کی بیٹی ایک شہید کی بہن اور ایک شہید کی بیوہ ہے پوچھا گیا کہ تمہارا یہ شوہر بھی تو جہاد پر جاتا ہے اگر یہ بھی شہید ہو گیا تو کہنے لگی بے شک شہید ہو جائے۔ میرے یہ تینوں بچے بھی جہاد کریں گے بڑے ہو کر شہید کی ماں بھی تو بننا ہے مجھے۔"

مبین میاں کے بھائی منہ دیکھتے رہ گئے اور بس کیا کہتے۔

یہ ساری بات ہم تک پہنچی تو ہم تو سوچ کے اس مرحلے پر ہی تھے کہ جہاد دراصل ہے کیا؟ اور جو کچھ ہو رہا ہے یہ جہاد ہے بھی یا نہیں؟ کیا جہاد کا اعلان حاکم وقت کرے تو ہی جہاد کے لیے نکلنا چاہیے یا حکم کا انتظار کرنے کی ضرورت ہی نہیں کسی بھی صورت میں ہم اپنے بچوں کو کیسے محفوظ رکھیں اس لت سے مبین میاں ایک اور کہانی ایک اور موضوع یہاں والوں کی نذر کر کے خاندان سمیت چمن روانہ ہو گئے چند ہفتوں کے بعد خبر آئی وہ شہید ہو گئے۔ افغانستان میں ایک جھڑپ کے دوران زخمی ہوئے اور بالآخر وہ منزل پا گئے جس کی تلاش اور جستجو میں چند سال پہلے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا یعنی شہیدوں کی فہرست میں جگہ پا گئے۔

.....☆☆☆.....

کراچی کے دور افتادہ نئے آباد شدہ علاقے میں جہاں آس پاس کے ماحول سے غربت اور پسماندگی عیاں ہو اگر کسی گھر کے مکینوں کے پاس آج کے دور کی تمام آسائشیں موجود ہوں اور صاحب خانہ اپنی علمیت اور استطاعت سے کہیں زیادہ کمائی کر رہے ہوں تو آس پاس کے لوگوں میں وہ لوگ یقیناً عزت اور توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہوں گے اور اگر کہیں بڑا بیٹا پڑھنے لکھنے والا ہو خوش ذوق اور خوش لباس بھی ہو تو ایسے گھر کو ایک اچھا گھر اور مکینوں کو خوش قسمت و قابل رشک ہی کہا جائے گا ہاشم بھائی کا گھرانہ کچھ ایسا ہی تھا لیکن ایسے میں وہ خوش ذوق اور خوش لباس بیٹا مستقبل کی امید اور بھائی بہنوں کا سہارا اگر یونیورسٹی کی تعلیم ترک کر کے جہاد پر جانے کا اعلان کر دے تو بات عجیب سی لگتی ہے۔ اس بستی میں جانے کون سا مدرسہ تھا جہاں کے مولوی صاحب نے مبین میاں کے کان میں کیا کچھ ڈال دیا کہ وہ بالکل ہی بدل گئے اور یہ انتہائی قدم اٹھانے پر آمادہ ہو گئے عزیزوں، رشتہ داروں میں چہ مگوئیاں ہوئیں بحث مباحثے چلے کہ افغان جنگ کو جہاد کہا جائے یا قندھار کی جنگ یا افغان کی محض عادت جنگ مگر کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کچھ لوگ اس خوف میں بھی مبتلا ہو گئے تھے کہ کہیں مبین میاں کی دیکھا دیکھی خود ان کے سپوت بھی نہ نکل پڑیں اس راہ پر۔

کوئی کچھ کرنہیں کرسکتا۔ ماں باپ کو جو اعتراض نہیں تھا سنا ہے کہ روانگی کے وقت مبین میاں کی تو گل پوشی ہوئی ہی تھی ساتھ میں ماں باپ نے بھی خوب مبارک باد اور ہار پھول وصول کیے اور مٹھائی کی ریل پیل الگ اچھی خاصی سمجھ دار بہنیں اور بے وقوفی کی حد تک سیدھا چھوٹا بھائی سب اس طرح خوش رہے تھے کہ جیسے بھائی خطرناک سفر پر نہیں بلکہ دلہن رخصت کرانے جا رہے ہوں۔

چھ مہینے بعد خیر سے مبین میاں کی واپسی ہوئی اس بار بھی خوشیاں منائی گئیں ان کو رشتہ داروں کے سامنے فخر سے پیش کیا گیا۔ وہاں کی روداد سنی گئی، واستان اتنی بار دہرائی گئی کہ زبان زد عام ہوگئی۔ آخر مجاہد و غازی بن کے واپسی ہوئی تھی۔ البتہ ایک تبدیلی جس کا احساس گھر والوں کو بہت جلد ہوگیا نہ صرف احساس بلکہ یہ تبدیلی گھر والوں اور قریبی عزیزوں پر براہ راست اثر انداز ہوئی وہ تھی مبین میاں کے مزاج اور سوچ کی تبدیلی، عقائد اور رویے میں سختی جنوں کی حد تک بڑھی ہوئی داڑھی اونچی شلوار شمالی علاقوں والی ٹوپی ہر وقت سر پر مڑھی ہوئی موسموں سے بے نیاز بدرنگ سی جیکٹ ہر وقت بدن پر موجود۔ پھر ٹی وی اور موسیقی سے بے زاری، ایک خطیر رقم روانگی سے پہلے وہ ابا کے اکاؤنٹ سے نکال کر اپنی پسندیدہ جہادی تنظیم کی نذر کر چکے تھے۔ یہ بات بعد میں پتا چلی تھی اور ابو کے لیے اچھا خاصہ جھٹکا ثابت ہوئی تھی اور گھر والوں کے لیے بھی۔ ایک دن انہوں نے ٹی وی زمین پر پٹخ دیا۔ ابا تو شہر سے باہر تھے اماں نے سنبھال لیا معاملے کو لیکن بہنوں کے دل میں گرہ ڈال گئی یہ بات وہ گھر بھی بھلا کوئی گھر ہے جس میں ٹی وی تک نہ ہو، مجموعی طور پر ان کی آمد اور قیام کچھ ایسا تھا جیسے بیرون ملک امریکا، امارات اور سعودی عرب سے لوگ چھٹی پر آتے ہیں تو اپنی مالی مضبوطی کا بھرپور اظہار کرتے کھاتے پیتے کھلاتے پلاتے ہیں اور ایک دن پھر روانہ ہوجاتے ہیں اپنی ڈیوٹی پر۔ مبین میاں نے اپنی دولت ایمانی کا بے مہا اظہار کیا سب کو روزے نماز کا پابند کرا کر آلات موسیقی اور ٹی وی توڑ کے ایک دن پھر روانہ ہوگئے مگر اس بار وہ جوش و ولولہ تھا اور نہ خوشی و فخر کا وہ اظہار جس کے مزے عزیزوں رشتہ داروں نے پہلی بار لوٹے تھے اور پھر وہ تین بار گئے اور آئے۔

جہادی جاتے افغانستان ہی ہیں چاہے وہ جس راستے سے جائیں براستہ چمن یا براستہ پشاور پھر افغانستان میں چاہے جہاں چلے جائیں وہاں لڑتے رہیں اور شہید ہوجائیں یا واپس آجائیں ہاں ایک منزل اور ہے وہ ہے قید خانہ وہ افغانستان کا کوئی بے ترتیب بدوضع اور انتظامات سے عاری قید خانہ بھی ہوسکتا ہے اور امریکا کا بدنام زمانہ لیکن جدید نوعیت کا یعنی گوانتاناموبے کا قید خانہ بھی مبین میاں کدھر سے گئے اور کہاں پہنچے کسی کو پتا نہیں تھا۔

لیکن تھوڑے ہی دن میں کچھ ایسی خبریں آئیں کہ شاید وہ گرفتار ہوگئے اور اپنے چند ساتھیوں سمیت، ہر اطلاع کے بعد نئی اطلاع آتی رہی پتا چلا کہ کابل کے کہیں قریب سے گرفتار ہوئے کچھ دن دیسی قسم کی جگہوں اور جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں اور تشدد برداشت کرنے کے بعد ان کو امریکہ کے اسی بدنام زمانہ قید خانے کی طرف روانہ کردیا گیا جہاں کی ہولناک داستانیں اخبارات اور ابلاغ عامہ کے ذریعے بہت دن سے لوگوں تک پہنچ رہی تھیں پہلے پہلے

کپڑوں میں ملبوس لاغر بے بس قیدیوں کی کہیں دور فاصلے سے لی گئی جھلکیاں ٹی وی میں دکھائی جاتی رہی تھیں، قیدیوں کے ساتھ ظلم اور ذلت آمیز رویہ اور پھر ان کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے واقعات بھی سب نے سن اور دیکھ لیے تھے۔ لہٰذا یہ قیدی بن جانے والی اطلاعات خاصی تشویش ناک اور مایوس کن تھیں لیکن امید کی کرن کہیں سے در آتی تھی شاید یہ سب غلط ہو اخبار میں تو نام آیا نہیں ٹی وی پر بھی کچھ دیکھا یا نہیں، شاید یہ محض افواہ ہو امید وبیم کی کیفیت بھی اپنے انجام کو پہنچی جب مبین میاں کے ایک ساتھی جو محلہ دار بھی تھے اور ہم مسلک وہم خیال بھی کسی طرح بچ بچا کے واپس آ گئے انہوں نے مبین میاں کی گرفتاری کی تصدیق کر دی وہ جب ملنے آئے تو سب ان کو خوں خوار نظروں سے گھور رہے تھے اور وہ سب سے نظریں چرا رہے تھے اس بار کچھ ایسے حالات سے دو چار ہوئے تھے کہ آئندہ کے لیے تائب ہو کر گھر بیٹھے رہے۔

اس امریکی قید خانے بلکہ عقوبت خانے کے باسیوں کا رابطہ گھر والوں سے ریڈ کراس کے ذریعے ہوتا ہے۔ سنسر شدہ خط وہاں سے امریکا کے ریڈ کراس کے دفتر اور اس دفتر سے ایک عدد سادہ صفحے کے ساتھ لواحقین کو پوسٹ کر دیا جاتا ہے واپسی میں جواب اسی اضافی صفحے پر ہی لکھا جاتا ہے قیدی کے نام کی جگہ ایک مقررہ کوڈ اعداد اور حروف کا مرکب استعمال ہوتا ہے اس تیز رفتار زمانے میں اس خط و کتابت کی رفتار ایک صدی پرانی بات لگتی ہے کہ خط اور اس کے جواب کے درمیان ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں پر محیط انتظار ہوتا ہے تجسس ہوتا ہے تشویش ہوتی ہے اس ایک خط اور اس کے جواب کے دوران کئی لوگ جان سے گزر جاتے ہیں اور کئی ذی روح دنیا میں وارد ہو جاتے ہیں۔ اب ادھر کچھ ہو جائے یا ادھر امریکا والوں کی بلا سے۔

جوان اولاد کی دوری اپنا اثر دکھانا شروع کر چکی تھی نیا علاقہ ہونے کی وجہ سے ڈاک کے نظام پر اعتبار نہیں تھا لہٰذا خط و کتابت کے لیے ایک رشتہ دار کا پتا استعمال کیا جا رہا تھا لیکن وہ خط پہنچانا تو کجا خط کی اطلاع دینے میں بھی دیر کرتے تھے جب ہاشم بھائی نے کسی اور رشتہ دار کا پتا استعمال کرنے کی بات کی وہ کنی کترا گئے طالبان جو کبھی دوست تھے اب دشمن ٹھہرائے گئے تھے ان بدلے ہوئے حالات میں کون ایجنسیوں کے چکر میں پڑے ہاشم بھائی کے لیے یہ بھی ایک دھچکا تھا۔

ادھر مبین میاں قید میں اور وہ بھی دیار غیر میں، نہ کوئی عدالت نہ وکیل نہ پیشی اور نہ قید کی مدت کا پتا۔ سب کچھ اندازوں اور دعاؤں پر چل رہا تھا۔ ماں باپ گھلتے رہے پگھلتے رہے مگر خاموش نہ الفاظ میں نہ حرکات میں کس طرح کا اظہار کرتے جو خوشیاں منائی گئیں جو فخریہ بیانات دیے گئے ان کا بھی تو بھرم رکھنا تھا اور بھرم رکھنے کے چکر میں بہت تکلیف ہوتی ہے ذہنی بھی اور روحانی بھی۔ ذہنی خلفشار اور ناامیدی اور اولاد کی دوری کا دکھ زندہ ہے پر کہیں دور، بہت دور، کس حال میں کچھ خبر نہیں، ایسے میں جو نہ ہو جائے کم ہے۔ بنیادی کھوکھلی ہوتے ہوئے اچھی خاصی نظر آنے والی عمارت اچانک ڈھے پڑتی ہے۔ ہاشم بھائی کی اچانک موت کی خبر ملی تو پہنچنے والے بھاگم بھاگ پہنچے۔ عجب ویرانی کا عالم تھا اس بستی پر رات کے پہلے پہر سے پہلے ہی بہت سی دکانیں بند ہو گئی تھیں، کفن دفن سے متعلق کچھ سامان دستیاب نہیں ہو سکا، سب کچھ اگلے روز ہی ممکن ہو سکا۔ مبین میاں کو یہ خبر چالیسویں کے بعد ہی ملی ہو گی۔

ہاشم بھائی تو غموں سے آزاد ہوئے اب ان کی بیوی مبین میاں کی اماں اولاد کا غم برداشت کرتے کرتے اور ذیابیطس کی مار سہتے سہتے ڈھے جانے کی حد پر آ گئی تھیں مبین میاں کو گئے ہوئے کوئی چار برس ہونے کو آئے تو اچانک اطلاع ملی کہ چند لوگ وہاں سے رہا کر دیے گئے ہیں اخبار میں نام بھی آئے تھے جو پاکستانی تھے رہا ہو کر پاکستان آ بھی گئے تھے لیکن وہ کہاں تھے اور گھر کیوں نہیں آ رہے تھے؟ ان سوالوں کے جوابات ملنے میں کچھ دن لگ گئے اور ایک فون پر گھر والوں کو تنبیہ کی گئی کہ زیادہ بھاگ دوڑ اور شور مچانے کی ضرورت نہیں، تمہارا بندہ یہاں ماہرین نفسیات کے زیر علاج ہے ان کی برین واشنگ کر کے بہتر انسان بنا کے اس معاشرے میں رہنے کے قابل بنایا جا رہا ہے جب اس کی جہادی سوچ بدل جائے گی وہ تمہارے پاس آ جائے گا مگر سوچ اگر جبلت بن جائے تو شاید جبلت بدلنے کا بھی کوئی طریقہ ایجاد ہو گیا ہو وہ جو کہتے ہیں کہ بہت دیر کی مہربان آتے آتے۔ مبین میاں تو بالآخر گھر پہنچ گئے لیکن اس چار سال کے عرصے میں ان کی اماں تھک چکی تھیں

بیماری اور انتظار کے ہاتھوں بہت دیر خوشی نہ منا سکیں بیٹے
سے ملنے کی اور ایک دن اللہ کو پیاری ہو گئیں تدفین میں
بہت رشتہ دار موجود تھے لیکن ایسے کہ جیسے صرف کاندھا دینے
آئے ہوں صرف تماشائی لاتعلق سے دراصل تدفین کے
انتظامات چند انجان سخت اور جذبات سے عاری نوجوانوں
نے سنبھالے ہوئے تھے ان میں سے کچھ روانی سے
انگریزی بول رہے تھے امریکن لہجے میں مبین میاں کے
وہاں کے ساتھی ہوں گے پتا نہیں وہاں چار پانچ سال کے
قیام کے دوران انہوں نے کتنے امریکیوں کے دل میں
ایمان کی شمع روشن کی ان کا لہجہ اور ان کی زبان ضرور لے
آئے تھے اور اپنے ساتھ بہت کم وقت میں تدفین ہو گئی ذرا
غیر روایتی سے انداز میں اور سب عزیزوں اور رشتہ داروں کو
بہت جلد فرصت مل گئی اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے
کی۔

مبین میاں جب تک رہے قریبی رشتہ داروں سے ملتے
رہے معلوم ہوا کہ مسئلہ نوکری کا تھا اگر مل جاتی تھی تو زیادہ دیر
چلتی نہیں تھی ان کی کمپیوٹر کی تعلیمی قابلیت اور انگریزی کا لہجہ
ان کے مزاج اور رویوں سے قطعی میل نہیں کھاتے تھے لوگ
ان کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے انہوں نے بتایا کہ ان کو
دہشت گرد سمجھا جاتا ہے کسی بے راہ روی پر ٹوک دیں تو لوگ
برا مانتے ہیں بات دل میں رکھ لیتے ہیں ایک جگہ سے نوکری
چھوڑ کر دوسری جگہ گئے تو ان کے بارے میں اطلاعات پہلے
ہی پہنچ چکی تھیں لہٰذا نوکری نہ چل سکی ایک بار مجھے ملے تو میں
نے کہا بھی ان سے کہ کیا عجیب سا حلیہ بنایا ہوا ہے۔ ایک
دہشت سی طاری کی ہوئی ہے اپنے چہرے پہ اپنی عادات اور
لباس میں کچھ تبدیلی لاؤ اپنا رویہ بدلو تو سب کچھ ٹھیک
ہو جائے گا ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کے برابر مدت کی
مسکراہٹ ان کے لبوں پر آئی اور کوئی جواب دیے بغیر وہ
سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

ادھر گھر میں بہنوں کے پردے لباس اور ٹی وی دیکھنے
کی عادت وغیرہ جیسے مسائل تھے بجائے اس کے کہ وہ اپنے
طور طریقے بدلتیں انہوں نے اپنا رویہ بدل لیا مبین میاں
کے تعلق سے بات چیت بند کر دی کھانے پینے کا خیال رکھنا
چھوڑ دیا باہر اور اندر دونوں طرف کے حالات اس قدر خراب
ہوئے کہ وہ بے زار ہو کر دوبارہ اپنے اسی مخصوص سفر پر روانہ
ہو گئے یعنی افغانستان براستہ پشاور یا براستہ چمن۔

شاید میرا اندازہ غلط ہو، شاید ان کے چلے جانے میں
ان عوامل کا بالکل ہی کوئی حصہ نہ ہو شاید ان کو جانا ہی تھا
چاہے یہاں ان کی راہ میں پھول ہی کیوں نہ بچھائے
جاتے۔ چاہے تمام لوگ اپنی تمام تر چاہت اور محبت ان کے
دامن میں کیوں نہ ڈال دیتے۔ ایک مقناطیسی طاقت کوئی
نادیدہ قوت کوئی پراسراری ان کو کھینچ رہی تھی اور وہ کھنچے چلے
گئے یہ تو ہم لوگ اپنی طرف سے اسباب ڈھونڈ رہے ہیں کہ
کسی کو تو قصوروار ٹھہرا سکیں دراصل یہ جذبہ ہماری عقل سے
ماورا تھا۔

ان کی بہنوں کا جو ذریعہ آمدنی ہے ایک چھوٹا سا کاروبار
ان کی دو وقت کی روٹی مہیا کرنے کے لیے بھی کم ہے۔
عزیزوں رشتہ داروں کی طرف سے تھوڑا بہت آنے لگا
مہینے کے مہینے لیکن اس مہنگائی میں کوئی زیادہ سے زیادہ کیا
کر سکتا ہے سنا ہے کسی تعویذ گنڈے والے بابا نے ان
دونوں کو قریبی رشتہ داروں سے بدظن کر دیا تھا کہ ان کی
پریشانیوں کا سبب دراصل وہی رشتہ دار ہیں لہٰذا ان سے
دوری اختیار کریں، نتیجتاً باری باری انہوں نے سب کو
ناراض کر دیا ہے لیکن لوگ اپنی استعداد بھر مدد پھر بھی کرتے
ہی رہتے ہیں چند ماہ قبل مبین میاں کی جو آمد ہوئی مع افغانی
بیوی اور تین بچوں کے اور پھر روانگی تو وہ ان کی آخری روانگی
تھی پھر تو ان کی شہادت کی اطلاع آئی۔ ان کے بیوی بچے
کس حال میں ہیں کسی کو نہیں معلوم البتہ ان کی بہنوں کا حال
سب کو معلوم ہے۔ ان کو اپنی منزل مل گئی۔ وہاں شاید ان کی
بیوی کے تینوں بچے جہاد کے لیے تیار ہو رہے ہوں گے کہ
اس عورت کو ابھی شہیدوں کی ماں کہلوانے کا مرحلہ طے کرنا
ہے یہاں مبین میاں کی دو بہنیں جوان لیکن بے سہارا
لڑکیاں، ظالموں اور بے رحموں کی آبادی میں بے مہار
گھومتے دو پیروں والے درندوں کے درمیان ایک جہد
مسلسل میں مصروف ہیں یہ ایک اور جہاد ہے جو ان باقی
ماندہ افراد کو کرنا ہے یہ غازی بنیں گی یا شہید یا صرف ہلاکت
ان کا مقدر ہے کون جانے۔

مس کال

عارف شیخ

لو اگر کسی سے فون پر بات کر لی تو کیا ہوا؟ اگر کسی سے لفٹ لے لی تو کیا ہوا؟ آج کل یہ جملے ہر دوسری لڑکی بلکہ شادی شدہ خواتین کی زبان سے بھی سنائی دیتے ہیں لیکن بعض اوقات بلکہ عموماً یہ معمولی سمجھی جانے والی بات زندگی کے رخ کو تبدیل کرنے کا باعث ثابت ہوتی ہیں۔

ایک مس کال سے شروع ہونے والی [illegible] کی جان جانے کا سبب بن گئی تھی

رات کے کوئی دس گیارہ کے درمیان کا وقت رہا ہوگا۔ رات بہت زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی لیکن کیونکہ سردیوں کے دن تھے اس لیے لوگ جلد ہی گھروں کے اندر خود کو محصور کر لیتے تھے۔ اس وقت بھی لوگ گھروں کے اندر دروازے کھڑکیاں بند کر کے جاگ رہے تھے۔ کھڑکیوں سے باہر آتی روشنی اور ٹی وی کی آواز سرد رات میں ویرانی سے لڑ رہی تھی۔

ایسے میں ایک بھیانک چیخ نے پورے علاقے کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ چیخ سنانے کی وجہ سے طاقت ور ہوگئی تھی اور کافی دور تک سنی گئی تھی۔ چیخ طویل بھی تھی اس کے ساتھ ہی کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز آئی اور پھر گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔

جن کے کانوں تک آواز پوری شدت سے نہیں پہنچی تھی انہوں نے تو اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن جن کی سماعت اس چیخ سے متاثر ہوئی تھی وہ اپنے گھروں کی کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔ یہ علاقہ کیونکہ فلیٹوں سے بھرا ہوا تھا اس لیے کچھ افراد اپنی بالکونی میں آ کر سردی سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ جاننے کی جستجو کر رہے تھے کہ یہ چیخ آخر کس کی تھی۔

معلومات حاصل کرنے والے سب ہی لوگ ایک بات پر بہر حال متفق تھے کہ یہ چیخ انسانی ہے اور کسی نے پوری طاقت خرچ کی ہے لیکن تاریکی زیادہ تھی اس لیے فوراً یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ یہ چیخ کس نے ماری تھی اور کیوں ماری تھی لیکن اس چیخ کا راز بہت دیر تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کہ جلد لوگوں کو ایک انسانی لاش کے بارے میں پتہ چل گیا تھا۔

پولیس کے سائرن نے اب اردگرد کے لوگوں کو بھی گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس پلازہ کے علاوہ دیگر رہائشی عمارتوں کے لوگوں کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے علاقے میں کوئی لاش موجود ہے۔ عورتوں نے بچوں کی پہرے داری شروع کر دی تھی اور خود ہی آپس میں بات کرتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جب کہ مرد حضرات موقع پر پہنچ رہے تھے۔

پولیس کو بھی خبر ایک علاقہ مکین ہی نے دی تھی۔ اس لیے پولیس وہاں پہنچ گئی تھی اب پولیس نے لاش کے گرد پہرے داری بھی سنبھال لی تھی تاکہ شواہد کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ پولیس کا ایک انسپکٹر جو وہاں موجود تھا وہ خود لاش کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس انسپکٹر نے یہ تسلی کرنے کے لیے کہ وہ انسانی جسم جو بظاہر لاش تھا واقعی مر گیا ہے یا پھر ابھی اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

میں جان باقی ہے۔ اس انسپکٹر نے فلاحی ادارے سے ایمبولینس منگوائی تھی۔ جو اس لاش کو سرکاری اسپتال لے گئی تھی۔

....

انسپکٹر نے لاش کے روانہ ہونے کے بعد وہاں موجود افراد کو مخاطب کیا۔

''پولیس کو خبر کس نے دی تھی؟''

ایک درمیانی عمر کے شخص نے خود کو سامنے کیا۔

''میں نے فون کیا تھا۔''

انسپکٹر نے دیکھا وہ موٹا سا شخص جس کا قد بھی کم تھا۔

''تم کو کیسے معلوم ہوا۔ اس لاش کے بارے میں؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''یہ لاش میرے فلیٹ کے سامنے گری تھی۔'' اس نے بتایا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ گری تھی؟''

''مجھے اس کے گرنے کی آواز آئی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''تفصیل سے بتاؤ۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''میں اور میری فیملی پہلے کمرے ہی میں موجود تھے۔'' اس نے اشارے کی مدد سے سمجھایا۔

''ہمیں پہلے تو ایک چیخ سنائی دی اور پھر ایسی آواز آئی جیسے بہت اوپر سے کوئی بھاری چیز آ گری ہو۔'' بولتے بولتے اس کی سانس پھول رہی تھی۔

''پہلے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن پھر میں باہر آیا کہ دیکھوں کیا معاملہ ہے تو میری نظر لاش پر پڑی وہ کیونکہ میرے فلیٹ کے سامنے ہی پڑی تھی اس لیے میں نے فوراً پولیس کی مدد کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے فون کیا۔''

انسپکٹر نے دیکھا کہ وہ شخص جس نے فون کیا تھا اس کا فلیٹ گراؤنڈ کا تھا اور لاش اس کے فلیٹ سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر سے اٹھائی گئی تھی۔

''کیا تم اسے پہچانتے ہو؟'' انسپکٹر نے خبر دینے والے سے سوال کیا۔

''نہیں جناب میں اسے بالکل نہیں جانتا ہوں۔'' وہ بولا۔

انسپکٹر نے مزید سوال جواب میں وقت برباد نہیں کیا تھا اس لیے کہ اسے پہلے اسپتال جا کر اس لاش سے متعلق معلومات حاصل کرنا تھی۔ اس کے بعد ہی تحقیقات کا آغاز ہو سکتا تھا۔ ابھی تک نہ تو مقتول سے متعلق کچھ معلوم ہوا تھا اور نہ ہی یہ پتہ چل سکا تھا کہ یہ قتل ہے یا پھر کوئی حادثہ۔ لہٰذا وہ جائے واردات پر ایک سپاہی کی ڈیوٹی لگا کر اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں موجود لوگ بھی دھیرے دھیرے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

....

انسپکٹر احمد خان خیالوں میں گم اپنی تلوار جیسی مونچھوں کو تاؤ دینے میں مصروف تھا۔ وہ اس وقت تھانے میں اپنی کرسی پر بیٹھا رات والے حادثے سے متعلق کچھ سوچ رہا تھا۔

دفعتاً چونک کر اس نے اس آواز کی طرف دیکھا جو کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ آنے

والا شخص اس کا ماتحت سب انسپکٹر فرید شاہ تھا۔ فرید شاہ اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بولا۔

''پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی ہے۔''

اسے خاموش دیکھ کر احمد خان کو بولنا پڑا۔

''حادثہ یا قتل؟''

''بظاہر تو حادثہ معلوم ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس کی موت اوپر سے یعنی بلندی سے گرنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔''

''رپورٹ اور کیا بتا رہی ہے؟'' احمد خان نے پوچھا۔

''بازو سیدھے ہاتھ والا کندھے سے ٹوٹا ہے دو پسلیاں بھی ٹوٹ گئی ہیں۔ لیکن موت سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔''

''کوئی معلومات؟''

''چہرے پر آنکھ کے نیچے ایک نیل کا نشان ہے جیسے کوئی مار لگی ہو۔''

''ممکن ہے اوپر سے گرتے وقت کوئی چیز چہرے سے ٹکرائی ہو۔ جس سے نیل کا نشان آیا ہو۔''

''ہو سکتا ہے۔'' فرید شاہ نے کہا۔

''میں نے بھی یہ بات اس لیے بتائی کہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ ورنہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔''

''مقتول سے متعلق کوئی معلومات؟''

''ہاں یہ بات بڑی حیرانی کی ہے کہ مقتول کے پاس سے یعنی اس کے کپڑوں سے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو اس کے متعلق آگاہی دیتی۔''

''کیا مطلب؟'' احمد خان چونکا۔

''مقتول کی ہر جیب خالی تھی۔ کوئی والٹ نہیں تھا موبائل فون نہیں تھا۔ روپے پیسے نہیں تھے کوئی کاغذ کا ٹکڑا تک نہیں تھا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' احمد خان کافی حیران تھا۔ ''آج کے دور میں ہر چھوٹے بڑے انسان کی جیب میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔''

''نہیں اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں نکلا اس کی ہر جیب مکمل طور پر خالی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں پتہ نہ چل سکے کہ مرنے والا کون ہے؟''

فرید شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''کوئی کلیو نہیں ہے۔''

''کیا وہ جس عمارت سے گرا ہے اس کا رہائشی ہے؟''

احمد خان نے سوال کیا۔

''میں تو اسپتال میں رہا ہوں۔ اب وہاں جا کر معلومات حاصل کرنا ہوگی۔''

''ٹھیک ہے تم فوراً موقع پر جاؤ اور مقتول کے گھر کا پتہ کرو۔ اور ہاں لاش کا کیا کیا؟''

''فی الحال تو سرکاری سرد خانے میں جمع کرا دی ہے۔''

فرید شاہ نے بتایا اور پھر بولا۔

''مقدمہ کیا درج کرنا ہے؟''

''ابھی مقدمہ درج نہیں کرو۔ یہ معلوم ہو جائے کہ گرنے والا حادثے سے مرا ہے یا پھر اس کا قتل ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب میں بعد میں رپورٹ کرتا ہوں۔''

فرید شاہ وہاں سے روانہ ہوا۔

......

فرید شاہ اپنے ساتھ سپاہیوں کو لے کر سیدھا اس طرف آیا تھا جہاں کل رات لاش کے اوپر سے گرنے کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس نے اپنی تحقیقات کا آغاز پلازہ کے چوکی دار سے کیا تھا۔ چوکی دار مجاہد خان اپنے سامنے پولیس کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

''تم یہاں پر کب سے ہو؟'' فرید شاہ نے چوکی دار کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''کم و بیش دس سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔'' چوکی دار مجاہد خان نے بتایا۔

سب انسپکٹر فرید شاہ نے اندازہ لگایا کہ چوکی دار چالیس برس کی درمیان والی عمر کا آدمی ہے۔

''تم رات کہاں تھے؟'' فرید شاہ نے پوچھا۔

''میں رات ادھر ہی سوتا ہوں۔''

''لیکن تم رات حادثے کے وقت نہیں تھے؟'' فرید شاہ اپنی آنکھوں کی مدد سے چوکی دار کے جوابات کی سچائی ناپنے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کر رہا تھا۔

''کل رات میں دیر سے آیا تھا۔ جب آیا تو اس واقعے کے بارے میں معلوم ہوا۔'' چوکی دار سنبھل کر جواب دے

رہا تھا۔
''میرے گاؤں سے کوئی مہمان آیا تھا میں اسے روٹی کھلانے ایک ہوٹل لے گیا تھا۔ ادھر باتوں میں تھوڑی دیر ہو گئی جب واپس آیا تو مجھے ادھر یہ ساری بات معلوم ہوئی۔'' وہ ایک سانس میں بولتا چلا گیا۔
''جس بلڈنگ سے وہ لڑکا گرا ہے مجھے اس کی چھت پر جانا ہے۔'' فرید شاہ نے کہا۔
''آ جائیں جی۔'' چوکی دار نے فرماں برداری دکھائی۔
فرید شاہ چوکی دار اور ایک کانسٹبل کو لے کر اوپر چھت پر آ گیا تھا۔ وہ بڑی باریک بینی سے چھت کا جائزہ لے رہا تھا لیکن اسے کوئی ایسی خاص نشانی نہیں ملی جس سے وہ یہ اندازہ کرتا کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔
''یہ چھت اسی طرح لاک رہتی ہے؟'' فرید شاہ نے چوکی دار کو چھت کا تالا کھولتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔
''چھت کے دروازے میں تالا ہوتا ہے۔ میں چڑھتا ہوں پانی کی ٹنکی وغیرہ دیکھنے کے لیے۔''
''کیا رات میں جب یہ حادثہ ہوا۔ اس وقت بھی تالا لگا ہوا تھا؟'' فرید شاہ اپنے ساتھ آنے والے کانسٹیبل سے مخاطب ہوا۔
کانسٹیبل اکرم جو رات احمد خان کے ساتھ آیا وہی اوپر چھت دیکھنے آیا تھا۔
''جی جناب رات میں نے اوپر آ کر دیکھا تھا چھت پر تالا لگا ہوا تھا۔''
''اس کا مطلب ہے کہ رات چھت نہیں دیکھی گئی تھی۔''
''وہ جناب انسپکٹر صاحب نے کوشش کی تھی ایک چوکی دار کی موجود نہیں تھا پھر صاحب کو لاش اسپتال بھی لے جانی تھی اس لیے چھت اوپر سے نہیں دیکھی گئی تھی۔''
''اس کی چابی کیا ہر وقت تمہارے پاس ہی ہوتی ہے؟'' وہ دوبارہ چوکی دار کی طرف گھوما۔
''جی جناب میرے پاس ہی ہوتی ہے اور کل بھی میرے پاس ہی تھی۔'' وہ بولا۔
''کل تمہارے سامنے کوئی یہاں آیا تھا؟''
''جناب وہی لوگ آئے تھے جو یہاں رہتے ہیں۔ نیا آدمی کوئی مہمان آتا تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے۔'' اس نے بتایا۔
فرید شاہ کو خاصی مایوسی ہوئی تھی اس لیے کہ کوئی کلیو نہیں ملا تھا جس سے یہ طے کیا جا سکے کہ آخر یہ حادثہ تھا یا قتل وہ لوگ تو ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کر سکے تھے کہ مرنے والا آخر کون تھا اس کا نام کیا تھا وہ کہاں رہتا تھا اور اس کی موت کیونکر ہوئی؟

....

سارے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد انسپکٹر احمد خان اور سب انسپکٹر فرید شاہ تھانے میں موجود تھے اور تھکن اتارنے کے لیے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ احمد خان نے آخر کار کمرے میں طاری سکوت کو توڑا۔
''یہ کیس کہیں وبال جان نہ بن جائے؟ آج کل افسران بہت پوچھنے لگے ہیں۔ ابھی تک تو مقدمہ ہی درج نہیں ہوا۔''
فرید شاہ بولا۔
''وجہ معلوم ہو تو پھر مقدمہ بھی درج کیا جائے۔''
''یہ خودکشی تو نہیں ہے؟'' احمد خان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
''سوال یہ ہے کہ اگر خودکشی ہے تو وہ اس اجنبی عمارت میں کیوں آیا؟ اور دوسری چھت کھلی ہوئی کیسے ملی؟''
''یہ مسئلے کی وجہ سے کیس اٹک گیا ہے۔'' احمد خان نے کہا۔
''میرے خیال سے نئے سرے سے اس پر بات کرتے ہیں اور جو کچھ معلوم ہوا ہے اس سے اس الجھی ہوئی گتھی کا سرا ڈھونڈتے ہیں تاکہ ہم اصل حقائق تک پہنچ سکے۔''
''ایک نوجوان لڑکا عمر بیس بائیس برس ہو گی۔'' احمد خان نے تفصیل بیان کی۔
''ایک رہائشی عمارت کی چھت سے گر کر مر جاتا ہے وہ اس عمارت کا رہائشی نہیں ہے۔ کوئی اسے جانتا بھی نہیں ہے۔ اس کے کپڑوں سے کوئی چیز بھی نہیں ملی جیبیں خالی تھیں۔

''یہ حیرانی کی بات ہے۔'' فرید شاہ نے جواب دیا۔ والے کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔

جناب عالی ایک لاوارث موٹر سائیکل کی اطلاع ملی ہے جو کل رات سے سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ وہ دونوں فوراً ہی روانہ ہو گئے۔

....

موٹر سائیکل تھانے آ گئی تھی۔ موٹر سائیکل کے بارے میں جو اطلاع اس علاقے کے لوگوں نے دی تھی وہ اسی رات سے کھڑی تھی جس رات وہ لڑکا چھت سے گر کر ہلاک ہوا تھا۔

''کیا لگتا ہے۔ اس بائیک کا اس لڑکے کے مرنے سے کنکشن ہوگا؟'' احمد خان نے فرید شاہ کو مخاطب کیا۔

''سوفی صد ہوگا۔'' فرید شاہ بولا۔

''اس کی بڑی وجہ دونوں کے ٹائم کا ایک ہونا ہے۔ دوسرے وہ جس جگہ وہ لڑکا مرا ہے اس سے کچھ دور ہی سڑک کنارے ملی ہے۔''

''یہ بائیک شاید اسی لڑکے کی ہے۔'' احمد خان نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو ہم اس لڑکے کے ایڈریس تک تو پہنچ جائیں گے۔''

''مجھے تو لگتا ہے یہ موٹر سائیکل اس پوری الجھی گتھی کو سلجھائے گی۔'' فرید شاہ نے کہا۔

''بس تو تم پہلی فرصت میں یہ معلوم کرو کہ یہ موٹر سائیکل کس کے نام پر ہے؟'' احمد خان نے کہا۔

''میں محکمہ ایکسائز سے رابطہ کرتا ہوں اور بائیک کے مالک کا نام پتہ سب نکال لیتا ہوں۔'' فرید شاہ نے کہا۔

....

فرید شاہ نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس لیے کہ اس نے محکمہ ایکسائز سے موٹر سائیکل کے مالک کا نام اور پتہ معلوم کر لیا تھا۔ اس وقت وہ سیدھا اس ایڈریس پر پہنچا تھا جو ایکسائز ڈیپارٹمنٹ نے اسے دیا تھا۔

دروازہ کھلا تو سامنے ایک پچاس برس کا آدمی موجود تھا۔

''جی فرمایئے؟'' وہ اپنے سامنے پولیس کی وردی

''بشیر احمد کون ہے؟'' فرید شاہ نے سوال کیا۔

''میرا نام بشیر احمد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کی موٹر سائیکل گم ہے؟''

''میرا تو بیٹا بھی لاپتہ ہے۔'' بشیر احمد کے اس جواب نے جیسے فرید شاہ کو چونکا دیا تھا۔

''آپ کا بیٹا گم ہے؟''

''میری موٹر سائیکل اور بیٹا دونوں ہی غائب ہیں۔'' بشیر احمد نے بتایا۔

''آپ کے پاس شاید کوئی خبر ہے؟''

''یہ آپ کیسے جانتے ہیں کہ میرے پاس کوئی خبر ہے؟'' فرید شاہ نے الٹا سوال کر دیا۔

''کیا آپ نے اپنی بائیک اور بیٹے سے متعلق پولیس کو اطلاع دی ہے؟''

''جی ہاں میں نے آج ہی اپنے قریبی تھانے کو گمشدگی کی اطلاع دی ہے۔'' بشیر احمد نے بتایا۔

''کیا آپ کے پاس خبر ہے کہ میرا بیٹا کہاں ہے؟''

''وہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے آپ مجھے اپنی موٹر سائیکل کا نمبر بتا سکتے ہیں۔''

''کیوں نہیں آپ اندر آ جائیں۔'' اس نے راستہ دیا تو فرید شاہ اپنے ایک کانسٹیبل کے ساتھ گھر کے اندر چلا آیا۔

وہ ایک درمیانہ سا گھر تھا جو شاید تین کمروں پر مشتمل تھا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی فرید شاہ کو گھر کے دوسرے لوگ بھی دکھائی دے گئے۔ جو پولیس کو دیکھ کر سہم سے گئے تھے۔ بشیر احمد نے ان کو اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اس کمرے میں چلا گیا جدھر گھر کی خواتین موجود تھیں۔ چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے پاس موٹر سائیکل کے اصل کاغذات تھے۔ فرید شاہ نے جانچ پڑتال کے بعد وہ کاغذ لوٹا دیئے اور بولا۔

''موٹر سائیکل تھانے میں موجود ہے۔''

''میرے بیٹے کی کوئی خبر نہیں دی آپ نے؟'' بشیر احمد کی آواز میں فکر تھی۔

''کیا آپ کے پاس آپ کے بیٹے کی کوئی تصویر ہے؟'' فرید شاہ نے پوچھا۔ ''اگر ہے تو مجھے دکھا دیں تو میں

آپ کو جواب دونگا۔"

بشیر احمد بغیر کوئی لفظ بولے سیدھے دوبارہ اندر چلے گئے اور جب واپس آئے تو فریم والی تصویر ہاتھ میں تھی۔ جو انہوں نے فرید شاہ کے سامنے کر دی۔

فرید شاہ نے گہری سانس سینے سے خارج کی۔

"آپ کو تھانے چلنا ہوگا۔" "موٹر سائیکل اور بیٹا دونوں وہیں ہیں۔" اس کے بعد فرید شاہ بشیر احمد کو ساتھ لے کر تھانے کے لیے روانہ ہوا۔

......

چوبیس گھنٹوں کا وقت گزر چکا تھا جب فرید شاہ، بشیر احمد کو لے کر تھانے آیا تھا۔ بشیر احمد نے اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ اپنے بیٹے کی بھی شناخت کر لی تھی۔ ضروری کارروائی کے بعد بیٹے کی لاش بشیر احمد کے سپرد کر دی گئی تھی۔ لاش کے لواحقین نے اپنے فرائض کو سمجھتے ہوئے لاش کی آخری رسوم بھی ادا کر دی تھیں۔

اس لڑکے کی تدفین پولیس کی اجازت سے کی گئی تھی اور گھر سے قبرستان تک فرید شاہ خود بھی موجود رہا تھا۔ وہ جنازے میں اس لیے بھی گیا تھا کہ شاید کوئی ایسا کلیو مل جائے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس لڑکے کی موت کے کیا اسباب ہیں۔

......

احمد خان نے کیس مکمل طور پر فرید شاہ کے حوالے کر دیا تھا اس لیے فرید شاہ کو اب اس کیس پر پوری توجہ کرنا تھی۔

اس وقت بھی وہ تھانے سے احمد خان کے ساتھ موجود تھا۔

"کچھ کامیابی ملی؟" احمد خان نے پوچھا۔

"مرنے والے کا نام شجاع ہے۔ اس کے باپ کا ایک میڈیکل اسٹور ہے۔ وہ اپنے گھر میں سب سے بڑا تھا۔" فرید شاہ رک رک کر بتا رہا تھا۔

"عمر بائیس برس تھی۔ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ کردار کے معاملے میں وہ غلط نہیں تھا۔"

"کیا تم یہ نتیجہ نکال رہے ہو کہ وہ قتل نہیں ہوا حادثے سے مرا ہے؟" احمد خان بولا۔

"میرے سامنے تین نتائج ہیں۔ قتل، خودکشی اور حادثہ جو اتفاقیہ ہوا ہو۔"

"خودکشی کے لیے کسی اور کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔" احمد خان نے کہا۔

"اگر وہ قتل ہوا ہے تو کوئی قاتل ضرور ہوگا اور اگر اتفاقیہ حادثہ ہوا ہے تب بھی کسی اور کا ہونا بہت ضروری ہے جس کے ساتھ وہ چھت پر گیا ہوگا۔"

"اگر خودکشی بھی ہے تو وہ اس پلازہ کی چھت پر کیسے پہنچا؟" فرید شاہ بڑبڑایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تینوں صورتوں میں ایک اور کریکٹر کا موجود ہونا لازم ہے۔"

"یعنی مجھے اسے تلاش کرنا ہے جس سے مقتول کی پہچان ہو۔"

"یہ ضروری ہے ورنہ یہ کیس کبھی حل نہیں ہوگا۔" احمد خان نے کہا۔

"مجھے کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔"

"تمہیں اس کے کالج کے دوستوں سے ملنا چاہیے۔" احمد نے مشورہ دیا۔

"نوجوان تھا دوست کافی ہوں گے اس کے۔"

"میں کالج کے ساتھ اس کے محلے کے دوستوں کو ملتا ہوں۔" فرید شاہ نے کہا۔

"یہ اور بھی اچھا رہے گا۔" احمد خان نے کہا۔

"اور اس میں مقتول کا باپ اور اس کے گھر کے لوگ بھی مددگار ہو سکتے ہیں۔"

......

فرید شاہ نے کالج کے پرنسپل سے اجازت ملنے کے بعد شجاع کے قریبی دوستوں سے ملاقات کی تھی۔ لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ سوائے اس بات کے کہ کچھ عرصے سے وہ دوستوں سے بھی کم مل رہا تھا اور کالج سے بھی غیر حاضر رہنے لگا تھا۔

فرید شاہ نے اس کے بعد محلے کے دوستوں کو بھی ایک ایک کر کے پوچھ گچھ کی تو وہاں سے بھی اس طرح کی بات معلوم ہوئی کہ وہ بہت کم دکھائی دینے لگا تھا۔

فرید شاہ کے لیے یہ بات بہت اہم تھی کہ شجاع کی توجہ کسی اور طرف تھی اور شاید یہی وہ وجہ تھی جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ اب اسے شجاع کے اچانک

بدل جانے کی وجہ ڈھونڈنی تھی۔

"میرا تجربہ یہ یقین دلا رہا ہے کہ اس قتل یا حادثے دونوں صورتوں میں کوئی لڑکی شامل ہے۔" احمد خان نے تمام معلومات فرید شاہ سے سننے کے بعد کہا۔

"خودکشی کی صورت میں بھی وہ لڑکی شامل رہی ہوگی۔" فرید شاہ بولا۔

"اس لڑکی کا تعلق یقیناً اس عمارت سے ہوسکتا ہے۔ جہاں یہ حادثہ پیش آیا ہے۔"

"اب مجھے وہ لڑکی ڈھونڈنی ہے۔ لیکن اس لڑکی کو صرف شجاع جانتا تھا۔"

فرید شاہ نے کہا۔ "اور وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"اگر کوئی لڑکی ہے تو پھر وہ شجاع کے ساتھ کہیں نہ کہیں ضرور دیکھی گئی ہوگی۔" احمد خان نے کہا۔

"تمہیں اس طرح سے کوشش جاری رکھنی چاہیے۔"

"میں اگر اس لڑکی تک پہنچ گیا تو یہ معمہ حل ہوجائے گا۔" فرید شاہ گرم جوشی سے بولا۔

"لیکن کیسے معلوم کروگے کہ وہ لڑکی کون ہے؟"

فرید شاہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"میرے خیال میں جس پلازہ میں حادثہ ہوا ہے اس میں سو کے لگ بھگ فلیٹ ہیں اور چار الگ الگ بلڈنگوں پر یہ پلازہ مشتمل ہے۔"

"یعنی ایک بلڈنگ میں پچیس فلیٹ ہوئے۔" احمد خان نے ٹیبل پر ہاتھ مارا۔

"اور جس بلڈنگ کی چھت سے وہ گرا ہے اس میں وہ لڑکی موجود ہوسکتی ہے۔"

"ابھی تک تو ایسا ہی لگ رہا ہے لیکن ہم غلط سمت بھی جاسکتے ہیں۔"

احمد خان مسکرایا۔ "ہماری سمت درست ہے۔"

"اس بلڈنگ کے گھروں کی جانچ کرو اور مقتول کی عمر کے نزدیک والی لڑکیوں کی تعداد کم ہوگی اور انہی میں وہ لڑکی ہوسکتی ہے۔"

"لیکن پہلے میں شجاع کے گھر والوں سے ملنا چاہوں گا۔" فرید شاہ نے کہا۔

"وہ کس لیے؟"

"ایک سوال ہے وہ کرنا ہے اس کے جواب سے یہ بات اور یقینی ہوجائے گی کہ وہ کس لڑکی کے چکر میں تھا۔" فرید شاہ نے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ تم یہ کیس چند دنوں میں حل کرلو گے۔" احمد خان نے حوصلہ بڑھایا۔

"تھینک یو سر۔" فرید شاہ نے مسکرا کر جواب دیا اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

"کیا آپ کا بیٹا شجاع اکثر رات میں آپ کی بائیک لے کر جاتا تھا؟" فرید شاہ جو اکیلا ہی شجاع کے گھر آیا تھا۔ اس وقت مقتول کے والد بشیر احمد اور ان کی بیوی سے مخاطب تھا۔

"وہ غلط لڑکا نہیں تھا۔" بشیر احمد نے کہا۔

"آپ اس کے قاتلوں کو ڈھونڈیں۔" ماں نے پکار لگائی۔ "اللہ غرق کرے جنہوں نے میرا بیٹا جوان بیٹا مجھ سے چھین لیا۔"

"ہم وہی کام کر رہے ہیں اور اگر آپ لوگ سوالوں کے جواب نہیں دیں گے تو ہم قاتل تک اور قتل کی وجہ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"تم اندر چلی جاؤ یا پھر خاموش بیٹھو۔" بشیر احمد نے بیوی کو سمجھایا اور پھر فرید شاہ کو مخاطب کیا۔

"آپ پوچھیں انسپکٹر صاحب جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ کسی لڑکی کے چکر میں تھا؟"

"یا خدا مجھے اس بارے میں ذرا سا بھی معلوم نہیں ہے۔" بشیر احمد نے جواب دیا۔

"آپ تو ماں ہیں۔ کیا آپ سے اس نے ذکر کیا یا آپ نے محسوس کیا کہ وہ کسی لڑکی سے ملتا ہے؟" فرید شاہ نے مقتول کی ماں سے پوچھا۔

"نہیں وہ ایسا نہیں تھا وہ کسی لڑکی کے چکر میں نہیں تھا۔" وہ بولی۔ "شجاع بالکل ایسا نہیں تھا وہ تو بالکل سیدھا سادہ تھا۔" وہ رونے لگی تھیں۔

"وہ موٹر سائیکل کس وقت چلاتا تھا؟" وہ اب دوبارہ بشیر احمد سے بات کر رہا تھا۔

"موٹر سائیکل تو میرے پاس ہی رہتی تھی وہ کبھی کبھار جب ضرورت ہوتی مجھ سے پوچھ کر لے جاتا تھا۔"

"اس روز رات میں جب وہ موٹر سائیکل لے کر گیا تو کیا آپ لوگوں نے پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟" فرید شاہ نے سوال کیا۔

"میں نے پوچھا تھا تو کہنے لگا ایک دوست باہر سے آیا ہے اس سے ملنے جا رہا ہے۔" شجاع کے والد نے بتایا۔

"کیا وہ اکثر اوقات رات میں جاتا تھا؟"

"نہیں وہ یہ کام ایک ماہ سے کر رہا تھا۔" بشیر احمد نے کہا۔

"اور اس ایک ماہ میں بھی شاید تین چار دفعہ ہی رات میں گیا ہوگا۔"

"وہ رات نو بجے تک جاتا تھا اور واپسی دو ڈھائی گھنٹے میں ہو جاتی تھی۔"

"ٹھیک ہے میں اب چلتا ہوں۔" وہ جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرے بیٹے کے قاتل پکڑے جائیں گے؟" بشیر احمد نے امید سے دیکھا۔

"وجہ قتل سمجھ آ رہی ہے تو قاتل بھی مل جائیں گے۔" وہ مسکرایا اور روانہ ہو گیا۔

……

فرید شاہ دوبارہ سے قتل والی جگہ پہنچ گیا تھا اس نے چوکی دار سے رابطہ کیا۔

"بلاک ڈی کے تمام فلیٹ آباد ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں جناب تین فلیٹ بند ہیں۔"

"کیوں؟"

"ان کے مالکان ملک سے باہر رہتے ہیں۔" چوکی دار نے بتایا۔

"بلڈنگ کا انتظام وغیرہ کون سنبھالتا ہے؟"

"سبحان بھائی سنبھالتے ہیں۔" چوکی دار نے بتایا۔

"جس بلڈنگ سے وہ لڑکا گرا ہے اس کے تمام گھروں سے تم واقف ہو؟"

"جی جناب۔"

"اب جو سوال کر رہا ہوں اسے دھیان سے سنو اور سچائی سے جواب دو۔"

"حادثے والی بلڈنگ میں ایسی کتنی لڑکیاں ہیں جو کالج جاتی ہیں؟"

چوکی دار کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "شاید تین ہیں۔"

"پورا یقین ہے۔"

"جناب میں صبح گیٹ پر ہی رہتا ہوں جب وہ جاتی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"ان میں سے کوئی تنہا آتی جاتی ہے؟" فرید شاہ نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

چوکی دار پھر کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"کریم بھائی کی لڑکی کالج جاتی ہے اس کی تو وین آتی ہے لینے کے لیے اسی میں وہ واپس آتی ہے۔"

"دوسری لڑکی صدف ہے وہ برکت بھائی کی بیٹی ہے۔ وہ بھی اکیلے نہیں جاتی ہے نہ ہی آتی ہے۔ یا تو برکت بھائی چھوڑتے ہیں یا پھر لڑکی کا بھائی یہ ذمہ داری پوری کرتا ہے۔"

"اور تیسری لڑکی صبا وہ اکیلے آتی جاتی ہے۔" چوکی دار نے بتایا۔

"وہ کس کی بیٹی ہے؟"

"وہ سبحان بھائی کی بیٹی ہے اور وہی بلڈنگ کا انتظام وغیرہ بھی دیکھتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پہلا شک سبحان اور اس کی بیٹی صبا پر ہونا چاہیے۔" وہ خود کلامیہ انداز میں بولا۔

"کیا کوئی گڑبڑ ہے؟"

"کچھ نہیں اور تم اپنی زبان بالکل بند رکھو گے۔ میں نے جو کچھ پوچھا ہے کسی سے کوئی ذکر نہیں کرو گے۔" فرید شاہ نے چوکی دار کو سمجھایا۔

"میں بالکل خاموش رہوں گا۔ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔

……

فرید شاہ موبائل کے ساتھ سبحان نامی شخص کے گھر پہنچا

تھا۔ سبحان جو حادثے والی عمارت کے گراؤنڈ فلور پر ہی رہتے تھے پولیس کو اپنے گھر دیکھ کر گھبرا گئے اور بولے۔

"کیا معلوم ہوا ہو مرنے والا لڑکا کون تھا؟"

"تمہیں سوال نہیں کرنا ہے۔ سوال میں کروں گا اور جواب تمہیں دینا ہے۔" فرید شاہ اپنے روایتی پولیس کے انداز میں آ گیا تھا۔

"ویسے مقتول سے متعلق اب سب سامنے آنے والا ہے۔"

"جی جی آپ سوال پوچھیے؟" وہ سہم سا گیا تھا۔

"باہر بات کرو گے تو لوگ جمع ہو جائیں گے۔" فرید شاہ نے اطراف میں دیکھا تو چاروں طرف سے نگاہیں ان پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

سبحان بھی معاملے کی گمبھیرتا سمجھ رہا تھا اس لیے فرید شاہ کو اندر لے آیا۔ وہ دونوں سبحان کے ڈرائنگ روم میں تھے۔ فرید شاہ نے کمرے کی حالت سے اندازہ لگایا کہ سبحان ایک عام انسان ہے۔

"تمہاری بیٹی صبا کہاں ہے؟" فرید شاہ کے اس سوال نے سبحان کو لڑکھڑا دیا تھا۔

"میری بیٹی سے اس معاملے کا کیا تعلق ہے؟" سبحان نے تھوک سے حلق کو گیلا کیا۔

"ثبوت ملے ہیں کہ تمہاری بیٹی سے اس مقتول لڑکے شجاع کے مراسم تھے۔"

"یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

فرید شاہ ایک پولیس والا تھا وہ سبحان کی کمزور لرزتی آواز سے جان گیا کہ وہ اب منزل کے قریب ہے۔

"دیکھو مسٹر ہم پاکستان کی پولیس ہیں۔ تمہیں اور تمہاری بیٹی کو تھانے لے جا کر بھی سوال جواب کر سکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی بیٹی سے اپنے گھر میں ہی بات کرا دو۔"

فرید شاہ کے سخت رویے کو دیکھتے ہوئے سبحان نے اندر جا کر اپنی بیٹی کو ساتھ لیا اور فرید شاہ کے سامنے آ گیا۔ فرید شاہ نے دیکھا لڑکی واقعی کالج گرل تھی اور خاصی خوب صورت بھی تھی۔

"تو مس تم خود سچ بولو گی یا پھر ہمیں اگلوانا پڑے گا؟"

لڑکی نے باپ کی طرف دیکھا۔ سبحان احمد نے کہا۔

"اب ہمیں سچائی ڈھانپ کر نہیں رکھنا چاہیے۔"

وہ لڑکی جو پتے کی طرح کانپ رہی تھی پوری طرح زرد پڑ گئی تھی۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ بڑی مشکل سے بولی۔

"پوری کہانی کیا ہے؟"

"یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے، جس میں، میں، میری بیٹی، میرا گھر کوئی فرد قصور وار نہیں ہیں۔" سبحان نے حوصلہ کر کے کہا۔

"یہ فیصلہ قانون کرے گا کہ مقتول قتل کیا گیا ہے یا پھر وہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہے۔" وہ دوبارہ لڑکی کی طرف گھوما۔

"تم مجھے الف سے ی تک کی کہانی سنا دو۔"

"میں شجاع کو جانتی تھی۔" صبا نے کہنا شروع کیا تھا کہ فرید شاہ نے جملہ اچک لیا۔

"کب سے؟"

"ایک ڈیڑھ ماہ سے۔"

"دوستی کیسے ہوئی؟" فرید شاہ نے پوچھا۔

"مس کال سے۔" وہ بول کر خاموش ہوئی تو فرید شاہ بولا۔

"بولتی رہو۔"

"کئی بار فون اور میسج پر بات ہوئی اور پھر دوستی ہو گئی۔"

"پھر ملنے بھی لگے ہو گے؟"

لڑکی نے سر جھکا لیا۔

"ملاقات کہاں ہوتی تھی؟"

"باہر ریسٹورنٹ یا پارک میں۔" وہ بولی۔

"کتنی بار باہر ملاقات ہوئی ہو گی؟"

"شاید تین سے چار بار ہوئی ہو گی۔"

"وہ بلڈنگ کی چھت پر اس رات کیوں آیا تھا؟" فرید شاہ نے پوچھا۔

"کالج بند ہو گیا تھا میں باہر نکل نہیں رہی تھی اس لیے وہ یہاں آنے لگا۔"

"چھت پر ملنے کی تجویز کس کی تھی؟"

لڑکی نے ایک بار پھر ہار کی شکل میں سر جھکا لیا۔

"کتنی مرتبہ چھت پر ملے ہو؟"

"پانچ چھ بار۔" اس نے بتایا۔

"چھت تو لاک ہوتی ہے؟"

"میں نے چوکی دار کی چابی چرا کر اسے دی تھی اس نے چوکی دار کو پتہ چلے اس سے پہلے اس چابی کی کاپی تیار کر لی تھی۔"

"اس رات کیا ہوا تھا؟" فرید شاہ اصل بات کی طرف آیا۔

"باقی تفصیل میں بتا دیتا ہوں۔" سبحان نے گہری سانس کے ساتھ خود کو شامل گفتگو کیا۔ وہ کچھ دیر اپنے لفظوں کو ترتیب دینے کے بعد بولا۔

"چند روز سے مجھے اپنی بیٹی پر شک ہو رہا تھا۔ وہ ایک دو گھنٹے رات میں غائب رہتی تھی۔ بیوی سے پوچھا تو وہ یہ بتاتی کہ محلے میں دوست کے گھر گئی ہے۔ میں باپ تھا اس لیے محتاط رہتا تھا۔ حادثے والے دن بھی جب وہ مجھے نظر نہیں آئی تو میں نے بیوی سے پوچھا کہ صبا کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ وہ اپنی دوست کے گھر گئی ہے لیکن میں دیکھ چکا تھا کہ صبا اوپر کی منزل کی طرف گئی ہے۔ چنانچہ میں تیسری منزل پر اس کی دوست کے گھر پہنچا لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ بس میں ویسے ہی غیر ارادی طور پر ایک منزل اور چڑھ گیا۔ کیونکہ میں نے صبا کو اوپر ہی کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اوپر چڑھتے ہی مجھے چھت کے دروازے کا تالا کھلا دکھائی دے گیا۔ چھت کا دروازہ کیونکہ دوسری طرف سے لاک نہیں کیا جا سکتا تھا اس لیے مجھے چھت پر پہنچنے پر کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔" اس سے آگے سبحان کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ خاموش ہو گئے۔

"تم نے ان دونوں کو غیر اخلاقی حالت میں دیکھ کر مشتعل ہو گئے اور شجاع پر تشدد کیا اور اسے چھت سے نیچے پھینک دیا۔" فرید شاہ نے کہا۔

"نہیں میں نے اسے نہیں مارا ہے۔" سبحان نے جلدی سے کہا۔

"تم ہی نے مارا ہے؟"

"نہیں شجاع کو میرے ابو نے نہیں مارا ہے۔ وہ خود اوپر سے گرا ہے۔" صبا چیخی۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی پھر۔ سبحان کی آواز سنائی دی۔

"میں چھت پر پہنچ کر چاروں طرف دیکھا مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ تو میں نے صبا کے نام کی آواز لگائی۔"

"میں نے اور شجاع نے ابو کی آواز سن لی تھی۔" صبا نے کہانی کو آگے بڑھایا۔

"ہم دونوں پانی کی ٹنکی کے پیچھے بیٹھے تھے۔ میری گھبراہٹ سے شجاع بھی ڈر گیا۔ میں اسے بھاگ جانے کو کہا اور خود بھی جانے لگی۔ لیکن ڈرے ہوئے شجاع نے مجھے بازو سے پکڑنے کی کوشش کی۔ میں اتنی خوف زدہ تھی کہ میرا ہاتھ چل گیا اور سیدھا شجاع کی آنکھ پر لگا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ کچھ بھی کرے کیسے بھی کر کے وہاں سے بھاگ جائے۔ شجاع بھی ڈرا ہوا تھا اس نے چھت سے نیچے کی طرف جھانکا اور بولا۔ میں پائپ کے ذریعے اتر جاتا ہوں۔ اس نے ابھی دوسری طرف سے اترنا شروع ہی کیا تھا کہ ابو جھ تک پہنچ گئے اور پھر نیچے جھانکتے دیکھ کر انہوں نے بھی لٹکے ہوئے شجاع کو دیکھا۔ انہوں نے شجاع کو گالی دی اور پھر یہ حادثہ ہو گیا۔" صبا خاموش ہو چکی تھی۔

"میں نے گالی کے ساتھ یہ کہا تھا کہ پولیس کو بلا کر تجھے ڈکیتی میں بند کراتا ہوں۔" سبحان نے بتایا۔

"اس کا ہاتھ پھسل گیا اور وہ اوپر سے نیچے آ گرا۔"

فرید شاہ جانتا تھا کہ یہ دونوں سچ بول رہے ہیں۔

"حادثہ ہی سہی لیکن ایک انسان کا خون ہوا ہے۔ اس لیے کیس تو بنے گا۔"

"میں خود جیل جانے کو تیار ہوں لیکن میری بیٹی کا نام نہ آئے۔" سبحان نے التجا کی۔

"میں آپ کی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔" فرید شاہ بولا۔

"میں کیس تیار کرتا ہوں آپ اچھا سا وکیل کر لیں تا کہ ابھی آپ کو ضمانت مل جائے۔" وہ جانے کے ارادے سے گھوما لیکن رک کر بولا۔

"تھانے آ کر بیان ضرور تحریر کرا دیں۔"

سبحان نے اثبات میں سر ہلایا اور فرید شاہ کو رخصت کر کے اپنے گھر لوٹ آیا۔

آخری رشتہ

عنبرین اختر

اک ماں کی روداد، وہ اپنی بیٹی کی خوشیاں چاہتی تھی اس نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہر رشتہ ٹھکرا دیا تھا لیکن جب ایک آخری رشتہ آیا تو......

حقیقت سے آنکھیں چرانے والی ایک خاتون کا فسانہ

ماں جی کتنی ہی دیر سے زہرہ بی کے ہونے والے دولہا اور ان کے پورے خاندان کو صلواتیں سنا رہی تھیں جن سے چند ہی روز پہلے انہوں نے زہرہ بی کی منگنی بڑے دھوم دھڑکے سے کی تھی۔ منگنی کی انگوٹھی تو ماں جی کو ایک آنکھ نہ بھائی۔

"نگوڑی یہ ہی انگوٹھی رہ گئی تھی۔ میری شہزادیوں جیسی بچی کے لیے؟"

کوئی چھوٹا موٹا ہیرا ابھی نہ جوڑا انہیں۔ زہرہ بی ماں جی کو کچھ زیادہ ہی پسند تھیں۔ وہ ان کی چاروں بیٹیوں میں سے سب سے بڑی تھیں اور تھیں بھی بھلی مانس۔ ماں جی کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا گویا ان کا فرض تھا۔ کم زبان اتنی کہ دس باتیں سنا لو تو مجال ہے کہ ایک لفظ بھی منہ سے نکال لیں اور صورت تو جیسے خدا نے انہیں اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔

ماں جی تو انہیں نظر بھر کر دیکھتی بھی نہ تھیں۔ اپنے اسی اوصاف کی وجہ سے وہ ماں جی کی آنکھ کا تارا تھیں۔ ان کی نازک سی انگلی میں بھدی سی انگوٹھی دیکھتے ہی ماں جی کا جی چاہا تھا کہ لانے والوں کے منہ پر دے ماریں۔

مگر ابوذر اعوان کی وجہ سے خاموش رہیں۔ قسمت سے ہی تو کسی کو اتنا اچھا داماد ملتا ہے اور ابوذر اعوان تو خیر سے ولایت میں ایک بڑی فرم میں منیجر تھے۔ جن کی تصویر وہ دن میں کئی بار دیکھتیں اور تصور ہی تصور میں زہرہ بی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتیں اور پھر مطمئن ہو جاتیں۔ اپنی زہرہ کے ہی جوڑ کا تھا۔

بڑی بڑی ذہین روشن آنکھیں۔ فراخ پیشانی' شرافت و قابلیت تو اس کے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔ جی بھر کے دیکھنے کے بعد وہ تصویر کو ایسی جگہ چھپا دیتیں جہاں زہرہ بی کی نظر نہ پڑے۔ زہرہ بی کا وہ تصویر دیکھ لینا ان کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا۔

یوں تو زہرہ بی کے لیے رشتوں کی کچھ کمی نہ تھی۔ اپنے ہی خاندان میں بہت سے لوگ ان کے لیے خواہش رکھتے تھے۔ ماں جی کی اپنی ہی

بہن کا بیٹا فوج میں کپتان تھا اور ان کی بہن کی دلی تمنا تھی کہ وہ زہرہ کو بہو بنائیں۔ لیکن ماں جی کہتیں۔

''بہن فوج کی نوکری بھی کوئی نوکری ہے۔ شادی کے دوسرے ہی دن جنگ چھڑ جائے تو ایک دن کی بیاہی دلہن بیوہ ہو جائے۔''

ماں جی زہرہ کو اپنے پائلٹ بھانجے سے بیاہنے کے بھی خلاف تھیں۔

''توبہ ہے..... موئے جہاز چلانے والوں کی جان ہر وقت سولی پر رہے زندگی کا پتہ نہ موت کا۔ میرا تو کلیجہ ڈول جاتا ہے جب جہاز اڑتا دیکھتی ہوں۔''

اور ڈاکٹر! ان سے تو ماں جی کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ جب زہرہ کی پھوپھی نے اپنے بیٹے کے لیے پیام دیا۔ تو ماں جی نے فوراً انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک ڈاکٹروں کی ملک میں قطعی ضرورت نہیں تھی۔

''بھلا ایک سے ایک اچھا حکیم موجود ہو تو ڈاکٹروں کی کیا ضرورت؟

اور وہ نکڑ والے شاہ جی سے دم کروانے کے بعد تو تکلیف کا جڑ سے خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اور پھر ان ڈاکٹروں میں ویسے بھی ہمدردی اور انسانیت تو نام کو نہیں ہوتی۔ پچھلے ہی دنوں جب ان کی ہمسائی بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہوئیں تو مجبوراً ماں جی کو بھی انہیں دیکھنے کے لیے جانا پڑا۔ ادھر ڈاکٹروں اور نرسوں کی آپس میں بے تکلفی دیکھ کر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ یہ بے حیائی انہیں ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس دن سے انہیں ملک کی تمام نرسیں اپنی زہرہ کی سوکنیں نظر آنے لگیں۔

گھر کے ان تمام رشتوں کو ٹھکرا کر انہوں نے ابوذر اعوان کا انتخاب کیا۔ غیروں میں زہرہ کو بیاہتے ہوئے ان کا کلیجہ بھی ہول کھا رہا تھا۔ لیکن اپنی بچی کے روشن مستقبل کی امید میں وہ یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھیں لیکن ان کی تمام امیدیں خام میں مل گئیں۔ صبح ان کے ایک قریبی عزیز نے جو کاروبار کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا اور جو ماں جی کی ہدایت کے مطابق ابوذر اعوان سے مل کر آیا تھا۔ آ کر انہیں بتایا کہ ابوذر اعوان کوئی

معمولی سی فیکٹری میں مزدور ہے اور تعلیم بھی صرف میٹرک تک ہے اور جو کچھ ان کے متعلق بتایا گیا ہے۔ اس میں ذرا بھی صداقت نہیں۔ ماں جی اس انکشاف پر چکرا کر رہ گئیں۔ پہلے کچھ لمحے تو سن سی بیٹھی رہیں پھر جو ان کی زبان چلنی شروع ہوئی تو خدا کی پناہ جب جی بھر کر ان کو صلواتیں سنا چکیں تو اندر جا کر الماری سے قرآن شریف نکالا۔

قرآن شریف کھول کر اس میں سے ابو ذر اعوان کی تصویر آخری مرتبہ دیکھی۔ اس مرتبہ تصویر میں انہیں دنیا جہان کی برائیاں نظر آئیں۔ نا تو ان کی آنکھوں میں روشنی اور ذہانت دکھائی دی اور نہ ان کی پیشانی پر اقبال مندی کا ستارہ چمکتا ہوا نظر آیا۔ فوراً تصویر اور انگوٹھی بھجوا کر منگنی کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔

زہرہ نے اپنے مستقبل کے نا جانے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے۔ وہ اپنے سپنوں کو لوٹتے دیکھ کر بھی خاموش تھیں۔ وہ تو تھیں ہی صدا کی صابر، شاکر، شکوہ کرنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ صدمہ تو انہیں بھی ہوا تھا لیکن چند لمحوں بعد ہی وہ سنبھل گئیں۔

اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اب کہ ماں جی نے زہرہ کے لیے ایک زمین دار کا انتخاب کیا۔ عمر تو تیس سے کچھ اوپر تھی۔ اور ان کی زہرہ صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ شکل صورت سے تو شریف ہی لگتا تھا۔ اور زمینیں وغیرہ بھی بہت سی تھیں اور خاصا خوش حال تھا۔ اب کہ بھی پروردگار نے انہیں بال بال بچا لیا۔ منگنی کے بعد چند روز پہلے پتہ چلا کہ زمین دار صاحب خیر سے تین عدد بیویوں کے شوہر ہیں اور شادی کرنا ان کا خاص مشغلہ ہے۔

ماں جی تو وہیں فکر میں گھومتی جا رہی تھیں کہ بس ان کی بیٹی کے لیے حسب منشا رشتہ مل جائے۔ زہرہ سے چھوٹی بیٹیاں بھی اب اللہ رکھے جوان ہو رہی تھیں۔ بیٹی تو ہے بھی پرایا دھن۔

اسے کوئی کب تک گھر بٹھا سکتا ہے۔ ویسے تو یوں ہی رشتہ داروں نے زہرہ کی منگنی ٹوٹنے کی خبر سنی۔ سب نے اپنا اپنا دامن پھیلا دیا اور ماں جی بھی اب کہ نیم راضی تھیں اور اب ان کا خیال تھا کہ اپنے جیسے بھی ہوں۔ غیروں سے بہر حال بہتر ہیں۔ زہرہ کے ابا اس معاملے میں بالکل لاتعلق تھے۔ ان کا گھر سے صرف اتنا واسطہ تھا کہ یہ پہلی تاریخ کو پوری کی پوری تنخواہ بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ صبح کے دفتر گئے۔ رات کو گھر آتے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کی بیٹیاں کدو کی بیل کی طرح بڑھ رہی ہیں۔ انہی دنوں زہرہ کے لیے وقاص صاحب کا رشتہ آیا۔

وقاص صاحب نے نا جانے کس تقریب میں زہرہ کی ایک جھلک دیکھ لی تھی اور اسی دن سے ان کو بیاہنے کی دھن میں تھے لیکن اماں جی اب نکڑ والے شاہ جی کے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

اس لیے وقاص صاحب کے گھر والوں سے بھی کہا کہ شاہ جی سے مشورہ کر کے ہی جواب دیں گی۔

وقاص صاحب نے خود بھی لاہور میں پیری

محبت' نفرت اور رشک کی آمیزش سے مزین ایک ناقابل فراموش کہانی
بنتے بگڑتے رشتوں سے آراستہ ایک معاشرتی و رومانوی دلکش تحریر
حسد کی آگ میں دوسروں کی زندگی جھلسا دینے والوں کا دردناک انجام
حجاب کے صفحات پر بہت جلد ملاحظہ فرمائیں
انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ نفرت بو کر محبت کے پھول نہیں پا سکتا
نفرت کے آنگن میں محبت کے پھولوں کو کھلنے سے کون روک سکتا ہے
گمراہی سے ہدایت تک کا سفر' بنتے بگڑتے رشتوں کی اچھوتی داستان
امید اور ناامیدی کے درمیان پرورش پاتی محبت کی حسین کہانی
پریشانی سے بچنے کے لئے اپنی کاپی آج ہی بک کرائیں۔ رابطہ 03008264242

مریدی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ دوسرے ہی دن ماں جی شاہ جی کے پاس پہنچی۔ جتنے بھی غیروں اور عزیزوں کے رشتے اس وقت ان کے سامنے تھے۔ وہ ان کو بتلائے۔ شاہ جی نے وقاص صاحب کے حق میں فیصلہ دیا۔

اور کہا کہ تمہاری بچی یہاں خوش رہے گی اور بہت عیش کرے گی۔ ماں جی شاہ جی کے گھر سے آ کر مطمئن تھیں اور اس بات سے بالکل بے خبر تھیں کہ ان کے شاہ جی کے ہاں پہنچنے سے پہلے ہی وقاص صاحب ان کے ہاں پہنچ کر معاملہ طے کر چکے تھے۔

ماں جی نے بڑی دھوم دھام سے اپنی بیٹی کو رخصت کیا اور اتنا بہت سا جہیز دیا کہ سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وقاص صاحب کی عمر تو کچھ زیادہ نہ تھی۔ بمشکل پچیس چھبیس سال کے ہوں گے۔ لیکن ان کے چہرے پر نحوست سی برستی تھی۔ ان کا زہرہ سے کوئی جوڑ تو نہ تھا۔ لیکن ماں جی کے لیے شاہ جی کی بات پتھر کی لکیر تھی۔ سب عزیزوں کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے اپنی ہی مرضی کی۔ زہرہ کی ڈولی جس وقت رخصت ہو رہی تھی ماں جی منہ ہی منہ میں بیٹی کو دعائیں دے رہی تھیں۔

"بیٹی! تیرا سہاگ سدا سلامت رہے بیٹی تو سدا سہاگن رہے۔"

شادی کے چند دن بعد زہرہ اپنے شوہر کے ساتھ صرف دو دنوں کے لیے گھر آئیں۔ ماں جی تو انہیں دیکھتے ہی گھبرا گئیں۔ اجاڑ صورت۔ نا نئی دلہنوں والی بات۔ اور نہ ہی کوئی بناؤ سنگھار ماں جی کے پوچھنے پر کہنے لگیں کہ "وقاص صاحب کو بھڑکیلا لباس پسند نہیں"۔

دوسرے ہی دن وقاص صاحب انہیں مجبور کرنے لگے کہ واپس چلو۔ سب گھر والوں نے بہت روکا لیکن ان کی تو ایک ہی ضد تھی کہ آج ہی واپس جاؤں گا اور زہرہ کو بھی ساتھ ہی لے کر جاؤں گا اور پھر سب کے بے حد اصرار کے باوجود وہ زہرہ کو ساتھ لے گئے۔

جاتے ہوئے زہرہ جس طرح تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔ ماں جی کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا لیکن مجبور تھیں۔ بیٹی کی بات تھی۔ اگر بڑھ جاتی تو لوگ کہتے کہ ماں نے بیٹی کا گھر اجاڑ دیا۔ پھر کتنے ہی مہینوں تک زہرہ کا کوئی فون نہ آیا۔ کبھی کبھار وقاص صاحب کا کوئی فون آ جاتا جس میں خیریت کی اطلاع ہوتی۔

آخر ماں جی کب تک صبر کرتیں۔ انہوں نے زہرہ کے ابا کے ساتھ ان کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا لیکن جانے سے ایک دن پہلے چھوٹی بیٹی سدرہ بیمار ہو گئی۔ جس کی وجہ سے ماں جی کو رک جانا پڑا اور وہ اکیلے زہرہ کے ہاں گئے۔ جب واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ زہرہ سے مل کر نہیں آئے۔ کیونکہ وہ کوئی لمبا وظیفہ پڑھ رہی تھی اور جب تک وہ پورا نہ ہو جائے وہ کسی سے نہیں مل سکتیں۔ ان کے واپس آنے کے چوتھے ہی دن زہرہ کے انتقال کی خبر ملی۔

ماں جی تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں۔ ان کی

پھول سی بچی جو چھ مہینے پہلے دلہن بن کر ان کے گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اس دنیا سے رخصت ہو گئی ہے۔ ابھی تو اس نے زندگی کی اٹھارہ بہاریں دیکھی تھیں۔ گھر میں تو گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ بہنوں کا روتے روتے برا حال ہو گیا۔ سب اسی وقت سرگودھا کے لیے روانہ ہو گئے۔

ماں جی کی آنکھوں کے سامنے زہرہ کی معصوم سی صورت تھی۔ وقاص صاحب کے ساتھ جاتے ہوئے کیسی بلک بلک کر رو رہی تھی اور اس سے پہلے اکیلے میں کتنی منتیں کی تھیں کہ انہیں چند دنوں کے واسطے اپنے پاس رکھ لو اور ماں جی تڑپ تڑپ گئیں۔

''ہائے میری بچی! میں نے کیوں نہ تیری بات مان لی۔'' روتے پیٹتے جب یہ لوگ وقاص صاحب کے مکان پر پہنچے تو نہ ہی میت کے پاس لوگ نظر آئے اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دی۔ صدمے سے نڈھال اندر پہنچے تو وقاص صاحب آرام سے بیٹھے تھے۔

''میری زہرہ کہاں ہے؟ بولو! اسے تم نے کیا کیا؟''

''اس کے ساتھ تم نے کیا ظلم کیا؟ جو چند مہینوں کے اندر ہی اس کی جان لے لی۔''

ماں جی پاگلوں کی طرح چلا رہی تھی اور جب انہیں معلوم ہوا کہ زہرہ کو ان کے آنے سے پہلے ہی دفن کر دیا گیا ہے تو ان کی حالت اور خراب ہو گئی۔ میں اپنی بچی کو آخری بار ضرور دیکھوں گی۔ مجھے قبرستان لے چلو۔''

''آخر ہمارا انتظار کیوں نہیں کیا۔ ہم سے پہلے ہی زہرہ کو دفن کیوں کر دیا گیا۔'' ماں جی رو رہی تھیں لیکن زہرہ کے ابا کچھ اور سوچ رہے تھے۔ ان کے پوچھنے پر وقاص صاحب نے بتایا کہ وظیفہ کے دوران زہرہ بھاگی ہوئی آئی اور کہنے لگی۔

''مجھے یا رسول اللہ کا دیدار ہو گیا ہے۔'' اور اس کے بعد تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

لیکن ماں جی تو اپنی زہرہ کا آخری دیدار چاہتی تھی۔ قبر کھودی گئی۔ زہرہ کپڑوں سمیت خون میں لت پت تھی۔ جسم پر اس قدر زخم تھے کہ گننا مشکل۔ دانت ٹوٹے ہوئے، پسلیاں چٹخی ہوئی۔ اور آنکھیں باہر نکلی ہوئی۔ پولیس کے تشدد کے باوجود اسے اپنے اس بیان پر اصرار تھا کہ زہرہ بدچلن تھی۔

اس لیے میں نے اسے مارا لیکن ماں جی یہ کیسے مان لیتیں کہ ان کی بیٹی بدچلن تھی۔ اس کی تو آواز تک کسی غیر شخص نے نہ سنی تھی لیکن کوئی بھی تو اس راز کو نہیں جان سکا۔ خدا جانے وہ کون سا راز تھا جسے چھپانے کے لیے اس نے اس معصوم کی جان لے لی۔ ماں جی سرگودھا کے بڑے پیر کے مزار پر پڑی رہتی تھی اور دعائیں مانگتی تھی کہ اسے بھی رسول اللہ کا دیدار ہو جائے اور وہ مگر اب تو اس کی نیند بھی چھن گئی تھی۔

❀

خلیل جبار

ان لوگوں کا احوال' جو آنکھیں بند کر کے اجنبی خواتین کی زلف کے اسیر ہو جاتے ہیں۔
شہر میں سرگرم ایک ایسے گروہ کی کہانی' خواتین کے سہارے سادہ لوح نوجوانوں کو لوٹنے میں آج بھی سرگرم ہے۔

کورٹ رپورٹر کی ڈائری سے ایک خونریز واقعہ کی روداد

میں جیسے ہی سرفراز کے گھر کے قریب پہنچا۔ میں نے اس کے گھر سے کسی خاتون کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ میں خاتون کو دیکھ کر بری طرح چونکا تھا بات بھی ایسی تھی۔ اس کے گھر میں کسی عورت کا کیا کام اور پھر وہ ادھیڑ عمر خاتون جس کی ڈریسنگ بھی کسی بازاری عورت کے جیسی تھی اس بات پر میں زیادہ فکر مند ہوا تھا۔

سرفراز سے میری پانچ سال قبل دوستی ہوئی تھی وہ پنجاب کے ایک علاقے منڈی بہاؤ الدین سے تعلق رکھتا تھا وہ روزگار کے سلسلے میں کراچی آیا تھا اور اپنے کسی عزیز کی معرفت ایک پیٹرول پمپ پر ملازم ہو گیا تھا۔ میں بھی اسی پیٹرول پمپ سے موٹر سائیکل میں پیٹرول بھروایا کرتا تھا۔ پیٹرول پمپ پر اس سے بات چیت ہوا کرتی تھی جو پھر دوستی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

سرفراز بہت خوش مزاج قسم کا نوجوان تھا۔ اس کی تین بہنیں تھیں اس کے والدین کی خواہش تھی وہ بیٹیوں کے فرض سے جتنا جلدی فارغ ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ سرفراز کو بھی اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا۔ اسی لیے وہ تنخواہ میں سے اچھی خاصی رقم بچا کر گھر بھیج دیتا تھا تاکہ اس کے والدین سرفراز کی بہنوں کے لیے جہیز تیار کر سکیں وہ جس کرائے کے مکان میں رہتا تھا وہ میرے گھر کے قریب ہی تھا اس لیے میں اکثر فرصت میں سرفراز سے ملنے چلا جاتا تھا آج میں فارغ ہی تھا اور اس وقت سرفراز مکان میں ہی ہوتا تھا۔

''سرفراز میں نے تمہارے مکان سے کسی خاتون کو نکلتے دیکھا ہے۔'' میں نے سرفراز سے پوچھا۔ میری بات سن کر وہ مسکرایا۔

''ہاں دیکھا ہو گا وہ آنٹی ماہ لقاء ہیں۔

''میں نے انہیں پہلے کبھی تمہارے مکان پر نہیں دیکھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''واقعی تم نے نہیں دیکھا ہو گا۔'' سرفراز زیرلب مسکرایا۔

''کیا تمہاری رشتے دار ہیں۔''

''نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''میں تمہاری حیرانگی دور کئے دیتا ہوں یہ ایک ہفتہ پرانی بات ہے۔ رات کی ڈیوٹی پر مامور میرا ساتھی ریحان ڈیوٹی پر نہیں آیا مجبوراً مجھے اس کی جگہ رکنا پڑ گیا وہ چار گھنٹے کی تاخیر سے پہنچا۔ میں اس کے ڈیوٹی پر آ جانے سے پیٹرول پمپ سے چلا آیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں موٹر سائیکل پر سوار تھا اچانک ایک خاتون بھاگتے ہوئے میری موٹر سائیکل سے ٹکرائی۔ اگر میں فوری بریک نہ لگاتا تو موٹر سائیکل سمیت گر پڑتا۔ موٹر سائیکل

کو بریک لگتے ہی وہ خاتون موٹر سائیکل پر بیٹھ گئیں اور بولیں۔

"جلدی گاڑی چلاؤ میرے پیچھے چند غنڈے لگے ہوئے ہیں۔" میں نے گاڑی کو ریس دے دی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے پر واقعی مجھے چند غنڈے نظر آئے جو ایک گلی سے نکلے تھے۔ میں گاڑی کو تیز دوڑاتے ہوئے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ چونکہ پیدل تھے اس لیے میں ان کی پہنچ سے دور تھا۔

"یہ غنڈے تمہارے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟" میں نے خاتون جس کا نام ماہ لقاء تھا اس سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم وہ مجھے کیوں اغوا کرنا چاہتے ہیں آج میری سہیلی نازش کی بچی کنول کی سالگرہ تھی میں سالگرہ میں شرکت کر کے نکلی تھی۔ میں نے جیسے ہی گلی سے باہر نکلنا چاہا۔ اندھیرے میں چھپے ان غنڈوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ مجھے اغوا کرنا چاہتے ہیں اسی لیے میں کسی نہ کسی طرح خود کو ان سے چھڑا کر تیزی سے بھاگی اور سیدھی تمہاری گاڑی سے ٹکرا گئی۔" اس نے بتایا۔

"اتنی رات گئے یوں اکیلے نہیں نکلنا چاہیے۔ میں نے کہا۔

"میں اکثر رات میں ایک بجے کبھی دو بجے نازش کے گھر سے اکیلی نکلتی ہوں گلی سے نکلتے ہی رکشہ مل جاتا تھا کبھی ایسا نہیں ہوا جیسا آج ہوا ہے۔" آنٹی نے کہا۔

"آنٹی ایسے واقعات روزانہ کہاں ہوتے ہیں کبھی کبھی ہی ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو اگر اس طرح کے واقعات روزانہ ہونے لگیں تو لوگ گھروں سے رات میں نکلنا چھوڑ دیں میں آج کے واقعے سے سبق حاصل کرتے ہوئے آئندہ احتیاط کروں گی۔" آنٹی نے کہا۔

میں نے آنٹی کو ان کے گھر کے دروازے پر چھوڑا اور چلا آیا تھا اب تم کہو گے وہ میرے مکان پر کیسے پہنچیں۔"

"ظاہر سی بات ہے رات میں آنٹی سے ملنا اتفاق ہو سکتا ہے تمہارے مکان پر پہنچنا اتفاق نہیں ہو سکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ اتفاق نہیں مجھ سے آنٹی نے موبائل نمبر لیا تھا اور آج وہ میرا شکریہ ادا کرنے گھر آئی تھیں۔ آنٹی بہت اچھی خاتون ہیں بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہیں۔" سرفراز نے کہا۔

"کیا وہ دوبارہ بھی تمہارے دولت خانے پر آنے کا ارادہ رکھتی ہیں؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بے شک دس بار آئیں میں انہیں ویلکم کہوں گا۔" سرفراز نے جواباً قہقہہ لگایا۔

"کیا آنٹی پسند آ گئی ہیں؟" میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"آنٹی بہت اچھی خاتون ہیں۔" سرفراز نے مختصر جواب میں کہا۔

"ہاں ڈریسنگ بھی اچھی کر لیتی ہیں حالانکہ اس عمر میں خواتین زیادہ تر سادگی پسند ہو جاتی ہیں۔"

''یار! ایسا لگ رہا ہے مجھ سے زیادہ دلچسپی تمہیں آنٹی سے ہوگئی ہے۔'' سرفراز نے معنی خیز انداز میں کہا۔
''میں نے اسے دور سے دیکھا ہے دلچسپی اسے ہو سکتی ہے جس نے آنٹی کو قریب سے دیکھا ہو۔'' میں نے جوابی حملہ کیا۔
''کہو تو یہ موقع تمہیں بھی فراہم کیا جا سکتا ہے۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔
''مجھے معاف ہی رکھو۔'' میں نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔
''کیوں؟'' وہ چونکا۔
''میں خواتین سے دور ہی رہتا ہوں کیونکہ بعض دفعہ خواتین سے دوستی بہت ہی نقصان دہ ہوتی ہے۔''
''تم سدا کے ڈرپوک واقع ہوئے ہو۔ میں نے آنٹی کو غنڈوں سے بچایا ہے اور وہ میرا شکریہ ادا کرنے پہنچ گئیں اس میں میرا کیا نقصان ہوا ہے۔''
''سرفراز میرا مشورہ تمہیں یہی ہے کہ آنٹی سے زیادہ دوستی مت بڑھانا اس واقعے کو اس طرح بھول جانا کہ جیسے ہوا ہی نہ ہو۔'' میں نے اسے مشورہ دیا۔
''میں کوشش کروں گا کہ تمہارے مشورے پر عمل کروں۔'' سرفراز نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔
میں تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھ کر گھر چلا آیا۔ میں نے سرفراز کو آنے والے خطرے سے پہلے آگاہ کر دیا تھا اب یہ اس کا کام تھا کہ سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنٹی سے نہ ملے۔ اس دن کے بعد بھی میں نے آنٹی کو کئی بار سرفراز کے مکان سے نکلتے دیکھا۔ نا جانے کیوں مجھے وہ پسند نہیں آئی تھیں۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرے دل میں انجانے سے اندیشے سر اٹھانے لگتے تھے مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ سرفراز کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والا ہے ایک دن مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں پھٹ پڑا۔
''سرفراز میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ آنٹی سے دوستی مت بڑھانا پھر بھی تم نے اس سے دوستی بڑھا لی ہے۔''
''یار وہ بہت اچھی خاتون ہیں تم نجانے کیوں اس سے اتنے خوف زدہ ہو۔'' وہ بولا۔
''میں آنٹی سے نہیں آنے والے برے وقت سے خوف زدہ ہوں تم اپنے گھر سے دور ہو خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو کون تمہیں سنبھالے گا۔'' میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔
''آنٹی سنبھالے گی۔'' سرفراز نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔
''یہ تم کس طرح کہہ رہے ہو؟'' میں چونکا۔
''محمود تم وعدہ کرو میں جو بات تمہیں بتانا چاہ رہا ہوں وہ کسی کو نہیں بتاؤ گے۔''
''نہیں بتاؤں گا۔''
''یار محمود آنٹی دل کی بہت اچھی خاتون ہیں ان کے شوہر کاشف کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے بچے ابھی چھوٹے ہیں وہ بچوں کو اسکول چھوڑ کر ملازمت پر چلی جاتی ہیں شام کو گھر لوٹتی ہیں تھکی ہاری ہونے کے باوجود بچوں کے لیے کھانا تیار کرنا ان کا معمول ہے۔''
''اس میں انوکھی کون سی بات ہے ہر بیوہ عورت تقریباً ایسا ہی کرتی ہے کوئی خوش نصیب خاتون ہوگی جس کی مدد کرنے والا کوئی عزیز یا رشتے دار مل جائے۔'' میں نے کہا۔
''پہلے پوری بات سن لو پھر آگے بولنا۔'' وہ غصے سے بولا۔
''اچھا بتاؤ۔''
''مجھے یہاں رہتے ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو گیا ہے یہاں میری تنہائی کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ آنٹی بھی شدید تنہائی کا شکار تھیں بس ہم دونوں میں ایک خاموش سا معاہدہ ہو گیا اور ہم دونوں کی تنہائی دور ہو گئی ہم دونوں ہی اس معاہدے پر خوش ہیں۔''
''سرفراز تمہیں اگر تنہائی اتنا ہی پریشان کرتی ہے تو اس کا سادہ سا حل ہے کہ تم شادی کر لو۔ گناہ آلود زندگی گزارنے سے یہ زیادہ بہتر ہے۔''
''میں کس طرح شادی کر سکتا ہوں میرے کاندھوں پر جوان بہنوں کا بوجھ ہے جب تک یہ بوجھ اتر نہیں جاتا میں شادی نہیں کر سکتا۔'' سرفراز نے کہا۔
''میں مانتا ہوں مگر یہ بھی اچھا نہیں ہے کہ تم آنٹی کو اپنے گلے کا ہار بنا لو یہ سودا تمہیں بہت مہنگا بھی پڑ سکتا

ہے۔"

"اس لیے میں نے آنٹی سے قانونی طور پر کسی بھی قسم کا معاہدہ نہیں کیا ہے انہوں نے مجھ سے بہت اصرار کیا تھا کہ میں ان سے نکاح کرلوں۔"

"کیا!! آنٹی نے تمہیں نکاح کی آفر کی تھی اس نے اپنی عمر دیکھی ہے۔"

"محمود میری پوری بات سن لو۔" اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں بولو۔" میں نے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔

مجھے اس بات پر زیادہ غصہ تھا کہ وہ سرفراز کی بے وقوفی کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہ رہی تھی اور وہ بے وقوف بنے جارہا ہے۔

"آنٹی کو اس بے رحم معاشرے میں خود کو محفوظ رکھنے کے لیے شوہر کے سہارے کی ضرورت ہے میں ان کا شوہر برائے نام ہوتا یعنی دنیا کو دکھانے کے لیے معاہدے کی رو سے مجھے یہ اجازت تھی جب میں چاہوں اس نکاح کو ختم کر سکتا ہوں آنٹی کوئی اعتراض نہیں کریں گی مگر میں نے انکار کردیا کہ میں ایسا کوئی معاہدہ نہیں کروں گا۔ جس سے میں قانون کی گرفت میں آسکوں۔ بس زبانی معاہدہ ٹھیک ہے اور ہم دونوں اس معاہدے پر قائم ہیں اور رہیں گے۔"

"سرفراز یہ دل کے بہلانے کی حد تک ٹھیک ہے مگر تم بڑی پریشانی میں پھنسنے والے ہو میرا مشورہ مخلصانہ ہے تم نے آنٹی سے جو بھی تعلق قائم کرلیا ہے اسے ختم کردو اور اس سے ملنا بھی چھوڑ دو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے جب میں پریشان نہیں ہوں تو تم کیوں پریشان ہورہے ہو۔ میٹرک تک میں نے بھی تعلیم حاصل کی ہے اور پیٹرول پمپ پر کام کرتے ہوئے یہ سیکھا ہے کہ انسان قانونی کارروائی میں پھنس سکتا ہے جو کام کاغذی کارروائی میں نہ ہو اس سے بچنا بہت آسان ہوتا ہے۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں یہ کراچی ہے یہاں غیر قانونی کام بغیر کاغذی کارروائی کے ہوتے ہیں۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

میں سرفراز کو سمجھانا چاہ رہا تھا مگر وہ میری بات کو سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ آنٹی نے اپنی اداؤں سے سرفراز کو بری طرح سے پھنسالیا تھا اور وہ صرف آنٹی کی باتوں کو سمجھ رہا تھا۔ میری باتیں اس کے سر سے گزر رہی تھیں یا وہ میری باتوں کو سمجھنا ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس دن کے بعد بھی میں نے بار ہا سرفراز کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس نے میری باتوں کو ان سنی کردیا۔ میں نے بھی پھر سرفراز کو سمجھانا چھوڑ دیا کہ جو شخص خود سمجھنا نہیں چاہتا پھر اس پر محنت کرنا فضول ہے۔

ایک دن میری سرفراز سے پیٹرول پمپ پر ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش دکھائی دیا۔ میرے استفسار پر سرفراز نے بتایا کہ اس کی دو لاکھ روپے کی کمیٹی کھلنے والی ہے۔

"یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم اتنی بچت کر لیتے ہو کہ گھر رقم بھیج کر بھی کمیٹی ڈالی ہوئی ہے۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار میری بہنوں کے اچھے رشتے آگئے ہیں جہیز وغیرہ پہلے ہی تیار ہو چکا ہے اب کھانے کا انتظام رہ گیا تھا وہ میری کمیٹی کھل جانے سے حل ہوجائے گا۔"

"اللہ تعالیٰ سب بہتر کرے گا شادی پر کھانے کا انتظام بھی اچھا ہوجائے گا۔"

"تمہیں شادی سے ایک ہفتے پہلے میرے گھر چلنا پڑے گا۔" وہ بولا۔

"وہ کیوں بھئی؟"

"شادی کے انتظامات میں میرا ہاتھ کون بٹائے گا میں تمہیں پہلے کہہ رہا ہوں کہ تمہیں شادی کے انتظامات میں میرا ہاتھ بٹانا پڑے گا۔" وہ مصنوعی غصے سے بولا۔

"اچھا بھئی ناراض مت ہو میں ضرور تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا تم بتاؤ شادی کب ہے؟"

"اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں ہے اور کمیٹی مجھے اس ماہ کی 15 تاریخ کو مل جائے گی۔" سرفراز نے بتایا۔

"آنٹی شادی میں آئے گی۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"نہیں یار آنٹی نے شرکت سے انکار کردیا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"بس یار وہ مجھ سے ان دنوں ناراض ہے۔"

"اتنی پیاری آنٹی ناراض ہے یقین نہیں آرہا ہے۔" میں نے بے یقینی سے کہا۔

''بس یار وہ مجھ سے ناراض ہے کئی دن سے ملاقات کرنے بھی نہیں آئی ہے خیر میں انہیں منالوں گا اور پوری کوشش کروں گا کہ وہ بھی شادی میں شرکت کریں۔'' سرفراز نے کہا۔

''پھر تو تمہاری راتیں تنہائیاں بڑی پھیکی پھیکی گزر رہی ہوں گی۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسا تو ہوتا ہے ایسے کاموں میں مگر آنٹی کے مان جانے پر یہ راتیں پھر سے رنگین ہوجائیں گی۔'' سرفراز بھی جواباً مسکرا دیا۔

وہ میرا دوست تھا اس کی خوشی میں میری خوشی ہونا فطری تھا۔ اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہوجانے پر سرفراز ہی کا نمبر تھا شادی کا اور اس کی شادی ہوجانے پر آنٹی سے خود بخود سرفراز کی جان چھوٹ جانی تھی۔ آنٹی سرفراز سے ناراضگی ظاہر کررہی تھی کہ شاید اس کا سرفراز سے دل بھر گیا ہے اور اس نے اپنی تنہائیوں کا ساتھی کسی اور کو بنالیا ہے ایسی عورتیں ایسا ہی کرتی ہیں ایسا ہوجانا سرفراز کے لیے اچھا شگون تھا کہ اس کی آنٹی سے جان چھوٹ جائے گی۔

یہ اتفاق ہی ہے کہ اس دن ملاقات ہونے کے بعد پھر میری سرفراز سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میرا اس کے پیٹرول پمپ پر جانا ہی نہیں ہوسکا ورنہ عموماً ہفتے میں میری اس سے دو تین بار ملاقاتیں ہوجاتی تھیں وہ اتوار کا دن تھا میری آفس کی چھٹی تھی۔ سرفراز بھی اتوار کو چھٹی پر ہوتا تھا۔ میں اس سے ملاقات کرنے کی غرض سے گھر سے نکلا۔ سرفراز کے مکان کے باہر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا سب سے پہلا خیال میرے دل میں جو آیا تھا وہ یہی تھا کہ آنٹی اور سرفراز کو محلے والوں نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ اب اس کی خیر نہیں ہے دل میں آیا کہ پلٹ جاؤں مگر تجسس کے سبب ایسا نہ کرسکا اور میرے قدم بے اختیار آگے بڑھتے ہی چلے گئے۔ سرفراز کے مکان کے دروازے سے خون باہر کی طرف آرہا تھا خون دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''خدا خیر کرے۔''

مکان میں گھستے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سرفراز خون میں لت پت تھا کسی نے اس پر خنجر سے وار کیا تھا وہ اپنے پیٹ سے بہتے خون کو روکنے کی غرض سے اپنے ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑے ہوئے تھا۔

''سرفراز یہ...... یہ کس نے تم پر حملہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آنٹی...... م...... میرے دو لاکھ روپے لے گئی ہے۔'' وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اس نے پوری بات مجھے نہیں بتائی تھی لیکن اس کے ایک جملے سے میں پوری بات سمجھ گیا تھا۔ آنٹی نے سرفراز کی تنہائیاں دور کرنے کی پوری قیمت وصول کرلی تھی ایمبولینس کی آواز بتارہی تھی کہ ایمبولینس آگئی ہے وہاں موجود لوگوں میں سے کسی نے ایمبولینس کے لیے کال کردی تھی اسی لیے ایمبولینس آگئی تھی سرفراز زخموں کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوچکا تھا۔ ایمبولینس میں اسے ڈال کر فوری اسپتال لے جایا گیا ایمرجنسی وارڈ میں بروقت طبی امداد ملنے سے سرفراز کی جان بچ گئی مگر اسے کئی دن اسپتال میں زیر علاج رہنا پڑا۔

سرفراز مجھ سے نظریں نہیں ملا پارہا تھا۔ وہ بہت شرمندہ تھا میری باتیں اس کی سمجھ میں اس حادثے کے بعد آگئی تھیں سرفراز نے مجھے یہ بھی بتادیا تھا کہ آنٹی کو اس کی کمیٹی کے بارے میں پتا چل گیا تھا اور وہ اس سے پوری کمیٹی ادھار مانگ رہی تھی سرفراز نے پہلے اس بات کو مذاق سمجھا اور کہہ دیا کہ ہاں کمیٹی لے لینا اور جب اس نے کمیٹی لینے کا بھرپور تقاضہ کیا تو سرفراز نے سمجھایا کہ کمیٹی ابھی کھلی نہیں ہے اور اگر کمیٹی کھل بھی گئی تو اپنے والدین کو دے گا تاکہ اس کی بہنوں کی شادی کے کھانے پینے اور دیگر اخراجات کے کام آسکے۔

اس پر آنٹی ناراض ہوگئی اور دھمکیاں دینے لگی کہ اگر اس نے کمیٹی نہیں دی تو اچھا نہیں ہوگا۔ سرفراز آنٹی کی باتوں کو مذاق میں ٹالتا رہا اور آنٹی کو جیسے ہی یہ خبر ملی کہ کمیٹی سرفراز کو مل گئی ہے وہ اس سے رقم لینے پہنچ گئی۔ اس کے ساتھ دو خوف ناک صورت کے نوجوان بھی تھے۔ سرفراز کے رقم دینے سے انکار پر دونوں نے مل کر اسے تشدد کا نشانہ بنایا اس دوران آنٹی نے مکان میں مختلف جگہوں پر رقم ڈھونڈتی رہی رقم مل جانے پر آنٹی نے دونوں نوجوانوں کو

چلنے کو کہا وہ جیسے ہی باہر جانے کو لپکے سرفراز بھی ان کے پیچھے دوڑا۔ ایک نوجوان نے اسے اپنے پیچھے آتا دیکھ کر خنجر کے کئی وار کر کے شدید زخمی کر دیا زخمی سرفراز زمین پر گر کر تڑپنے لگا تھا اس کے جسم سے ابلتا خون زمین کو رنگین کرتا ہوا دروازے سے باہر جانے لگا تھا۔ اس خون کو دیکھ کر ہی محلے کے لوگ چونکے تھے اور مکان میں گھس آئے۔ سرفراز کو زخمی حالت میں دیکھ کر فوری ایمبولینس کو کال کر کے بلوا لیا گیا تھا۔

آنٹی جس مکان میں رہتی تھیں وہ کرائے کا تھا۔ اس واقعے کے فوری بعد انہوں نے مکان خالی کر دیا تھا اس لیے ان کی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی تھی سرفراز کے والدین کو اس کی بہنوں کی شادی کی تاریخ بھی آگے بڑھانی پڑ گئی تھی پولیس کو سرفراز نے آنٹی کی تصویر بھی دے دی تھی یہ اتفاق ہی تھا کہ اس کے موبائل میں تصویر محفوظ تھی اس تصویر سے پولیس کو بہت فائدہ پہنچا اور آنٹی ماہ لقا کو پولیس نے ایک ریسٹورنٹ سے گرفتار کر لیا۔ وہ اپنے نئے شکار کے ساتھ ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے آئی تھی۔ آنٹی کے نئے مکان سے پانچ لاکھ روپے بھی برآمد ہوئے تھے جو تفتیش کے دوران آنٹی نے انکشاف کیا کہ وہ سرفراز جیسے لوگوں کو دوست بنا کر لوٹتی رہی ہے ان کا پانچ افراد پر مشتمل ایک گروہ تھا جو باہر سے آئے ہوئے نوجوانوں پر نظر رکھتا تھا اور جن کے بارے میں پوری معلومات اکٹھی ہو جاتی تھی آنٹی ایک ڈرامہ کرتی تھی وہ بھاگتے ہوئے راستے میں اس شخص سے ٹکرا جاتی تھی اور اسے بتاتی کہ غنڈے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اس شخص کے پیدل ہونے پر اس کے ساتھی بھاگ جاتے تھے اگر وہ شخص گاڑی پر ہوتا تو آنٹی اس کی موٹر سائیکل یا کار میں سوار ہو جاتی اس کے ساتھی ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کو کچھ دور تک پیدل دوڑتے اور پھر گاڑی دور ہونے پر واپس چلے جاتے تھے۔

سرفراز کا نصیب اچھا تھا کہ آنٹی پکڑی گئی تھی وہ بھی اپنی غلطی کے سبب کیونکہ ان کے طریقہ واردات میں یہ بات بھی شامل تھی کہ کوئی بھی واردات کرنے کے بعد وہ ایک یا دو ماہ کے لیے روپوش ہو جاتے تھے اس بار پرویز نامی نوجوان سے اس کی نئی نئی دوستی ہوئی تھی اور اس نے اپنی سالگرہ کے دن آنٹی کو ریسٹورنٹ میں بلا لیا تھا اس نے بہت کوشش کی کہ وہ پرویز کی دعوت کو ٹال دے مگر اس کی ضد اور آئندہ نہ ملنے کی دھمکی کام دکھا گئی اور وہ ملنے پہنچ گئی اور اس وقت ایس ایچ او کاظم اپنے ساتھوں اے ایس آئی ندیم پولیس کانسٹیبل صادق کے ساتھ کھانا کھانے آئے تھے جیسے ہی ان کی آنٹی پر نظر پڑی تو وہ بری طرح چونکے اپنی جیب سے تصویر نکال کر دیکھا تصویر اور آنٹی میں کوئی فرق نہیں تھا اس لیے ایس ایچ او نے آنٹی کو گرفتار کرنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی اور گرفتار کر کے تھانے لے گیا اور تھانے میں آنٹی نے تشدد کے خوف سے سب کچھ سچ سچ اگل دیا۔ اس کی نشاندہی پر اس کے ساتھیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔

سرفراز اس واقعے کے بعد بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ اور اس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ اب کسی عورت کے چکر میں نہیں پڑے گا اب وہ ہر کام کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ سرفراز خوش نصیب ہے کہ دو لاکھ روپے کی رقم مل چکی ہے ورنہ گئی رقم کہاں ملتی ہے اور وہ کمیٹی اس نے جس مقصد کے لیے ڈالی تھی اس میں کام آ گئی ہے۔ دو سال گزرنے پر سرفراز کی بھی اس کی کزن سے شادی ہو چکی ہے وہ اب اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہے۔

❀

روشن اندھیرے

مہتاب خان

وہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا' موت دھیرے دھیرے اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے موت کی اندھیری سرنگ میں گرنے والا ہے' ایسے میں ایک فرشتہ چراغ بن کر اس کی اندھیری دنیا میں داخل ہوا۔

ایک نوجوان کی سرگزشت' کینسر نے اس کی زندگی کو موت کی دہلیز پر لاکھڑا کیا تھا

ڈاکٹر شفیق اور پروفیسر حامد کی دوستی برسوں پر محیط تھی۔ ان کی یہ دوستی اسکول کے زمانے سے شروع ہوئی تھی کالج پہنچ کر دونوں کے راستے جدا ہوگئے تھے۔ ڈاکٹر شفیق سائنس کے شعبے میں آگئے تھے۔ جب کہ حامد صاحب کی دل چسپی کا میدان الگ تھا۔ بہرحال برسوں گزرنے کے باوجود ان کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر وقتاً فوقتاً ملتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر شفیق کا شمار شہر کے انتہائی ایمان دار' محنتی اور قابل ڈاکٹروں میں ہوتا تھا۔ وہ گورنمنٹ اسپتال میں خدمات انجام دینے کے بعد حال ہی میں ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا عامر جو پڑھنے کے لیے ملک سے باہر کیا گیا کہ گھر واپس آنے کا راستہ ہی بھول گیا۔ وہ آسٹریلیا پڑھنے گیا تھا اور ایک سال بعد اپنی کلاس فیلو سے شادی کرکے وہیں رہ گیا تھا۔

ڈاکٹر شفیق کی بیوی بیٹے کی جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کرسکیں۔ پانچ سال انہوں نے بیٹے کا انتظار کیا تھا وہ بہت بیمار رہنے لگی تھی۔ بالآخر اسی بیماری میں ایک سال پہلے ان کی وفات ہوگئی۔ یوں ڈاکٹر شفیق تنہا رہ گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جو واجبات انہیں ملے تھے وہ انہوں نے بینک میں ڈپازٹ کروا دیے تھے اور گھر کے ایک حصے کو کلینک کی شکل دے دی تھی۔ یہاں وہ آس پاس رہنے والوں کا علاج کیا کرتے تھے اس سے انہیں معقول آمدنی ہوجاتی تھی جو ان کی گزر اوقات کے لیے کافی تھی۔ ڈاکٹر شفیق کافی عرصے سے حج پر جانے کے خواہش مند تھے۔ وہ دراصل اپنی بیوی کے ساتھ حج پر جانا چاہتے تھے مگر ان کی زندگی نے انہیں مہلت نہیں دی۔ خوش قسمتی سے اس سال حج قرعہ اندازی میں ان کا نام نکل آیا تھا اور اب وہ فریضہ حج ادا کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ انہوں نے یہ خوش خبری اپنے دیرینہ دوست پروفیسر حامد کو بھی فون پر سنا دی تھی۔ پروفیسر صاحب نے انہیں مبارک باد دی اور آج شام پروفیسر حامد کے گھر مل بیٹھنے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔

پروفیسر حامد کی فیملی بھی مختصر تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی عائشہ اور چھوٹی آمنہ۔ عائشہ کی شادی پروفیسر صاحب نے اس کی تعلیم مکمل ہوتے ہی کردی تھی۔ عائشہ کے شوہر کی پوسٹنگ آج کل کوئٹہ میں تھی۔ وہ کوئٹہ میں رہائش پذیر تھی۔ جب کہ چھوٹی بیٹی آمنہ انٹرمیڈیٹ میں تھی اور ابھی پڑھ رہی تھی۔ پروفیسر حامد کی بیوی درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھیں اور ایک مقامی کالج میں لیکچرار تھیں۔ پروفیسر حامد کا گلشن اقبال میں ایک کافی بڑا دو منزلہ

گھر تھا اوپر کا پورشن پروفیسر صاحب نے کرائے پر اٹھا دیا تھا جب کہ نیچے والے پورشن میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔

آج مطلع صبح سے ابر آلود تھا۔ ڈاکٹر شفیق پروفیسر صاحب کے گھر پہنچے تو ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ انہوں نے گاڑی گیٹ کے قریب پارک کی اور بیل بجائی کچھ دیر بعد گیٹ پروفیسر صاحب کی بیوی نے کھولا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے بتایا کہ پروفیسر صاحب اوپر کے پورشن میں ہیں وہیں چلے جائیں۔

''بھابھی اوپر تو کرائے دار رہتے ہیں۔''

''آپ کو شاید علم نہیں ہے ایک مہینے پہلے کرائے دار گھر خالی کر گئے ہیں۔''

''اوہ اچھا!'' کہتے ہوئے وہ اوپر چلے گئے۔ اوپر پورے گھر میں اندھیرا اور ویرانی تھی صرف ایک کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ اسی کمرے کی سمت بڑھ گئے۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کمرہ خالی تھا۔ دائیں طرف ایک بیڈ پڑا تھا اور بائیں جانب ایک میز کے گرد کچھ کرسیاں رکھی تھیں۔ بیڈ کے سامنے ایک چھوٹا صوفہ رکھا تھا اور صوفے کے اوپر دیوار میں ایک بک شیلف لگا ہوا تھا جس پر چند کتابیں رکھی تھیں باقی شیلف خالی تھے۔

ڈاکٹر شفیق کرسی پر جا بیٹھے کہ اچانک انہیں باتھ روم میں پانی گرنے کی آواز آئی۔ غالباً پروفیسر صاحب اندر تھے اور کچھ دیر بعد وہ باہر نکلے اور انہیں دیکھ کر چونک گئے۔

''تم کب آئے یار اور اتنی خاموشی سے آئے کہ پتا ہی نہیں چلا؟''

''چند منٹ پہلے ہی آیا ہوں۔'' ڈاکٹر شفیق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں میری تو بڑی خواہش تھی کہ ہم ساتھ ہی چلتے مگر خیر آپ کا بلاوہ پہلے آ گیا۔ دیکھیں ہم پر کب نظر کرم ہوتی ہے؟''

''اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ انشاء اللہ تم بھی جاؤ گے۔''

وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں پروفیسر صاحب کی بیوی چائے کی ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ وہ بھی ان کے ساتھ آ بیٹھیں۔ ابھی ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک بادل زور سے گرجے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر شفیق نے جو کھڑکی کے باہر تیز بارش برستے دیکھی تو اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

''یار مجھے اب اجازت دو میں چلتا ہوں ورنہ گھر پہنچنا دوبھر ہو جائے گا۔ کراچی کی سڑکوں کا حال تو تمہیں پتہ ہے کہ بارش کے بعد کیسا ہوتا ہے۔''

''تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ ڈاکٹر اتنی تیز بارش میں تو میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گا۔ کیوں بیگم؟'' انہوں نے اپنی بیوی کی طرف تائیدی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی صاحب۔ آج آپ

یہیں ٹھہر جائیں۔"
ان دونوں کے اصرار پر وہ یہاں ٹھہرنے پر نیم رضامند ہوگئے تھے۔
"تم چاہو تو اس کمرے میں سو جانا ورنہ نیچے بھی انتظام ہوسکتا ہے۔"
"میرا خیال ہے یہیں ٹھیک ہے۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔
"آپ لوگ بیٹھیں میں کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔" کہتی ہوئی پروفیسر صاحب کی بیوی چلی گئیں۔
"یہ بتاؤ یار کہ تمہارے کرایہ دار کیوں چلے گئے وہ لوگ تو کافی عرصے سے یہاں رہ رہے تھے؟"
"کیا بتاؤں یار ان بے چاروں کے ساتھ تو بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے۔ ان کا ایک ہی جوان بیٹا ہے اسے معدے کا کینسر ہوگیا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے بیٹے کا بے حد علاج کروایا۔ بے چارے احمد صاحب نے پیسہ پانی کی طرح بہایا اور اپنی بساط کے مطابق اچھے سے اچھے اسپتال اور اچھے سے اچھا ڈاکٹروں سے علاج کروایا مگر اس کی بیماری دور نہیں ہوئی۔ سنا تھا کہ ڈاکٹروں نے اس کا آپریشن تجویز کیا ہے۔ اب پتا نہیں اس کا آپریشن ہوا یا نہیں کیوں کہ وہ لوگ یہاں سے اپنے کسی عزیز کے گھر شفٹ ہوگئے ہیں۔" پروفیسر صاحب نے افسردہ لہجے میں بتایا۔
"اوہ!" ڈاکٹر شفیق نے پرتاسف لہجے میں کہا۔
کمرے کی فضاء کچھ دیر کے لیے سوگوار ہوگئی۔ پروفیسر صاحب نے اس سوگواری کو کم کرنے کے لیے کہا۔
"چلو یار نیچے چلتے ہیں اور ٹی وی دیکھتے ہیں۔ دیکھیں کہ بارش نے شہر میں کیا تباہی مچائی ہے۔"
ڈاکٹر شفیق نے کھڑکی کے پار دیکھا بارش اسی تیزی سے جاری تھی۔ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھے۔ ٹی وی پر شہر کی سڑکوں کے مناظر دکھائے جا رہے تھے جو اب تالاب کا منظر پیش کر رہی تھیں۔
"کب اس شہر کی قسمت بدلے گی۔ ملک کا سب سے بڑا شہر ہے یہ اور اتنا ناقص نظام۔" پروفیسر صاحب بولے تھے کہ پروفیسر کی بیٹی آمنہ آئی اور ڈاکٹر شفیق کو سلام کرنے کے بعد بولی۔
"ابو کھانا تیار ہے۔ امی آپ لوگوں کو کھانے پر بلا رہی ہیں۔"
کھانا کھانے کے بعد اور پروفیسر صاحب سے کچھ دیر گپ شپ کے بعد وہ سونے کے لیے اسی کمرے میں آگئے جہاں کچھ دیر پہلے بیٹھے تھے۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹے کروٹیں بدلتے رہے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی وہ ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ آخر وہ اٹھ بیٹھے اور بک شیلف کا جائزہ لینے لگے جہاں چند کتابیں رکھی تھیں۔ یہ کسی کی ٹیکسٹ بکس تھیں قریب ہی کچھ نوٹس بھی رکھے تھے۔ شاید یہ اسی لڑکے کی کتابیں تھیں جو اس کمرے میں مقیم تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب واپس شیلف میں رکھ رہے تھے کہ ان کی نظر کتابوں کے پیچھے چھپا کر رکھی ہوئی براؤن جلد والی ایک ڈائری پر پڑی۔
وہ ڈائری ڈاکٹر شفیق نے اٹھائی اور بستر پر آ کر نیم دراز ہوگئے۔ اسے آہستہ سے کھولا۔
پہلے صفحے پر لکھا تھا۔ تیمور خان اور تاریخ لکھی تھی 19 مارچ 2010 اس کے بعد آٹھ دس صفحے خالی تھے۔ پھر ایک صفحے پر لکھا تھا۔
"آج یونیورسٹی میں میرا پہلا دن تھا کلاس میں پورا دن پڑھائی کم اور انٹروڈکشن زیادہ ہوتا رہا۔ بہت مزا آیا۔ آج کا دن بہت اچھا گزرا۔ سہ پہر کو گھر آنے کے بعد میں دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ کرکٹ مجھے بہت پسند ہے۔ لیکن آج کرکٹ کھیلنے کے بعد مجھے بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ جسم میں بہت درد ہے۔ امی کا کہنا ہے کہ میں کھانا ٹھیک سے نہیں کھاتا وہ زبردستی مجھے کچھ نہ کچھ کھلانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔"
انہوں نے چند صفحے پلٹے۔ پھر ڈائری پڑھنا شروع کی۔ تیمور نے لکھا تھا۔
"گرمیاں شروع ہوگئی ہیں۔ کرکٹ کھیلنا ہی کم ہوگیا ہے۔ گھر میں بہت بوریت ہوتی ہے۔ کل رات جب ہم

کھانا کھا رہے تھے تو ابو نے کہا کہ میرے ایگزام کے بعد کہیں گھومنے پھرنے کا پروگرام بنائیں گے۔ مجھے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ جی چاہتا ہے کہ پوری دنیا کا چکر لگاؤں۔ کل سے میرا گلا خراب ہے بخار بھی ہے۔ ڈاکٹر بتارہے تھی کہ گلے میں انفیکشن کی وجہ سے بخار ہوا ہے۔ لائٹ گئی ہوئی ہے۔ جنریٹر کی آواز سے میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔'' اگلے چند صفحات پر روزمرہ کی باتیں لکھی تھیں پھر ایک صفحہ پر لکھا تھا۔

''آج یونیورسٹی میں بہت مزا آیا۔ کلاس میں ہمارا گروپ بن گیا ہے۔ ہمارے گروپ میں اریبہ، شرجیل، وقار، یمنیٰ اور میں شامل ہیں۔ گروپ کی سب ممبر خوش اخلاق اور ہنس مکھ ہیں ایک یمنیٰ کے علاوہ جو نہ جانے خود کو کیا سمجھتی ہے۔ بہرحال آج تو ہم نے خوب انجوائے کیا۔ آج شرجیل کی برتھ ڈے تھی۔ اس نے کیفے ٹیریا میں ہمیں ٹریٹ دی تھی۔ ہمارے گروپ میں وقار کی آواز سب سے اچھی ہے اور اسے گانے کا بہت شوق بھی ہے۔ ہم دیر تک اس سے گانے سنتے رہے اسی وجہ سے گھر بھی دیر سے پہنچا۔ امی میرا انتظار کر رہی تھیں وہ بہت پریشان لگ رہی تھیں نہ جانے وہ کیوں اتنی جلدی فکرمند ہو جاتی ہیں۔ کیا ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی میری امی ہیں۔''

تقریباً ایک ماہ بعد کی تاریخ میں تیمور نے لکھا تھا۔

''شکر ہے آج میری طبیعت کچھ بہتر ہے۔ پرسوں رات کو بخار ہو گیا تھا مگر شکر ہے کہ دوا کے بغیر ہی ٹھیک ہو گیا۔ لیکن گلا ابھی تک خراب ہے دراصل میں نے رات آئس کریم کھالی تھی۔ امی سے مجھے خوب ڈانٹ پڑی امی ابو نے کھٹی اور ٹھنڈی چیزوں پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ گلے کی وجہ سے مجھے کھٹی چیزیں کھانے کو نہیں دی جاتیں۔ آج کاشف بھی آیا تھا اور شکایت کر رہا تھا میں دوستوں سے ملنے بھی نہیں جاتا اور نہ ان لوگوں کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا ہوں۔ میرا کرکٹ کھیلنے کو دل نہیں چاہتا بہت زیادہ تھکن ہو جاتی ہے۔'' کوئی پندرہ دن بعد تیمور نے لکھا تھا۔

''نزلے زکام کی دوائیاں کھا کھا کر میرا برا حال ہو گیا ہے۔ دوائیاں کھا کھا کر میں تھک چکا ہوں۔ امی دوا لے کر آتی ہیں تو ان سے بھی جھگڑ پڑتا ہوں بعد میں مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ اتنی محبت کرنے والی ماں کا دل دکھا دیا۔ آج کل میں نے گھر سے نکلنا تقریباً چھوڑ دیا ہے صرف یونیورسٹی جاتا ہوں وہاں بھی پڑھائی میں میرا دل نہیں لگتا۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہوتی جا رہی ہے۔ ابو میری طرف سے بڑے فکرمند ہیں کل کہہ رہے تھے کہ تیمور کو کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔'' اگلے صفحے پر اس نے لکھا تھا۔

''آج یونیورسٹی جانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لیے میں نے چھٹی کر لی اور ڈائری لکھ رہا ہوں۔ ابو روز کہتے ہیں کہ ڈاکٹر کے پاس لے کر چلیں گے مگر شام میں وہ آفس سے اس قدر تھکے ہوئے آتے ہیں کہ بات کل پر ٹل جاتی ہے۔ ابو ایک پرائیویٹ فرم میں آئی ٹی آفیسر ہیں اور اس وجہ سے ان پر کام کا بہت بوجھ ہوتا ہے۔ میں جلد ہی کمپیوٹر سائنس کی ڈگری لے کر ابو کا سہارا بننا چاہتا ہوں۔ اس عمر میں ان پر کام کا اتنا بوجھ اچھا نہیں لگتا یہ ان کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ میں جلد سے جلد ان کا سہارا بننا چاہتا ہوں۔'' اس کے بعد کچھ صفحوں پر عام سی باتیں تھیں۔ دو ہفتے کی بعد کی تاریخ میں درج تھا۔

''آج یمنیٰ کی وجہ سے ہم سب کا موڈ آف ہو گیا۔ دراصل سر حسن رضا نے ہمارے گروپ کو ایک presentation بنانے کے لیے دی تھی۔ گروپ کا ہر ممبر کافی محنت کر رہا تھا سوائے یمنیٰ کے نہ جانے وہ خود کا کیا سمجھتی ہے اسے اپنے حسن پر ناز ہے یا اپنی دولت پر۔ حد ہوتی ہے خود پسندی اور مغروری کی مجھے تو آج اس پر بہت غصہ آیا۔ ہمارا بی ایس کمپیوٹر سائنس کا پہلا سمسٹر اختتام پزیر ہے اور کچھ ہی دنوں میں ایگزامز شروع ہونے والے ہیں۔ ایک تو ایگزامز کی ٹینشن پھر یمنیٰ کی وجہ سے presentation بھی تیار نہیں ہوئی۔''

''میرے سر میں شدید درد ہونے لگا۔ گھر پہنچا تو کھانا کھانے کو بھی دل نہیں چاہا۔ میں نے امی سے کہہ دیا کہ کھانا نہیں نکالیں مجھے بھوک بالکل نہیں ہے وہ مجھے دیکھ کر وہ فکرمند ہو گئیں۔ امی کچھ دیر مجھ سے سر کھپاتی رہیں پھر

میرے لیے بادام کا حلوہ تیار کر کے لے آئیں۔ ان کا خیال ہے کہ مجھے دماغی طاقت کی ضرورت ہے۔ حلوا کھانے کا میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا بس میں تو اس وقت لمبی تان کر سونا چاہتا ہوں۔'' ڈاکٹر شفیق نے ڈائری کا صفحہ پلٹا لکھا تھا۔

''آج کا دن بہت برا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ابو نے مجھے ڈانٹا ہے اتنا خفا ہوئے ہیں۔ غلطی میری ہے امتحانات سر پر ہیں اور میں یونیورسٹی سے چھٹیاں کر رہا ہوں۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ یونیورسٹی جانے کو میرا بالکل دل نہیں چاہتا کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ ابو کے ڈانٹنے پر مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ امی دروازہ کھولنے کے لیے کہتی رہیں لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ آخر کافی دیر بعد میں نے دروازہ کھولا۔ امی رونے لگی تھیں انہوں نے ابو سے کہا۔

''تیمور ایسا نہیں تھا آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیں لیکن آپ کو تو فرصت ہی نہیں ہے۔''

''ابو نے کہا۔ ''یہ بالکل ٹھیک ہے تمہارے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔''

''بہرحال رات تک ابو کا غصہ اتر چکا تھا۔ رات دیر تک وہ مجھے سمجھاتے رہے مجھ سے باتیں کرتے رہے کہ تعلیم کتنی ضروری ہے اور مجھے کامیاب دیکھنا ان کی دلی خواہش ہے۔ میں انشاء اللہ ان کی اس خواہش کو ضرور پورا کروں گا۔ میں ان دونوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے سوچا ہے کہ اب دل لگا کر پڑھوں گا اور ان کے سارے خوابوں کو پورا کروں گا۔''

''کل رات ابو مجھے ایک بڑے اسپتال لے کر گئے تھے۔ یہاں کے ڈاکٹر طاہر شہر کے ایک بڑے ڈاکٹر ہیں۔ ان کی فیس بھی کچھ زیادہ ہے۔ انہوں نے کافی دیر میرا معائنہ کیا پھر کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے اور دوائیاں لکھ کر دیں۔ آہ...... پھر سے وہی کڑوی کسیلی بے مزہ دوائیاں میرا ابھی سے دل خراب ہو رہا ہے۔ آج کل کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہتا۔ دوستوں کے پاس جاتا ہوں تو ایک طرف بیٹھا رہتا ہوں وہ کرکٹ کھیل رہے ہوتے ہیں لیکن میں ان کے بارہا کہنے کے باوجود کھیل میں شامل نہیں ہوتا۔ کاشف کہہ رہا تھا

''تم تو اتنا اچھا کھیلتے ہو اور کرکٹ کے دیوانے ہو کیوں نہیں کھیلتے؟'' چند دن بعد کی تاریخ میں لکھا تھا۔

''امتحانات میں بری طرح مصروف ہوں۔ باہر کی ساری سرگرمیاں میں نے بند کر دی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ پرچے اچھے جا رہے ہیں۔ میں نے دن رات محنت کر کے کلاس کی پڑھائی کو کور کر لیا ہے۔ اس میں میرے کلاس فیلوز نے بہت کا پریٹ کیا ہے اور تو اور اس نک چڑھی یمنیٰ نے بھی میری بہت مدد کی۔ یونیورسٹی کی لائبریری میں اس نے گھنٹوں سر کھپا کر مجھے پڑھایا ہے وہ زبان کی تیز سہی دل کی اچھی ہے۔ اب اس سے میری پکی دوستی ہو گئی ہے۔''

''ایگزامز کے بعد ابو نے باہر آؤٹنگ کا پروگرام بنایا ہے کھانا بھی ہم باہر کھائیں گے مزہ آئے گا۔ میں نے آج کل ڈاکٹر کی دوائیاں چھوڑی ہوئی ہیں جب سے دوا چھوڑی ہے طبیعت بہت ہلکی محسوس ہو رہی ہے۔ امی کو پتا نہیں ہے کہ میں دوا نہیں لے رہا ورنہ وہ بہت ناراض ہوں گی۔''

18 جنوری 2011ء کی تاریخ میں لکھا تھا۔

''ہم کل آؤٹنگ پر گئے تھے۔ کھانے سے پہلے ہی مجھے اپنی طبیعت ٹھیک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ گھر پہنچتے ہی مجھے الٹی ہو گئی۔ سب گھبرا گئے ابو نے جیسے ہی مجھے سہارا دیا تو چونک گئے اور بولے۔

''تیمور تمہیں تو تیز بخار ہے۔''

''ہم رات گیارہ بجے ڈاکٹر کے پاس گئے انہوں نے انجکشن لگایا۔ اس سے بخار کچھ کم ہو گیا تھا۔ لیکن سارا جسم دکھ رہا تھا۔ امی ابو بہت پریشان ہیں میری کیفیت دیکھ کر پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ بخار تو پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا۔ کل خالہ جان بھی آئی تھیں وہ ابو کو مشورہ دے رہی تھیں کہ تیمور کا لگ کر علاج کروائیں۔ اس کے منہ پر سوجن لگ رہی ہے اور رنگ بھی زرد پڑ گیا ہے۔ ابو نے کہا کل تیمور کی رپورٹس آئیں گی پھر ڈاکٹر طاہر علاج شروع کریں گے۔'' اگلے

صفحے پر تیمور نے لکھا تھا۔

"آج میں امی اور ابو کے ساتھ ڈاکٹر طاہر کے پاس گیا تھا۔ میری ٹیسٹ کی رپورٹس دیکھ کر انہوں نے دوبارہ میرا چیک اپ کیا پھر مجھے اور امی کو باہر بھیج دیا وہ اکیلے میں ابو سے کچھ بات کرنا چاہتے تھے۔ ابو باہر آئے تو ان کا چہرا اترا ہوا تھا۔ وہ کچھ گم صم سے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ خراب ہے۔ انہوں نے مجھے کھل کر کچھ نہیں بتایا بس اتنا کہا کہ تمہارے کچھ اور ارجنٹ ٹیسٹ لکھ کر دیئے ہیں۔ ان کی رپورٹس آج ہی ڈاکٹر دیکھیں گے۔ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ میرے کچھ مزید ٹیسٹ ہوئے۔ ہم نے کوئی تین چار گھنٹے اسپتال میں گزارے۔ ان کی رپورٹس لے کر ہم دوبارہ ڈاکٹر طاہر کے پاس گئے وہاں دو تین ڈاکٹرز اور بھی بیٹھے تھے ان سب نے میری رپورٹس دیکھیں۔ پھر مجھے اور امی کو باہر انتظار کرنے کا کہا اور ابو سے اکیلے میں کوئی بات کی۔ مجھے تیز بخار تھا اور بار بار پیاس محسوس ہو رہی تھی۔"

"ابو باہر آئے اور مجھ سے کچھ فاصلے پر امی کو بلایا اور دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔ ایک دو فقرے میرے کانوں میں پڑے۔ ابو کہہ رہے تھے۔

"ہر تکلیف کا علاج ہے۔ اللہ شفاء دینے والا ہے۔"

امی کا رنگ ہلدی ہو گیا تھا۔ وہ بار بار ابو سے پوچھ رہی تھیں کہ ڈاکٹروں نے کیا بتایا ہے تیمور کو کیا بیماری ہے۔ ابو انہیں بس گول مول سا جواب دیتے رہے تھے۔ ابو کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ شاید وہ امی کے سوالات سے پریشان ہو گئے تھے۔ ڈائری میں کوئی آٹھ دس دن بعد کی تاریخ میں لکھا تھا۔

"میرے سامنے کوئی نہیں روتا لیکن امی کی سرخ آنکھیں دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ وہ آج کل بہت رو رہی ہیں۔ خالہ جان بھی اپنی فیملی کے ساتھ آئی تھیں اور بہت افسردہ لگ رہی تھیں۔ کوئی مجھ سے کھل کر بات نہیں کرتا۔ میں آج کل ڈائری کو ساتھ لے آیا ہوں۔ یہ ایک پرائیویٹ اسپتال ہے۔ کافی مہنگا ہے ابو کا بہت خرچہ ہو رہا ہے۔ کل رات ابو میرے پاس ٹھہرے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تیمور صحت، بیماری، دکھ اور سکھ سب اللہ کی طرف سے آتے ہیں۔ کبھی کبھی اللہ ہمیں آزماتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرض بعد میں آتا ہے اللہ اس کا علاج پہلے بھیجتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بیٹا ہمت نہ ہارنا۔"

میں نے ہمت کر کے ان سے پوچھا۔

"ابو مجھے کیا بیماری ہے ابو، پلیز مجھے سب سچ سچ بتا دیں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟"

"بیٹا اب کوئی بیماری لاعلاج نہیں رہی ہے۔"

"مجھے...... کینسر ہے کیا؟"

"اب یہ لاعلاج نہیں ہے۔ تم انشاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ڈاکٹر بہت پرامید ہیں۔ تم پہلے کی طرح یونیورسٹی جاؤ گے۔ دوستوں کے ساتھ گھومو گے اور کرکٹ بھی کھیلو گے۔ بس شرط یہ ہے کہ دوا ٹائم پر کھانی ہے اور جو پرہیز ڈاکٹر بتائیں گے وہ کرنا ہے۔ بس کچھ عرصے میں تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"میں بہت سوچتا رہا کہ ابو سے اپنی بیماری کی تفصیل پوچھوں۔ ان سے پوچھوں کہ اگر مجھے کینسر ہے تو یہ کس طرح کا کینسر ہے اور کس اسٹیج پر ہے لیکن ہمت نہیں پڑی۔" ایک ہفتے بعد تیمور نے لکھا تھا۔

"اسپتال میں داخل ہوئے آج چودہ پندرہ دن ہو گئے ہیں۔ آج کا دن میرے لیے بڑا دکھی دن تھا۔ ابو موبائل فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ کسی کو شاید میری تکلیف کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کا فقرہ میرے کانوں میں پڑا۔"

"ہاں جی معدے میں کینسر ہے۔ ابھی ابتداء کی اسٹیج ہے پھیلا نہیں ہے جی بہت سخت علاج ہو رہا ہے۔"

"یہ سب سن کر میں بہت اداس ہو گیا۔ مجھے لگا کہ بس میں کچھ ہی دنوں میں مرنے والا ہوں۔ میرا دل امی اور ابو کے بارے میں سوچ کر دکھنے لگا کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو وہ کیا کریں گے۔ وہ دونوں تو ایک پل بھی میرے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"مجھے یہ سوچ کر رونا آ گیا اور میں کروٹ بدل کر

لیٹ گیا اور چہرہ چھپا کر دیر تک روتا رہا۔ ابو اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کے واپس آنے سے پہلے میں نے اپنی آنکھیں اچھی طرح صاف کرلیں تاکہ انہیں پتا نہیں چلے کہ میں رو رہا ہوں۔ وہ تو پہلے ہی میرے لیے بہت پریشان ہیں۔ مجھے پتا ہے امی کی طرح ابو بھی چھپ چھپ کر روتے ہیں۔ شاید اسی طرح چھپ کر جیسے آج میں رو دیا ہوں۔ میں اب نہیں روؤں گا اور بہادری سے اس بیماری کا سامنا کروں گا۔" ڈاکٹر شفیق نے صفحہ پلٹا لکھا تھا۔

"آج کافی دنوں بعد ڈائری لکھ رہا ہوں۔ اس دوران میں دوبارہ اسپتال میں ایڈمٹ ہو چکا ہوں۔ آج کل میری کیموتھراپی ہو رہی ہے۔ یہ بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے میرے بال جھڑ چکے ہیں اور حد سے زیادہ کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ ہر ہفتے ہزاروں کا خرچہ ہوتا ہے۔ ابو مجھ پر بے دریغ پیسے خرچ کررہے ہیں۔ اس اسپتال کے چارجز بھی بہت زیادہ ہیں کہ چھوٹے سے چھوٹے کام کا بھاری معاوضہ لیتے ہیں۔ ابو نے جاب کے ساتھ ساتھ شام میں ایک کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ میں ٹیوشن دینی شروع کردی ہے۔ وہ بہت زیادہ تھکے ہوئے گھر آتے ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں وہ برسوں کے بوڑھے نظر آنے لگے ہیں۔ امی گھر بڑے سلیقے سے چلا رہی ہیں۔ پرسوں میں نے امی کو ابو سے بات کرتے سنا تھا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میرے کچھ زیور ہیں انہیں فروخت کردیں۔ جیسے بھی ہو تیمور کا علاج کروائیں۔"

"ابو انہیں تسلی دے رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے باس بھی بہت تعاون کررہے ہیں۔ سب کی ایک ہی خواہش ہے کہ میں جلد سے جلد ٹھیک ہو جاؤں۔"

"آج یونیورسٹی کے دوست مجھ سے ملنے گھر آئے تھے۔ میں اسپتال سے کیموتھراپی کروا کر آیا تھا۔ جب کیموتھراپی کرواکر آتا ہوں تو دو تین دن تو میں بستر سے اٹھ بھی نہیں پاتا۔ اس لیے میں بہت نڈھال تھا۔ یمنیٰ بھی ان کے ساتھ آئی تھی۔ بتا رہی تھی کہ اس کا کزن امریکا میں رہتا ہے اور وہ وہیں پلا بڑھا ہے اسے بھی معدے کا کینسر تھا اس کا دو سال علاج ہوا اور وہ اب بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ بیماری لاعلاج نہیں ہے۔ امی بازار سے کچھ لینے گئی ہوئی ہیں۔ میں گھر میں اکیلا ہوں اور ڈائری لکھ رہا ہوں۔ میں اپنی ڈائری کو چھپا کر رکھتا ہوں۔"

"پتا نہیں میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ جب طبیعت کچھ بحال ہوتی ہے دوبارہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ کل رات کا کھانا کھا کر میری طبیعت خراب ہوگئی میں واش روم میں گیا تو الٹی ہوگئی۔ اس میں بہت سا خون تھا۔ میں بہت گھبرا گیا لیکن باہر آکر میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ دونوں میری طبیعت کی بحالی پر بہت خوش ہیں اور میں ان کی خوشی کو برباد نہیں کرنا چاہتا۔

مگر امی میرا چہرہ دیکھ کر چونک گئی۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھیں کہ "کیا بات ہے۔" میں نے ان کو کچھ نہیں بتایا۔ اپنی پریشانی اور تکلیف کو چھپا کر چہرے پر مسکراہٹ لانا کتنا مشکل ہوتا ہے اس کا اندازہ مجھے آج ہوا ہے۔"

ڈاکٹر شفیق نے صفحہ پلٹا وہ انتہائی انہماک اور دکھ کے احساس سے یہ ڈائری پڑھ رہے تھے۔

"آج بڑا مشکل دن تھا۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے جسم میں جان ہی نہیں رہی۔ پوری رات میری بڑی بے چینی سے کٹی تھی۔ صبح ابو پھر مجھے اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر طاہر نے پھر کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے۔ دو دن بعد ہم ٹیسٹ کی رپورٹ لے کر گئے تو ڈاکٹر صاحب نے میرا چیک اپ کیا پھر باہر انتظار کرنے کو کہا۔ میں تو باہر چلا گیا لیکن دروازے کے پاس ہی ٹھہرا رہا۔ ڈاکٹر ابو کو بتا رہے تھے کہ رپورٹس ٹھیک نہیں آئی ہیں۔ تیمور کا آپریشن ضروری ہو گیا ہے۔ آپریشن کے بعد کیموتھراپی کا ایک کورس اور ہوگا پھر انشاء اللہ آپ کا بیٹا ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن آپریشن خاصا مہنگا ہے۔ اس کا خرچہ اچھا خاصا ہوگا۔ انہوں نے جو خرچ ابو کو بتایا تھا اسے تو سن کر میں حد سے زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔ ہم کبھی بھی یہ خرچ برداشت نہیں کرسکتے اور ہمارے پاس بچا بھی کیا ہے۔ پہلے ہی اس بیماری کے علاج پر ہماری تمام جمع پونجی لگ چکی ہے۔

"کچھ دیر بعد ابو باہر آئے تو ان کے ماتھے پر پسینے کی

چمک تھی۔ وہ بہت افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ان پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ گھر میں سوگ کی سی کیفیت طاری ہے امی ابو چپکے چپکے نہ جانے کیا باتیں کرتے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ بڑے بوجھل دل کے ساتھ ڈائری لکھ رہا ہوں پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

''ہمارے گھر میں سب آج کل اسی موضوع پر بات کر رہے ہیں۔ رات خالو جان بھی آئے تھے بہت افسردہ لگ رہے تھے انہوں نے ابو کو مشورہ دیا کہ تیمور کو کسی سرکاری اسپتال میں دکھاتے ہیں۔ وہاں آپریشن پر زیادہ خرچہ نہیں ہوگا۔ ابو نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تھا۔''

''سرکاری اسپتالوں میں پہلے ہی ویٹنگ پر لاتعداد مریض موجود ہیں۔ نہ جانے تیمور کا نمبر کب آئے گا اور اس کے پاس شاید اتنا وقت نہیں ہے ڈاکٹر طاہر نے فوری طور پر آپریشن کا کہا ہے۔ وہ پرامید ہیں کہ آپریشن کے بعد تیمور ٹھیک ہو جائے گا۔''

''یہ ایک بڑی مصیبت ہے جو ہم سب پر آئی ہوئی ہے۔'' ابو دن رات میرے آپریشن کے لیے پیسے اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ خالو نے ابو کو مشورہ دیا ہے کہ ہم ان کے گھر شفٹ ہو جائیں کرائے کے اس گھر کو خالی کر دیں ان کا گھر کافی کشادہ ہے۔''

''مجھ سے امی اور ابو کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔ کہتے ہیں کہ ہر اندھیرے کے بعد روشنی ہوتی ہے مگر میری زندگی کا یہ اندھیرا تو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا کہیں سے امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ابو تو جیسے تھک چکے ہیں ٹوٹ چکے ہیں۔ ان سے میری تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ اس خوفناک بیماری کے پنجوں سے مجھے چھڑا کر کہیں دور لے جائے۔ اللہ کرے کوئی راستہ نکل آئے۔ یہ بہت برے دن ہیں۔ آج تو ڈائری لکھنے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن میرا دل آج بہت بھرا ہوا تھا سوچا ڈائری لکھ کر کچھ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

یہ اس ڈائری کی آخری تحریر تھی۔ اس کے بعد ڈائری کے صفحے خالی تھے۔

ڈاکٹر شفیق نے بھاری دل کے ساتھ ڈائری بند کی اور آنکھیں موند لیں۔ اس ڈائری کا ایک ایک لفظ درد و کرب کی ایک داستان تھا۔ وہ یہ درد اب اپنے دل میں محسوس کر رہے تھے۔ وہ اپنے دل میں کچھ ٹھان چکے تھے۔

صبح ان کی آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا وہ نیچے آئے تو پروفیسر حامد نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

''اٹھ گئے! میں دو بار تم سے ناشتے کا پوچھنے گیا تھا لیکن تم بے خبر سوئے ہوئے تھے میں نے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔''

''ہاں یار رات کافی دیر سے سویا تھا۔''

''بیگم ہمارے لیے ناشتہ یہیں لے آؤ۔'' انہوں نے کچن میں کام کرتی اپنی بیوی کو آواز دی۔

''میں نے بھی ابھی تک ناشتہ نہیں کیا سوچا تھا تمہارے ساتھ ہی کروں گا۔''

ناشتے کے دوران ڈاکٹر شفیق نے پروفیسر صاحب سے پوچھا۔

''تمہارے کرائے دار آج کل کہاں رہ رہے ہیں؟''

''خیریت تو ہے تمہیں کیا کام ہے ان سے؟''

''مجھے اس بیمار لڑکے تیمور سے ملنا ہے اور جلدی ملنا ہے کسی طرح ان کا پتا چلاؤ۔''

''تمہیں تیمور کا نام کیسے پتا چلا تم تو کبھی اس سے نہیں ملے نہ ہی میں نے تمہیں بتایا تھا؟''

''اس کی کچھ کتابیں شیلف پر رکھی تھیں اس سے پتا چلا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی سوچا کہ کوئی کتاب پڑھ لوں اسی لیے ایک کتاب اٹھائی تو اس پر اس کا نام لکھا تھا۔''

''ہاں تیمور نے کہا تھا اس کی کچھ کتابیں رہ گئی ہیں بعد میں آ کر لے جاؤں گا۔'' پروفیسر صاحب نے بتایا۔

''احمد صاحب کا موبائل نمبر میرے پاس ہے ان سے ایڈریس معلوم کر لوں گا۔''

''ابھی بات کرو ہم آج ہی ان سے ملیں گے۔''

ناشتے کے بعد پروفیسر حامد نے احمد صاحب سے بات کی۔ حال احوال پوچھنے کے بعد ان کا ایڈریس ایک کاغذ پر

نوٹ کر کے ڈاکٹر شفیق کی طرف بڑھا دیا۔
انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔
''انہیں بتادو ہم سہ پہر تین بجے تک ان سے ملنے آرہے ہیں۔''
پروفیسر صاحب نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا بہر حال انہوں نے تیمور کے والد کو بتا دیا کہ وہ سہ پہر تین بجے ان سے ملنے آرہے ہیں۔'' فون بند کر کے وہ بولے۔
''ایسی کیا ایمرجنسی ہوگئی بھائی؟''
''بس یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔''
''کونسا کام؟''
''تمہیں بتاؤں گا انتظار کرو ذرا میں ایک فون کرلوں۔'' وہ کسی ڈاکٹر ہمدانی سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ گفتگو تیمور کی بیماری اور اس کے آپریشن کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ کچھ میڈیکل ٹرمز تھیں جو پروفیسر صاحب کی سمجھ میں نہیں آئیں۔
سہ پہر ٹھیک تین بجے وہ دونوں نارتھ ناظم آباد کے اس ایڈریس پر موجود تھے۔ جو احمد صاحب نے فون پر لکھوایا تھا۔ یہ تیمور کی خالہ کا گھر تھا۔ دروازہ تیمور کے والد احمد صاحب نے ہی کھولا تھا اور بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔ کچھ دیر وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے اتنی دیر میں چائے آگئی پھر تیمور کا ذکر آیا ساتھ ہی اس کی بیماری کا بھی۔
''اب تو چلنے پھرنے سے بھی قاصر ہے اور ابھی تک آپریشن کا بھی کوئی انتظام نہیں ہو سکا ہے۔''
ڈاکٹر شفیق کے کہنے پر وہ انہیں تیمور کے کمرے میں لے گئے۔ یہ کافی ہوادار اور کشادہ کمرہ تھا۔ بائیں طرف لگے ہوئے بیڈ پر تیمور لیٹا ہوا تھا۔ وہ نوجوان ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس بیماری نے اسے گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔
کچھ دیر ڈاکٹر شفیق تیمور سے باتیں کرتے رہے پھر احمد صاحب سے تیمور کی بیماری کی دیگر تفصیلات معلوم کر کے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر ہمدانی بہت سینئر ڈاکٹر ہیں اور دوران سروس وہ ان کے ساتھی ڈاکٹر رہے ہیں۔
''انہوں نے بتایا کہ شہر کے کچھ سینئر اور درد مند دل رکھنے والے ڈاکٹروں نے اپنا ایک پرائیویٹ اسپتال بنایا ہے جہاں کم خرچ پر بہترین علاج کیا جاتا ہے اور اب وہ تیمور کی طرف سے بے فکر ہو جائیں کیونکہ اب تمام علاج اور اس کے اخراجات وہ خود برداشت کریں گے۔''
ڈاکٹر شفیق نے دیکھا تیمور کی آنکھیں یہ سن کر چمکنے لگی تھیں۔ تیمور کے والد نے بڑھ کر ڈاکٹر شفیق کے ہاتھ تھام لیے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
''آپ ہمارے لیے فرشتہ بن کر آئے ہیں۔ ہم سب تو ہمت ہار چکے تھے۔ میرا یہ اکلوتا بیٹا ہے۔ جب تک یہ سانس لے رہا ہے ہماری سانسیں آرہی ہیں۔ یہی ہماری کل کائنات ہے۔ اگر اللہ نہ کرے اسے کچھ ہو گیا تو ہم بھی زندہ نہیں رہیں گے۔''
''اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ انشاء اللہ تیمور ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ان کو تسلی دے کر اور تیمور کی اب تک کی ساری رپورٹس لے کر گھر آگئے تھے پھر دوسرے دن وہ تمام رپورٹس لے کر ڈاکٹر ہمدانی کے پاس گئے اور تیمور کی بیماری کی تفصیلات وغیرہ بتائیں۔ اگلے دن انہوں نے تیمور کو چیک اپ کے لیے بلالیا۔ چیک اپ کے بعد انہوں نے بھی آپریشن کو ضروری قرار دے دیا اور اسی دن تیمور کو اسپتال میں ایڈمٹ کرلیا گیا۔ آپریشن کے اخراجات میں بھی انہوں نے نمایاں کمی کردی تھی۔ بہر حال تیمور اسپتال میں داخل تھا اور اس کے ضروری ٹیسٹ ہو رہے تھے اسے چار دن بعد آپریشن کی تاریخ دے دی گئی تھی۔
آپریشن والے دن ڈاکٹر شفیق اور پروفیسر حامد بھی اسپتال میں موجود تھے۔ تیمور کے والدین مصلیٰ بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔
تیمور کا آپریشن کامیاب رہا تھا۔ یہ کافی نوبل آپریشن تھا۔ اس کے معدے کے کینسر زدہ حصے کو نکال دیا گیا تھا۔ یہ ایک جدید سہولیات سے مزین اسپتال تھا۔ ڈاکٹرز بھی بہت تعاون کر رہے تھے۔ آپریشن کے بعد آٹھ دس دن تیمور کی ٹریٹمنٹ ہوتی رہی۔ ڈاکٹر ہمدانی ڈاکٹر شفیق کو بتا رہے تھے کہ آپریشن کا رزلٹ بہت اچھا ہے۔ بیماری

اب کنٹرول میں ہے۔ کیموتھراپی کے ایک کورس کے بعد تیمور انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے اپنی قوت ارادی سے بیماری کو پچھاڑ دیا ہے۔"

ڈاکٹر ہمدانی کی باتیں سن کر سب بہت خوش نظر آ رہے تھے اور تیمور کے والدین کو آپریشن کی کامیابی کی مبارک باد دے رہے تھے۔

جس دن تیمور کو اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا اس دن احمد صاحب کی خوشی دیدنی تھی۔ یہ دن ان کے لیے بہت اہم اور خوشی والا دن تھا۔ تیمور کی امی بار بار اس کا ماتھا چوم رہی تھی۔ کچھ عرصے تیمور کی کیموتھراپی ہوتی رہی جس کے نتیجے میں اس کے بال کافی ہلکے ہو گئے تھے۔ کیموتھراپی ختم ہونے کے بعد وہ آہستہ آہستہ تندرست ہوتا چلا گیا۔ گاہے بگاہے وہ ڈاکٹر شفیق سے ملنے آتا رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا

"انکل آپ میری زندگی میں آنے والے سب سے اہم شخص ہیں۔ آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں چکا سکتا۔"

اس دن پروفیسر حامد ڈاکٹر شفیق سے ملنے آئے تو کہا۔

"تم تیمور کے علاج کی وجہ سے حج پر نہیں جا سکے تمہیں اس کا افسوس نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے کیسے ان پیسوں کا انتظام کیا تھا۔ تم نے اپنی پوری جمع پونجی ایک ایسے شخص پر لگا دی جسے تم جانتے تک نہیں تھے۔ نہ اس سے تمہارا کوئی رشتہ تھا۔"

"بھائی میری حج کی نیت تو تھی اور بے پناہ خواہش بھی مگر خیر تم نے نہیں سنا کہ ایک انسان کی زندگی بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے۔ بس اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ میری اس چھوٹی سی کاوش کو قبول کر لے۔"

تیمور کی کیموتھراپی کا کورس پورا ہو چکا تھا اور اب تیمور کو معمول کی دوائیں دی جا رہی تھیں۔ اس کے بال بھی اگ آئے تھے اور چہرے پر سرخی بھی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر شفیق سے ملنے آیا تو وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

"اس نے بتایا کہ اس نے دوبارہ یونیورسٹی جوائن کر لی ہے اور اسے کبھی کبھی معمولی چیک اپ کے لیے اسپتال جانا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہمدانی اس کی پروگریس سے بہت مطمئن ہیں۔"

کوئی چھ ماہ گزرے تھے کہ اس دن ڈاکٹر شفیق اپنی کلینک میں ایک مریض کا معائنہ کر رہے تھے کہ ان کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف تیمور تھا۔ خوشی سے بھرپور چہکتی ہوئی آواز میں وہ کہہ رہا تھا۔

"انکل ایک سرپرائز ہے۔ میں اور ابو شام کو آپ کے گھر آ رہے ہیں۔"

"انکل میں ایگزامز میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا ہوں اور مجھے پارٹ ٹائم جاب بھی مل گئی ہے۔ ہم نے الگ گھر بھی لے لیا ہے۔" وہ خوشی سے بھرپور آواز میں بتا رہا تھا۔

"بھائی صاحب ہم نے تیمور کا رشتہ بھی اس کی خالہ زاد سے طے کر دیا ہے۔ کل ان کی منگنی ہے آپ کو اس سلسلہ میں دعوت دینے آ رہے ہیں۔ آپ کو ضرور آنا ہے۔" حامد صاحب نے اطلاع دی۔

"یہ ایک سرپرائز تو نہیں ہوا۔ یہ تو تین چار سرپرائز ہو گئے ایک ساتھ۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔"

انہوں نے اسے مبارک باد دی اور سینے سے لگا لیا۔

بکرا کہاں ہے

عنبرین اختر

اک ماں کی روداد، وہ اپنی بیٹی کی خوشیاں چاہتی تھی اس نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہر رشتہ ٹھکرا دیا تھا لیکن جب ایک آخری رشتہ آیا تو......

حقیقت سے آنکھیں چرانے والی ایک خاتون کا فسانہ

مرزا سائیکل کے ساتھ خود بھی جلدی سے صحن میں داخل ہوئے سائیکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر سائیکل کا اسٹینڈ ہی نہیں تھا۔ پھر سائیکل کو صحن کی دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ سائیکل کے ہینڈل میں اڑسا ہوا اخبار نکالا اور اس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر چلانے لگے۔

"بیگم بکرا، بیگم بکرا" سر جھٹک کر "بکرا بیگم بکرا بیگم کہاں ہو تم" دونوں ہاتھ اوپر کر کے دھمال کے انداز میں "بیگم بکرا، بکرا بیگم" چلانے لگے۔

اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا اس میں سے ایک بھاری بھرکم چھوٹے قد کی عورت برآمد ہوئی وہ بڑی تیزی سے مرزا کی جانب آئی مرزا نے اس کے تیور دیکھ کر گھبراہٹ کے عالم میں دونوں ہاتھ اوپر ہی روک لئے اس نے مرزا کو گھورتے ہوئے کہا

"کیا شور مچا رکھا ہے؟"

مرزا نے ہاتھ نیچے کرتے ہوئے کہا "اس عید پر ہم قربانی کریں گے"۔

"کوئی بانڈ لگ گیا ہے یا کوئی تگڑی مچھلی ہاتھ لگی ہے۔ ہمارے نصیبوں میں کہاں مرزا بکرا"۔ مرزا کی بیگم نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا

"میں تو ایک شریف کلرک ہوں درباروں پر بیٹھے ہوئے فقیر کی طرح جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی اور یہ بخشش اتنی نہیں ہوتی کہ اس سے قربانی کی جا سکے"۔ ایک موڑھے پر بیٹھتے ہوئے مرزا نے کہا

"لو جی سنو ایک کلرک اور قربانی تاریخ کلرکاں میں دیکھی نہ سنی"۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں اس دفعہ ہم ضرور قربانی کریں گے"۔

"کوئی بھائی دے رہا ہے تمہیں بکرا؟" مرزا کی بیگم نے چڑاتے ہوئے کہا

مرزا نے غصے سے کہا۔ "تم نے اس قابل ہی کب چھوڑا ہے۔ جو ہم سے چنگے تھے وہ ہمیں چھوڑ گئے۔ جو ہم سے ماڑے تھے انہیں ہم نے چھوڑ دیا اور جو سالے دیلے مشٹنڈے ہیں وہ اس قابل کہاں؟"

"خبردار جو میرے ویروں کو کچھ کہا۔ کیسے کرو گے قربانی تنخواہ میں تو بمشکل دال روٹی پوری ہوتی ہے۔ کیا اس دفعہ حکومت بکرے دے رہی ہے۔ ویسے وزارت مذہبی امور تم جیسے بکروں" سر جھٹکتے ہوئے "نہیں کلرکوں کا بھی سوچے۔ آخر قربانی بھی تو مذہبی فرائض میں شامل ہے"۔

مرزا نے اخبار کھول کر بیگم کو دکھاتے ہوئے کہا "دیکھو اخبار میں اشتہار آیا ہے۔ بکرے قسطوں پر حاصل کریں"۔

بیگم نے اٹھ کر کولر سے پانی کا گلاس بھرتے ہوئے کہا "فریج ٹی وی سائیکل کا تو سنا تھا قسطوں پر مل جاتی ہیں اب

بکرے بھی.....''

''تم دیکھتی رہ جاؤ گی اس پہلی تاریخ کو میں بکرا بک کروا دوں گا''۔

بیگم نے مرزا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا''لینا ہے تو ذرا موٹا تازہ بکرا لینا اپنے جیسا صرف چانپوں والا نہ اٹھا لانا اور میں نے اپنے ویروں کو قربانی پر ضرور بلانا ہے۔انہیں بکروں کی چانپیں کھلائے بہت دیر ہوگئی ہے ۔میری شادی پر ہی انہوں نے میرے پیکے سے چانپیں کھائی تھیں۔تمہارے پلے سے تو کبھی ہمت ہی نہیں پڑی''۔

''نہ بھئی نہ کم از کم تم جتنا نہ ہو، رج کر جائیں، آخر تمہارے ویلے مشٹنڈوں نے ڈرون اٹیک کرنا ہے''۔

مرزا کی بیگم نے گلاس سے مرزا کا نشانہ لیا اور گلاس مرزا کی جانب پھینکتے ہوئے کہا۔''ڈرون اٹیک سے بعد میں بچنا پہلے میرے میزائل سے تو بچ''۔

مرزا گلاس کے اٹیک سے بچتے ہوئے باہر نکل گئے۔

......☆☆☆......

مرزا نے صحن میں چارپائی پر بیٹھے ایک گول شیشے میں منہ دیکھتے ہوئے قینچی سے مونچھیں ٹھیک کرتے ہوئے اپنی چائے بناتی بیگم سے کہا''تمہارا نام بھی کسی نے کیا سوچ کر رکھا ہوگا زینت ہاہا''۔

مرزا کی بیگم نے چائے انڈیلتے ہوئے جواب دیا''اور خود تو جیسے شاہد کپور ہو مرزا خوش بخت نام رکھنے سے بندہ خوبصورت نہیں ہو جاتا مرزا!''۔

مرزا نے بدستور شیشے میں دیکھتے اور قینچی چلاتے ہوئے کہا''جس بیوٹی پارلر نے تمہیں تیار کیا تھا مجھے پتہ چلا کہ وہ رکشے بھی سجاتے تھے۔رخصتی کے وقت یوں لگ رہا تھا جیسے میں رکشہ بیاہ کر لے جا رہا ہوں''۔

مرزا کی بیگم نے چائے کا کپ مرزا کی جانب لاتے ہوئے ،مارنے کے انداز میں کہا۔''چائے پینی ہے یا آج پھر چائے سے نہانے کا ارادہ ہے''۔

اس سے قبل مرزا کوئی جواب دیتا سات عدد بچے دروازے سے ٹکرائے اور صحن میں داخل ہو گئے۔مرزا ان کو دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا مرزا کی بیگم ہاتھ میں چائے کا کپ اسی طرح پکڑے کھڑی رہی بچے ایک دائرے کی شکل میں مرزا اور اس کی بیگم کے گرد گھومنے لگے۔وہ خوب شور کر رہے ہیں۔بڑا لڑکا اپنے باپ کی طرف دیکھ کر ہاتھ اوپر کر کے نعرے کے انداز میں''ابا کی''

دوسرے بچے اسی طرح چکر میں بھاگتے ہوئے یک زبان ہو کر''جے''۔

مرزا ان کو روکنے کی کوشش میں ان کے ساتھ چکر کھاتے ان کی گنتی کرتے ہوئے کہا۔''اوئے دو کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟''۔

بڑا لڑکا آگے کھڑے ہو کر بھاگتے ہوئے بچوں کو روکتے

ہوئے" ایک بارات لوٹنے گئے ہیں آتے ہی ہوں گے"۔
مرزا تھک کر دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا "ایک تو اس کیبل نے بیڑا غرق کر دیا ہے۔ لوگوں کی اولاد خراب کر دی ہے"۔
دو بچے باہر سے بھاگے ہوئے دروازے سے ٹکرائے ایک ہاتھ پکڑے رو رہا تھا دوسرا اس کو چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مرزا ان کی جانب بھاگ کر جاتے ہوئے اس کے ساتھ والے لڑکے سے" جیلے کیا ہوا؟"۔
جیلے نے اپنے بھائی کے ہاتھ پر پھونک مارتے ہوئے کہا" ابا! طیفے کے ہاتھ میں بم چل گیا"۔
مرزا کی بیگم کے ہاتھ سے چائے کا کپ گر پڑا "ہائے دہشت گردوں نے میرا گھر دیکھ لیا۔ میرے معصوم پر بم چلا دیا، ہائے ظالموں تمہارا ککھ نہ رہے"۔
مرزا نے بیگم کو ڈانٹا" تو تو چپ کر (طیفے کا ہاتھ پکڑ کر جیلے سے) کیسے چلا بم؟"۔
جیلا بڑی تیزی سے نان اسٹاپ کہانی سنانے لگا طیفے نے غصے سے کہا" اوئے کہانی بعد میں سنا لینا پہلے فرسٹ ایڈ دودھ کا گلاس تو دے، بڑا دل گھبرا رہا ہے"۔
مرزا کی بیگم نے پانی کا گلاس بھرا اور طیفے کے ہونٹوں سے لگا دیا جسے وہ غٹا غٹ پینے لگا
"اماں یہ تو پانی ہے، پہلے ہی دل گھبرا رہا تھا اوپر سے تو نے پانی پلا دیا"۔
مرزا نے جیلے سے پوچھا" مگر بم طیفے کے ہاتھ میں کیسے پھٹا؟"
"ابا! وہ جج والے بڑے کنجوس تھے۔ وہ صرف باجا ہی بجائے جا رہے تھے نہ پیسے لٹا رہے تھے اور ویلیں بھی نہیں کروا رہے تھے۔ باجے والے بھی ان سے تنگ آ کر بس پیں پیں کر رہے تھے۔ بارات کے پاس ٹوٹل پانچ بم تھے۔ تین چل گئے۔ ایک ٹھس کر کے رہ گیا۔ ایک کو آگ لگی مگر وہ چل نہ سکا"۔
"پھر؟" مرزا کی بیگم نے بے چین ہو کر پوچھا
جیلے نے تھوڑا رک کر دوبارہ اسٹارٹ لیا" ابا! بھائی نے بھاگ کر وہ بم پکڑ لیا بارات کا دولہا بولا میں تمہیں دس روپے دوں گا اگر اس بم کو چلا دو۔ ہماری ٹور بن جائے گی۔ پھر بھائی نے اس بم کو دونوں ہاتھوں میں لے کر پھونکیں مارنی شروع کر دیں اور پھر وہ بم بھائی کے ہاتھوں میں چل گیا۔ دولہا نے ہمیں دس روپے بھی نہیں دیئے کہنے لگا میں تمہیں پولیس کو پکڑوا دوں گا باراتوں میں بم چلاتے ہو اور ہم ڈر کر بھاگ آئے"۔ جیلا خود بھی رونے لگا اس کورس میں طیفا بھی شامل تھا۔
"جو حجیں لوٹیں وہ مرزا کے بچے، جو لوگوں کے سر پھاڑ آئیں وہ مرزا کے بچے، جو سردیوں میں ننگے پھریں وہ مرزا کے بچے، جو چوتھے دن گم ہو جائیں وہ مرزا کے بچے"۔ مرزا نے جوتا اتار لیا اور پہلے ان کی باری آئی جو غور سے اپنے بھائی کی داستان بم سن رہے تھے۔
......☆☆☆......
مرزا کی بیگم صحن میں بنے ہوئے باورچی کھانے میں توے پر روٹی ڈال رہی تھی۔ بچے ناشتہ کرتے ہوئے شور کر رہے تھے۔ ایک چھوٹا بچہ اپنے دوسرے بھائی پر پلیٹ پھینکتے ہوئے اپنی ماں کی طرف دیکھ کر چلایا" اماں بھائی میرا انڈا کھا گیا"۔
مرزا کی بیگم نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے کہا" لڑائی جھگڑا بند کر دتمہارا ابا اٹھ گیا تو پھر انڈے کی جگہ ڈنڈے ملیں گے"۔
بڑا لڑکا خیلا لوفرانہ انداز میں" ایک تو اماں تو نے اس باپو کو بڑا سر پر چڑھا رکھا ہے۔ تیرا لحاظ کرتے ہیں ورنہ...... بات ادھوری چھوڑ دی۔
شور کی آواز سن کر کمرے میں سویا ہوا مرزا آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا" صبح ہی صبح کیا شور مچا رکھا ہے"۔ پانی کی کلی کرتے ہوئے بیگم سے" ایک چائے کا کپ دینا"۔
چھوٹے لڑکا مرزا سے شکایت کے انداز میں" ابا یہ میرا انڈا کھا گیا"۔
مرزا اس کو پچکارتے ہوئے" چل تھوڑی دیر انتظار کر لے مرغی اور دے دے گی تو نے کونسا دفتر جانا ہے"۔
خیلے نے مرغی کی ہسٹری بیان کرتے ہوئے کہا" ابا مرغی

نے چھ انڈے دیئے تھے وہ پورے ہو چکے ہیں۔ اب وہ چھ مہینے کڑک کے پورے کرے گی"۔

چھوٹا لڑکے نے روتے ہوئے کہا "اب میں چھ ماہ بعد انڈا کھاؤں گا"۔

"بھائیوں نے مرغی بھی دی تو چھ مہینے کڑک والی اس سے تو اچھا تھا نہ دیتے۔ کم از کم بچے تو نہ لڑتے اور سنو ایسی مرغی سنی تو تھی مگر دیکھی اب ہے۔ اب میرا بچہ چھ ماہ بعد انڈا کھائے گا"۔ بچے کو پچکارتے اور روٹی پکاتی بیگم کو چڑاتے ہوئے کہا

بیگم نے اٹھ کر مرزا کو چائے کا کپ پکڑایا اور کہا "تیرے بھائی تو ایک مرغی بھی نہ دے سکے"۔

"تجھے کھانے کے لئے ہر سال گندم بھی تو میرے بھائی دیتے ہیں"۔

"ہاں جس سال گندم کو سسری لگ جائے اس سال ضرور دیتے ہیں"۔

منجھلے نے لوفرانہ انداز میں مرزا سے کہا "ابا! تو ماموں کی شان میں کچھ زیادہ ہی گستاخی نہیں کر رہا"۔

مرزا منجھلے کو غصے سے دیکھتے ہوئے چائے کا کپ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا

"مجھے دفتر سے دیر ہو رہی ہے ورنہ تجھ سے آج میں مصطفےٰ قریشی ضرور نکال دیتا"۔

مرزا کمرے میں گھس گئے۔ بڑا لڑکا مرزا کا رکھا ہوا کپ اٹھا کر سڑل سڑل کی آواز کے ساتھ چائے پینے لگا۔ مرزا کمرے سے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے باہر آیا اور سیدھا سائیکل کے قریب گیا ایک چھوٹا تو تلا لڑکا بھاگ کے مرزا کے پاس گیا

"ابا! اماں تہہ لہی تھی تم بترا لا رہے ہو"۔

مرزا نے سائیکل کی ہوا ہاتھ سے چیک کرتے ہوئے کہا "ہاں لا رہا ہوں"۔

چھوٹے بیٹے نے خوشی سے کہا "ابا! محلے میں تھب تو بتا دوں"۔

مرزا نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا "ہاں تھب تو بتا "ابا! میں بترے نے تھاتھ تصیر بناؤں دا"۔

مرزا سائیکل کو سیدھا کرتے ہوئے کہا "اچھا"۔

چھوٹے بیٹے نے ایکشن کے ساتھ آگے پیچھے ہو کر کہا "تھ ابا بترا دودھوں میں تلاسن تو ف ہونا چاہئے پیچھے ہٹ ہٹ تے تتریں مارے"۔

مرزا نے ہنستے ہوئے پوچھا "تمہارا مطلب ہے سینگوں والا ہونا چاہیے"۔

چھوٹے بیٹے نے بازوؤں کو چوڑا کرتے ہوئے کہا "محلے میں پھر دہست بھی تو ہو دی"۔

مرزا نے سائیکل کو پکڑ کر دروازے سے باہر نکالتے ہوئے کہا "اچھا مجھے دفتر سے دیر ہو رہی ہے"۔

مرزا کی بیگم نے پیچھے سے آواز لگائی "ناشتہ تو کر جاتے"۔

مرزا نے بغیر رکے "دفتر میں ہی کر لوں گا صاحب کا کھانا آتا ہے"۔

مرزا کے باہر نکلتے ہی بچوں کی دھما چوکڑی عروج پر پہنچ گئی۔ وہ ایک دائرے میں گھومتے ہوئے کورس کی شکل میں گا رہے تھے۔

"بکرا آوے گا تے پھلاں نال دھرتی سجاواں گی چلاں گے پکھیاں اپنے بکرے توں پکھیاں، چلا گے پکھیاں"۔

......☆☆☆......

مرزا کو جیسے ہی تنخواہ ملی وہ قسطوں کا بکرا حاصل کرنے کے لئے اخبار میں شائع اشتہار کے پتے پر پہنچ گئے باہر سائن بورڈ پر دو بکرے ویٹ لفٹنگ کے انداز میں تھے وہ دفتر میں داخل ہو گئے ایک عجیب سے حلیے کا آدمی میز پر پاؤں پسارے آنکھیں بند کئے گا رہا تھا۔

"سہانی رات ڈھل چکی نہ جانے کب آؤ گے۔ ہوا بھی رت بدل چکی۔ نہ جانے کب آؤ گے۔ کب آؤ گے۔ کب آؤ گے"۔

مرزا نے بلند آواز سے کہا "میں آ گیا جناب"۔

اس نے مرزا کو دیکھ کر چھلانگ کے انداز میں پہلے کرسی

پر کھڑا ہوا پھر نیچے اترا۔
"آیئے جناب آیئے"۔
مرزا نے کرسی کی جانب اشارہ کیا "میں بیٹھ جاؤں"۔
منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ کرسیاں بندوں کے لئے ہیں، بکروں کے لئے نہیں۔ بیٹھیں جناب بیٹھیں"۔
کرسی پر بیٹھتے ہوئے مرزا نے منیجر سے ہاتھ ملایا۔
"آپ بولتے ہیں تو پتہ چلا آپ بندے ہیں۔ ویسے مرزا خوش بخت نام ہے میرا ایک سرکاری محکمے میں شریف کلرک ہوں"۔
منیجر ناک بھوں چڑھاتے، ایک البم کھولتے ہوئے کہا "یہ دیکھیں"۔
مرزا البم کو دیکھے بغیر رازداری سے "میں بکرے کے لئے حاضر ہوا ہوں رشتے کے لئے نہیں"۔
منیجر البم اس کے آگے کرتے ہوئے۔
بال کالے کرنے سے بندہ جوان نہیں ہو جاتا جناب آگے کی تیاری کریں"۔
"آگے کی تیاری کے لئے تو حاضر ہوا ہوں۔ قربانی کر کے ثواب سمیٹنا چاہتا ہوں کوئی ایسا بکرا دے دیں جو بس پار لگا دے"۔
مرزا البم کے صفحے پلٹنے۔
"بکرا ضرور پسند کریں مگر اپنی حیثیت کے مطابق"۔ منیجر نے کہا۔
منیجر اس کے ساتھ البم کی تصویریں دیکھتے ہوئے۔
"یہ بکرا کیسا رہے گا؟ منیجر نے مرزا کے چہرے کو گھورا۔
مرزا تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے۔
"اس بکرے کی تصویر بندر کے ساتھ کیوں ہے؟"
منیجر ایک اور تصویر دکھاتے ہوئے
"یہ کیسا رہے گا؟"
مرزا نے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا
"یہ تو بڑا عجیب سا ہے ٹیڑھے میڑھے سینگوں والا بڑا خطرناک دکھائی دیتا ہے"۔
درحقیقت یہ پہاڑی بکرا ہے۔ تم اس سے ڈر رہے ہو شادی شدہ ہو؟"
"سچ بتائیں بیوی سے بھی خطرناک ہے یہ بکرا؟ مرزا نے ذہن میں بیوی کی تصویر کو لاتے ہوئے کہا۔
"نہیں بیوی زیادہ خوفناک ہے"۔
منیجر نے ایک اور تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔
"یہ دیکھیں یہ میدانی بکرا ہے"۔
مرزا نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔
"اس کا ماتھا بڑا عجیب ہے۔ بالکل میرے سالے کی طرح اس نے ایک دفعہ ٹکر مار کر میرے ناک کی ہڈی توڑ دی تھی"۔
منیجر دوبارہ ایک تصویر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ دیکھیں، بالکل شریف ٹیڈی بکرا ہے اور سستا بھی ہے"۔
"یہ تو بیمار لگ رہی ہے۔ گوشت کتنا ہوگا اس میں"۔
"امید ہے سات آٹھ کلو تو نکل ہی آئے گا"۔
اتنا گوشت تو میری بیوی کھا جائے گی، میرے سالے کیا کھائیں گے"۔ مرزا نے اپنا حساب کتاب لگایا۔
منیجر نے البم کو بند کرتے ہوئے کہا۔
"آپ اصل میں بتائیں کتنے میں بکرا لینا چاہتے ہیں؟"
مرزا نے ڈرتے ہوئے رازداری کے ساتھ کہا۔
"پندرہ ہزار میں"
منیجر نے کرسی پر سیدھے ہوتے ہوئے کہا
"آپ کسی ویہڑی میں حصہ ڈال لیں۔ ہمارے پاس کم سے کم بکرے کی قیمت بیس ہزار ہے"۔
"اچھا بھائی کوئی پندرہ ہزار والا ایک بکرا کر دو"۔
منیجر نے ایک کلکولیٹر پر حساب لگاتے ہوئے کہا
"پندرہ ہزار والا بکرا آپ کو پچیس ہزار میں ملے گا اور پانچ ہزار ایڈوانس دینا ہوگا"۔
مرزا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکال کر منیجر کو پکڑاتے ہوئے کہا

''اس کی رسید دے دیں''۔
منیجر نے پیسے پکڑتے ہوئے کہا۔
''تم کلرک کے کلرک ہی رہے۔ نیک کام میں رسید کیسی۔ ہم لاکھوں روپے لگا کر یہ کام کر رہے ہیں۔ بدو ملہی میں یہ ہماری دو سو چالیسویں شاخ ہے''۔
''آپ کی دو سو چالیسویں شاخ کہیں میرا چالیسواں نہ کروا دے کوئی فراڈ نہ ہو جائے''۔ مرزا نے گھبراتے ہوئے کہا
منیجر نے مرزا کا ایڈوانس اس کو پکڑاتے، مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
''آپ ہم پر شک کر رہے ہیں۔ یہ اپنے پیسے لے لیں''۔
مرزا نے منیجر کا ہاتھ پکڑ لیا
''جناب آپ تو ناراض ہو گئے۔ اچھا چلیں ایڈوانس واپس نہ کریں۔ بکرے کی منہ دکھائی کب ہو گی''۔
''دسمپل آپ پرسوں دیکھ لیں ڈیلیوری اگر قسطیں بروقت ادا کر دیں تو عید کی رات ہو جائے گی۔ ورنہ پھر......''
مرزا، نے منیجر سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جی بالکل بالکل''۔

......☆☆☆......

مرزا کی بیگم صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھی محلے سے آئی تین خواتین سے محو گفتگو تھی ایک چھوٹا بچہ صرف اس لئے دروازہ میں بیٹھا تھا کہ اگر مرزا صاحب نظر آئیں تو وہ جلدی سے بتا دے۔
مرزا کی بیگم اپنے میکے کی بڑائی بیان کرتے ہوئے۔
''بہن کیا بتاؤں۔ گاؤں گئی تھی بھائی کہنے لگے اتنے اونچے گھرانے سے تمہارا تعلق تھا۔ جب سے مرزا کے ساتھ بیاہی گئی ہو ایک بار بھی تم نے قربانی نہیں کی۔ یہ گھر کے پلے ہوئے بارہ بکرے ہیں ان میں سے تمہیں جو دو پسند ہیں لے جاؤ۔ بس بہن آنسو نکل آئے۔ میں نے کہا نہیں بھائی بکرا نہیں لوں گی۔ مگر انہوں نے زبردستی دو بکرے دینے کی کوشش کی۔ ان کے بے حد اصرار پر میں نے ایک بکرا لے لیا...... اے بڑا موٹا تازہ سا''۔ ہاتھ سے سائز بتانے کی کوشش کی۔
ایک عورت نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔
''کہاں ہے بکرا؟
مرزا کی بیگم نے رازداری سے کہا۔
''میں ابھی نہیں لائی، تمہیں مرزا کے شریکے کا تو پتہ ہی ہے، کیسے لوگ ہیں بس اسی ڈر سے نہیں لائی، بھائیوں سے کہا ہے عید سے ایک دن پہلے پہنچا دینا''۔
دوسری عورت نے ہنستے ہوئے کہا۔
''اس کا مطلب ہے آپ کا بکرا عید و بکرا ہے''۔
''بہن ہمارے محلے دار بھی تو جلتے ہیں۔ ہمارے گھر میں جب فریج اور ٹی وی آیا تھا تو سارے محلے میں کھپ مچ گئی تھی۔ حالانکہ وہ بھی میرے بھائیوں نے دیا تھا۔ مرزا کے دفتر میں کسی چغل خور نے شکایت کر دی تھی کہ مرزا رشوت لیتا ہے''۔
''بہن زمانہ ہی ایسا ہے کسی پر اعتبار ہی نہیں رہا۔ عید پر بلانا ضرور بکرے کی چانپیں کھائے عرصہ ہو گیا ہے''۔ تیسری عورت نے اپنی خواہش ظاہر کی
''کیوں نہیں محلے داروں کا بھی تو حق ہوتا ہے۔ کہنے کو بکرا ہے مگر اونٹ ہے سمجھو''۔
دروازے میں بیٹھا ہوا لڑکا باہر کی طرف دیکھتا ہوا گھبرا جاتا ہے اور وہاں سے بھاگ کر اپنی ماں کی طرف آتا ہے۔ منہ پر انگلی رکھتے ہوئے۔
''اماں! ابا''۔
مرزا کی بیگم نے گھبراتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔
''بہن کیا بتاؤں مہنگائی اتنی زیادہ ہو گئی ہے۔ بندہ اب کھائے تو کیا کھائے۔ سبزی بھی اب دال سے مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ گوشت تو اب کیا کہنے۔ گوشت تو اب یا عید پر کھایا جا سکتا ہے یا کسی شادی بیاہ پر۔ کل میں نے ایک انڈا پکانے کے لئے گھی منگوایا انڈا پانچ روپے کا اور اس کے لیے گھی پچیس روپے کا۔ میرے خیال میں اب سا شے پیک

کے بعد ماشے پیک بھی بہت جلد مارکیٹ میں آجائے گا اور دکانوں پر آوازیں سنائی دیں گی۔ ایک ماشے پیک گھی دینا ساتھ ایک تولہ چینی بھی دے دینا"۔

......☆☆☆......

"سنا ہے مرزا، بکرا لے رہے ہو؟"

مرزا کے ہمسائے مرزا کا بکرا دیکھنے کے خواہش مند تھے جنہیں بڑی مشکل سے مرزا باتوں میں لگا کر ٹال رہا تھا ۔مرزا کی بیگم گھر پر نہیں تھی اور اس کی آمد کی پیشگی اطلاع کے لئے مرزا نے اپنے توتلے بیٹے کو باہر دروازے میں بٹھا رکھا تھا۔

مرزا حیرانی سے "تمہیں کس نے بتایا؟"

"مرزا پورے محلے میں تمہارے بکرے کا شور ہے اور تم پوچھ رہے ہو ہمیں کس نے بتایا"۔ دوسرے ہمسائے نے بھی مرزا کی معلومات میں اضافہ کیا۔ مرزا نے دروازے میں بیٹھے ہوئے لڑکے سے کہا۔

"طیلے، اپنی اماں سے کہو تین کپ چائے بنا دے"۔

"ابا اماں تو بازار گئی ہے"۔

مرزا نے دونوں ہمسایوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"بھئی چائے کے لئے انتظار کرنا پڑے گا"۔

ایک ہمسائے نے مسکراتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں چائے کے پیسے دے دینا ہم ہوٹل سے پی لیں گے تم بکرے کا سناؤ"۔

مرزا نے چارپائی پر سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا سناؤں بکرے کی کہانی، گاؤں گیا تھا بھائی کہنے لگے مرزا جب سے بیاہے گئے ہو۔ تم نے کبھی عید پر قربانی نہیں کی۔ ایک وہ بھی دور تھا جب ہمارے گھر میں اکٹھی سات قربانیاں ہوتی تھیں۔ اس بات پر میرا دل بھر آیا اماں، ابا یاد آگئے۔ اس پر بھائی نے کہا مرزا ہم تمہارے بھائی ہیں۔ ان بکروں میں سے جو تمہیں پسند ہیں تین لے لو۔ ہم چاہتے ہیں عید کے تینوں دن تمہارے گھر قربانی ہو"۔

ایک ہمسائے نے سر ہلاتے ہوئے کہا

"واہ بھئی واہ بھائی ہوں تو ایسے"۔

مرزا نے ان کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنے بھائیوں سے کہا میرے گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ مگر وہ میری بات نہ مانے۔ پھر ان کے بے حد اصرار پر میں نے ایک بکرا لینے کی ہامی بھر لی"۔

ایک ہمسائے نے خیالوں میں گوشت کا مزہ لیتے ہوئے کہا

"مرزا، ہمیں عید پر ضرور بلانا"۔

"ہاں کیوں نہیں ضرور بلاؤں گا۔ کہنے کو بکرا ہے مگر گوشت شاید دیہاڑی سے بھی زیادہ نکلے"۔

ایک ہمسائے نے کان لگا کر بکرے کی آواز سننے کی کوشش کی

"بکرے کی آواز نہیں آرہی۔ بکرا ہے کہاں؟"

مرزا نے رازداری سے کہا۔

"تمہیں تو میرے سالوں کا تو پتہ ہے۔ اگر انہیں پتہ چلا کہ مرزا قربانی کر رہا ہے تو انہوں نے میرے گھر میں ڈیرے ڈال دینے ہیں۔ پھر میں کہاں بکروں اور سالوں کے لئے چارے کا بندوبست کرتا پھروں گا۔ بس اسی لئے بکرا عید پر لاؤں گا"۔

دروازے میں بیٹھا ہوئے طیلے پہلے باہر کی طرف دیکھا اور پھر دوڑ کر مرزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"ابا، اماں"۔

مرزا گھبرا کر موضوع بدلنے کی کوشش میں بولا۔

"نہ جانے سیاست دان اس ملک کا کیا حال کریں گے۔ کل ٹی وی کے ایک پروگرام میں ایک خاتون وزیر نے چینی بیس روپے کلو بتائی۔ ایک وزیر خاتون کا کہنا تھا کہ اس نے گھر کا سودا سلف کبھی خود نہیں خریدا۔ وہ لوگ جنہوں نے آگے جا کر ہمارے مسائل کو ہائی لائٹ کرنا ہے۔ وہ عام آدمی کی تکلیف سے واقف ہی نہیں وہ اس درد کا علاج کیا کریں گے۔ غربت کو ختم کرنے کے دعوے کئے جا رہے ہیں۔ جب غریب ہی ختم ہو جائیں گے۔ غربت خود بہ خود ختم ہو جائے گی"۔

......☆☆☆......

دفتر سے واپسی پر مرزا نے سوچا کہ بکرے کی ڈیلیوری تو عید پر ہی ہونی ہے چلو آج اس بکرے کا سیمپل ہی دیکھ لیں کچھ دل کو تسلی ہو جائے کچھ بکرے کے ساتھ ایک تصویر بھی لے لوں گا محلے میں ٹور ہی بن جائے گی بچے الگ خوش ہو کر محلے میں مشہوری کریں گے۔ مرزا نے سائیکل دفتر کی دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور اندر داخل ہو گیا۔ دفتر کا منظر پہلے سے الگ نہیں تھا وہی منیجر ٹانگیں پسارے لیٹا تھا۔

"السلام علیکم"۔ مرزا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

منیجر کی نظریں ایک البم پر تھیں بغیر سلام کا جواب دیئے اس نے کہا۔"جی"۔

"جی میں مرزا ہوں، مرزا خوش بخت"

"تو پھر"۔ منیجر نے بغیر نظریں اٹھائے کہا۔

مرزا نے گھبراتے ہوئے کہا"میں مرزا خوش بخت ہوں مجھے نہیں پہچانا"۔

منیجر نے البم ایک طرف رکھتے ہوئے کہا"جی نہیں"۔

مرزا نے گھبرا کر دوکان میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا

"یہ بکروں کے قسطوں کی دوکان نہیں۔"

"تم نے مجھے سائیکل کو پنکچر لگاتے دیکھ لیا ہے، میں منیجر ہوں۔"

"جناب میں نے ایک بکرا بک کروایا تھا"۔

میں کونسا ڈاک رجسٹریاں بک کر رہا ہوں ہم نے تو بکروں کے ہزاروں آرڈر بک کئے ہیں آپ نے کب بک کروایا تھا۔؟

مرزا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنا شروع ہو گئیں۔

"جناب ایک ہفتے پہلے، آج تو منہ دکھائی کے لئے بلایا تھا"۔

"تو پھر آپ نے میرا منہ دیکھ لیا"۔

مرزا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔"میں بکرے کی بات کر رہا ہوں"۔

منیجر نے ایک رجسٹر کھولا اس پر انگلی پھیرتے ہوئے ایک نام پر رک گیا۔

"مرزا خوش بخت بیگ تیلی محلہ"۔

مرزا سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا

"آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا نام تو ٹھیک ہے، محلہ درست کریں تیلی محلہ جیسے ماچس کی تیلی"۔

"جناب ڈریں گے تو آپ عید کے دن"۔ منیجر نے مسکراتے ہوئے کہا

"کیا مطلب؟"

منیجر نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا

"سینگوں والے بکرے سے تو ڈرنا ہی چاہئے نا تم نہ ڈرنا سارے محلے کو ڈرانا"۔

مرزا نے سکون کی سانس لی"آج بکرے منہ دکھائی تھی"۔

منیجر نے اٹھتے ہوئے کہا"کیوں نہیں آؤ میرے ساتھ"۔

منیجر مرزا کو ساتھ لئے ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں بہت سے بکرے موجود تھے اور ایک ملازم بکروں کو چارہ ڈال رہا تھا۔

"یہ ہمارے فارم ہاؤس کے سیمپل بکرے ہیں اصل سپلائی عید سے ایک دن پہلے آئے گی"۔

مرزا نے ایک بکرے کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا

"میرا بکرا تو اس جیسا خوبصورت ہونا چاہیے۔ موٹا تازہ بھینسے جیسا۔ سنا ہے بکروں میں دو دندے چوگے اور چھگے بھی ہوتے ہیں"۔

منیجر ملازم سے"مرزا صاحب کو دو ندا بکرا دکھاؤ"۔

ملازم نے ایک بکرے کو پکڑا اور اس کا منہ کھولا۔

مرزا بکرے سے پرے ہٹتے ہوئے

"اس کے تو دانت بہت گندے ہیں"۔

"اس کے دانت گندے ہیں۔ اپنے دانت دکھاؤ ذرا"۔

مرزا نے خوشی سے اپنے دانت منہ کھول کر منیجر کو دکھایا ۔مرزا کے دانت دیکھ کر منیجر نے کہا

"تم سے تو بکرے کے دانت سفید ہیں"۔

مرزا شرمندگی سے ”دراصل میں سگریٹ پیتا ہوں“۔
”مگر ہمارا بکرا ایسا نشئی نہیں“۔

مرزا ہاتھ ملاتے ہوئے ”اچھا میں چلتا ہوں“۔
”مگر قسطیں ذرا یاد سے پہنچا دینا۔ تاکہ ہم وقت پر بکرا پہنچا سکیں“۔ منیجر نے مرزا کے ساتھ واپس آتے ہوئے کہا

......☆☆☆......

ان مہینوں میں مرزا کو عجیب سی بے چینی رہی مرزا بکرے کی قسطیں پوری ادا کر چکے تھے وہ بڑی احتیاط کے ساتھ ادا شدہ رقم کی رسیدیں ایک فائل میں لگا رہے تھے تاکہ بوقت ضرورت کام آسکیں عید میں ابھی چند دن باقی تھے اس کے باوجود مرزا نے بغدے اور چھریاں بھی تیز کروا لی تھیں تاکہ اگر قصائی وقت پر نہ مل سکے تو مرزا خود قربانی کر سکیں۔ مرزا نے قصائی بھی عید کے پہلے روز کے لئے بک کر لیا تھا بہت سے محلے داروں کو قربانی کے ختم کا بھی کہہ دیا تھا ایک دو محلے داروں نے مرزا کو قربانی کا گوشت بنانے کے لئے رضا کارانہ پیشکش کر دی تھی ابھی عید میں تین دن باقی تھے جب دروازہ زور زور سے پیٹا گیا مرزا نے سمجھا شاید بکرے کی ڈیلیوری پہنچ گئی ہے مگر دروازہ کھلنے پر مرزا کے دو ہٹے کٹے سالے دروازے میں کھڑے مرزا کو نظر انداز کر کے صحن میں کھڑی اپنی بہن کی طرف لپکے اور مرزا کے بچے ان کے ساتھ والہانہ انداز میں لپٹ گئے اور مرزا بس ان کو دیکھتا رہ گیا۔

......☆☆☆......

کل عید تھی شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے لیکن ابھی تک بکرے کی ڈیلیوری کا وعدہ پورا نہیں ہوا مرزا صاحب بے چینی سے صحن میں ٹہل رہے تھے بچے بکرے کی ضد کر کے اب باہر ہمسائیوں کے بکروں سے اپنا شوق پورا کر رہے تھے مرزا نے کچھ سوچا اور ایک پی سی او کا رخ کیا۔ پی سی او والے نے کہا۔ ”جی فرمائیے مرزا صاحب!“

مرزا نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی اور ایک نمبر پر انگلی رکھ کر پی سی او والے سے کہا ”یہ نمبر ملا دیں“۔
دوکان دار نے نمبر ملا کر ہینڈ سیٹ مرزا کے ہاتھ میں دے دیا۔ مرزا نے دوسری طرف کی آواز غور سے سن کر کہا۔
”جناب میں مرزا خوش بخت بول رہا ہوں“۔ دوسری جانب کی آواز کو غور سے سنتے ہوئے دوکاندار سے مخاطب ہو کر۔ ”آپ نے شاید ریلوے کا نمبر ملا دیا، گاڑیوں کی چھک چھک سنائی دے رہی ہے“۔
پی سی او والے نے ٹیلی فون سیٹ کو بغور دیکھتے ہوئے۔
”نہیں، جناب میں نے نمبر بالکل درست ملایا ہے“۔
مرزا نے فون کو دوبارہ کان کے ساتھ لگایا اور ریسیور دوکان دار کو تھما دیا ”یہ تو کٹ گیا“۔
پی سی او والے نے دوبارہ نمبر ملایا اور ہینڈ سیٹ مرزا کو پکڑا دیا۔ مرزا فون کو پکڑ کر زور سے چلاتے ہوئے۔
”منیجر صاحب! میں مرزا بول رہا ہوں۔ جی کیا کہا آپ کی دوکان کو تو تالا لگا ہوا ہے۔ آپ ہیں کہاں؟ جی کیا کہا ریلوے اسٹیشن پر وہاں کیا کر رہے ہیں؟ کل عید ہے اور آپ کا بکرا ابھی تک نہیں پہنچا۔ آپ کے بکرے پسنجر ٹرین سے تو نہیں آ رہے ایسا نہ ہو اگلی عید تک ہی پہنچیں“۔
مرزا نے فون پی سی او والے کو دے دیا کہ وہ سنیں پی سی او والے نے فون کان سے لگا کر مرزا سے کہا
”مرزا صاحب! فکر نہ کریں“۔
مرزا صاحب نے فون دکان دار سے چھین کر اپنے کان سے لگایا اور کہا۔
”فکر کیسے نہ کروں، قصائی کو کہہ دیا ہے۔ سارے محلے کو پتہ ہے مرزا قربانی کر رہا ہے اور جن کو نہیں بلانا تھا وہ سب سے پہلے پہنچ چکے ہیں“۔
دکان دار نے پوچھا۔ ”مرزا صاحب! کون پہنچ چکے ہیں“۔

”میرے سالے جناب، اگر آپ کا بکرا نہ پہنچا تو میری خیر نہیں۔ سالے میری چانپیں روسٹ کر کے کھا جائیں گے اور اس کام میں میری بیوی سب سے آگے ہو گی“۔
مرزا نے فون دوبارہ دکان دار کے کان کو لگا دیا دکان دار نے دوسری طرف کی پوری بات سن کر کہا ”مرزا صاحب! وہ کہہ رہے ہیں پہاڑی علاقوں سے بکروں کو لانا کس قدر

مشکل کام ہے۔اس سے ہم ہی واقف ہیں۔آپ فکر نہ کریں۔آپ کا بکرا پہنچ جائے گا۔

''فکر کیسے نہ کروں میں تو قسطیں بھی بروقت ادا کر دی تھیں اب دیر کس بات کی ہے؟''

مرزا نے دکان دار سے کہا۔''تمہیں ٹرین کی آواز تو آ رہی ہے۔''

دوکان دار نے دوسری طرف سے آنے والی آوازیں سن کر کہا''ٹرین کی آواز تو آ رہی ہے مگر بکروں کی میں میں اور بھے بھے سنائی نہیں دے رہی۔'' دکان دار نے دوسری طرف کی پھر آواز سنی''مرزا صاحب وہ کہہ رہے ہیں میں بکروں کی ڈیلیوری کے لیے اسٹیشن پر موجود ہوں۔ہماری ٹرین لیٹ ہے آپ تسلی سے گھر جائیں۔بکرا آپ کو رات پہنچ جائے گا''۔

مرزا نے جلدی سے فون پکڑا اور کہا''میں بھی اسٹیشن پر نہ آ جاؤں۔گھر کس منہ سے جاؤں گا؟''۔

لیکن دوسری طرف سے اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی مرزا صاحب نے پی سی او والے کو ہینڈ سیٹ پکڑاتے ہوئے کہا

''فون کٹ گیا شاید،''

پی سی او والے نے ہینڈ سیٹ پکڑتے ہوئے کہا

''کٹا نہیں،کاٹا گیا ہے''۔

......☆☆☆......

مرزا بکرے کو لے کر گھر میں داخل ہوئے۔صحن میں موجود مرزا کے سالے اور بچوں نے بچے بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔مرزا کے ایک سالے نے چارہ پکڑ کر بکرے کو کھلانا شروع کر دیا اور دوسرے نے اس پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔مرزا کے سالے نے بکرے کو چھوڑ کر خوشی سے مرزا کو اوپر اٹھا لیا۔مرزا کی بیوی بھی بڑی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔مرزا کی خوف سے چیخیں نکل رہی تھیں۔مرزا کی چیخوں کے ساتھ بکرے کی میں میں اور بھے بھے جاری تھی۔مرزا ان کی منتیں کر رہے تھے۔''ظالموں مجھے نیچے اتارو''۔اور وہ چلا رہے تھے۔''مجھے چھوڑ دو،مجھے چھوڑ دو۔''مگر وہ مرزا کو اوپر ہی اوپر کیے جا رہے تھے اور پھر انہوں نے اوپر سے مرزا کو پھینک دیا۔مرزا کی آنکھ کھل گئی۔

مرزا کے صحن میں بکرے کی میں میں اور بھے بھے جاری ہے۔وہ بھاگ کر صحن میں آتا ہے۔خوشی سے چیخ کر بولے۔

''بیگم بکرا،بکرا بیگم''۔

گھر کے کمروں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔سب سے پہلے سالے بھاگے ہوئے آئے۔ان سے پیچھے بچے اور ان سے پیچھے مرزا کی بیگم تھی۔بڑا سالا بڑے پیار سے مرزا کا منہ پکڑ کر

''جیجا!بکرا تے بڑا جا بر ماریا ای''۔

دوسرا سالا بکرے کو ٹٹولتے ہوئے''چانپوں کا مزہ تو اب آئے گا''مرزا سے''کیوں پا جی!''

''مرزا بکرا تو بڑا تگڑا ہے''۔مرزا کی بیگم نے بھی خوشی کا اظہار کیا

''بس تمہارے بھائی رج جائیں باقی ہم تو دال سے بھی روٹی کھا لیں گے''۔

''اتنے بھی میرے بھائی بھوکے نہیں وہ تو تم سے لاڈ کر رہے تھے''۔

بچوں نے بکرے کے گرد گھیرا تنگ کر دیا اور بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔

''اوئے یہ پہاڑی بکرا ہے شہری آداب سے واقف نہیں پرے ہٹ جاؤ کہیں سینگ نہ مار دے''۔مرزا نے خبردار کیا۔

طیفا نے بکرے کے آگے چارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ابا!یہ مسلسل بولے جا رہا ہے کچھ کھا ہی نہیں رہا''۔

مرزا نے بکرے کی گردن کو سہلاتے ہوئے کہا

''یہ لمبے پہاڑی سفر سے آیا ہے۔ریلوے کا تو چھوٹا سفر بھی بہت لمبا ہوتا ہے۔بندے تھک جاتے ہیں یہ تو بے چارہ پھر بے زبان ہے۔فریاد بھی نہیں کر سکتا''۔

بڑا سالا بالٹی پکڑتے ہوئے۔''جیجا!اسے نہلا نہ دوں تھکاوٹ دور ہو جائے گی''۔

''تھکاوٹ آرام کرنے سے دور ہوتی ہے۔نہلانے

سے اس کی چانپیں گیلی ہو جائیں گی پھر تمہیں چانپیں کھانے کا مزہ نہیں آئے گا۔"
دوسرا سالا بکرے کی ٹانگیں دباتے ہوئے۔
"پھر اس کی ٹانگیں دبا دیں"۔
بڑا سالا حیران ہوتے ہوئے "جیجا! بکرا چھوڑ کر کون گیا ہے"۔
"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا"۔
"جیجا جی! یہ بکرا ہے بڑا پیارا بالکل آپ جیسا لگتا ہے"۔
"یار مینیجر صاحب کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ انہوں نے میری امیدوں سے بڑھ کر ڈیلیوری دی ہے"۔
"ابا بکرے کے گلے میں ایک کاغذ لٹک رہا ہے شاید بکرے نے تعویذ پہنا ہے"
"خوبصورت بکرا ہے تعویذ تو پہنا ہی ہوگا" مرزا نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر وہ کاغذ پکڑ کر کھول لیا اس میں لکھا تھا۔ "مرزا صاحب ہمارا ورا کام دوسروں سے مختلف ہے ہم نے آپ کو پتہ بھی نہیں چلنے دیا اور مجھے امید ہے آپ اس وقت بکرے کو ٹٹول رہے ہوں گے"۔
"آپ کا شکریہ مینیجر صاحب!" مرزا نے کاغذ پڑھ کر خیالی شکریہ ادا کیا۔
جیلا بکرے کے آگے چارہ کرتے ہوئے "ابا! یہ چارہ کیوں نہیں کھا رہا؟"
"اسے لات میں چھلیاں نظر آئی ہونگی ابھی لئے نہ تھا لہا ہے اور ایسے بول رہا ہے"۔ چھوٹے تو تلے بیٹے نے بھی آنکھیں ملتے ہوئے وضاحت پیش کی۔
"ابا! اسے پھرانے کے لئے نہ لے جائیں محلے میں ذرا ٹیکا شیکا بن جائے گا"۔
"بیگم بکرے کو سنبھالو اور تم سب عید کی نماز کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں چاہتا ہوں اس عید پر قربانی کا سب سے پہلا ختم مرزا کے گھر ہو"۔ مرزا نے سب سے کہا
دونوں سالوں نے بکرے کو پکڑ لیا ایک نے ٹانگیں دبانا شروع کر دیں اور دوسرا اس کی کھال کو سہلانے لگا۔
جیجا جی! آپ نماز پڑھ آئیں۔ ہم بکرے کی خاطر سیوا کرلیں۔
مرزا نے دونوں سالوں کو گردن سے پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلا۔
"کیوں میرا عید کا ثواب بھی مرواؤ گے۔ چلو عید کی نماز کی تیاری کرو"۔

......☆☆☆......

مرزا کے صحن میں قصائی، مرزا کے سالے، چند محلے دار اور مرزا کے بچے جمع تھے۔ ان کے درمیان بکرے کی میں میں اور بھے بھے جاری تھی۔ قصائی بکرے کی طرف دیکھتے ہوئے۔
"مرزا بکرا تو چنگا مارا ہے"۔
"واہ جی واہ مزہ آ جائے گا"۔ ایک محلے دار نے منہ ہی منہ میں گوشت کا ذائقہ محسوس کیا
"ہمارے پا جی ایسا ہی سودا مارتے ہیں"۔ ایک سالے نے اپنے بہنوئی کی تعریف کی۔
"جیجا جی! بندے تو زیادہ نہیں بلا لئے"۔ دوسرے سالے نے اپنے تذبذب پن کا اظہار کیا۔
"بھئی جتنے مرضی بندے آ جائیں چانپیں تو تم ہی کھا کر جاؤ گے"۔ مرزا نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
قصائی نے مرزا سے کہا "بکرے کو نیچے گراؤ۔ میں نے اور بھی قربانیاں کرنی ہیں"۔
"اتنے دنوں سے کھا رہے ہو کوئی کام بھی کر لو۔ چلو بکرے کو نیچے گراؤ"۔ مرزا نے اپنے دونوں سالوں سے کہا
اس سے قبل کہ وہ بکرے کو پکڑتے بکرے نے ایک سالے کو سینگ دے مارے اور بھے بھے شروع کر دی۔ دونوں سالے اپنے ہاتھوں کو سہلا رہے تھے اور بکرے سے ڈر رہے تھے۔
"یہ یوں کیوں کر رہا ہے؟" مرزا نے قصائی سے پوچھا۔
"تمہارے سالوں سے ڈر گیا ہے شاید"۔
قصائی نے بکرے کو گردن سے پکڑ لیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-
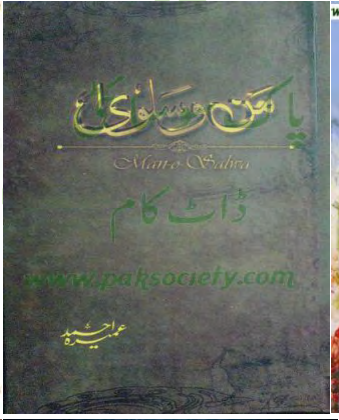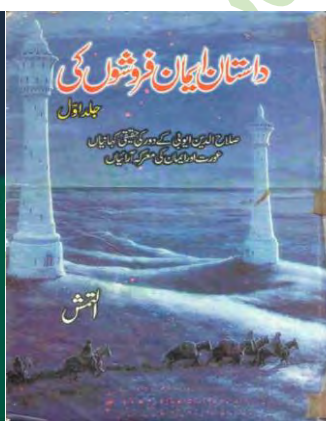
"مرزا! بکرا بڑا اڑیل اور سخت ہے"۔
"بھائی خالص خوراک کا پلا ہوا ہے۔ اپنی مرضی کی خوراک ملے تو بندہ بھی اتنا اڑیل اور سخت ہو جاتا ہے جیسے میرے سالے ہیں"۔ مرزا نے مسکراتے ہوئے کہا
"جیجا جی! یہ تو اپنے بکرے کی تعریف کر رہا ہے یا ہماری بے عزتی"۔
"تمہاری تعریف کرنے کی ناکام کوشش کی ہے"۔
ابھی قصائی نے بکرے کو نیچے لٹا کر چھری سیدھی ہی کی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی مرزا نے اپنے سالے سے کہا
"دیکھو باہر کون ہے؟"
مرزا کے سالے نے باہر دیکھے بغیر کہا" جیجا جی! فقیر ہو نگے آواز لگاتے ہوئے" اوئے رک جاؤ گوشت لے کر ہی جانا"۔
دونوں سالوں نے بکرے کو ٹانگوں سے پکڑے ہوئے تھے۔ بکرے کی گردن قصائی کے ہاتھ میں تھی۔ بچوں نے بھی اس کار خیر میں حصہ لیا۔ انہوں نے بکرے کو گرا لیا۔ بکرے کی میں میں، بھے بھے تیز ہوگئی۔ دروازہ زور سے پیٹنے کی آواز سنائی دی۔
"اچھے فقیر ہیں دو منٹ صبر بھی نہیں ہوتا۔ میرے خیال میں چھری ان کے ہاتھ میں دے دیں خود ہی اپنی مرضی کا گوشت کاٹ لیں گے"۔
قصائی نے مرزا کی طرف دیکھا" مرزا صاحب !اجازت"۔
اچانک ایک زوردار آواز سے سے دروازہ کھل گیا وہ پولیس والوں کے ساتھ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ وہ سیدھا جا کر بکرے کے ساتھ قصائی کے آگے لیٹ گیا۔
"شرم کرو، چوری کے بکرے کی قربانی کرتے ہو"۔ ایک سپاہی نے کہا
قصائی نے بکرے کو چھوڑ دیا سالوں نے جھٹ پٹ بکرے کی ٹانگیں چھوڑ دیں۔ بکرا اٹھ کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی پیار سے اس پر ہاتھ پھیر رہا تھا
"یہ بکرا میں نے قسطوں پر لیا ہے" طیفے نے" جاؤ اندر سے رسیدیں اٹھا کر لاؤ"۔ مرزا نے روہانسے ہو کر کہا
"آپ کن نو سر بازوں کے ہاتھ چڑھ گئے۔ ان لوگوں نے تو بہت سے لوگوں کو ٹھگا ہے ان کی بہت سی شکایات ہمارے پاس ہیں"۔
"یہ بکرا تو وہ چھوڑ کر گئے ہیں"۔
"چھوڑا انہوں نے ہی ہے لیکن کسی کا چوری کر کے"
قصائی نے اپنی ٹوکری اور چھریاں اٹھاتے ہوئے کہا" اچھا بھئی مرزا میں نے تو اور بھی قربانیاں کرنی ہے"۔
"چلو بھئی لو اپنا بکرا ہم بھی اپنے گھر جا کر عید کر سکیں"۔ پولیس والے نے کہا۔
بکرے والا اپنے بکرے کو لے کر کھسک گیا اس کے ساتھ پولیس والے بھی باہر نکل گئے۔ محلے دار بھی کھسک چکے تھے۔ صحن میں مرزا اس کے سالے اور اس بچے رہ گئے۔
"ابا ہمارا بترا تہاں ہے؟"۔ چھوٹے تو تلے بیٹے اپنی اماں سے پوچھا
مرزا کی بیگم نے لڑکے کو ایک تھپڑ رسید کیا" چل ڈھونڈ اپنے ابا کے ساتھ"۔
مرزا نے گھبراتے ہوئے کہا" بیگم! قسم لے لو میرا اس میں کوئی قصور نہیں"۔
مرزا کی بیگم نے غراتے ہوئے کہا" میرے بھائی کل سے بھوکے ہیں"۔
مرزا کا سالا کچن سے چھری اٹھا لایا۔ ایک سالے نے مرزا کو پیچھے سے پکڑا چھری والے سالے نے چھری مرزا کی چھاتی کی طرف بڑھائی اور یک زبان ہو کر بولے" ہم تو چانپیں کھا کر ہی جائیں گے"۔

قتل

سید وجاہت علی

اک ماں کی روداد، وہ اپنی بیٹی کی خوشیاں چاہتی تھی اس نے خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہر رشتہ ٹھکرا دیا تھا لیکن جب ایک آخری رشتہ آیا تو......

حقیقت سے آنکھیں چرانے والی ایک خاتون کا فسانہ

قتل کی خبر ٹاؤن میں سرعت سے پھیل گئی تھی کیوں کہ یہ پہلا خونی واقعہ تھا جو اس علاقے میں ہوا۔ پولیس اسٹیشن پر آنے والا فون انسپکٹر فلیمنگ نے خود ہی ریسیو کیا تھا۔

"قتل ہو گیا ہے انسپکٹر صاحب ٹاؤن کے جنوبی سرے پر... مقتول ایچ بلاک کا رہائشی ہے" اسے مطلع کیا گیا تھا۔

"اوہو میں عملہ بھیجتا ہوں آپ کون صاحب ہیں......؟" فلیمنگ نے سوال کیا۔

"میں پیٹر ہوں سر میرا مکان بھی ایچ بلاک میں ہے۔ جنوبی سمت میں میری ڈیری شاپ ہے۔ میں آج دوکان کھولنے گیا تو میدان میں مجھے دور سے کوئی شے نظر آئی جس پر مجھے کسی انسانی وجود کا شبہ ہوا۔ نزدیک جا کر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ مجھے خوف محسوس ہوا۔ لاش کا منہ زمین کی طرف ہے اور اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا لیکن میں اس کو عقب سے بھی پہچان سکتا ہوں۔ وہ جوزف ہے۔ لاش کو ابھی کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔" پیٹر نے رنجیدہ لہجے میں تفصیل بتائی۔

ہوں آپ وہیں رکیں۔ میں آ رہا ہوں۔"

"بہت بہتر۔"

انسپکٹر فلیمنگ نے ریسیور رکھتے ہی کرسی چھوڑ دی۔ اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ چند لمحوں میں وہ موبائل کار میں جائے وقوع کی طرف دوڑ رہا تھا۔ راستے میں اس نے سیل فون سے کال کر کے سارجنٹ ہل کو کو کانسٹیبلز کے ساتھ جنوبی سرے پر پہنچنے کا آرڈر کر دیا تھا۔

فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ راستے میں قتل اور مقتول کے متعلق غور کرتا رہا۔ جب سے اس کی پوسٹنگ ٹاؤن میں ہوئی تھی قتل کا یہ پہلا کیس تھا بلکہ رہائشیوں کے بہ قول ایسا گزشتہ دس سالوں میں نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا خوب صورت ٹاؤن تھا جو ایک کھاڑی کے قریب واقع تھا۔ سمندر کے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں کا موسم تقریباً ہر وقت خوش گوار رہتا تھا۔ علاقے کے شمالی سرے پر ایک شاہراہ تھی جو اس کو مرکزی شہر سے ملاتی تھی۔ جنوب میں ایک بڑا سا میدان تھا جہاں ٹاؤن کے مکانات کا اختتام ہو رہا تھا۔ میدان سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر کھاڑی شروع ہو جاتی تھی جو آگے سمندر سے جا ملتی تھی۔ قصبے میں اس سے قبل چوری اور ڈاکے کی وارداتیں ہوتی رہی تھیں لیکن اکثر مجرم بہت عرصے مفرور نہ رہ سکے تھے۔

انسپکٹر فلیمنگ کار بھگاتا ہوا پانچ منٹ میں ہی جائے قتل پہنچ گیا۔ وہاں خاصے لوگ جمع ہو گئے تھے۔

گاڑی کی آواز سن کر لوگ پیچھے مڑے۔ فلیمنگ کار سے اتر پڑا۔ انھوں نے لاش تک رسائی کے لیے اس کو راستہ دے دیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مقتول کے نزدیک پہنچا۔ اگلے ہی لمحے وہ چونک اٹھا تھا۔

......☆☆......

مقتول اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی گدی پر ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ معلوم یہ ہی ہوتا تھا کہ اسے کسی نوکیلی چیز سے ہلاک کیا گیا ہے۔ آس پاس ایسے نشانات تھے جیسے دم نکلنے سے قبل مقتول اذیت کے سبب لوٹ پوٹ ہوتا رہا

ہو۔ لاش سے خون نکل نکل کر میدان کی مٹی میں جذب ہو گیا تھا۔ ایک خوف ناک منظر تھا۔ مقتول کو جس کا نام جوزف بتایا گیا تھا' بہت بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ یہ ہی انسپکٹر فلیمنگ کے چونکنے کا سبب تھا۔ وہ قریب ہو کے جوزف کی لاش اور جائے واردات کا گہری نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ اس نے جوزف کے جسم کو ہاتھ نہیں لگایا تھا کیوں کہ وہ دستانوں سے تہی دست تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے آس پاس جوزف کے پیروں کے علاوہ کوئی اور نشان نظر نہیں آیا جو قاتل کا پتا دیتا اور نہ کسی ایسی ہی چیز پر اس کی نظر پڑی جس پر آلۂ قتل کا گمان گزرتا۔ بین امر تھا کہ قاتل آلۂ قتل ساتھ ہی لے گیا ہوگا تا کہ اس کو ضائع کر دے۔ انسپکٹر کچھ دیر جائزہ لیتا رہا۔ پھر وہ مڑا۔

''پیٹر کون ہے......!''

''میں ہوں انسپکٹر صاحب'' ہجوم میں سے ایک شخص آگے آیا۔ وہ ایک دبلا پتلا شخص تھا جس کی آنکھوں پر اس وقت حیرت غالب تھی بلکہ وہاں کھڑا ہر شخص ہی متحیر تھا۔ ٹاؤن میں یہ پہلا حادثہ قتل تھا۔ پھر جوزف نہ کوئی دولت مند شخص تھا کہ بہ وجہ امارت کوئی اس کی جان لے لے۔ نہ وہ لڑائی جھگڑے میں پڑنے والا فرد تھا کہ مخاصمت کی بنیاد پر اسے اس سفاکانہ انداز میں قتل کر دیا گیا۔

''تم جوزف کو کیسے جانتے ہو؟'' فلیمنگ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم بادی النظر میں بھانپ چکے تھے کہ یہ جوزف ہے جب کہ ابھی چہرہ کسی نے دیکھا ہی نہیں ہے۔''

''ٹاؤن میں ہر شخص ہی ایک دوسرے کو جانتا ہے۔'' اس نے ویلیکن مطمئن انداز میں بتایا۔ وہ بے فکر تھا کہ انسپکٹر فلیمنگ اس پر یا کسی دوسرے شخص پر کتنا ہی شک

کرے لیکن وہ کسی کو بے جا پریشان نہیں کرے گا۔ اگرچہ کسی کو شبے سے بری سمجھنا سراغ رسانی کی مبادیات کے خلاف ہے مگر کسی کا جرم ثابت ہوئے بغیر اس کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک یا اسے خواہ مخواہ تنگ کرنا ہرگز درست نہیں تھا اور قصبے کی پولیس ایسی نہیں تھی کہ ایسا گھٹیا طرزعمل اختیار کرتی۔

''میں ہی نہیں' ہر شخص اسے عقب سے دیکھ کر پہچان جاتا اور پہچان چکا ہے کہ یہ جوزف ہے۔ جوزف سے میری اچھی واقفیت تھی۔ وہ اکثر میری دوکان پر ناشتے کا سامان لینے آتا تھا۔''

''آہم'' انسپکٹر فلیمنگ نے دھیرے سے سر ہلایا۔ وہ دوبارہ فکر میں ڈوب گیا۔ سوچ رہا تھا کہ مجرم نے آلہ قتل کس طرح ضائع کیا ہوگا؟

پھر اس کا ماتحت سارجنٹ ہل متعلقہ سامان لیے ہوئے دو کانسٹیبل ٹیکنیشنز کے ساتھ پہنچ گیا۔ وہ لوگ اپنی کارروائی کرنے لگے۔ ایک کانسٹیبل نے ٹرانسپیرنٹ دستانے پہن کر لاش کو سیدھا کیا۔

''جوزف'' پیٹر کے منہ سے کراہ نکلی۔

''کیا جوزف کے گھر پر اطلاع نہیں دی گئی ہے.....؟'' فلیمنگ کا رخ دوبارہ مجمع کی طرف ہو گیا تھا۔ ''اس کی فیملی میں کون کون ہے......؟''

''آپ کو اطلاع دینے کے فوراً بعد ایک شخص جوزف کے گھر کی طرف گیا ہے۔'' پیٹر نے ہی جواب دیا۔ ''اس کے گھر میں اب تین افراد رہ گئے ہیں۔ اس کی اہلیہ اور دو بچے۔''

انسپکٹر نے دوبارہ جوزف کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ مسلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ کسی بھاری نوکیلی شے سے اسے قتل کیا گیا تھا جو اس کی گدی سے ٹکرائی ہوگی۔ جوزف نیچے گر پڑا۔ اس وزنی چیز کے' جو کوئی نوکیلا پتھر بھی ہو سکتا ہے' بوجھ سے اس کا منہ زمین سے جا لگا ہوگا اور زمین اور پتھر کے درمیان میں اس کا چہرہ رگڑا گیا۔

فلیمنگ نے لاش کو دوبارہ الٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے زخم کا دوبارہ جائزہ لینے لگا۔ زخم گہرا تھا لیکن اس کے کنارے محدود نہیں تھے۔ وہ خنجر یا اس طرح کے کسی ہتھیار سے بن جانے والا سوراخ معلوم نہیں ہو رہا تھا بلکہ وہ ایک گول سوراخ کی بجائے پھیلا ہوا سا گڑھا تھا۔ فلیمنگ کو یقین ہونے لگا کہ قتل کا آلہ کوئی نوکیلا وزنی پتھر ہی رہا ہوگا ورنہ خنجر وغیرہ کے استعمال کی صورت میں زخم کے کنارے اتنے پھیلے ہوئے نہ ہوتے۔

''جوزف...'' یکایک ایک نسوانی چیخ ابھری۔ پھر ایک عورت ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھی۔ وہ دھاڑیں مار رہی تھی۔

''جوزف... جوزف... کس ظالم نے تمہیں قتل کر دیا...؟؟'' وہ بڑے درد سے چلاتی ہوئی جوزف کی لاش کی طرف بڑھی۔ انسپکٹر فلیمنگ نے اسے لاش کے پاس جانے دیا کیوں کہ فنگر پرنٹس اور ہر زاویے سے تصاویر لی جا چکی تھیں۔ پھر جوزف کی بیوی کی سسکیوں نے سب کو اشک بار کر دیا تھا۔ جب کہ انسپکٹر فلیمنگ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر کھاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکنوں کا جال پھیل گیا تھا۔

......☆☆......

انسپکٹر فلیمنگ کا خیال تھا کہ اگر آلہ قتل کوئی وزنی پتھر رہا ہے تو قاتل کے لیے اس کو ضائع کرنے کی بہترین جگہ کھاڑی تھی جس کا فاصلہ جائے واردات سے پیدل پندرہ بیس منٹ کا تھا۔ کھاڑی کے پانی کی تہہ میں نہ جانے کتنے نوکیلے پتھر ہوں گے۔ کون اسے وہاں تلاش کر پاتا؟؟ پھر آب سمندر نے اس پتھر سے خون کے داغ دھو ڈالے ہوں گے۔ اگر یہ ممکن تھا کہ سمندری پانی میں ڈوبنے کے بعد اس سنگ خوں چکاں کو لیبارٹری میں لے جا کر پتا چلایا جا سکتا کہ آیا یہ پتھر انسانی خون سے آلودہ رہا ہے یا نہیں تو بھی یہ ممکن نہ تھا کہ اس پتھر کو ڈھونڈ لیا جاتا۔ پتھر لیبارٹری میں تب جاتا' جب کہ انسپکٹر فلیمنگ اس کو ڈھونڈ نکالتا۔ اس کو تلاش کر لینا ہی ناممکن تھا۔ دراصل انسپکٹر فلیمنگ وہاں اس خیال سے گیا تھا کہ قاتل کے قدموں کے نشانات یا کوئی اور کلیو مل جائے مگر بہت دیر چھان بین کے بعد بھی اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

فلیمنگ تھک کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ وہ افق کی جانب دیکھنے لگا جہاں ہلکے ہلکے بادل پھیلے ہوئے تھے۔ دور سمندر میں آتے جاتے بحری جہاز نظر آ رہے تھے جو اتنے فاصلے سے بچوں کے کھلونوں کی طرح چھوٹے چھوٹے سے

معلوم ہوتے تھے۔

کچھ دیر بعد فلیمنگ کار میں جا بیٹھا۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ انجن جاگ پڑا۔ لیکن پھر یک بارگی اس نے چابی الٹی گھما کر انجن بند کیا اور گاڑی سے اتر پڑا اور پیدل ہی جائے وقوع کی طرف گام زن ہو گیا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے زمین کو دیکھتے ہوئے جائے قتل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اتنی احتیاط سے تفصیلی جائزہ لیتا ہوا قدم اٹھاتا تھا کہ بیس منٹ کا راستہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ شاید قاتل نے ایسے جوتے پہنے ہوں گے جن کے سول پر کسی قسم کا نشان نہیں تھا یا پھر وہ اس طرف آیا ہی نہیں ہوگا۔ اگرچہ جوتوں کے بہت سے نشانات نظر آئے تھے لیکن کوئی بھی نشان شمالی سمت عین جائے وقوع تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ نہ اسے کوئی ایسی ہی چیز نظر آئی جو کسی طور قاتل کا پتا دیتی۔ جائے وقوع پر آنے کے بعد اس کے منہ سے گہری سانس خارج ہوئی۔ اور وہ مضمحل انداز میں دوبارہ کھاڑی کی سمت چل دیا۔ اسے کار اٹھا کے دوبارہ دفتر کا رخ کرنا تھا۔

آفس آ کر اس نے انٹر کام پر کافی کا آرڈر دیا اور پر تفکر انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

جب فلیمنگ کھاڑی کی طرف روانہ ہوا تھا تو جوزف کی لاش بیوی اور پھر بعد میں بچوں کو دکھانے کے بعد جوزف کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا گیا تھا۔

اگلے روز شام تک فنگر پرنٹس رپورٹ آ گئی۔ بالکل صاف ہی تھی۔ لاش پر کسی کے نشانات نہیں ملے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کم سے کم پانچ دن لگ ہی جانے تھے۔

تب تک فلیمنگ دوسرے کام نمٹاتا رہا۔ پانچویں دن پانچ بجے رپورٹ بھی آ گئی۔ رپورٹ کے مطابق پوسٹ مارٹم سے آٹھ گھنٹے قبل قتل ہوا تھا یعنی وہ نیم شب کے آس پاس کا وقت بنتا تھا۔ آلۂ قتل ایک سنگ گراں ہی رہا تھا کیوں کہ زخم کے کناروں اور گہرائی میں کچھ ذرات ہائے خاک بھی ملے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ میدان کی مٹی کے ریزے رہے ہوں لیکن زخم کی گہرائی میں میدان کی مٹی کے ریزوں کا چلے جانا اگرچہ ناممکن نہیں تھا لیکن قرین قیاس بھی نہیں تھا۔

جوزف آدھی رات کو ادھر کیا کر رہا تھا جب کہ اس کا گھر وہاں سے خاصا دور تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ قاتل نے اسے کہیں اور قتل کیا اور بعد میں میدان میں لا کر ڈال دیا کیوں کہ وہاں خاک میں جذب ہوئے خون اور اس کے ہاتھوں پیروں سے بننے والے نشانات سے یہ ہی ثابت ہوتا تھا کہ اس نے وہیں دم توڑا ہے۔

آخر جوزف وہاں کیسے پہنچا؟ کیا قاتل نے اسے وہاں بلایا تھا یا وہ جوزف کے ساتھ ہی تھا اور اس کو کسی بہانے سے میدان میں لے آیا؟ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ گزشتہ رات وہ کس کے ساتھ تھا تو یہ خاطر خواہ کلیو ثابت ہو سکتا تھا اور تفتیش کی گاڑی آگے حرکت پزیر ہو سکتی تھی۔

انسپکٹر فلیمنگ رپورٹ لفافے میں ڈال کر کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے کرسی چھوڑ دی۔ وہ اسی وقت جوزف کے گھر کی طرف روانہ ہونا چاہتا تھا لیکن اس سے قبل کہ وہ کمرے سے باہر نکلتا' ٹیبل پر رکھے فون کی گھنٹی سے کمرہ گونج اٹھا۔

......☆☆......

اس نے ڈسپلے پر نظر ڈالی۔ چیف انسپکٹر کے آفس کا نمبر تھا۔

''ہیلو... گڈ ایوننگ سر...'' اس نے ریسیور اٹھا کر مودبانہ لہجے میں کہا۔

''گڈ ایوننگ... کیسے ہو فلیمنگ؟؟ ٹاؤن والے کیس میں کیا پیش رفت ہوئی...؟؟''

اس نے چیف انسپکٹر کو پہلے دن ہی اس واقعے کی رپورٹ کر دی تھی۔ سن کر وہ بھی حیرت میں پڑ گئے۔ اب وہ اس کے متعلق سوال کر رہے تھے۔ اگر وہ اس کے امیڈی ایٹ نہ ہوتے تو بھی باہمی بے تکلفی کی وجہ سے وہ ضرور کیس کے بارے میں پوچھتے۔

''فائن سر... رپورٹس آ گئی ہیں۔ قتل بھاری نوکیلے پتھر سے ہی کیا گیا ہے۔ وقت آدھی رات کا بنتا ہے اور بس... اس کے علاوہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ مقتول کے علاوہ کسی اور کی انگلیوں کے نشانات بھی نہیں ملے۔''

''آہم...''

''لیکن اگر یہ پتا چل سکے کہ اس رات کے کسی بھی حصے میں جوزف کس کے ساتھ تھا؟ اگر قتل میدان میں ہی ہوا

ہے کون اس بدنصیب کو وہاں لے گیا تو...؟؟

"گڈ... تو پھر تم فوراً جوزف کی اہلیہ اس کے پڑوسیوں اور اس کے دوستوں سے پوچھ گچھ کرو۔ تمھاری گزشتہ کارکردگی کی بنیاد پر مجھے امید ہے کہ قاتل جلد فولادی سلاسل میں جکڑا ہوا ہوگا۔"

"شکریہ سر... بس میں اسی طرف جاتا ہوں..."

"اوکے۔ بائے۔" چیف انسپکٹر نے سلسلہ منقطع کردیا۔

فلیمنگ نے بھی ریسیور کریڈل پر رکھا اور اپنی ٹوپی اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کا رخ جوزف کے مکان کی طرف تھا۔

وہ وہاں پہنچا۔ کار سے اتر کر وہ کچھ لمحے جوزف کے ایک منزلہ مکان کو دیکھتا رہا۔ لیکن پھر اس نے جوزف کے مکان کی بہ جائے برابر والا دروازہ کھٹکھٹا ڈالا تھا۔ دوسری دستک پر کسی کے قدموں کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ دروازہ کھل گیا اور ایک دبلا پتلا لمبے قد کا شخص نمودار ہوا۔ اس کے بال بھورے رنگ کے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شائستگی کے تاثرات پائے جاتے تھے۔ وہ فلیمنگ کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"انسپکٹر فلیمنگ... یہ تو آپ کے علم میں ہوگا کہ آپ کے پڑوسی جوزف کو بے دردی سے قتل کردیا گیا ہے۔ میں اس کیس کی تفتیش کررہا ہوں۔"

"ہاں... مجھے پتا چل گیا تھا۔" اس کے لہجے میں تاسف سمٹ آیا۔ "یہ واقعہ حیرت انگیز بھی ہے اور درد ناک بھی... نہ جانے کس شقی القلب نے ایسے بے ضرر انسان کی جان لے لی؟؟ اوہ... آپ اندر آئیے... کہیے... میں کیا تعاون کرسکتا ہوں...؟؟"

"نہیں۔ بس میں چند سوالات پوچھ کر اجازت چاہوں گا۔"

"ضرور... تاہم ساتھ اگر خدمت کا موقع دیں تو میرے لیے باعث مسرت رہے گا۔ مجھے اگر کافی تیار کرنے میں چھ منٹ لگ جائے تو آپ جاسکتے ہیں..."

اس کے ایسے مہذب اصرار پر انکار کرنا فلیمنگ کو خلاف تہذیب محسوس ہوا۔

وہ شخص اسے اندر لایا۔ پھر واقعی پانچ منٹ میں ہی وہ کافی لاچکا تھا۔ اس دوران میں فلیمنگ کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا ڈرائنگ روم سادہ سا تھا۔ دو جانب صوفے اور درمیان میں ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ ایک طرف دیوار میں ریک تھا جس میں مختلف موضوعات کی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

"میرا نام راجر ہے۔ یہ میرا عزلت خانہ ہے۔ میں اکیلا رہتا ہوں۔" اس نے کافی کا کپ اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"آہم۔ تو آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی... جوزف سے آپ کے مراسم تھے..." کافی کا سپ لیتے ہوئے فلیمنگ نے بیک وقت دو سوال کر ڈالے۔

"مصروفیات..." راجر نے دہرایا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "میں مصنف ہوں۔ ناول لکھتا ہوں۔"

"اوہ... کہیں آپ مشہور ناول نگار راجر فورٹ تو نہیں ہیں...؟؟" فلیمنگ ٹھٹک کر بولا۔

"آپ کو مغالطہ نہیں ہوا۔" راجر فورٹ نے انکساری سے کہا۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی۔" فلیمنگ نے گرم جوشی سے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ "میں نے سوچا نہ تھا کہ یوں معاً آپ سے ملاقات ہوجائے گی۔ آپ کے کچھ ناولز پڑھے ہیں۔ گو کہ میری مصروفیت بہت زیادہ ہے لیکن جب بھی موقع ملتا ہے میں آپ کے ناولز پڑھ ڈالتا ہوں۔ خوف ناک مناظر کی منظر کشی پر کمال عبور ہے۔ کم زور دل لوگوں کے لیے آپ کے ناولز پڑھنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ آپ نے یہاں کب رہائش اختیار کی؟؟" فلیمنگ کہتا چلا گیا تھا۔ راجر کے انکشاف نے کہ وہ مشہور ناول نگار راجر فورٹ ہے اسے مسرور کردیا تھا۔

"شکریہ۔ یہاں سکونت پزیر کچھ ہی ہفتے ہوئے ہیں۔ اگرچہ جوزف سے میرے تعلقات زیادہ گہرے نہیں تھے لیکن پھر بھی اس سے اکثر ملنا جلنا رہتا تھا۔"

"آپ کیا کہتے ہیں جوزف کے قتل کے متعلق؟؟"

"میری تو عقل قطعاً ماؤف ہوکر رہ گئی ہے کہ ایسے سیدھے سادے انسان کو کس نے قتل کردیا؟ کون درندہ تھا

جس نے اس کے دو اطفال صغیر سن کا بھی خیال نہیں کیا؟ آخر شک بھی کس پر کیا جائے؟ اور میں اس قصبے کے لوگوں سے زیادہ شناسا بھی نہیں ہوں جو اپنی رائے ظاہر کر سکوں۔"

فلیمنگ اس کی بات پر سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"اس رات آپ کہاں تھے جب جوزف کے قتل کا حادثہ ہوا تھا؟؟"

"میں اس پوری شب گھر پر ہی رہا۔ کتابوں کے مطالعے میں رات گزر گئی تھی۔"

اس کے بعد وہ کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ فلیمنگ نے اس سے مختلف عنوانات پر گفت گو کی۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ راجر فورٹ اسے چھوڑنے دروازے تک آیا۔

"اس کیس سے فارغ ہو کر بھی آتے رہیے گا۔"

"ضرور ... اگر آپ کے وقت کا زیاں نہ ہو تو یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔" فلیمنگ نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

اب اس نے دوسری طرف والا دروازہ بجایا۔ تیسری دستک پر کھل گیا۔ اندر سے ایک فربہ جسم کا شخص برآمد ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے بے زاری ٹپک رہی تھی جیسے دروازے تک آنے میں اسے بہت کوفت ہوئی ہو۔ انسپکٹر کو دیکھتے ہی وہ چونک گیا۔

"انسپکٹر فلیمنگ..." اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"میں آپ کو جانتا ہوں۔ جائے واردات پر میں بھی موجود تھا' جب آپ آئے تھے۔"

"خوب... مجھے چند سوالات کرنے ہیں..."

"لیکن میں آپ کو کیا معلومات فراہم کر سکتا ہوں... ؟؟" اس نے پریشانی اور خفگی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟؟" فلیمنگ نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

"پیرسن۔"

"تو مسٹر پیرسن... جوزف کے پڑوسی ہونے کے ناطے آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ جوزف ٹاؤن میں اکثر کس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا... اس کے گھر کون آتا جاتا تھا؟؟"

"پتا نہیں۔ ٹاؤن کے سب ہی لوگوں سے اس کی راہ و رسم تھی۔ مجھے وہ اکثر اس نئے پڑوسی کے ساتھ بھی دکھائی دیا تھا۔" پیرسن کا اشارہ راجر کے مکان کی طرف تھا۔ "میری اس سے کوئی خاص دوستی نہیں تھی۔ جیسی دوسرے لوگوں سے ہیلو ہائے تھی' ایسے ہی عام روابط مجھ سے بھی تھے۔"

"میں آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔" چند ثانیوں کے توقف کے بعد یکا یک فلیمنگ نے مطالبہ کر ڈالا۔

پیرسن کے چہرے پر الجھن پھیل گئی۔ "کیا آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟؟"

"کیا سراغ رسانی میں کسی کو شک سے بری سمجھا جا سکتا ہے؟؟"

"وارنٹ دکھائیے۔ محض شک کی بناء پر آپ میرے گھر کی کیوں کر تلاشی لے سکتے ہیں؟؟"

"بغیر وارنٹ کے بھی میں یہ کام کر سکتا ہوں لیکن مجھے خوشی ہوتی کہ اگر آپ اخلاقی بنیاد پر مجھے اجازت دے دیتے۔" فلیمنگ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تاہم آپ کے اطمینان کے لیے میں وارنٹ منگوا لیتا ہوں۔"

اس نے جیب سے سیل فون نکال لیا لیکن اس کے نمبر ڈائل کرنے سے قبل پیرسن نے قدرے لچک دار لہجے میں کہا۔

"آجائیے۔"

نہ جانے کیوں وہ نرم پڑ گیا تھا۔ اس نے فلیمنگ کو راستہ دے دیا۔

فلیمنگ نے ایک نظر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اندر قدم رکھ دیا۔

"آپ کے ساتھ اور کون رہتا ہے؟؟" تلاشی شروع کرنے سے قبل اس نے سوال کیا۔

"میری اہلیہ اور تین بچے۔" پیرسن نے مختصراً جواب دیا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری ہو گیا تھا۔

اس نے اپنی بیوی اور بچوں کو لاؤنج میں جمع ہونے کی تاکید کی تاکہ فلیمنگ باآسانی تلاشی لے سکے۔ وہ تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا لیکن خوب صورت اور قرینے

سے سجا ہوا گھر تھا۔ ان میں سے ایک کمرہ لائبریری معلوم پڑتا تھا۔ اس کی دیواروں پر چاروں طرف ریک لگے ہوئے تھے جن میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ زیادہ تر جاسوسی ناولز تھے۔

"یہ ناولز آپ پڑھتے ہیں؟؟" فلیمنگ بڑے پر خیال انداز میں ناولوں کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔" پیرین نے اس بار بھی مختصر جواب دیا تھا۔

"خوب۔" فلیمنگ کے منہ سے نکلا۔ پیرین اندازہ لگانے میں ناکام رہا کہ اس کے لہجے میں طنز تھا یا تحسین۔

انسپکٹر نے تلاشی مکمل کر لی۔ اسے کوئی متوقع چیز یا کنایہ نہ مل سکا۔

"تعاون کا شکریہ۔" اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مگر ممکن ہے کہ میرا دوبارہ آپ کی طرف چکر لگے۔"

"ضرور۔ لیکن یقین رکھیے، مجھے قتل سے نفرت ہے۔"

پیرین کے طنز میں بہت کٹیلا پن تھا۔

فلیمنگ خاموش رہا۔ وہ باہر نکل آیا۔

اس کا رخ اب جوزف کے گھر کی طرف تھا۔ اس نے دستک دی۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد دروازہ کھل گیا اور جوزف کی بیوی کی نمودار ہوئی۔

"انسپکٹر فلیمنگ...."

وہ اس کو پہچانتی ہوگی کیوں کہ وہ جائے واردات پر آئی تھی لیکن پھر بھی اس نے تعارف کروانا مناسب سمجھا۔

"جی جی... اندر آجایئے۔" اس نے غمگین لہجے میں کہا۔ شوہر کی حادثاتی موت کا غم اسے اب تک نڈھال کیے ہوئے تھا۔

"نہیں بس۔ شکریہ۔ جوزف کے قتل پر مجھے بہت دکھ ہے۔ میں قاتل کو بے نقاب کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کا شک کس پر جاتا ہے؟؟"

"کسی پر نہیں۔ میں کسی پر کس بنیاد پر شک کر سکتی ہوں؟؟"

"اچھا... مسٹر جوزف کیا کرتے تھے؟؟"

"مرکزی شہر سے سٹیشنری خرید کر ٹاؤن کی دوکانوں پر سپلائی کرتے تھے۔"

"اور ان کا حلقہ احباب...؟؟"

"ہیلو ہائے سب سے تھی لیکن زیادہ وقت رابرٹ کے ساتھ گزرتا تھا۔ ہمارے گھر رابرٹ کی آمد و رفت سب سے زیادہ تھی۔"

"رابرٹ کون ہے؟؟"

"ہیٹنگ (Heating) کے سامان کی دوکان ہے ٹاؤن کے وسط میں۔"

"کیا اس پر شک کیا جا سکتا ہے؟؟"

"میرا نہیں خیال... دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔"

"کبھی دوستی کی گہرائی میں ہی نفرت اور دشمنی کی شاخیں پھوٹ پڑتی ہیں۔ آپ کا شکریہ۔ اب میں رابرٹ کو کھنگالتا ہوں۔ بے فکر رہیے۔ قاتل جو بھی ہے جلد آہنی شکنجوں میں ہوگا۔" اس نے جوزف کی بیوی کو تسلی دی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ لیکن چند قدم چل کر وہ رکا اور پلٹ پڑا۔ جوزف کی بیوی دروازہ بند کر چکی تھی۔ فلیمنگ کی دستک پر اس نے دروازہ کھولا تو اس کو دوبارہ دیکھ کر قدرے حیران ہوئی۔

"کیا اس رات جوزف کو کوئی بلانے آیا تھا...؟؟" یہ بنیادی سوال وہ بھول ہی گیا تھا۔

"ہاں۔"

"کون؟؟"

"پیرین۔ رات دس بجے وہ انھیں بلانے آیا تھا۔ اس کے بعد وہ گھر نہیں آسکے..."

"اوہ..." فلیمنگ دھک سے رہ گیا۔

......☆☆......

"پیرین کی نگرانی میں کوئی بھول چوک نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے ساتھ سارجنٹ جیک کو بھی لگا لو۔" فلیمنگ نے ہل کو جوشیلے انداز میں ہدایات دیں۔ "چند لمحوں کے لیے بھی اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔ ممکن ہے کہ جوزف کے قتل کا معمہ جلد حل ہو جائے۔"

"بہت بہتر سر..." سارجنٹ ہل نے مودبانہ انداز میں کہا۔

آفس ٹائمنگ تو ختم ہو چکی تھی۔ اس نے ہل کو سیل فون پر کال کی تھی۔ ہل اور جیک کی رہائش گاہیں دفتر کے احاطے میں بنی ہوئی عمارت میں ہی تھیں۔

کار کا رخ اس نے مارکیٹ کی طرف کر دیا تھا۔
رابرٹ اسے دوکان پر ہی مل گیا تھا تاہم کوئی خاطر خواہ بات اسے معلوم یا محسوس نہیں ہو سکی۔ شاید فلیمنگ کا ذہن ابھی پیرسن ہی کی طرف متوجہ تھا۔ اس کا اسپ خیال پیرسن کو ہی زد میں لیے ہوئے تھا۔
دو گھنٹے بعد اس نے سارجنٹ سے رپورٹ طلب کی۔
"کوئی خاص رپورٹ نہیں سر... پیرسن گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔"
"او کے۔ تم مستعد رہو..."
اگلے دن دوپہر میں فلیمنگ کو ہل کی کال موصول ہوئی۔
"پیرسن کھاڑی کی سمت گیا تھا سر..."
"اوہ..." فلیمنگ کے منہ سے نکلا۔
"جی سر... وہ آدھی ساعت وہاں پھرتا رہا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ پھر وہ اس جگہ چلا آیا جہاں جوزف کو قتل کیا گیا تھا۔ پندرہ منٹ سے زیادہ وہ جائے وقوع کا معائنہ کرتا رہا۔ اس کے بعد دوبارہ کھاڑی کی سمت گام زنی کی تھی۔ کافی دیر تک وہاں موجود رہا لیکن اب وہ گھر لوٹ آیا ہے۔"
"گڈ... مجھے لگ رہا ہے کہ پیرسن جلد کوئی ایسی غلطی کر ڈالے گا جو اسے قاتل ثابت کر دے گی۔ اسے شک تو نہیں کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ میرے خیال میں تم نے نگرانی کے لیے پیرسن کے گھر کے سامنے والا پلازہ منتخب کیا ہے جہاں تمہارے دوست کا فلیٹ ہے؟؟"
"جی سر... وہ فلیٹ بہت مناسب مقام ہے۔ ہم حتی الامکان احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔"
"ویری گڈ... تم نگرانی میں مصروف رہو۔ میں اگلی رپورٹ کا انتظار کروں گا۔"
"او کے سر۔"
فلیمنگ نے رابطہ منقطع کر دیا۔
وہ اب مطمئن تھا۔ اسے بڑی حد تک یقین ہو چلا تھا کہ جوزف کا قتل پیرسن نے ہی کیا ہے لیکن وجہ قتل کے متعلق وہ جتنا سوچتا الجھنے لگتا۔
اگلے دو دن تک رپورٹ میں کوئی خاص اطلاع نہیں تھی چناں چہ ہل کو چوکس رہنے کی تاکید کرتے ہوئے وہ دوسرے کام نمٹاتا رہا۔
تیسرے دن بھی وہ ان ہی دیگر معاملات میں مصروف رہا۔ گھڑی کی چھوٹی سوئی پانچ کے ہندسے سے ادھر کھسک رہی تھی لیکن وہ ابھی تک کرسی پر براجمان تھا۔ شاید اس کا دیر تک بیٹھ رہنے کا ارادہ تھا۔
باہر شام کے دھندلکے تاریکیوں میں تبدیل ہونے لگے۔
رات آٹھ بجے وہ اٹھ گیا لیکن باہر نکلنے سے قبل فون کی گھنٹی نے اس کے قدم روک لیے۔
اس نے ڈسپلے پر نظر ڈالی۔ کوئی اجنبی موبائل نمبر چمک رہا تھا۔
"انسپکٹر فلیمنگ سپیکنگ..." اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔
دوسری طرف سے ایک قدرے جوشیلی آواز کا اس کی سماعت سے تصادم ہوا۔ "انسپکٹر صاحب... میں پیرسن بول رہا ہوں..."
"پیرسن..." شاید بم کا دھماکہ بھی اس کے اعصاب کو اس طرح تحمل نہ کرتا۔ اسے گمان ہی نہ تھا کہ کال کرنے والا پیرسن ہوگا جو اس کے بہ خیال جوزف کا قاتل تھا لیکن اگلے لمحات میں اس کے لیے کہیں زیادہ حیرانی اور دہشت تھی جب پیرسن نے اسے آگاہ کیا۔
"میں قاتل تک پہنچ گیا ہوں انسپکٹر صاحب... نن... نن... آ آ آ آ..." کہتے کہتے وہ دردناک انداز میں چلا اٹھا تھا۔ اس کی چیخ سے فون جھنجھنا گیا۔
"پیرسن... پیرسن..." فلیمنگ نے پکارا لیکن جواب میں اسے گھٹی گھٹی سی آوازیں سنائی دیں جیسے پیرسن کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ رابطہ ابھی منقطع نہیں ہوا تھا لیکن دوسری طرف مکمل سکوت تھا جیسے کسی خوف ناک طوفان سے تباہی پھیلنے کے بعد ماحول میں سوگوار اور جگر دوز خاموشی پھیل جاتی ہے۔ فلیمنگ نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور کمرے سے بہ سرعت دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کا رخ پیرسن کے گھر کی طرف تھا۔ پانچ منٹ سے قبل ہی وہ وہاں پہنچ گیا۔ وہ تیزی سے اندر گھستا چلا گیا۔ آخر ایک کمرے میں اسے

پیرسن کی شریک حیات اس کی لاش سے لپٹی دھاڑیں مارتی نظر آئی۔ پاس اس کے بچے بھی کھڑے تھے۔ وہ بھی رو رہے تھے۔ دل خراش منظر تھا۔ وہ لمحہ پیرسن کو بہت مشکل لگا۔ اس لمحے اس کو اپنے آنسو روک لینا مشکل ترین کام محسوس ہوا تھا۔ فلیمنگ نے بہت وقت سے اپنے آپ پر قابو پایا تھا۔ اس نے پیرسن کی بیوی کو سمجھایا۔ وہ لاش سے الگ ہو گئی لیکن اس کی سسکیاں نہیں رکی تھیں۔ اس کی زندگی یک دم ہی تاریک ہو گئی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر پھیل جانے والا اضمحلالی پن اس کے اعصاب کی شکست و ریخت کا غماز تھا۔ ایکا ایکی ہی اس کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ فلیمنگ لاش کا جائزہ لینے لگا۔ اس کو دو گولیاں ماری گئی تھیں۔ ایک سوراخ پشت پر تھا اور ایک کنپٹی پر۔ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی اور اس کا بستر خون سے رنگین ہو چکا تھا۔

''کیا آپ نے فائر کی آواز سنی تھی؟؟''

''نہیں...'' پیرسن کی بیوی نے روتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ان کی چیخ بلند ہوئی تھی۔ میں دوسرے کمرے میں بچوں کے ساتھ تھی۔ میں فوراً بھاگتی ہوئی آئی تو یہ دل خراش منظر دیکھنے کو ملا... پیرسن کی آخری سانسیں چل رہی تھیں....''

فلیمنگ نے سیل فون نکال کر نائٹ ڈیوٹی پر موجود سارجنٹ چارلس کو عملے سمیت پہنچنے کا آرڈر دیا۔ پھر اس نے سارجنٹ ہل کو کال ملائی۔ انھیں پیرسن کے گھر آنے تاکید کی کیوں کہ اب ان کا نگرانی کرنا بے معنی تھا۔

سارجنٹ ہل اور جیک تقریباً فوراً ہی پہنچ گئے تھے۔

''کیا تم نے پیرسن کے گھر سے کسی کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے؟؟''

''نہیں سر... پیرسن کی چیخ کی ہلکی سی آواز ہمارے کانوں میں پڑی تھی لیکن ہم نے جگہ چھوڑنا مناسب خیال نہیں کیا کیوں کہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ جھوٹی چیخ ہو لیکن کچھ دیر بعد ہم نے آپ کو اس مکان میں داخل ہوتے دیکھا آپ کا کوئی اشارہ ہمیں موصول نہیں ہوا' اس لیے ہم اسی جگہ موجود رہے۔''

''آہم... ٹھیک ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ قاتل شاید عقبی سمت سے فرار ہوا ہے۔ بیڈ روم جہاں پیرسن موجود تھا' اس کے عقبی دیوار کی کھڑکی سے وہ اندر داخل ہوا اور پیرسن کو قتل کر کے اخراج کے لیے چھت استعمال کی۔''

''لیکن سر فلیٹ سے اس گھر کی چھت بھی نظر آتی ہے۔''

''اوہ... یقیناً مجرم بہت چالاک ہے... تم یہیں رکو اور عملہ آ جائے تو کارروائی مکمل کراؤ۔ میں مکان کے پیچھے کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔''

فلیمنگ کے قدم عقبی سمت اٹھ گئے۔

......☆☆......

لیکن پھر ایسا نہ ہوا جیسے انسپکٹر کی توقعات تھیں۔ پیرسن کے گھر سے بھی اسے اس چالاک قاتل کا کوئی نشان نہ مل سکا۔

فلیمنگ اب تک پیرسن کو جوزف کا قاتل سمجھتا آیا تھا' مگر خود پیرسن کے قتل کے بعد ظاہری بات ہے' یہ مفروضہ بکھر گیا تھا۔ آخر قاتل کون تھا؟ کیا وہ جوزف اور پیرسن کا کوئی مشترکہ دشمن تھا؟ اس سے کہیں زیادہ اچنبھے کا پہلو یہ تھا کہ قاتل نے کہیں اپنا ذرا سا نشان نہیں چھوڑا تھا۔ پیرسن جس کمرے میں قتل ہوا' وہ اس کا سونے کا کمرہ تھا۔ بیڈ روم کی عقبی دیوار میں ایک کھڑکی باہر کی جانب کھلتی تھی۔ یہ ہی کھڑکی اس کے داخلے کا ذریعہ رہی۔ ریوالور اس نے سائلینسر لگا استعمال کیا تھا کیوں کہ فائر کی آواز کسی نے نہیں سنی تھی۔ قاتل جو کوئی بھی تھا' بہت ظالم اور مکار تھا۔ فلیمنگ نے پیرسن کا کمرہ' اس کا پورا گھر' عقبی حصہ اور آس پاس کی تمام جگہیں کھنگال ڈالی تھیں لیکن ایک معمولی سراغ بھی نہیں تھا جس سے اس ننگ انسانیت قاتل تک رسائی ہو جاتی۔

ٹاؤن میں جہاں دس سالوں میں ایک قتل نہیں ہوا تھا' وہاں دس دنوں میں ایسا دوسرا واقعہ تھا۔ سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ ہر شخص ہراساں تھا کہ کہیں تیسرا مقتول وہ نہ ہو۔ ٹاؤن کی رونق کم ہو گئی تھی۔ پولیس سے ان کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ وہ جوزف کے قاتل کو ہی گرفتار نہ ڈھونڈ سکی تھی کہ اب پیرسن بھی مارا گیا تھا۔

چیف انسپکٹر نے فلیمنگ سے اس کیس کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ اس نے یہ ہی بتایا کہ وہ تفتیش کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ قاتل جلد بے نقاب ہو جائے لیکن در

حقیقت اس کی تفتیش کی گاڑی زیرو پوائنٹ سے آگے نہیں سرک سکی تھی۔ قاتل نے کوئی سراغ ہی نہ چھوڑا تھا۔ جرم کی دنیا بڑے بڑے شاطروں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کا واسطہ بھی کسی ایسے ہی شاطر دماغ سے پڑ گیا تھا جو کہیں نشان ہی نہ چھوڑتا تھا۔ رپورٹ سے بس یہ معلوم ہوسکا کہ گولی کا حجم دو انچ تھا' چناں چہ اس بے غیرت قاتل نے اعشاریہ پینتالیس بور کا ریوالور استعمال کیا ہوگا۔ اور بس... علاوہ ازیں رپورٹ میں مزید کچھ نہ تھا۔

فلیمنگ نے جوزف اور پیرسن کے تمام جاننے والوں کو کھنگال ڈالا لیکن ایسا کوئی نکتہ اسے نہ مل سکا جو قاتل کا سراغ لگانے میں معاون ثابت ہوتا۔

انسپکٹر زچ ہوکر رہ گیا۔ اسے اپنی صلاحیتیں منجمد ہوتی محسوس ہورہی تھیں۔ آخر تھک ہار کر اس نے سوچا کہ وہ کیس بند کردے لیکن یہ اس کی شکست ہوتی۔ خود فلیمنگ اپنے آپ سے شرمندہ رہتا کہ وہ ایک درندے کو نہ پکڑ سکا۔ ڈپارٹمنٹ میں کسی کی اسے اتنی پروا نہیں تھی۔

بہرحال اس نے کیس سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ چیف انسپکٹر سے کہہ دے گا کہ اگر وہ یہ کیس کسی اور کے سپرد کرنا چاہیں تو کردیں۔ میں قاتل کو پکڑنے میں ناکام رہا۔

وہ اپنے آفس میں کرسی پر براجمان تھا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکائے' دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے پر جمائے آنکھیں بند کیے ہوا تھا۔ اس کے خیالات کی رو دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ جوزف اور پیرسن کی لاشوں کی تصویریں سامنے میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ کبھی وہ آنکھیں کھول کر تصویروں پر نظر ڈال لیتا اور پھر بند کرلیتا۔ ایک دفعہ اس نے دونوں تصویروں پر نظر ڈالی تو یک دم وہ چونک اٹھا۔ کچھ دیر وہ انھیں سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اسے ان دونوں تصویروں میں ایک مماثلت محسوس ہوئی تھی۔

''نن.. نہیں... '' اس کے منہ سے نکلا جس میں حیرت اور خوف دونوں شامل تھے۔

......☆☆......

''تم اور سارجنٹ جیک بہت احتیاط سے اس شخص کی خفیہ نگرانی کرو۔ اسے قطعی احساس نہیں ہونا چاہیے ورنہ یہ شخص فرار ہوجائے گا۔ کس طرح نگرانی کروگے؟ یہ میں تمھیں بتاتا ہوں۔''

پھر وہ اسے تفصیل سمجھانے لگا۔

''بہت بہتر سر... میں جیک کے ساتھ فوراً نکل رہا ہوں۔ ہم اپنا حلیہ بھی تبدیل کرلیں گے۔ پولیس کا عملہ ہونے کی وجہ سے یہ ہمیں پہچانتا ہوگا۔'' سارجنٹ ہل نے توثیق طلب لہجے میں کہا۔

''میں یہی کہنے والا تھا...''

''او۔کے سر۔''

سارجنٹ ہل اس کے کمرے سے نکل گیا۔

انسپکٹر فلیمنگ اپنے آپ کو بھی خیال کررہا تھا کہ اس سے مشاہدے میں اتنی بڑی خطا کیسے ہوگئی؟ اتنی سامنے کی بات وہ نوٹ نہیں کرسکا۔ بہرحال اس کے اگلے تین دن بہت مصروف رہے۔ وہ نہ جانے کیا کچھ کھنگالتا رہا۔ بہتیرے لوگوں سے اس نے رابطہ کیا۔ تیسرے دن سہ پہر سے قبل وہ اپنا کام نمٹا چکا تھا۔ پھر وہ ولولہ چھلکتی آواز میں چیف انسپکٹر کو مطلع کررہا تھا۔

''سر میں قاتل تک پہنچ چکا ہوں۔ کیا آپ اس کی گرفتاری کا منظر دیکھنے چلیں گے؟؟''

''کیا واقعی...؟؟'' چیف انسپکٹر نے تعجب آمیز خوشی سے کہا۔ ''ہاں میں چلوں گا۔ میں فارغ ہوں۔''

''او۔کے۔ سر میں آپ کو آفس سے پک کرتا ہوں۔ آپ اپنے روم میں ہی ہیں یا باہر نکلے ہوئے ہیں؟؟''

''ہاں دفتر میں ہی ہوں۔ آجاؤ۔''

چیف انسپکٹر فلیمنگ کو ماتحت سے زیادہ دوست سمجھ کر برتاؤ کرتے تھے۔ ایک بے تکلفی باہم بن گئی تھی چناں چہ اس نے انھیں ساتھ چلنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔

''تم قاتل تک کیسے پہنچ گئے؟؟'' فلیمنگ نے چیف انسپکٹر کو پک کیا تو کار میں بیٹھنے کے بعد انھوں نے سوال کیا تھا۔

''میں پہلے ہی قاتل تک پہنچ جاتا لیکن مجھ سے مشاہدے میں بنیادی غلطی ہوگئی۔ ابھی آپ تفصیل سن لیجیے گا۔''

کچھ ہی دیر بعد وہ ایک مکان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ جلد دروازہ کھلا اور انھیں اس کی شکل نظر آئی۔ وہ ان دونوں

کو ایک ساتھ دیکھ کر ٹھٹک گیا تاہم اسے یہ خیال نہ رہا ہوگا کہ اس کے قاتل ہونے کا راز افشا ہو چکا ہے۔ غالباً اسی لیے وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''میں چیف انسپکٹر کو آپ سے ملانے لایا ہوں۔ آپ سے کچھ باتیں ہو جائیں؟؟'' فلیمنگ نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ وہ اس کے لہجے میں دبے طنز کو محسوس نہیں کر سکا۔

''ضرور... آیئے۔'' وہ ایک طرف ہٹ گیا اور انھیں اس کمرے میں لے آیا جہاں اس سے قبل وہ فلیمنگ کی میزبانی کر چکا تھا۔ فلیمنگ کا پروگرام کچھ اور تھا لیکن اس نے یک بہ یک اپنا ارادہ بدل دیا اور تمہید باندھے بغیر ہی اس سے کہا۔

''کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ کوئی مصنف اپنے ناولوں میں جان ڈالنے کے لیے لوگوں کی جان لیتا پھرے...؟؟''

''کیا مطلب...؟؟'' اس نے بے ساختہ بوکھلاہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہاتھ اٹھا دو مسٹر راجر فورٹ...'' فلیمنگ نے برفیلے لہجے میں کہا۔ اس نے اپنا ریوالور نکال کر اس پر تان لیا تھا۔ ''میں تمھیں جوزف اور پیرسن کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔ تم نے محض ان دونوں ہی کو قتل نہیں کیا بل کہ اس سے قبل کتنے ہی لوگ تمھاری بہیمیت کا شکار ہو چکے ہیں...''

'' آپ کو مضحکہ خیز غلط فہمی کا ہو گئی ہے انسپکٹر صاحب...'' راجر فورٹ نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پر سکون انداز میں کہا۔ ''مجھے توقع نہیں تھی کہ آپ جیسا آفیسر ایسی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کرے گا۔ آپ اپنے ماتحت کو سمجھایئے چیف صاحب... شاید ناکامی نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو تشویش ناک حد تک متاثر کیا ہے۔''

''تم نے اب تک ہاتھ نہیں اٹھائے راجر فورٹ... اس رات تم ہی جوزف کو میدان میں لے گئے تھے اور ایک نوکیلے پتھر سے اس کو قتل کر ڈالا تھا۔ تم یہ مشاہدہ کرنا چاہتے تھے کہ ایسے نوکیلے ہتھیار سے' ایسے دردناک انداز میں قتل ہونے پر انسان کس طرح تڑپتا ہے تاکہ آئندہ شائع ہونے والے ناول میں یہ منظر تحریر کر سکو۔ دراصل تم اپنے ناولوں کے خوف ناک مناظر میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے لوگوں کو قتل کر ڈالتے ہو تاکہ حقیقت میں ان کے تڑپنے کا منظر دیکھ کر اپنے ناول میں بھی حقیقت کا گمان پیدا کر سکو۔ تم ہر بار نیا طریقہ اختیار کرتے ہو۔ جوزف سے شناسائی پیدا کرنے کے بعد اس رات اسے بہلا پھسلا کر جنوبی سمت لے گئے اور اسے قتل کر دیا۔ آلۂ قتل تم نے کھاڑی میں پھینکا ہوگا۔ میں پیرسن پر شک کرتا رہا لیکن پیرسن خود اپنے تئیں جوزف کے قاتل کو ڈھونڈ نکالنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ اس نے تمھارے ناول پڑھ رکھے ہوں گے۔ ان تمام لہورنگ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ بھانپ گیا کہ قاتل کون ہے؟؟ اس رات کال کر کے اس نے مجھے یہ بتانا چاہا تھا لیکن اس سے قبل ہی تم وہاں پہنچ گئے اور اس کی پشت اور کھوپڑی میں گولیاں اتار ڈالیں۔

دونوں قتل تم نے ایسی صفائی اور چالاکی سے کیے کہ سر توڑ کوششوں کے باوجود میں تمھارا سراغ لگانے میں ناکام رہا۔ پھر ایک روز جب کہ میں مایوس ہو کر اس کیس سے دست بردار ہونے والا تھا کہ میں نے پیرسن اور جوزف کی تصویروں میں ایک مشابہت نوٹ کی۔ دونوں کی دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اور انگوٹھا مل کر ایسا نشان بنا رہے تھے جیسے ان کا اشارہ لکھنے کی طرف ہو۔ یعنی انگلی اور انگوٹھا مل کر قلم کی سی شکل بنا رہے تھے۔ تم نے جوزف کو قتل کیا تھا تو وہ منہ کے بل گرا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو اس کی دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اور انگوٹھا بائیں ہاتھ کی انگلی سے اس طرح ملے ہوئے تھے کہ لکھنے کا اشارہ مشکل ہو رہا تھا۔ میری نا اہلی کہ اس وقت میں نوٹ نہیں کر سکا۔ دونوں کی تصویریں میں نے ایک ساتھ دیکھیں' پھر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ قتل ہونے سے قبل پیرسن کے منہ سے ''نن... نن'' نکلا تھا۔ اس لمحے میں نے اس سے مراد ''نن... نہیں....'' لیا تھا۔ میں نے گمان کیا کہ یہ ''نہیں'' سراسیمگی اور خوف کی وجہ سے اس کے منہ سے نکل رہا ہے جب کہ حقیقت یہ تھی کہ یہ ''نن'' نہیں کا نہیں تھا

بل کہ 'پیرسن'ن... ناول نگار راجر فورٹ' کہنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے ہی تم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ جملہ ادا نہ کر پایا۔ دونوں کی تصویروں میں لکھنے کا اشارہ دیکھ کر میری سمجھ میں آیا کہ دم واپسیں پیرسن کیا کہنا چاہتا تھا؟ میرا خیال لامحالہ تمھاری طرف گیا لیکن وجہ قتل کے متعلق میں الجھ رہا تھا کہ 'آخر کیوں تم' جو ایک ناول نگار ہو' جوزف اور پیرسن کو قتل کرنے لگے؟؟ مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ جب میں نے تم سے تمھاری مصروفیات کے متعلق استفسار کیا تھا تو یک لحظہ تم ہچکچائے تھے۔ پھر میں نے کچھ غور کرنے کے بعد چھان بین شروع کر دی کہ تم اس سے قبل کہاں کہاں رہے اور وہاں کیا حالات پیش آتے رہے؟؟ مجھے تمام سوالوں کے جوابات ملتے گئے۔ تم ٹاؤن میں رہائش سے پہلے متعدد مقامات پر کرائے رہے۔ جہاں بھی تمھاری بود و باش رہی' وہاں قتل ضرور ہوا اور بہت سفاکانہ انداز میں ہوا۔ پولیس قاتل ڈھونڈنے میں ناکام رہتی کیوں کہ تم بہت منصوبہ بندی اور مکاری کے ساتھ قتل کرتے تھے۔ تھک ہار کر پولیس کیس بند کر دیتی تھی۔ کچھ عرصے بعد اطمینان سے تم شہر چھوڑ دیتے۔ پھر میں نے تمھارے سارے ناولز پڑھے۔ ہر ناول میں قتل کی واردات ہوتی ہے۔ پڑھنے والے بہت خوف محسوس کرتے ہیں لیکن انھیں مزا بھی آتا ہے۔ تمھاری جزئیات نگاری اور منظر کشی سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کے اتنا قریب لکھنا تمھیں شہرت دے گیا۔ لوگ تمھارے ناولز کثرت سے پڑھنے لگے اور تمھارا نام بنتا گیا۔ جہاں جہاں تم نے رہائش اختیار کی' میں نے وہاں کے کیس نکلوائے اور ان کا تمھارے ناولوں سے موازنہ کیا۔ ناولوں میں قتل کے واقعات کی وہی صورت حال تھی جو تمھارے ناولوں میں تھی۔ اشاعت کی تاریخوں میں بھی بڑی مناسبت ہے۔ ادھر کسی علاقے میں قتل ہوا' ادھر دو مہینے بعد ناول چھپ گیا اس میں تازہ قتل کی کہانی ہوتی۔ تلاش کرنے پر ہمیں تمھارے گھر سے تمھارے نئے ناول کا مسودہ مل جائے گا جس میں ایک قتل کا سین ہے اور وہ وہی جوزف کے قتل کا سین ہوگا۔ تم بے نقاب ہو چکے ہو۔ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔"

"تمھیں محکمہ سراغ رسانی کی بہ جائے ناول نگار ہونا چاہیے۔ اچھی کہانی گھڑی ہے تم نے۔" راجر نے بے خوف لہجے میں کہا۔ وہ بہ دستور مطمئن تھا۔ "لیکن یہ محض مفروضہ ہی ہے۔ اس کا حقیقت سے سر مو تعلق نہیں ہے۔ آخر تمھارے پاس ثبوت ہی کیا ہے؟؟"

"ایک سال قبل کیمبرج ٹاؤن میں قتل ہوا تھا۔ وہاں تم اپنی انگلیوں کے نشانات چھوڑ آئے تھے لیکن چوں کہ پولیس کے پاس تمھارے فنگر پرنٹس کا ریکارڈ نہیں تھا اس لیے تم گرفت میں نہیں آ سکے مگر اب وہ ریکارڈ میں نے حاصل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ جوزف کے دوست رابرٹ نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ اس نے تمھیں اس رات جوزف کے ساتھ میدان کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے تم سے سوال کیا تھا کہ اس شب تم کہاں تھے؟ تو تم نے جواب دیا تھا کہ تم پوری رات گھر ہی رہے... تم نے یہ دروغ گوئی کیوں کی تھی...؟؟"

"اوہ... رابرٹ..." اس نے دانت کچکچائے۔ اس کی آنکھوں میں شعلے ناچنے لگے تھے۔ "مجھے اس پر شک ہو گیا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔" وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا۔

پھر اگلے ہی لمحے فائر ہوا اور فلیمنگ کے ہاتھ سے ریوالور نکل گیا۔ راجر نے بڑی پھرتی سے جیب سے ریوالور نکال کر اس کے ریوالور بردار ہاتھ پر فائر کیا تھا۔ فلیمنگ اور چیف انسپکٹر کچھ کر ہی نہ سکے۔ انھیں ایسی پھرتی کی اس سے توقع نہیں تھی کیوں کہ فلیمنگ نے اسے اپنے ریوالور سے کور کیا ہوا تھا۔

"ہاں میں نے جوزف اور پیرسن کو قتل کیا ہے۔" اس نے زہر آلود قہقہہ لگایا۔ وہ مصنوعی شگفتگی یک دم عنقا ہو چکی تھی۔ "پیرسن کی پشت اور کھوپڑی میں روشن دان بنانے کے بعد میں چھت پر گیا اور ایک ستون کی آڑ لے کر

پیچھے والی تنگ گلی میں کودا کیوں کہ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ تم نے دو سارجنٹس کو اس کی نگرانی پر لگایا ہوا ہے۔ پھر اپنے گھر کے عقبی حصے میں داخل ہوگیا۔ ہاں میں اس سے قبل بھی لوگوں کو قتل کرتا رہا ہوں۔ تم اس لذت سے آشنا نہیں ہو جب میں کسی کو تڑپتے دیکھتا ہوں اور اس منظر کو قلم بند کرتا ہوں۔ محض خیال آرائی میں وہ نشاط کہاں' جو ایک منظر سے براہ راست محظوظ ہونے میں ہے۔ لوگ یوں ہی میرے ناول پسند نہیں کرتے۔ اب میں جا رہا ہوں۔ مجھے روکنے کا رسک نہیں لینا۔ ایک قاتل مزید قتل کرنے سے نہیں چوکتا۔"

وہ دونوں واقعی مجبور ہوگئے تھے۔ گو کہ چیف انسپکٹر کے ہولسٹر میں پستول موجود تھا لیکن اسے نکال لینا مشکل امر معلوم ہوا۔ راجر فورٹ الٹے قدموں باہر نکلتا چلا گیا۔

لیکن پھر زیادہ لمحات نہ گزرے ہوں گے کہ فائر کی آواز گونجی۔ فوراً ہی دوسرا فائر ہوا۔ ساتھ ہی انھوں نے راجر کی چیخ سنی تھی۔ وہ دونوں دوڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔ بیرونی دروازے سے کچھ دور راجر زمین پر پڑا تھا۔ اس کی پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا۔ سارجنٹ ہل اور جیک اسے گھیر چکے تھے۔

"ہم نے اسے باہر نکلتے دیکھا لیکن آپ اندر ہی تھے۔ میں معاملہ بھانپ گیا۔" سارجنٹ ہل نے راجر کو قہر بار نگاہوں سے گھورا۔ "میں نے پہلا فائر اس کے ریوالور والے ہاتھ پر کیا اور دوسری گولی ٹانگ پر ماری۔ اب یہ فرار نہیں ہوسکتا۔"

"گڈ..." چیف انسپکٹر نے تعریف کی۔ "تم سب کی کارکردگی اچھی رہی۔ یہ سفاک قاتل پکڑا ہی گیا۔"

"میرے پاس اسے گرفتار کرنے کے لیے کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔ کیمبرج ٹاؤن میں اس نے قتل ضرور کیا تھا لیکن وہاں اس کے فنگر پرنٹس مجھے نہیں ملے تھے۔ نہ رابرٹ نے جوزف کے ساتھ اسے میدان میں جاتے دیکھا تھا۔ میں نے یہ تیر اس لیے چھوڑے تھے تاکہ یہ اعتراف جرم کرلے۔ اب اس کی گفت گو ریکارڈ ہوچکی ہے۔"

فلیمنگ کے اس انکشاف پر راجر کے چہرے پر غصے کے تاثرات ابھر آئے۔ اس کے دانت بھنچ گئے لیکن اب وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بے بس تھا۔ سارجنٹس کے ریوالورز اس پر تنے ہوئے تھے۔

پھر کچھ دیر بعد خطرناک مجرموں کو لے جانے والی مخصوص گاڑی آگئی تھی۔

اگلے دن فلیمنگ چیف انسپکٹر کے کمرے میں بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔

اچانک اس نے کہا۔

"مجھ سے ایک غلطی ہوگئی سر..."

"کیسی غلطی... ؟؟" چیف انسپکٹر نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"مجھے چاہیے تھا کہ راجر فورٹ کو اسی وقت' جب کہ وہ قابو آچکا تھا' گولی مار دیتا۔ اس بھیڑیے نے نہ معلوم کتنے بے گناہوں کو جان سے مار ڈالا۔ کتنے ہی گھر اجاڑ دیے لیکن پھر بھی اسے سزائے موت نہیں ہوگی کیوں کہ ہمارے ملک سے سزائے موت کا قانون ختم کردیا گیا ہے۔ مجھ سے جوزف اور پیرسن کی بیوی اور بچوں کا حال دگرگوں نہیں دیکھا جاتا۔ کتنی ہی بیویاں اپنے شوہروں اور بچے اپنے باپوں کے قتل پر مغموم ہیں لیکن اس درندے راجر کو سزا تب بھی نہیں ہوگی۔ بس یہ ہوگا کہ اس کی قید کی سزا کی مدت بڑھا دی جائے گی۔ جس سزا کا وہ حق دار ہے' وہ اسے یہاں ہرگز نہیں ملے گی۔ کیسا اندھیر ہے؟ افسوس ہے ہمارے مہذب ملک کے غیر مہذب قانون پر..."

فلیمنگ بڑے درد سے کہتا چلا گیا تھا اور چیف انسپکٹر تاسف آمیز انداز میں سر ہلا کر اس کی تائید کر رہے تھے۔

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھولیں گی

افسانہ برگد	جاوید انور
بلاعنوان	صائمہ قریشی
باباجی	ناظم بخاری
بوجھ	صوبیہ احمد
خسارہ	سیما بنت عاصم
اماں جنتے	ڈاکٹر عفت بھٹی

افسانہ..... برگد

جاوید انور

وہ تین دیہات کے عین وسط میں زمانوں سے چھایا ایک انتہائی شاندار گھنا گھنیرا، چھتنار، تناور برگد تھا اس کی موٹی، لمبی اور مضبوط شاخوں نے چاروں طرف ایسا دبیز، نرم اور خواب آور سایہ پھیلا دیا تھا کہ دن کو سورج کی قوی ترین کرن بھی اسے چیر کر زمین نہیں چھو پاتی تھی۔ مانو اس کے نیچے دن بھی رات ہی تھا۔ چیلوں اور ابابیلوں کا پسندیدہ مسکن۔ کبھی کبھار اپنی لمبی گردن جھلاتے گدھ بھی آنکلتے۔ ان کی بیٹوں سے ماحول ہر وقت ہلکی گیلی بو میں بسا رہتا۔ بگولے تخلیق کرتی، جھلساتی گرم دو پہروں اور زرد چاندنی راتوں میں گدھوں کی چیختی تیز آوازوں سے سناٹا گونج اٹھتا۔ چمگادڑیں چیں چیں کرتیں یا الو ہو کتے ہوائی جڑوں نے اسے جٹا دھاری یوگی سے مشابہت دے رکھی تھی۔ اس کے ارد گرد دور دور تک کوئی اور درخت نہیں تھا۔ یوں اس کی ویران تنہائی اسے انتہائی پُر اسرار، فسوں خیز اور دہشت انگیز بنائے ہوئے تھی۔ گاؤں کی کچی سڑک سے بہت دور ہونے کی وجہ سے شب کی تاریک سیاہی میں اس کی پُر اسراریت مزید خوف آگیں ہو جاتی۔ ہر کس و ناکس کو علم تھا کہ اس منفرد، مہیب نباتاتی شاہکار کے نیچے جنات بسیرا کرتے ہیں ان کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں اور عجیب الخلقت، غیر مرئی مخلوق کے بچے نادیدہ مدرسے میں حصول علم میں مشغول رہتے ہیں۔ اس روایت پر یقین ہی کی وجہ سے شاملات دیہہ ہونے کے باوجود یونین کونسل کے کسی لالچی اہلکار نے کبھی جرأت نہیں کی کہ اسے کاٹ کر بیچ کھائے۔ جنات سے ٹکر کوئی احمق ہی لے سکتا تھا۔

لوگ دن کو عموماً اس سے کترا کر گزر جاتے اور رات کو تو اس سمت کوئی بہت فاصلے سے بھی گزرنے کی جرأت نہ کرتا۔ گویا ایک ان دیکھی بادشاہت تھی جو اس علاقے میں اس شہنشاہ کی قائم تھی۔ یہ تصرف مستند اور متفقہ، قطعی اور غیر متنازعہ تھا۔

گاماں میراثن کا نام جس نے بھی غلام بی بی رکھا ہوگا اس نے زیادہ غور و فکر نہیں کیا ہوگا۔ اس کی ملاحت، گڑ گڑائی شکل، سیاہی مائل پتلے ہونٹ، ترشی ہوئی ستواں ناک اور شب دیجور کا جمالیاتی اسرار لیے بڑی بڑی شرارتی آنکھیں غلاموں کی سی نہیں تھیں۔ اس کی تیکھی سلونی ناک پر لٹکتا چاندی کا کوکا کسی مہکتی سرمئی شام میں اظہار کے طالب اولین ستارے جیسا ہی تھا۔

وہ جب جوانی کی دہلیز پر پہنچی تو کسی ہوئی کمان لگی۔ اس کے جنگلی، بے پروا اور بے عیب جسم میں کوئی کمی نکالی نہیں جا سکتی تھی سوائے گہرے گندمی رنگ کے، جو خامی کی بجائے خوبی بن گیا تھا۔ اس کے ناگن جیسے لہریں لیتے لمبے بال، بنا دیکھ ریکھ کبھی چوٹی میں گندھے، کبھی کھلے، جہاں جھولتے، نظر وہاں ٹکتی نہ تھی۔ وہ جاٹوں کے محلے سے گزرتی تو گبھرو چھورے خواہ مخواہ ڈھولے ماہیے اور ٹپے الاپنے لگتے۔

گاماں جتنی مقناطیسی تھی اتنی ہی طرار اور طرح دار بھی تھی۔ نہ تو کوئی اشارہ سمجھتی نہ منت ترلے کا اثر لیتی۔ اگر ذرا بھی نرمی دکھاتی تو جاٹوں کے سانڈ جیسے کڑیل جوان چھوکرے اسے ڈکار گئے ہوتے۔

لیکن ہاں ایک مقام تھا جہاں وہ رہ جاتی تھی۔ اور وہ تھا نمبرداروں کا اچھو۔

اچھو بھی تو تھا اپنی مثال آپ۔ پیراں دتے نمبردار کی اکلوتی اولاد۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، چوڑی چھاتی، بھاری کالی سیاہ مونچھوں کے اوپر پتلی ناک اور سفیدی گھلا گلابی رنگ۔ ہر دور نزدیک گاؤں کے میلے میں کبڈی میں اچھو اچھو ہوتی۔

"نی گاماں! اچھو فیر جت گیا ای کل کوڈی نویں پنڈ دے میلے وچ ای۔" گاماں کی سہیلیاں مزے لیتیں۔

"تو میں کیا کروں؟ گاؤں کی شان بنی ہے تو میں بھی خوش ہوں اور گاؤں بھی خوش۔ مجھے کون سا اس نے اپنی سردائی میں سے آدھا گلاس دے دینا ہے۔ اور شامت آگئی آ بے کی۔ اور رگڑے گا بادام تے خشخاس۔ چہار مغز تے گوند کتیرا۔ لگی لاچی پا کے۔ ہور کرے گا مالشاں۔"

جب بھی وہ اٹھکیلیاں کرتی، آدھی چلتی آدھی اڑتی رنگیلی بڑی بیٹھک کے سامنے سے گزرتی تو جان بوجھ کر چوری سے ادھر دیکھتی۔

اچھو سے ٹاکرا ہوتا تو انجانی خوشیاں برقی رو بن کر اس کے جثے میں کوند جاتیں۔ اس کا ذرہ ذرہ بج اٹھتا اور وہ خود کو لعل سائیں کے ایک تارے کی کسی خفی تار محسوس کرتی۔

انگلی کے ایک اشارے کی منتظر کہ مس ہو اور سُر بکھیرنے لگا

اور اچھو بھی تھا تاروں میں چاند۔ نجیب الطرفین۔ سونا اگلتے مربعوں کا اکلوتا وارث۔ بانکا سجیلا۔ پنڈ کی شان، مردوں کا مان تو گوریوں کا گوپی اور اپنی اس حیثیت کا پورا پورا ادراک رکھنے والا۔

گاماں کی مقناطیسی سوئی اس کے قرب سے تھرتھراتی اور اسی کی اور جا ٹکتی۔ کچھ تو تھا کہ اچھو کا سارا بانکپن گاماں کے آبنوسی تراشیدہ بدن کی قربت سے سلگنے لگتا۔ اسے اپنی برنائی کی بے کراں طاقت سمٹ کر قلب میں مجتمع محسوس ہوتی جو گاماں کے شرربار حسن میں تحلیل ہونے کے لیے تیار رہتی۔

”تجھے کیا نکالنا ہے مجھ سے اچھو جی! میں ڈومنی تو نمبردار کا پتر نمبردار۔ اُچے شملے۔ کیا کمی ہے تیرے پاس کسی بھی چیز کی۔ لڑکیاں ایک جھلک دیکھنے کو سو سو بہانے کرتی ہیں۔ نہ اپنا پینڈا کھوٹا کر نہ مجھے امتحان میں ڈال۔ شاد اشے۔ اپنی اپنی قسمت اپنا اپنا نصیب۔

منقولی آئی تھی تو یں پنڈوں اسلم کے لیے رشتہ مانگنے۔ ابے نے نہ ہاں کی نہ ناں۔ تانگہ منگوایا، نیا نوٹ دیا اور تانگے میں بٹھا لاری اڈے چھوڑ آیا۔ میری طرف واپس آیا تو آنکھیں گیلی تھیں اس کی۔ نہ روٹی کھائی نہ حویلی گیا۔ وڈے نمبردار نے شوکے کو بھیج کر بلایا تو نہ کردی۔ بولا تاپ چڑھا ہوا ہے۔ صحن کے کونے میں ننگی چارپائی پر دیوار کی طرف منہ کیے پڑا رہا۔ میں کپڑے دھوتی رہی، اپنے منہ دھیان۔ کبھی کبھی چوری چوری پیچھے سے دیکھتی تو لگتا اس کی پشت بھی رو رہی ہے۔ پر اچھو تیری سوہنی جوانی کی قسم، کبھی اک لفظ نہیں بولا ابے سے کہ تجھے کیا چاہیے۔ ابے کی آگ تیرے میرے دیکھنے کہنے سے بہت گہری لگی ہے۔ کبھی کبھی مجھے پورا یقین ہو جاتا ہے کہ ابا اللہ کا بندہ ہے۔ اس کے آگے اندر بھی باہر ہے۔ اچھو! تجھے میری مجبوری کی قسم بچ جا۔ نہ تمن جانیں مار۔ میرے ابے پہ ترس کھا۔ بھلے بندے، یہ ہزاروں بار کی دہرائی بالی جٹی کے تھیٹر کی کہانی نہ دہرا۔ نہ دہرا۔“

وقت بھی ایک بدمست لہریں مارتا دریا ہے۔ بے پروا اور منہ زور۔ دائیں بائیں کا ندھے مارتا گزرتا ہی چلا جاتا ہے۔ سو یہ خوا۔ گاماں کے باپ بگے میر عالم نے کبھی بات نہیں کی۔ گاماں بھی ایک لفظ نہیں بولی۔ اچھو کی تو رہنے ہی دے۔ اپنی شہ زور جوانی میں بدمست، اس بڑھتے ابلتے کینسر کو معمول جان کر یوں پالتا جیسے سانسوں کا حصہ ہو۔ آئے آئے تو آئے پر کبھی نہ جتائے، جو جائے تو سب جائے۔

عجب تکون بنی تھی۔ بڑی غیر فطری اور منفرد۔ جو سر بسر مشغول تھے وہ جیتے تھے اور جو باہر تھا۔ وہ اندر ہی اندر مر رہا تھا۔ کبھی آسمان کو تکتا تو کبھی زمین کریدتا۔ اس کے اندر کوئی کالی بلی مر رہی تھی۔ بلکہ مر چکی تھی اور اب آہستہ آہستہ گل سڑ کر بو دینے لگی تھی، جو دوسروں کو بھی سانس سانس احساس دلا رہی تھی کہ کچھ ہے جو مر رہا ہے، گل رہا ہے۔ سڑ رہا ہے۔

”اچھو! تم نے دیکھا ہے سوکھا کی ٹاہلی کی طرح خزجھاتے ہوئے ابے کو۔ یہ کیا ہو رہا ہے اس کو؟ ما تو بالکل خالی ہو رہا ہے اندر سے۔ کھوکھلا اور ہلکا۔ جیسے دیمک اندر ہی اندر سے چاٹ رہی ہو۔ کڑیل، شہتیر جیسا بندہ ڈولتا پھرتا ہے۔ اچھو مجھے ڈر لگتا ہے ابا کہیں آگے ہی نہ نکل جائے۔“

اچھو اس کے سفید دانتوں کی نورانی لکیر کو روکتا، کیف میں ڈوبتی سسکاری بھرتا۔ ”کچھ نہیں ہوتا چاچے بگے کو۔ نمبردار کا ہتھ ہے اس کے اوپر۔ بڑا رسوخ ہے۔ میرا ابا بھی بوڑھا بر گد ہے۔ گاموا تیرا ابا میرے ابے کی چھتر چھاؤں میں ہے۔ اسے سنتے ای خیراں ہیں۔

☆☆☆

جتنا بھنا اساڑھ آدھا گزر چکا تھا۔ گرمیاں جوبن پر تھیں۔ اس دن پتہ نہیں کیا غضب ہوا کہ مٹی اڑاتی لال آندھی چاروں طرف سے چڑھ دوڑی۔ واورولے (گرد باد) سلگتی گرم دوپہر کی ساری گرمی چوس کر زمین سے اُٹھتے تو گھمن گھیریاں کھاتے آسمان تک پہنچتے۔ گندم کی کٹ چکی فصل کی ناڑیاں، پرانے اخبار، پوحلی کے کٹے زرد خار دار جھاڑ، خشک پتے اور ٹہنیاں، کپڑوں کی غلیظ بوسیدہ دھجیاں اور چیل کوؤں کے فردار پر، جو بھی راستے میں آیا واورولوں نے پکڑا اور چکریاں دے کر آسمان پر چڑھا دیا۔

ہوا کا غصہ کم ہوا تو کثیف، مٹ میلے وسیاہی مائل بادل چاروں اور سے بھاگم بھاگ پہنچے اور گاؤں بھاگلپور کو اپنے حصار میں لے لیا۔

بارش جو ٹوٹ کر برسی تو جل تھل ایک ہو گیا۔ بارش نے اُس وقت تک رُکنے کا نام نہیں لیا جب تک ایک چوتھائی بھاگلپور کچی مٹی کا ڈھیر نہ بن گیا۔ غریبوں کے کچے پکے گھروں کی کچی دیواریں گارا بن کر درختوں کے ناتراشیدہ تنوں سے بنائے گئے شہتیروں کے نیچے بیٹھ گئیں۔ گیلے بھیگے، کانپتے سہمے، بڑے چھوٹے سب گاؤں کی واحد پختہ مسجد میں جمع ہونے لگے۔ جانوروں کو کھول دیا گیا۔ کوئی گائے بھینس، بچھڑا، بکری، گدھا تک باہر کو نہ بھاگا۔ بچی کچی دیواروں کی اوٹ میں سب جانور اکٹھا ہونے لگے۔

جی بھر رقص دباراں کے بعد بادلوں نے مشرق کی سمت، نیچے ہی نیچے، تقریباً زمین کو چھوتے ہوئے یوں بھاگنا شروع کیا جیسے کوئی مہیب خلا انہیں پوری قوت سے اپنی سمت کھینچ رہا ہو۔ چند ساعت میں سارا آسمان بالکل صاف اور گہرا نیلا میدان ہو گیا۔ گاہے گاہے بادل کا ایک چھوٹا آوارہ ٹکڑا آتا اور اپنے لشکر کے تاراج کردہ میدان کا جائزہ لیتا رہ جاتا۔

تیز چمکیلی نوکیلی دھوپ نکلی تو سلامت چوکیدار کچی گلیوں کے چکنے کیچڑ سے بچتا بچاتا لاٹھی ٹیکتا آ پہنچا۔ بکے کو آگے لگایا اور حویلی لے گیا۔

بڑی ہی دیر چھوٹی بیٹھک میں نمبردار اور بکے میر عالم کے سوا کوئی داخل نہیں ہو پایا۔ خیر دین اور سلامت اپنی لوہے کی شام والی لٹھیں پکڑے منج کے منجے پر چڑھے ٹانگیں جھلاتے پہرہ دیتے رہے۔

بڑا تھانیدار جیمہ تشدد کے لیے ضلع بھر میں مشہور تھا غلام رسول فقیر کو جب اُلٹا لٹا کر خوب چھتر مارے تو اس کی چیخیں آدھے گاؤں والوں نے سنیں دینو اوڈھ کو سردارے والے بڑے شہتر کے ساتھ اُلٹا لٹکایا اور بھول گیا۔ یہاں تک کہ اس کے ڈھیلے باہر اُبل آئے۔ کوئی مان کے نہیں دے رہا تھا کہ اُس طوفانی دن کے بعد چھائی گہری، اندھیری، حبس زدہ رات میں کس نے گاماں کو گلا گھونٹ کے مارا اور کون بکے کی لاش کو روہی والے پکے برگد پر لٹکا آیا۔ نمبردار نے اپنے سامنے تفتیش کروائی کیونکہ بکا میر عالم اس کا خاص الخاص پشتنی میراثی تھا۔

کوئی کہتا، بکے نے خود گاماں کو مارا اور اپنی لمبی بھوری چادر برگد کی اونچی ٹہنی سے باندھ کر جھول گیا۔ مولوی صاحب سمیت ایک کثیر تعداد اس خیال کی قائل تھی کہ بکے نے برگد کے نیچے پیشاب کر کے جنوں کی دعوت خراب کر دی تھی۔ پھر یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔

بکے اور گاماں کی قبریں گاماں کی مرحومہ ماں کی قبر کے دونوں طرف بنائی گئیں مولوی صاحب اور ان کے شاگرد چالیس دن تک پڑھائی کرتے رہے۔

☆☆☆

اچھو نمبردار کی شادی پر چاندی کے روپوں کی وہ چھوٹ پڑی کہ کھیت سفید ہو گئے۔ آتش بازی سے سارا گاؤں گلنار ہو گیا۔ پندرہ بکرے اور دو بچھڑے کٹے تو ولیمہ ہوا۔ پورے گاؤں نے دو دن چولہا جلایا نہ ضرورت محسوس ہوئی۔ زوپ دھاریوں کی ٹولیاں ہنڈولے جلائے فجر کی اذان تک دھما چوکڑی مچاتیں احمد دین نائی نے اپنے سارے رشتے دار بلوائے

تو کہیں جا کر دیگیں پکیں۔ عنایت حلوائی اور اُس کا بیٹا سارا ہفتہ کڑھائی چڑھائے کھویا مار کر برفی اور نرم بالوشاہی بناتے رہے تو گاؤں بھر کا ناشتہ بھگتایا۔ سارے گاؤں نے پورا ہفتہ شادی کا جشن منا کر ریت نبھائی۔

......☆☆☆......

وقت کا دریا بہتا رہا، بہتا رہا۔ مدتیں گزر گئیں۔ بوڑھے آسیب زدہ برگد نے بھی کئی موسم دیکھے اور کئی سرد و گرم جھیلے۔ اُلوؤں، چیلوں، گِدھوں اور چمگادڑوں کی نئی نسلیں آباد ہوئیں۔ گاؤں میں کئی بار سن کے پیلے، السی کے نیلے اور سرسوں کے زرد پھول کھلے پھر سوکھ گئے۔ بیریوں پہ بور آیا، کچے لیس دار بیر بیل کے مجور بنے اور اتر گئے۔ کماد کے نوئے پھوٹ کر گزدوں لمبے گنے بنے، کٹے، بیلن میں سے گزر کر رؤ اور کڑاہی میں کڑھ کر گڑ بنے۔ کتنی بار سرسوں کی گندلیں نکلیں اور مٹیاروں نے توڑ توڑ کر ساگ گھڑیاں بنائیں۔ کتنی ہی بار گاؤں کے کچے کوٹھوں کو توڑی ملی سوندھی مٹی سے لیپا گیا۔۔۔

مدتوں بعد مجھے گاؤں کی یاد ستائی تو واپس لوٹا۔ زمانہ بدل چکا تھا۔

اسٹیشن کے باہر گاؤں کے لئے تانگہ مل گیا۔ مریل گھوڑی انجر پنجر ہلے یکے کو جھولتی جھلاتی شام ڈھلے گاؤں کے قریب آ پہنچی۔ گاؤں بہت پھیل چکا تھا۔ بہت سے کھیت کھلیان جنہیں میں پہچانتا تھا آبادی نے نگل لیے تھے۔ گاؤں سے کوس بھر دور وہ بوڑھا برگد جہاں بھوتوں کے بچے مدرسہ لگاتے اور جنوں کے قافلے پڑاؤ کرتے تھے مجھے نیچی کھنستا ہوا نظر آیا۔ اس سے زیادہ حیرت یہ دیکھ کر ہوئی کہ جس پر اسرار مہیب دیو کے آس پاس کوئی پھٹکتا نہیں تھا اس کے گرد آریاں کلہاڑے لئے خلقت کا ایک اژدہام تھا کہ کلبلاتا پھر رہا تھا۔ بڑی بڑی ٹہنیاں کاٹی جا رہی تھیں اور ٹکڑے کر کے درجنوں بیل گاڑیوں میں لادے جا رہے تھے۔ پتوں کے انبار تھے جو بیگھہ بھر زمین کو سبز کئے ہوئے تھے۔ گاؤں میں کسی شادی پر عبدل موچی کا لاؤڈ اسپیکر پوری قوت سے عالم لوہار کی 'جگنی' کو چھت پر ٹنگے چاروں ہارنوں (بھونپو) سے دور دور پہنچا رہا تھا۔

میں نے لالو تانگے والے کی طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ منہ کو ہلاتی لگام کھینچ کر بولا۔ "جناب! پورے پینتیس ہزار کا نیلام ہوا ہے بوڑھا برگد۔ دس گاؤں میں ڈھول بجا کر منادی کر کے بولی لگی۔ اس پیسے سے یونین کونسل کا نیا دفتر بنے گا۔"

......☆☆☆......

بلا عنوان

صائمہ قریشی

"کاش کوئی میرا دکھ بھی لکھے۔"

"کاش کوئی میرے آنسوؤں کا بھی حساب لے۔"

"کاش کوئی یہ بھی جانے درندگی صرف مرد کے حصے میں نہیں آئی لیکن کون ہے ایسا جو میرا یقین کرے؟ کون ہے جو میری سچائی پر میری آواز کو بلند کرے؟ کون ہے ایسا جو میری سسکیوں پر مجھے تھپکی دے کر سلا سکے؟"

لوگوں کے ہجوم میں وہ ایک آواز سب سے نمایاں تھی، میں لوگوں کے مسائل حل کرتی تھی، آج بھی ایک کیس کے سلسلے میں ایک ایونٹ میں آئی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کا ایک خوبرو نوجوان تھا، تیکھے نقش میں ایک انوکھا طلسم تھا جو یک دم اپنی گرفت میں جکڑ لینے کی قوت رکھتے تھے لیکن اس کی حالت دیکھ کر لگتا تھا وہ کوئی ذہنی مریض ہے، عجیب ہذیانہ تھا، ایک بے بسی ایک الجھن اس کے چہرے پر جھلک رہی تھی، بہت سے لوگوں کو اس پر ہنستے دیکھا، بہت سی آنکھوں میں ہمدردی بھی تھی لیکن آگے بڑھنے والا کوئی نہ تھا۔

"میں..... میں سنوں گی، مجھے سناؤ یہ داستان، میں تمہاری آواز بنوں گی مجھے بتاؤ۔"

میری آواز پر جہاں اور لوگ چونکے وہاں وہ بھی ٹھٹکا لیکن بے یقین تھا، نا امید تھا۔ مجھے دیکھا اور میرا اعتبار کیے بنا اپنی فریاد سنائے بغیر چلا گیا اور میں اس کی کھوج میں لگ گئی۔

"پاگل ہے۔"

"چوریاں کرتا ہے۔"

"گالیاں بھی نکالتا ہے۔"

"کچھ کہو تو مارتا ہے۔"

"بس چیختا، چلاتا ہے۔"

"تو بی بی کوئی سرپھیرا ہی ہوگا جو اس کے منہ لگے گا۔ آپ بھی جانے دو اور اپنا کام کرو۔" جس سے بھی اس کے بارے میں پوچھا یہی سننے کو ملا۔

"اس کی پکاریں عجیب پراسراری تھیں۔ کچھ کھوجنے پر اکساتی ہوئی، ایک دستک محسوس ہوتی تھی اور یہ "ٹھک ٹھک" نجانے کہاں ہو رہی تھی کہ آواز تو آتی تھی لیکن سمت کا اندازہ نہ ہو رہا تھا۔

اور پھر وہ ملا، ایک اور جگہ اسی انداز میں چیختا، چلاتا۔ فریادیں کرتا۔

"مجھے بتاؤ، کیا ہوا ہے؟"

"ہا...... ہاتھ نہ لگانا، مار ڈالوں گا۔" میں نے اس کے بکھرے بال سلجھا کر اس کو تسلی دینا چاہی تھی کہ وہ میرا ہاتھ جھٹک کر چلا اٹھا۔ اتنی نفرت سے مجھے دیکھا، اتنی بے یقینی سے کہ میں لرز کر رہ گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے اس سے پوچھا، اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی سرخ آنکھوں میں خون اترا ہوا محسوس ہوا۔

"مجھے بتاؤ، میں تمہاری مدد کروں گی۔" میں نے لہجے کو حتی الامکان پر یقین بنا کر اس سے پوچھا۔ تو یک لخت اس کا قہقہہ مجھے دہلا گیا۔

"مردوں کے معاشرے میں جب مرد پر ہی ظلم ہو تو کوئی بھی مدد نہیں کر سکتا۔" وہ خونخوار نظروں سے مجھے دیکھ کر بولا۔

"ظلم کسی پر بھی ہو، معاشرہ کسی کا بھی ہو انصاف کا در کھلا ہوتا ہے۔" میں اس کے تاثرات پر کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیے بنا نرمی سے کہا۔

"عورت جب ایک عورت کو نہیں بخشتی تو مرد کو کیسے چھوڑ سکتی ہے۔" اس کی آنکھوں میں، میں نے نفرت دیکھی تھی۔ عورت کے لیے نفرت اور مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی کم عمری میں عورت کی طرف سے بے وفائی کا اتنا گہرا اثر کیونکر ہوا؟

"ایسی بات نہیں ہے، ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، مجھے بتاؤ کس نے تمہیں چھوڑا ہے؟" اب کے میرے اندر ایک تجسس بھی ابھر رہا تھا کہ جلد از جلد اس کی "لو اسٹوری" پتہ چلے۔

"اونہہ" وہ ہنکارا اور عجیب نظروں سے مجھے دیکھا کہ مجھے اس کی نظریں اپنے آر پار ہوتی محسوس ہوئیں۔

"تم نے کبھی رقص دیکھنا ہے کیا؟"

وہ نظریں مجھ پر جمائے پوچھنے لگا۔

"میرا رقص...... ایسے......" وہ میری الجھن سمجھ کر دونوں ہاتھوں کو ہوا میں بلند کر کے عجیب انداز میں اپنی کمر کو حرکت دینے لگا۔ اس کی عجب حرکت پر مجھے شرم محسوس ہوئی تو میں نے منہ پھیرا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور ہنستا چلا گیا تو اس کی ذہنی حالت کے بارے میں جو سنا تھا مجھے اس پر یقین ہونے لگا۔

"وہ میری ماں کی سہیلیاں تھیں، مجھ سے ننگا ڈانس کروانے والی۔"

میں ایک سوشل ورکر تھی اور بھی کام ہوتے تھے اس کے قہقہے کے بعد میں نے اس کی کھوج کا ارادہ ملتوی کر دیا چند قدم

بڑھائے تھے کہ اس کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔
"کیا مطلب؟" ایک ہی جست میں، میں دوبارہ اس کے سامنے تھی۔
"اخ تھو" دوسرے لمحے وہ پھر اسی نخوست بھرے لہجے میں مجھے دیکھنے لگا تھا۔
"دیکھو میں نے تو کچھ نہیں کیا ناں؟" (مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ کون سے "ظلم" کا شکار ہے)
"بتاؤ مجھے کیا کیا انہوں نے؟" میں نے پھر نرم لہجے میں اس سے پوچھا۔
"مردوں کے معاشرے میں صرف عورت مظلوم نہیں کبھی کبھی ایک مرد کو بھی ظلم کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ عورت کے ظلم پر اس کی آواز کو بلند کرنے کے لیے ایک اور عورت سامنے آ جاتی ہے لیکن مرد کی آواز کو کوئی نہیں سنتا۔ سن بھی لے تو یقین نہیں کر سکتا۔"
اس نے بہت گہری بات کہی تھی یقیناً اس لمحے وہ حواس میں تھا میرے تجسس کی رگ پھر پھڑکی تھی میں نے مزید پوچھنا چاہا۔
کبھی کبھی ہم ادھوری کہانی کو اپنے مطلب کا انجام دے دیتے ہیں ان کہی داستانوں سے اپنے مطلب کا نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ ہماری بدنصیبی یہی ہے کہ ہم سامنے والے کی تکلیف کا اندازہ اس کے اندر جھانک کر نہیں اس کی ظاہری حالت سے کر لیتے ہیں وہ یک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا شاید اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں سب کچھ جاننا چاہ رہی ہوں اس نے پھر قہقہہ لگایا اور اٹھ کر چل پڑا۔ میرے بار بار پکارنے پر بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ بہت سے سوالوں کے جواب ادھورے چھوڑ کر وہ چلا گیا اور پھر مجھے نظر نہ آیا۔ بہت تلاش کیا لیکن کوئی اس کے بارے میں نہ جانتا تھا۔
لیکن مجھے اس کی ادھوری بات اور پوری طرح بگڑے حواسوں نے ایک نیا عزم دیا تھا ایک نئی سوچ دی تھی۔
اب اس پر کام کرنا ہے۔ آگہی کے بہت سے در، جن پر قفل لگے ہیں ان کو توڑنا ہے۔ مجھے آپ کا ساتھ، آپ کی دعا چاہیے۔
دیں گے ناں میرا ساتھ؟
کریں گے ناں دعا؟

......☆☆☆☆......

بابا جی
ناظم بخاری

اس وقت میں بہت چھوٹا سا تھا۔ غالباً چھ سات سال کا، جب میں نے پہلی بار ان بابا جی کو دیکھا تھا۔ سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی اس شام میں وہ سڑک کنارے اپنے آپ سے بے نیاز ہو کر "ہو ہو ہو" کا ورد الاپنے میں مصروف تھے۔ اس "ہو ہو" کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ خدا کو یاد کر رہے تھے۔ نہیں، بلکہ اس ہو ہو سے وہ خود کلامی میں مبتلا کسی وحشی کی طرح نظر آتے تھے، جس کا خود پر اختیار نہیں ہوتا۔ جو اپنی اذیت کو کم کرنے کے لیے یا ساری دنیا سے غافل رہنے کے لیے اس طرح کی لاشعوری حرکت کرتا رہتا ہے۔ میں نے جس وقت انہیں دیکھا تھا، وہ مجھے بہت میلے کچیلے اور بوسیدہ سیلا پس میں نظر آئے تھے، جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ انہیں پہلی بار دیکھتے ہی میرے دل میں ان کے لیے ہمدردی کی ایک گہری لہر اتر گئی تھی۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں انہیں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں۔ انہیں نہلاؤں، دھلاؤں اور صاف ستھرا کرنے کے بعد اپنے بابا کے گرم گرم سے کپڑے پہنا کر، اس چھوٹے سے کچے کمرے میں سلا دوں، جسے ماں کھانا بنانے کیلیے استعمال کرتی تھی۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔ کہرے کا موسم تھا۔ مغرب کے فوراً بعد سے ہی دھند پڑنی شروع ہو جاتی اور کئی کئی دن پڑی رہتی۔ ہم لوگ سورج کی شکل دیکھنے کو بھی ترس جاتے۔ گھر میں ہم صرف سات، آٹھ افراد رہتے تھے۔ ماں اور ابا، ہم تین بھائی اور تین بہنیں۔ سب سے بڑا ندیم بھائی تھا، اٹھارہ سال کا۔ اس سے چار سال چھوٹی بڑی آپی تھی۔ ان سے چھوٹی ایک اور بہن تھی اور ان کے بعد میرا نمبر تھا۔ مجھ سے چھوٹے ایک بھائی اور ایک بہن اور تھی۔ گھر کی ساری ذمہ داری بڑے بھائی اور ماں کے کاندھوں پر تھی۔ وہی دونوں مل کر گھر کا خرچ اٹھاتے تھے۔ ابا اس ذمہ داری سے سبکدوش تھا۔ وہ ذہنی مریض تھا۔ وہ ہمارا تو کیا اپنا بوجھ بھی اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ بھائی، سولہ سال کا تھا جب اسے دسویں کا امتحان دیے بغیر ہی ایک دھاگے والی مل میں کام کے لیے جانا پڑا تھا۔ ماں، آس پاس کے چند ایک متوسط طبقے کے لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی، جس کے ہر گھر سے انہیں صرف سو سو روپے ملتے تھے۔ سو روپیہ ایک گھر کا۔ تین چار سو کے لگ بھگ بھائی کی تنخواہ آجاتی تھی۔ ماں اور بھائی کی کل رقم سے بمشکل گھر کا سرکٹ چل پاتا۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب چھ سات سو، آج کے چھ سات ہزار کے برابر تھے۔ چھ سات ہزار میں سات آٹھ افراد کا پلنا، ایک ناممکن بات ہے، مگر ہمارا گزارہ ہو جاتا۔ وہ یوں کہ ہمیں کھانا بنانے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ ہمارے سالن اور روٹی کا بندوبست آس پاس والوں نے کیا ہوا تھا۔ صبح آٹھ، دس گھروں سے آٹھ دس روٹیاں آجاتی تھیں اور اتنی ہی رات کو، جس سے ہم سب گھر والوں کے پیٹ کا دوزخ بھرتا تھا۔ جب میں چھوٹا تھا، تب یہ روٹیاں لینے کی ذمہ داری بڑے بھائی کی ہوا کرتی تھی۔ وہ صبح سویرے مدرسے سے قرآن شریف پڑھ کر لوٹتا تو اماں اس کے ہاتھوں میں رومال والی چنگیر اور پالٹی رکھ دیتی اور بھائی وہ سامان لے کر صبح کا "ناشتہ" لینے کے لیے چل دیتا۔ آدھے پونے گھنٹے بعد ہی اس کی واپسی ہو جاتی۔ ہم سب بہن بھائی اس کے واپس لوٹنے کا بے تابی سے انتظار کرتے تھے۔ تاکہ وہ آئے تو ہمیں کھانا نصیب ہو۔ صبح کے ناشتے میں اکثر خشک روٹیاں اور رات کا باسی سالن ہی ملتا، جس سے ہماری پیٹ کی آگ بجھا کرتی۔ کبھی کبھار خشک روٹیوں کے ساتھ کسی گھر سے گھی میں تر ایک دو روٹیاں اور پراٹھے بھی مل جاتے، جس کے ساتھ چائے بھی ہوتی۔ وہ ناشتہ ہم سب کا پسندیدہ ناشتہ ہوتا۔ مگر وہ پسندیدہ ناشتہ، ایک ہی وقت میں سب کو ملنا ممکن نہ ہوتا۔ جس کا ماں نے یہ حل نکالا ہوا تھا کہ اس نے ہم سب بہن بھائیوں کی "باری" بنائی ہوئی تھی۔ اگر ایک دن بڑے بھائی کو وہ پراٹھا اور چائے ملتی تھی تو اس سے اگلے دن بڑی باجی کو۔ اس سے اگلی بار دوسری بہن کا نمبر ہوتا اور اس کے بعد میرا۔ میرے بعد دوسرے بہن بھائیوں کی باری آتی۔ ہم سب ماں کے اس طرح کے طریقے سے خوش بھی تھے اور راضی بھی۔ ان کا یہ طریقہ اور اصول ہم سب بہن بھائیوں کو بہت پسند تھا۔ ناشتہ کرنے کے بعد بھائی اسکول چلا جاتا اور ماں لوگوں کے گھروں میں کام کرنے۔ پیچھے مجھ سے بڑی باجی ہم بہن بھائیوں کا خیال رکھتی۔ صبح ہمارا اس طرح سے پیٹ بھرتا اور رات کو بھائی، ہماری بستی اور گھر سے ایک میل دور "جھوک پور" نامی بستی سے ہمارے لیے کھانا لاتا۔ آس

پاس کے لوگوں کا اتنا احسان بھی بہت تھا کہ وہ ہمارے لیے صبح کے ناشتے کا بندوبست کر دیتے تھے۔ رات کے کھانے کے وہ ذمہ دار نہیں تھے۔ یہ مہربانی "جھوک پور" کے لوگوں نے ہم پر کر دی تھی۔ وہ بہت اچھے لوگ تھے۔ خوش اخلاق، بھلے مانس اور نیک۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ ابا ذہنی طور پر معذور ہے اور کمانے کے قابل نہیں۔ گھر میں آٹھ دس افراد رہتے ہیں۔

ان کے پیٹ کا دوزخ تو کسی نہ کسی طرح بھرنا ہے۔ سو ہماری مدد کے خیال سے اس بستی کے آٹھ دس لوگوں نے ہمیں رات کو، ایک ایک روٹی اور سالن دینے کی ہامی بھر لی تھی ۔۔۔۔۔ بھائی مغرب کے بعد سے ہی رومال والی چنگیر اور ایک پیالہ نما سی بڑی سی کٹوری لے کر جھوک پور کی بستی کی طرف نکل جاتا اور عشاء • کی نماز کے کچھ دیر بعد تک واپس لوٹتا۔ پیچھے ہم سب بہن بھائی، اس کے جلد لوٹنے کی دعا کیا کرتے۔ پتہ نہیں کیوں، ایک تو ان دنوں اپنے گھر کا ذاتی کھانا نہیں تھا اور دوسرا ان دنوں ہم سب کو بھوک بھی بہت لگتی تھی ۔۔۔۔۔ پھر ایک دن بھائی معمول کے مطابق مغرب

کے وقت کھانا لینے گیا اور عشاء کے بعد تک بھی واپس نہ آیا تو ماں کے ساتھ ہم سب کو بھی فکر ہونے لگی کہ خدا خیر کرے، بھائی کہاں رہ گیا؟ پھر اس سے پہلے کہ ماں بھائی کا پتہ کرنے کے لیے گھر سے نکلتی، بھائی واپس آ گیا۔ اس کے چہرے اور سر پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ سالن والے پیالے کا سارا سالن کہیں گر گیا تھا اور چنگیر میں پڑی ہوئی روٹیاں خاک آلودہ تھیں۔ بھائی نے آتے ہی ماں سے کہا۔ ''میں نے جان بوجھ کر نہیں گرایا یہ سب۔ اصل میں اتنی روٹیاں اور سالن سنبھالنا میرے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اور پھر سفر بھی تو اتنا زیادہ ہے کہ آتے آتے میرے ہات دکھ جاتے ہیں۔ آج میں کھانا لے کر آ رہا تھا کہ راستے میں اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور...... '' پھر اس سے پہلے کہ بھائی اپنی صفائی میں اور کچھ کہتا، ماں نے اسے چپ ہو جانے کو کہا تھا۔ اس کے بعد ماں نے ان سب روٹیوں کو پانی سے دھویا تھا اور ہم بہن بھائیوں کے آگے لا کر رکھ دی تھیں۔ اس رات وہ خاک آلود روٹیاں، جنہیں دھونے کے باوجود ان میں خاک کے ذرات رہ گئے تھے، ہم نے بغیر سالن کے اپنے حلق سے اتاری تھیں۔ اگلے دن ماں نے بھائی کی اس مشکل کو حل کر دیا تھا۔ اس نے بھائی کو چنگیر اور سالن والا پیالہ دینے کی بجائے، ایک چھوٹی، ایک کلو والی بالٹی اور ایک بڑی سات آٹھ کلو والی بالٹی تھما دی تھی۔ بڑی بالٹی روٹیوں کے لیے تھی اور چھوٹی بالٹی سالن کے لیے۔ اس دن سے بھائی کو بہت سہولت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ میں چھوٹی بالٹی سنبھالتا اور دائیں ہاتھ میں بڑی بالٹی اور ان میں سالن روٹیاں لے کر آسانی سے گھر آ جاتا۔ اس دن کے بعد بھائی کے ہاتھ سے کبھی سالن اور روٹیاں نہیں گری تھیں۔ رات کو بھائی، جب وہ سالن اور روٹیوں والی بالٹیاں لا کر ماں کے ہاتھ میں تھماتا، تو ہم بہن بھائیوں کے لیے وہ وقت تھوڑے تجسس اور دلچسپی کا ہوتا۔ تجسس اور دلچسپی اس بات کی ہوتی کہ آیا بھائی آج دونوں بالٹیوں میں کیا کیا لے کر آیا ہے؟ کیوں کہ کبھی کبھار کسی گھر سے کبھی چاول بھی مل جاتے تو کبھی کھیر۔ کہیں سے کبھی کبھار حلوہ مل جاتا تھا اور کہیں سے سویاں۔ بھائی کبھی کبھار گوشت بھی لے آتا تھا اور کبھی مچھلی اور انڈا۔ ان سب چیزوں میں سے بھائی کوئی ایک چیز بھی لاتا تو ماں ایک پل کو آزمائش میں پڑ جاتی کہ وہ ''خاص'' چیز کسے دی جائے؟ پر اگلے ہی پل ماں کی یہ پریشانی دور ہو چکی ہوتی۔ کیوں کہ اس نے اس کے لیے بھی ایک ترتیب وار نمبر بنایا ہوا تھا۔ اگر چیز تھوڑی ہوتی تو جس کا نمبر ہوتا، اسے مل جاتی، اور اگر وہ زیادہ ہوتی تو ماں تھوڑی تھوڑی وہ چیز ہم سب بہن بھائیوں میں بانٹ دیتی۔ ایسی اچھی چیزوں میں سے، مجھے کبھی یاد نہیں کہ اس نے اپنے لیے بھی کوئی چیز نکالی ہو یا چکھی ہو۔ یہ سب مزے، میرے، دوسرے بہن بھائیوں کے یا ابا کے ہوتے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ ماں کو بھوکا بھی سونا پڑ جاتا تھا۔ وہ یوں کہ اگر کسی گھر میں کسی وجہ سے کھانا نہ بنا ہوتا، یا وہاں دیر ہوتی تو بھائی اس گھر سے کھانا لیے بغیر ہی گھر آ جاتا تھا اور اپنے ساتھ ایک روٹی کم لاتا تھا۔ جس کی قربانی ماں کو دینا پڑتی تھی۔ ہمارا اس طرح سے، صبح اور رات کا گزارہ ہو جاتا تھا مگر دوپہر...؟ اس کے لیے مشکل ہوتی تھی مگر یاں نے اس کے لیے بھی کچھ نہ کچھ کیا ہوا تھا۔ وہ صبح سویرے ہی جن لوگوں کے گھروں میں کام کرنے کے لیے نکل جاتی تھی، وہاں سے سہ پہر ڈھلے ہی واپس آتی۔ جب وہ واپس آتی تو اس کے ایک ہاتھ میں چار پانچ روٹیاں اور ایک کٹوری میں کچھ حد تک سالن ہوتا، جو وہ کام کرنے والوں کے گھر سے لاتی تھی۔ لوگوں کے گھروں میں کپڑے برتن دھونے، صفائی ستھرائی اور جھاڑ پونچھ کرنے کے علاوہ، وہ گرمیوں کی کڑی دھوپ میں، ان کے گھروں میں تندور پر روٹیاں بھی پکاتی تھی۔ اس بات کا مجھے اس دن پتہ چلا تھا، جس دن ماں کو آنے میں کچھ دیر ہو گئی تھی اور میرا بھوک سے بہت برا حال تھا۔ بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر میرے قدم اس گھر کی طرف اٹھ گئے تھے، جہاں مجھے اندازہ تھا کہ ماں وہاں ہو گی۔ مگر میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ ماں اس گھر میں روٹیاں پکا کر، کسی اور گھر میں یہی کام کرنے میں مصروف تھی۔ گرمیوں کی کڑکتی دوپہر میں، تندور پر روٹیاں پکاتے ہوئے اس کا پورا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ قمیص کا کچھ حصہ بھی پسینے سے تر تھا۔ مجھے انہیں اس حال میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا۔ میرا دل اچانک ہی بھینچنے لگا تھا۔ ماں کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ بھاگ کر میرے پاس چلی آئی تھی۔ انہوں نے میری پیشانی اور گالوں کو چومتے ہوئے کہا تھا۔

’’تو اتنی گرمی میں یہاں کیوں آیا ہے؟ دیکھ تو کتنی گرم لو چل رہی ہے... اگر تجھے کچھ ہو گیا تو...‘‘ ’’مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ تو اتنی دیر سے گھر نہیں آئی تو میں خود ہی چلا آیا‘‘ ماں نے ایک گہری سانس لی تھی ’’اچھا تو بیٹھ، میں تجھے روٹی دیتی ہوں‘‘ میں وہیں فرش پر بیٹھ گیا تھا۔ ماں نیا اپنے ساتھ رکھے ہوئے رومال میں بندھی ہوئی روٹی اور کٹوری سے سالن نکالا اور میرے سامنے رکھ تھا۔ کھانا دیکھتے ہی میں بھوکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا کھاتے ہوئے میری نظر بار بار ماں کی طرف اٹھتی رہی۔ مجھے روٹی دینے کے بعد وہ پھر روٹیاں لگانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے ماں سے کہا۔ ’’اماں! تم یہ کام مت کیا کرو۔ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔ دیکھو تو کتنی گرمی ہے۔ اتنی گرمی میں تندور پر روٹیاں لگانا کتنا مشکل ہوتا ہوگا؟‘‘ ماں میری بات سن کر مسکرائی تھی۔ ’’ہاں یہ تو ہے... پر پتر! یہ کام کیے بغیر چارہ بھی تو نہیں ہے۔ اگر میں دوپہر کو لوگوں کے گھروں میں تندور پر روٹیاں نہیں لگاؤں گی تو ہم دوپہر کو کھائیں گے کیا...؟‘‘ ’’ہم بھائی کو بھیج دیں گے۔ وہ جہاں سے صبح اور رات کا کھانا لاتا ہے، دوپہر کا بھی لے آئیگا۔‘‘ ماں میری بات سن کر دھیرے سے ہنس دی تھی ’’میرا بھولا پتر! اب ہر کوئی اتنا سخی بھی نہیں ہے کہ وہ صبح کا کھانا بھی دے، دوپہر کا بھی اور رات کا بھی۔ اور پھر یوں ہر کسی سے مانگ کر کھانا اچھی بات بھی تو نہیں ہے۔ اللہ نے ہاتھ پیر دیے ہیں، ان سے محنت لے کر بھی تو رزق حاصل کیا جا سکتا ہے...؟‘‘ میں نے ان کی بات نظر انداز کر دی تھی۔ ’’مجھے نہیں پتہ۔ بس تم دھوپ میں یوں دوسروں کی روٹیاں مت پکایا کروں...‘‘ میں نے اٹھلاتے ہوئے کہا تھا۔ ماں مسکرا دی تھی۔ ’’اچھا، جب تم کمانے لگو گے تو میں دوسروں کے گھروں میں کام کرنا چھوڑ دوں گی۔‘‘ ’’میں کماؤں گا کب...؟‘‘ ’’جب تم بڑے ہو جاؤں گے‘‘ ’’اور میں بڑا کب ہوؤں گا؟‘‘ ’’بس کچھ ہی سالوں میں‘‘ اور ان بس کچھ ہی سالوں کی مجھے سمجھ نہیں آتی تھی۔ پتہ نہیں یہ کچھ سال کب آتے اور کب میں بڑا ہو کر کمانے لگتا..... گھر میں ماں اور ابا کی ہمیشہ لڑائی رہتی تھی۔ ماں کہیں سے ذرا دیر سے لوٹتی اور ابا کی رام کہانی شروع ہو جاتی۔ ’’کہاں سے آ رہی ہے تو...؟‘‘ ’’کام سے آ رہی ہوں اور کہاں سے آنا ہے مجھے‘‘ ’’اتنی دیر کیوں لگائی ہے؟‘‘ ’’میاں صاحب کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے، اس لیے دیر ہو گئی۔‘‘ ’’میاں صاحب کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے یا میاں جی خود مہمان بنے ہوئے تھے...؟‘‘ ابا کا اچانک ہی پارا چڑھ جاتا۔ ’’سالی حرامزادی! بکواس کرتی ہے مجھ سے۔ جھوٹ بولتی ہے؟ سچ سچ بتا، کتنی دیر تک اس کا پاس گرم کرتی رہی ہے تو، جو تجھے اتنی دیر ہو گئی ہے...؟‘‘ اماں ایک ٹھنڈا سانس بھر کر رہ جاتی۔ ’’دیکھ فیضی کے ابا، کچھ خدا کا خوف کر، شرم کر کچھ۔ وہ میرا بھائی ہے... بہن سمجھتا ہے مجھے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو آج بچے بھی بھوکے مرتے اور تو بھی... کیوں اس شریف انسان کا نام لے کر اپنی آخرت برباد کرتا ہے؟‘‘ ’’اچھا!‘‘ ابا اچانک مجھے پکڑ لیتا ’’سچ سچ بتا، اس کی شکل تیرے اس یار سے ملتی ہے یا نہیں؟‘‘ میں اچانک ہی تھر تھر کانپنے لگتا۔ مجھے ابا کے غصے سے بہت خوف آتا تھا۔ ’’یہ... آپ کا بیٹا ہے، آپ پر گیا ہے یہ۔‘‘ ابا اچانک چھوٹے بھی کو پکڑ لیتا۔ ’’اٹھا قرآن کی قسم کہ یہ اس کمینے کا بیٹا نہیں ہے...؟‘‘ اچانک اماں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ ’’خدا کی قسم قرآن کی قسم یہ آپ کا ہی بیٹا ہے۔‘‘ ابا آگے بڑھتا اور پوری قوت سے اماں کے رخسار پر ایک طمانچہ جڑ دیتا۔ ’’سالی حرام زادی! ایک چوری اوپر سے سینہ زوری... گناہ بھی کرتی ہے اور ساتھ بکواس بھی۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ جس میاں جی کے ہاں تو کام کرنے جاتی ہے، وہ تیرا بھائی نہیں یار ہے...‘‘ ’’کوئی نہیں کہتا یہ بات‘‘ اماں لہجہ بھیگے ہوتا۔ ’’بس تو اپنی طرف سے خود ہی یہ باتیں سوچتا رہتا ہے۔‘‘ ’’اچھا اچھا، زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ ابا اچانک ہی موضوع بدلتے ہوئے کہتا۔ ’’چل کھانا دے مجھے اور ایک سگریٹ بھی۔‘‘ اماں اپنے آنسو پونچھتی اور ابا کو کھانا اور سگریٹ دیتی۔ مجھے ابا کا سگریٹ پینا ذرا بھی نہیں بھاتا تھا۔ ایک دن میں وہ کم سے کم دس سگریٹ ضرور پیتا تھا اور یہ رقم ماں کی جیب سے نکلتی تھی۔ کھانا کھانے اور سگریٹ پینے کے بعد ابا سارا دن گھر میں گشت کرتا رہتا۔ وہ کمرے کی چوکھٹ سے باہر گھر کی چوکھٹ تک جاتا اور پھر وہاں سے دوبارہ کمرے کی طرف چلا آتا۔ اس دوران وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے عجیب عجیب اشارے کرتا اور فضا میں کسی نادیدہ مخلوق سے باتیں کرتا

رہتا۔ اور جب ناویدہ مخلوق سے باتیں ختم ہو جاتیں تو وہ اماں کے سر ہو جاتا اور اس سے سب رشتہ داروں کی برائیاں کرنی شروع کر دیتا۔ جسے اماں پیار سے جھلاتی رہتی اور اسے سمجھاتی رہتی کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ کبھی کبھار ابا مان جاتا اور کبھی نہیں مانتا۔ ابا کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ ذہنی طور پر معذور ہے اور سچ بھی یہی تھا۔ اماں کہتی تھی کہ میری پیدائش کے فورا بعد ہی ابا نے کچھ الٹے سیدھے چلے کیے تھے، جس کے نتیجے میں اس کا دماغ الٹ گیا تھا، جو باوجود کوشش کے ٹھیک نہیں ہو سکا تھا۔ ماں نے اپنی بساط کے مطابق اس کا علاج کرنے کی کوشش کی تھی مگر صحت یابی ابا کی قسمت میں نہیں تھی۔ حالانکہ ماں اس کی صحت یابی کی ہر وقت رو رو کر دعا کیا کرتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ ابا پر ہر وقت ہی پاگل پن کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ نہیں، کبھی کبھار وہ بالکل ٹھیک بھی ہو جاتا تھا۔ وہ سب سے ہنستا بولتا، باتیں کرتا اور اماں سے کہتا۔ ''او نیک بخت! تو یوں لوگوں کے گھروں میں کام نہ کیا کر۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میں کچھ دنوں تک ٹھیک ہو جاؤں، پھر خود کمانے کے لیے گھر سے نکلوں گا۔'' اماں اس کی بات سنتی تو اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ جاتے۔ ''نہیں نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بس تو ایسے ہی گھر میں بیٹھ کر سب سے ہنسی خوشی سے باتیں کرتا رہ، یہی کافی ہے۔'' ''ارے کیوں نہیں؟ یہ میری ذمہ داری ہے اور مجھے ہی اٹھانی چاہیے۔ بس میں تھوڑا اور ٹھیک ہو جاؤں، پھر میں خود کمانے کے لیے گھر سے نکلوں گا۔'' پر اس بات کی نوبت بمشکل ہی آتی تھی۔ کچھ دن اور گزرتے تو ابا کی طبیعت ٹھیک ہونے کی بجائے پھر پہلے جیسی ہو جاتی اور گھر میں پھر وہی پہلے جیسے جھگڑے اور تو تو میں میں ہوتی۔ پھر ایک دن خدا نے ماں کی سن لی۔ اس بار ابا کی طبیعت سنبھلی تو سنبھلتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جیسے وہ اماں سے کہا کرتا تھا، وہ بالکل ہی ٹھیک ہو گیا اور اپنے ایک دوست کے ساتھ ایلومینیم کے برتن بیچنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ جب تین دن بعد ابا گھر لوٹا تو اس کے ہاتھ میں بہت سے پیسے، مٹھائی اور پھل فروٹ تھے، جو وہ ہم سب بہن بھائیوں کے لیے لایا تھا۔ اور ماں... اس کا تو خوشی سے رو رو کر برا حال تھا۔ خدا نے اس کی سن لی تھی اور اس کے سر کے سائیں کو بالکل ٹھیک کر دیا تھا۔ مگر یہ ماں کی عارضی خوشی اور خوش فہمی تھی۔ ابا دوسری بار گھر سے کمانے کے لیے نکلا تو دوسرے دن ہی واپس گھر چلا آیا اور آتے ہی ماں سے کہا۔ ''تو تو چاہتی ہی یہی ہے کہ میں کئی کئی دن گھر سے باہر رہوں اور تو اپنے یار کے ساتھ عیاشی کرتی پھرے۔ ہے نا...؟'' اماں کے دل پر جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا تھا۔

''خدا کی قسم ایسا کچھ نہیں ہے۔'' ابا کا لہجہ اچانک ہی سنجیدہ ہو گیا ''میں تم سے پہلی اور آخری بار پوچھ رہا ہوں کہ سچ سچ بتا، وہ تیرا یار ہے یا نہیں...؟ اگر تو نے اس بار جھوٹ بولا تو اس کی ذمہ دار تو خود ہوگی...'' ''میں ایک بار نہیں ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ وہ میرا بھائی ہے، بھائی ہے، بھائی ہے۔'' ''ٹھیک ہے، حرامزدی! اگر تو گناہ کر کے بھی نہیں مانتی تو تیری مرضی۔ اگر تجھے اپنی انا پیاری ہے تو مجھے اپنی غیرت عزیز ہے۔ اب تو کان کھول کر سن لے کہ تیری جیسی رذیل اور کمینی عورت کے ساتھ ایک پل بھی گزارنا مجھے گوارہ نہیں ہے... میں تجھے طلاق دیتا ہوں... طلاق دیتا ہوں... طلاق دیتا ہوں...'' ابا یہ کہہ کر گھر سے باہر نکل گیا تھا اور ماں ...وہ جیسے سکتے کی سی کیفیت میں آ گئی تھی۔ جیسے کسی نے اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ اپنے ہوش و حواس کی دنیا چھوڑ کر، زمین پر بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ ہم سب بہن بھائی اماں سے لپٹ کر رونے لگ گئے تھے۔ ماں کو آدھے گھنٹے بعد ہوش آ گیا تھا، مگر ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ بہت کھوئی کھوئی سی تھی۔ اس کی کھوئی کھوئی سی یہ کیفیت اس وقت ٹوٹی، جب ابا اپنے پیروں کی بجائے چار کاندھوں پر اٹھ کر گھر آیا۔ کسی نے بتایا کہ اس کی موت ریل گاڑی کے نیچے آنے سے ہوئی ہے۔ ابا نے خودکشی کر لی تھی۔ ماں اور ہم سب ابا کی لاش سے لپٹ کر بہت زور زور سے روئے تھے، اتنا کہ روتے روتے ہم سب کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور ابا کو جو چار کاندھے اٹھا کر لائے تھے، وہ دوبارہ اٹھا کر اس کی آخری آرام گاہ تک چھوڑ آئے۔ ابا کے جانے سے زندگی میں کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ بلکہ ایک

ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ گھر میں جو ہر وقت ابا کی وجہ سے چخ چخ ہوتی تھی، اس سے سب کو نجات مل گئی تھی۔ بھائی ذرا اور بڑا ہوا تو ایک دن اس نے اماں سے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ اب تو بڑا ہوگیا ہے، اب تو ہمارے گھر میں کھانا لینے کے لیے مت آیا کر، بلکہ اپنے چھوٹے بھائی کو بھیج دیا کر۔" ماں نے بمشکل اپنے آنسو پیے تھے۔ اس سوچ نے اس کا دل چیر دیا تھا کہ کیا اس کے سب بیٹوں کو روٹیاں لینے کے لیے جانا پڑا گا؟ کیا اس کی زندگی میں ایسے سکھ کے دن نہیں آئیں گے کہ اس کے گھر
میں بھی آگ جلے اور گھر کی روٹی پکے..." "اچھا ٹھیک ہے، کل سے فیضی کو اپنے ساتھ لے جانا۔ یہ دو تین دن تک سب گھر دیکھ لے گا تو اس کے بعد یہی وہاں سے
کھانا لے آیا کرے گا" اور پھر اگلے دن سے میں بھائی کے ساتھ چلا گیا تھا۔
اور ایک دو دن میں ہی میں نے سب گھر دیکھ لیے تھے۔ تیسرے دن سے میں ہی صبح اور رات کا کھانا لانے لگا تھا۔ یہ وہی دن تھے، جب میں نے پہلی بار ان بابا جی کو دیکھا تھا اور میرے دل میں ان کے لیے ہمدردی کی ایک گہری لہر اتر گئی تھی۔ میں نے دل میں سوچا تھا کہ میں اماں سے اس بارے میں بات کروں گا کہ بابا جی بھی ہم سب بہن بھائیوں کیساتھ رہنے لگیں۔ ہمارے گھر میں ایک چھوٹا سا کمرہ خالی پڑا تھا۔ اگر ہم وہ کمرہ بابا جی کو دے دیتے تو...... وہ اس روح میں اتر جانے والی سردی سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ دو دن بعد میں نے ماں سے اس بارے میں بات کی تو اس نے میری پیشانی چوم لی تھی۔ "میرا احساس پتر!... ابھی تیری عمر ان باتوں کو سوچنے کی نہیں ہے۔ جب تو بڑا ہو جائے گا۔ نا، تو تب اس بارے میں سوچنا..." میں اپنا دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ مجھے کتنی امید تھی کہ اماں میری بات مان لے گی مگر... میں روز جھوک پور سے رات کو کھانا لینے جاتا اور ہر روز مجھے راستے میں وہ بابا جی بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے، وہ کڑی سردیوں کے دن تھے۔ اس دن سرِ شام ہی بادل گھر آئے تھے اور ماں پیش گوئی کی تھی "مجھے لگتا ہے، آج بہت زور کی بارش ہوگی۔" اور پھر ہوا بھی وہی۔ عصر سے ذرا پہلے بارش شروع ہوئی اور مغرب تک پورے زور و شور سے جاری رہی۔ بارش تھمی تو ماں نے میرا ہاتھ پکڑا اور جھوک پور کی طرف چل دی۔ اس بارش بھرے راستے کو اکیلے عبور کر کے وہاں جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ جھوک پور جاتے ہوئے میں نے اس جگہ پر نظر کی، جہاں بابا جی بیٹھے ہوئے ہوتے۔ مگر مجھے حیرت ہوئی، وہ اپنی جگہ پر نہیں تھے۔ میرا دل اچانک ہی سینے میں بیٹھنے لگا تھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلے گئے تھے۔ جھوک پور سے واپسی پر بھی وہ مجھے نظر نہیں آئے۔ میری تشویش اور بڑھ گئی تھی۔ اگلے دن اسکول جانے سے پہلے میں نے ایک بار جا کر اس جگہ کو دوبارہ دیکھا، اس بار بھی مجھے ناکامی ہوئی۔ بابا جی وہاں موجود نہیں تھے۔ میں سارا دن پریشان رہا اور انہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ میری پریشانی اس وقت ختم ہوئی، جب شام کو میں جھوک پور سے کھانا لینے گیا اور مجھے راستے میں وہ وہیں بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔ انہیں وہاں دیکھ کر میرا سانس میں سانس آیا تھا۔ مجھے بابا جی سے حد سے زیادہ انس اور دلچسپی ہو چلی تھی۔ انہیں وہاں سردی میں ٹھٹھرتا دیکھ کر مجھے خیال آتا کہ کیا ان کا کوئی گھر نہیں ہے؟ ان کے ماں، باپ، بیوی بچے، بہنیں یا بھائی نہیں ہیں۔ جو وہ وہاں
سردی میں میں بیٹھے ٹھٹھرتے رہتے ہیں؟ اور یہ سوچ کر میرا دل کہتا کہ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان کا گھر بار، بیوی بچے، بہن، بھائی ضرور ہوں گے مگر... شائد ان کے ساتھ کچھ انہونی ہوگئی ہو اور... کئی دن اور گزرے تو ایک دن میرا دل چاہا کہ میں ان کے پاس جاؤں۔ انہیں سلام کروں۔ اور پھر میں ان کے پاس گیا بھی تھا اور انہیں سلام
بھی کیا تھا مگر انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ انہوں نے میری طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ شائد انہیں اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ میری طرف توجہ دے پاتے۔ میں نے انہیں قریب سے دیکھا تو میرا دل اور پسیج گیا۔ ان کا ایک پیر زخمی تھا، جس میں سے پیپ بہہ رہی تھی اور وہاں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مگر وہ مکھیوں کے کاٹنے سے بھی بے نیاز اپنے آپ میں گم تھے۔ شائد انہیں آس پاس کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی کسی دنیا میں مست تھے۔ میرا دل ایک بار پھر

چاہا کہ میں انہیں اپنے گھر لے جاؤں۔ انہیں نہلاؤں، دھلاؤں اپنے ابا کے انہیں کپڑے پہناؤں اور ان کے زخموں کی دوائی دلاؤں انہیں۔ مگر یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ ماں کی مدد کے بغیر یہ ناممکن تھا۔ اس دن میں نے ڈرتے ماں سے اس بارے میں ایک بار پھر بات کی تو وہ مجھ پر بے حد خفا ہوئی۔" میں نے اس دن کہا تھا نا کہ ابھی اس بارے میں مت سوچو، تمہاری عمر

ان باتوں کو سوچنے کی نہیں ہے۔... اور بفرض محال ہم انہیں اپنے گھر لے بھی آئیں تو لوگ کیا کہیں گے کہ ہمارا اس سے کیا رشتہ ہے، جو ہم نے اسے اپنے گھر میں بٹھایا ہوا ہے؟ اور دوسرا ہمارے اپنے کھانے کے لیے روٹی کپڑا پورا نہیں ہوتا، انہیں کہاں سے کھلائیں گے...؟" ماں کی بات سن کر میرا چہرا اتر گیا تھا۔ میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر ماں نے مجھے باہوں میں بھر لیا تھا۔" وہ جو اوپر اللہ تعالیٰ بیٹھا ہے نا، وہ ہی ہم سب کا پالنے والا ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کیا ہے تو وہی ہمارا خیال بھی رکھتا ہے۔ ہماری مشکلیں صرف وہی حل کرتا ہے۔ سب کچھ اس پر چھوڑ دو۔ جب تم بڑے ہو جانا تو ایسے لوگوں کی ضرور مدد کرنا۔ مجھے خوشی ہوگی۔ پر ابھی اس بارے میں مت سوچو......" ماں اور بھی نجانے کیا کیا کہتی رہی۔ میں یاد نہیں رکھ پایا۔ بابا کے حوالے سے مجھے اور کچھ پتہ چلا ہو یا نہ چلا ہو، پر ایک بات کا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ان کے رہنے کا دوسرا ٹھکانہ کہاں ہے۔ وہ صبح کہاں ہوتے ہیں، شام کو کہاں ہوتے ہیں اور رات کو کہاں؟ کیوں کہ وہ مجھے شام کو تو اسی راستے میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے، جہاں سے میں کھانا لینے جاتا، مگر وہ صبح وہاں نہیں ہوتے تھے۔ یہ بات میں نے کئی بار نوٹ کی تھی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے میں کئی بار ان کی مخصوص جگہ پر انہیں جا کر دیکھ کر آیا تھا۔ وہ مجھے نظر نہیں آتے تھے۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے کھاتے تھے، پیتے تھے، پہنتے تھے اور رہتے تھے؟ لباس کے نام پر میں نے ان کے جسم پر ایک پھٹے پرانے کرتے اور شلوار کے اور کچھ نہیں دیکھا تھا۔ پھر ایک دن مجھے ان کے رہنے کا ٹھکانا بھی معلوم ہو گیا۔ اس دن میں اماں کے ساتھ، ابا کی قبر پر فاتحہ خوانی کرنے کے لیے قبرستان آیا ہوا تھا۔ قبرستان میں داخل ہوتے وقت، ایک گھنے اور کھوکھلے سے درخت کے اندر مجھے کسی کے وجود کا احساس ہوا۔ وہ کھوکھلا سا درخت چاروں طرف سے جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے ذرا قریب جا کر ان جھاڑیوں میں غور سے دیکھا تو مجھے اندر وہی بابا جی بے سدھ پڑے ہوئے دکھائی دیے۔ میرا دل اندر سے اور کٹ گیا۔ اس دن میں اماں کے ساتھ قبرستان سے واپس لوٹا تو میرا دل بہت اداس تھا۔ مجھے رہ رہ کر بابا جی کی حالت کا خیال آتا تھا۔ آج یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا کوئی گھر بار نہیں ہے۔ وہ لاوارث ہیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں۔ اس دن کے بعد سے میں جب بھی ان کے پاس سے گزرتا تھا، اپنی نظریں جھکا لیتا تھا۔ انہیں اس اجڑی ہوئی حالت میں دیکھنا میرے بس سے باہر تھا۔ میرے پاس ان کیلیے دعا کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ

نہیں تھا اور وہ میں ہر روز کرتا تھا کہ خدا انہیں صحت دے، تندرستی دے، سکون دے، اور رہنے کے لیے ایک آرام دہ گھر دے۔ اور پھر خدا نے ایک دن میری سن لی۔ اس دن گھر میں ہی تھا کہ جب اچانک مسجد کے بڑے لاؤڈ اسپیکر سے کسی شخص کے مرنے اور جنازے کا اعلان ہونے لگا۔ اعلان سنتے ہی ماں نے بے اختیار کہا۔

تھا" اناللہ وانا الیہ راجعون......" اور پھر انہوں نے مجھے اپنے قریب بلا کر اپنی باہوں میں بھر لیا تھا۔ "تم جس بابا جی کے لیے اتنے پریشان ہوتے رہے ہو نا، آج خدا نے اس کی سن لی ہے۔ اسے سب دکھوں سے نجات دے کر اپنے پاس بلا لیا ہے۔ اب وہ بہت آرام سے ہوں گے...." پتہ نہیں کیوں یہ خبر سنتے ہی میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ کر کے آنسو بہنے لگے تھے اور ان آنسوؤں میں شدت اس وقت پیدا ہو گئی تھی، جب بڑا بھائی، ماں کے کہنے پر مجھے بابا جی کا آخری دیدار کرانے کے لیے قبرستان لے گیا تھا۔ بابا جی کے چہرے پر کیسا سکون تھا، کیسا آرام تھا، میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس مجھے یوں محسوس ہوا تھا، جیسے ان کے آس پاس بہت سے نیک دل فرشتے منڈلا رہے ہیں، جن کا نورانی سایہ ان کے چہرے پڑ کر انہیں اور نورانی بنا رہا ہے۔ پتہ نہیں میں کب تک انہیں دیکھتا رہا، لوگ کب تک وہاں اکھٹے ہوتے رہے۔ پھر ان کا

نماز جنازہ ادا کیا گیا اور انہیں ان کی آخری آرام گاہ میں اتار دیا گیا۔ قبرستان سے واپس لوٹتے وقت میرا دل کسی حد تک پرسکون تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب باباجی اللہ میاں کے پاس بہت سکون سے ہوں گے۔ وہاں انہیں کوئی دکھ، کوئی تکلیف، کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ وہاں نہ سردی ہوگی نہ گرمی اور نہ ہی دنیا کی کوئی آفت۔ باباجی کے جانے کے بعد کئی دنوں تک میرا دل اداس رہا تھا۔ میں ان کا تصور کر کے انہیں یاد کرتا رہتا تھا۔ یہ بات سچ کہا ہے کہ کوئی ہمیشہ کسی کو یاد نہیں رکھ پاتا۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ گزرے ہوئے وقت نے دھیرے دھیرے ان کی یاد میرے دل سے مٹادی تھی۔ وقت نے ابھی چند برسوں کا اور سفر کیا ہوگا کہ ایک دن ماں کو احساس ہو گیا کہ ان کا بڑا بیٹا ندیم، ان کے پیچھے ہم بہن بھائیوں کو سنبھالنے کے قابل ہو گیا ہے۔ جب اسے یہ احساس اور یقین ہو گیا تو اس نے بھی ایک دن، چپکے سے ابا کے پیچھے عدم کی راہ لی۔ جب اس کا آخری وقت تھا تو اس نے بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ ''پتر! وعدہ کر میرے پیچھے تو اپنے بہن بھائیوں کا اسی طرح خیال رکھے گا، ان کی اسی طرح پرورش کرے گا، جس طرح میرے ہوتے ہوئے کی ہے۔ ان کی ہر ضرورت پوری کرے گا۔ کسی شے کے لیے پریشان نہیں ہونے دے گا انہیں ......'' بھائی نے روتے ہوئے ماں سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ ماں کو جب احساس ہو گیا کہ بھائی کے لفظوں میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے تو اس نے چپکے سے آنکھیں بند کیں اور ہمیں روتا، بلکتا ہوا چھوڑ کر اوپر چلی گئی۔ اور جیسے اپنے پیچھے ساری دنیا ویران کر گئی۔

*****

وقت نے پتہ نہیں کتنے برس چپکے سے آگے قدم بڑھا لیے تھے۔ بھائی نے ماں سے جو وعدہ کیا تھا، اسے سچ میں اس طرح نبھایا کہ شائد ہی کوئی بھائی اس طرح سے نبھا پائے۔ اس نے ہم بہن بھائیوں کی اچھے سے پرورش کی۔ بہنوں کی اچھے گھروں میں شادی کی۔ مجھے اور چھوٹے بھائی کو پڑھایا، لکھایا اور اس قابل بنایا کہ نہ صرف ہم خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے بلکہ آس پاس والا جو شخص بھی ہمیں دیکھتا، اس کی آنکھوں میں ستائش اتر آتی۔ ہمیں کسی قابل بنا کر انہوں ہماری شادی کا فرض بھی بخوبی نبھایا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد چھوٹے بھائی نے پاکستان ہی میں ایک اچھی کمپنی میں جاب حاصل کر لی اور

میں سعودیہ عرب میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ جب ہم کسی قابل ہو گئے تو ہمیں بھائی کا خیال آیا۔ ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ چالیس سال کی عمر ہونے کے باوجود انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ ایک دن میں نے ان سے اس سلسلے میں بات کرنا چاہی تو انہوں نے ہنس کر کہا۔ ''بھئی! میں اب بڑھاپے میں شادی کرتا ہوا اچھا لگوں گا...؟'' مجھے ان کی بات سے حیرت ہوئی۔ ''آپ سے کس نے کہا کہ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں؟ ابھی تو آپ چالیس کے بھی نہیں ہوئے۔'' میری بات پر وہ مسکرا دیے تھے۔ ''بھئی میں جتنے پانی میں ہوں اور جتنا جوان ہوں، مجھے پتہ ہے۔ اور پھر دوسرا تم لوگوں کی طرح مجھ سے یہ ذمہ داری نہیں اٹھائی جاسکتی۔'' یہ ان کی بات غلط تھی۔ جس طرح انہوں نے ہماری ذمہ داریوں کو اٹھایا اور نبھایا تھا یہ صرف انہی کا کام تھا۔ اور پھر میرے لاکھ کہنے کے باوجود انہوں نے میری بات نہیں مانی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے انہیں کہنا ہی چھوڑ دیا۔ مجھے جب فرصت ملتی، میں وقتاً فوقتاً گھر کال کر کے سب گھر والوں سے بات کرتا رہتا تھا۔ دوران کال میں اپنی بیوی صائمہ سے کہتا۔ ''بھیا سے بات کراؤں میری۔'' اور اس کا جواب ہوتا۔ ''وہ گھر نہیں ہیں، فیکٹری گئے ہوئے ہیں'' ''کب آئیں گے۔'' ''رات کو دس بجے تک آئیں گے'' اور رات کے دس بجتے بجتے، میں بھائی سے بات کرنے کی بات بھول چکا ہوتا۔ پھر ایک دن میں نے گھر کال کی تو بھائی بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ میں نے ان سے بات کرتے ہوئے شکوہ کیا۔ ''میں جب بھی گھر کال کرتا ہوں، آپ گھر نہیں ہوتے۔ صائمہ کہتی ہے کہ آپ فیکٹری ہیں۔ آپ فیکٹری کا کام چھوڑ کیوں نہیں دیتے...؟ اللہ کے فضل سے اب ہم چھوٹے بھائی کمانے

والے ہیں ...! آپ کو گھر بٹھا کر اچھا کھلا پلا سکتے ہیں۔ آپ اب کام کرنے مت جایا کریں۔" میری بات سن کر وہ دھیرے سے ہنسے تھے۔ "بھئی مجھ سے بغیر کچھ کیے نہیں رہا جاتا۔ اگر میں نے کوئی کام نہ کیا تو پڑے پڑے بیکار ہو جاؤں گا۔ اس معاملے میں تو مجھے معاف ہی رکھو۔" اور پھر میرے لاکھ اصرار کے باوجود بھی بھائی نے میری یہ بات بھی نہیں مانی تھی۔ مجبوراً مجھے چپ ہونا پڑا تھا۔ بھائی فیکٹری سے جو تنخواہ لیتے تھے، وہ لا کر چپ چاپ صائمہ کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ بھائی نے اسے ہی گھر کا سربراہ بنایا ہوا تھا۔ اپنی ضرورت کی رقم بھی بعد میں وہ صائمہ سے لیتے رہتے۔ ایک دن اچانک ہی میرے نمبر پر گھر سے آٹھ دس مس کالز آئیں۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں نے کال بیک کی تو صائمہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔ "وہ... وہ بڑے بھائی ہیں نا، ان کا ایک ہاتھ فیکٹری کی مشین میں آ کر کٹ گیا ہے...." میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ "یہ... یہ سب کیسے ہوا...؟" میری آواز میں درد تھا۔ "پتہ نہیں۔ ابھی تو بھائی اسپتال ہیں، وہاں سے آئیں گے تو کچھ پتہ چلے گا۔" میرا دل چاہا کہ میں اسی وقت اڑ کر پاکستان پہنچ جاؤں اور بھائی کا سارا درد اپنے لبوں سے چن لوں... پر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے کچھ عرصہ قبل نوکری ملی تھی اور اتنا جلدی چھٹی ملنا ممکن نہیں تھا۔ میں کام کے دوران بھائی کے بارے میں پریشان ہوتا رہا اور ان کی صحت یابی کے لیے دعا کرتا رہا۔ شام تک اطلاع مل گئی کہ بھائی ٹھیک ہے اور سب سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے کال ملا کر ان کی خیریت پوچھی اور بہت دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ وہ کچھ دن تک اسپتال میں رہنے کے بعد گھر لوٹ آئے تھے۔ انہیں فیکٹری سے فارغ کر دیا گیا تھا اور اس بات کی مجھے بہت خوشی تھی۔ اب بھائی کم سے کم سکون سے تو گھر رہتے۔ اس کے بعد میں وقتاً فوقتاً گھر کال کرتا رہتا اور دوسروں کے ساتھ بھائی سے بھی میری بات ہوتی رہتی۔ میں کال ہمیشہ صائمہ کے نمبر پر کرتا تھا۔ گھر میں صرف ایک موبائل فون تھا اور وہ صائمہ کے پاس تھا۔ ایک دن میں نے گھر کال کی اور صائمہ سے کہا کہ میری بھائی سے بات کراؤ۔ میری بات پر اس نے بہت روکھے سے لہجے میں جواب دیا۔ "وہ باہر گیا ہوا ہے۔" "صائمہ! کیسے لہجے میں بھائی کے بارے میں بات کر رہی ہو۔ وہ ہمارا بڑا بھائی ہے۔ تمیز اور احترام سے بات کرو ان کی۔" "میں نے کونسا بدتمیزی کر لی ہے؟" اس نے خفا ہو کر کہا۔ "وہ گھر آیا تو بات کرا دوں گی آپ کی۔" اور دوسرے ہی پل اس نے کھٹ سے کال کاٹ دی۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے صائمہ کچھ بدتمیز اور چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا مسئلہ تھا۔ اس دن کے بعد میں جب بھی کال کرتا، میری بھائی سے بات نہیں ہو پاتی۔ کبھی پتہ چلتا کہ وہ گھر نہیں ہیں، کبھی معلوم ہوتا کسی رشتہ دار کے گھر گئے ہوئے ہیں اور کبھی جواب ملتا کہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ میں نے ایک دن خود سے چھوٹے بھائی سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے بھی ان سب باتوں کی تصدیق کی۔ اس دوران میری بڑے بھائی سے صرف ایک بار ہی بات ہو سکی تھی۔ اور میں نے ان سے شکوا کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اب کیا آپ سے بات کرنا بھی ممکن نہیں ہے؟ جب بھی کال کروں، کبھی آپ گھر نہیں ہوتے، کبھی سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی..." وہ میری بات پر مسکرا دیے تھے۔ "بھئی معذور بندہ ہوں۔ گھر میں پڑے پڑے اکتا جاتا ہوں تو ادھر ادھر نکل جاتا ہوں۔ اب کیا گھر سے نکلنے پر بھی پابندی لگانا چاہتے ہو...؟" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ابھی اس بات کو کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ میں نے ایک دن گھر کال کی اور بھائی کا پوچھا تو صائمہ نے کہا۔ "ان کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ کہہ کر گئے تھے کہ کسی رشتہ دار کے گھر جا رہے ہیں، پر آج ہفتہ ہو گیا ہے، وہ گھر نہیں لوٹے۔" میں پریشان ہو گیا۔ "ادھر ادھر سے پتہ کیا؟" "ہر جگہ سے پتہ کر چکے ہیں، وہ کہیں نہیں ہیں۔" "سجاد کو بھیج کر ادھر ادھر سے پتہ کراؤ۔" "سجاد بھائی بھی ہر جگہ سے پتہ کر آئے ہیں۔ کہیں نہیں ملے وہ۔ اب تو بس ان کے خود ہی لوٹ آنے کی امید ہے کہ شائد وہ آ جائیں۔" میں نے گرفتہ دل کے ساتھ کال منقطع کر دی تھی۔ اس کے بعد میں ہر روز کال کر کے گھر سے بھائی کے بارے میں پتہ کرتا رہا، مگر ہر بار ہی مجھے مایوسی بھرا جواب ملتا۔ ایک بار میرا دل چاہا کہ میں خود پاکستان جا کر بھائی کا پتہ کروں اور انہیں ڈھونڈوں، مگر باوجود کوشش کے مجھے چھٹی نہیں مل سکی۔ ایک ماہ، دو ماہ، تین ماہ اور پھر چھ ماہ گزر

گئے۔ بھائی کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کس حال میں ہیں۔ کبھی کبھار دل میں ایک خدشہ سا ابھرتا کہ انہیں خدانخواستہ کچھ ہو نہ گیا ہو۔ اس بات کو مان کر، دل پر پتھر رکھتے ہوئے، چھوٹے بھائی نے مردہ خانوں میں بھی پتہ کیا تھا مگر وہاں بھی ان کا کچھ اتا پتا نہیں مل سکا۔ آخر تھک ہار کر ہم نے ان کی تلاش ختم کردی تھی۔ اس امید پر کہ شائد وہ بھی خود ہی گھر لوٹ آئیں تو لوٹ آئیں، ورنہ یوں تو ان کے ملنے کی کوئی امید نہیں۔ پر ان کو نہ آنا تھا نہ وہ آئے۔ کئی ماہ کی ان تھک کوشش کے بعد آخر ہم نے ان کی تلاش ختم کردی اور اپنی مصروف زندگی کا بوجھ ڈھونے لگے۔

وقت نے اپنے قدم کچھ برس اور آگے بڑھا لیے تھے۔ میں دیار غیر میں پندرہ سال لگا کر اور چار پیسے کما کر واپس اپنے گھر لوٹ آیا اور اس دوران میں نے جو رقم بچائی، اس سے ایک کاروبار کا آغاز کرلیا۔ بہت جلد ہی میرا کام چل نکلا اور زندگی اپنے معمول پر آگئی۔ ان دنوں میرے ایک دوست اور واقف کار کے بھائی کی شادی تھی، جس میں میرے لیے جانا ناگزیر تھا۔ جس دن میں اس کے پاس گیا، وہ مجھے مطلوبہ جگہ پر لینے کے لیے موجود تھا۔ میں اس کی گاڑی میں بیٹھ کر کے گھر کی طرف چل دیا۔ ان کا گھر ایک دیہی علاقے میں تھا۔ ہم مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے اس کے گھر کی طرف رواں تھے کہ اچانک اس راستے سے گزرتے ہوئے میری نگاہ ایک شخص پر پڑی اور میرا دل ٹھٹک کر رہ گیا۔ میں نے شعیب سے کہا۔ ”ایک سنٹ رکو۔“ اس نے بے اختیار گاڑی کے بریک لگا دیے۔ کچھ فاصلے پر الجھے ہوئے بالوں، بڑھی ہوئی داڑھی اور پھٹے پرانے لباس میں ایک شخص بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ جس پر نظر پڑتے ہی میرا دل اچانک دھڑک اٹھا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بے نیاز ”ہو، ہو، ہو...“ کرنے میں مصروف تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے پینتیس سال پرانے مناظر گھوم گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے ان بابا جی کا چہرہ ابھر آیا، جب میں بچپن میں کھانا لینے جاتا تھا اور وہ مجھے راستے میں بیٹھے ہوئے، اپنے آپ سے بے نیاز ”ہو ہو ہو“ کرنے میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ جیسے میرا دل بچپن میں اس بابا جی کو دیکھ کر پسیج گیا تھا، ایسی ہی کچھ کیفیت میری اس شخص کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں بے اختیار ماں کی بات تازہ ہوگئی۔ ”جب تم بڑے ہو جانا تو ایسے لوگوں کی مدد ضرور کرنا مجھے خوشی ہوگی۔“ میں نے اسی وقت ہی دل میں ارادہ باندھ لیا کہ میں اس شخص کی ہر ممکن مدد کروں گا اور اگر ہو سکا تو انہیں اپنے گھر ہی لے جاؤں گا۔ مگر افسوس میں ایسا نہیں کرسکا تھا۔ ”کیا ہوا... رکنے کے لیے کیوں کہا ہے؟“ شعیب نے پوچھا۔ ”کچھ نہیں“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”چلو، راستے میں بتاتا ہوں“ شعیب نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں راستے میں اسے بچپن والی بات بتاتا رہا۔ میری بات سن کر اس نے کہا ”یہ بابا جی ہماری بستی میں کچھ سال پہلے ہی آئے تھے۔ کبھی کسی گلی میں پڑے ہیں تو کبھی کسی گلی۔ شروع شروع میں کسی نے انہیں ولی سمجھا تو کسی نے پیر بابا۔ پر جلد ہی سب پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ نہ تو کوئی پیر ہیں اور نہ ہی کوئی ولی وغیرہ۔ یہ ایک نیم دیوانہ سا انسان ہے، جس سے کسی کو کچھ خطرہ نہیں۔ سو تب سے یہ یہیں ہیں۔ کبھی کوئی اسے ایک وقت کا کھانا دے دیتا ہے تو کبھی کوئی دوسرا۔ اگر کوئی نہ بھی دے تو یہ کسی سے خود مانگتے کبھی نہیں گئے......“ شعیب مجھے اور بھی بہت کچھ ان کے بارے میں بتاتا رہا۔ ”واپسی پر میرا ارادہ ہے کہ میں انہیں اپنے ساتھ اپنے شہر لے جاؤں گا۔ وہاں ان کا خیال رکھوں گا“ ”اچھی بات ہے“ پر افسوس میں اس بات پر عمل نہ کرسکا۔ تیسرے دن میں شعیب کے ساتھ بیٹھا واپسی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے کسی کی موت کا اعلان ہونے لگا۔ شعیب نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”انا للہ وانا الیہ راجعون۔“ ”کون فوت ہو گیا ہے۔؟“ ”وہی بابا جی فوت ہو گئے ہیں، جنہیں تم اپنے ساتھ لے جانے کا سوچ رہے تھے۔“ میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی اور میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”بعد نماز ظہر، نماز جنازہ ہے۔ نماز جنازہ تو پڑھو گے نا؟“ ”کیوں نہیں۔“ بعد نماز ظہر میں نے شعیب کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی اور نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد میں نے سب کی طرح ان کا آخری دیدار کرنا چاہا۔ میں ان کے بالکل قریب پہنچا تو جیسے کسی نے میرے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا۔ اچانک میں دیوانوں کی طرح آگے بڑھا اور اس میت سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بابا جی کوئی اور نہیں، میرے بڑے

بھائی تھے، جو پندرہ سال پہلے ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

☆☆☆

بوجھ

صوبیہ احمد

نی چل اٹھ جا، ڈیا دن چڑھ آیا، تیرے سر نیند کا بھوت نہیں اتر رہا۔ اب تو 12 بج گئے ہیں۔ کتنے بار کہا ہے کہ صبح سویرے سورج نکلتے وقت ککڑ کی بانگ کے ساتھ اٹھ جایا کرو اور کوئی نماز قرآن بھی پڑھ لیا کرو۔ ہر وقت گھوڑے بیچ کر سوتی رہتی ہو۔

میں آہستہ آہستہ اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ اماں! آپ کو سکون کیوں نہیں آتا ہر وقت لعن طعن کرتی رہتی ہیں۔ کبھی تو پیار سے بات کر لیا کریں۔ نی بد جلی! کیا جوتے مار کے اٹھاتی ہوں۔ تمہارے سر نہ جانے کون سا بھوت سوار ہے۔ چل جا کر موت دھو لے۔ ٹھنڈے پانی کی بالٹی تمہارے منہ پے خود آ کر انڈیلنی پڑے گی۔

میں منہ بسورتے بغیر کچھ کہے نل کے پاس جا بیٹھی۔ ذرا گھر کی صفائی ستھرائی کر لینا۔ میں کچھ دیر کے لیے شنی کے گھر جا رہی ہوں۔ دوپہر کا کھانا بھی بنا لینا اور نماز بھی پڑھ لینا۔ کہیں جا کر سو مت جانا۔ کام کو تو ہاتھ تم نے لگانا نہیں ہے۔ اماں کی گرج دار آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ گویا وہ مجھے ایک نہیں کئی حکم ایک ساتھ دے رہی تھیں۔

اماں! آپ کو ہو کیا گیا ہے؟ آپ بھول کیوں جاتی ہو کہ میں صبح سویرے مرغے کی بانگ کے ساتھ ہی اٹھ جاتی ہوں۔ نماز پڑھ کر تلاوت کرتی ہوں اور پھر سو جاتی ہوں۔ میں صبح کا کام آپ کے ساتھ نہیں کرواتی باقی کا سارا دن تو آپ کے ساتھ لگی رہتی ہوں۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی داستان دل کہہ ڈالی۔

اماں کی گرج دار ایک بار پھر گونجی تمہارے منہ زبان بڑھ چلی جا رہی ہے۔ اسے سنبھال کر رکھو۔ اماں! آپ کو میری سچی باتیں کڑوی کیوں لگتی ہیں۔ اچھا بس کرو۔ اپنی زبان کو روکو۔ لازمی نہیں ہوتا کہ ہر غیر ضروری بات کی جائے۔ میں گھر آؤں تو سارے کام کر کے رکھنا۔ اماں اپنی بات مکمل کر کے چلتی بنیں۔

اس وقت میرے پاس اماں کے سارے سوالوں کے جواب موجود تھے۔ مگر اس وقت جواب دینا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی اماں ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ بولتی رہتی تھیں۔ جن میں بہت ساری باتیں محض باتیں ہی ہوتی تھیں جن کا جواب دینا یا ضروری نہیں تھا اور اگر کہیں ضروری تھا بھی تو سوائے اماں کے غصے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔

اب اماں کو کون سمجھا سکتا تھا کہ صبح صبح اتنے غصے میں بولنے کی بجائے وہی باتیں نرمی اور پیار سے بھی کی جا سکتی ہیں۔ ابھی میں پھول جیسے چہرے کو دھو رہی تھی۔ چھوٹی سکینہ نے آ کر حکم دیا۔ مجھے اماں نے ناشتہ بنا کر نہیں دیا۔ وہ بنا دیا جائے۔ میں جلتی کڑھتی ناشتہ بنانے لگی۔ ابھی پورے گھر کو بھی چمکانا تھا۔ میں نے سبزی بنا کر ہانڈی چڑھا دی اور ساتھ میں آٹا گوندھنے لگی ابھی اس کام سے فارغ ہو کر چارپائی پر بیٹھی ہی تھی کہ دماغ نے یاد دلایا کہ ابھی صفائی بھی کرنی ہے۔ ورنہ اماں نے آ کر پھر سے تقریر جھاڑ دینی ہے۔

ابھی گھر کو شیشے کی طرح چمکا کر ہٹی ہی تھی کہ خالہ حاضراں آن پہنچی۔ بڑی بوکھلائی ہوئی اماں کو پکارنے لگیں۔ زینت زینت کہاں ہو۔۔۔ ان کے مٹی سے بھرے جوتوں سے میرے پورے آنگن کی صفائی کا بیڑا غرق ہو گیا۔ ان کا نام رقیہ تھا۔ لیکن ہم سب بلکہ پورا محلہ انہیں خالہ حاضراں کہاں کہتے تھے۔ یعنی رقیہ خالہ عرف خالہ حاضراں۔ ان کا یہ نام محلے والوں نے اس لیے رکھا تھا کہ وہ ہر روز پورے محلے میں حاضر ہونے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ وہ مزید کچھ بولتیں اور میں ان کے پاس جا بیٹھیں۔ اری خالہ کیا بات ہے کیوں ڈھونڈ رہی ہو اماں کو۔ مجھے بتا دیں اماں شنی آنٹی کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ شنی آنٹی محلے کی پہلی خاتون تھی جنہیں سب لوگ آنٹی کہتے تھے۔ اچھا وہ جو کپڑے سیتی ہیں کا رزدانی۔ خالہ حاضراں

نے اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ میری یاد کمزور پڑ گئی ہو۔ ہاں ہاں خالہ، امی کی گھر گئی ہیں۔ اچھا چلو جاؤ میرے ایک گلاس ٹھنڈے شربت کا بنا کر لاؤ۔ اتنی گرمی میں آئی ہوں۔ خالہ حاضراں نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ خالہ حاضراں کھانے پینے کے معاملے میں بہت معروف تھیں۔ جہاں جاتی تھیں ان کی فرمائشیں شروع ہو جاتی تھیں۔ سارے دل ہی دل میں اس کے بارے میں کڑھتے رہتے تھے۔ لیکن ان کے منہ پر تعریف ہی کرتے اور ان کی فرمائشیں پوری کرنے کی کوشش کی جاتی تھیں۔ ان کو کون سمجھاتا کہ پیٹ کو پیٹ ہی سمجھیں۔ میں ان کے ہاتھ میں شربت کا گلاس پکڑایا۔ وہ گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے پورے آنگن میں چکر کاٹنے لگیں۔ آنگن کا فرش جو اس وقت کچھ صاف دکھائی دے رہی تھا وہ بھی ان کے قدموں کے نشانات سے خراب ہو گیا۔ میں ان کو کچھ کہتی اتنے میں اماں بھی آ گئیں۔

حاضراں کیوں من من بھر کے چکر لگائے جا رہی ہو۔ اپنا خون خشک کرنا ہے کیا۔ اماں آتے ہی بولنا شروع ہو گئیں۔ اگر تمہارا خون خشک ہو گیا تو چارپائی کی ہو کر رہ جاؤ گی اور تمہاری تیمارداری کرنی پڑے گی اور ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔ خالہ ڈری سہمی چارپائی پر بیٹھ گئیں اور اماں کی نان اسٹاپ باتیں سننے لگیں۔ اماں مزید کچھ کہتیں میں اماں کی درمیان میں آ گئی۔ اماں آرام سے خالہ کی بات سن لیں ورنہ آپ کا بلڈ پریشر بھی عروج پر پہنچ جائے گا اور آپ کو بھی ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ سکتا ہے۔

ثریا کچھ تو منہ سے اچھا نکال لیا کرو۔ اب ماں کو ڈاکٹر کو دکھلوائے گی۔ اماں کی صلواتیں اب مجھ پر برسنے لگیں تھیں۔ میں نے کانوں میں انگلیاں دیں اور کمرے میں جا کر سکون کا سانس لیا۔ اگلی صبح چائے کا کپ اور گاجر کا حلوہ جو مجھے بہت پسند تھا اور اماں کو حلوہ بہت کم ہی بنانے دیتی تھیں۔ میرے پاس لیے آ بیٹھیں۔ ثریا اٹھ جاؤ دیکھو میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔ اماں پیار بھرے انداز میں اٹھاتے ہوئے بولیں۔ میں اٹھ کر ہکا بکا انہیں دیکھنے لگیں۔ اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ جاؤ جا کر منہ دھو لو اور ناشتا کر لو۔ میں بھی یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے جلدی سے اٹھیں منہ دھویا اور ناشتے میں لگ گئیں۔ کھا پی کر فارغ ہو تو بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اماں کا یوں صبح صبح اٹھ کر صفائی کرنا اور پھر یوں ناشتہ جو مجھے پسند تھا وہ لا کر دینا اور پیار بھرے انداز سے بولنا۔ سب کچھ حیران کن اور بخلاف معمول تھا۔ یہ بات ابھی میں سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی۔ اماں نے سارا دن میری خدمت میں گزارا، شام کو اصل وجہ پتا چلی کو خالہ کہیں دور پار سے میرے لیے رشتہ لے کر آئیں تھیں اور اگلے ہی اتوار کو وہ مجھے دیکھنے کے لیے آ رہے تھے۔

پھر اللہ اللہ کر کے اتوار بھی آ گیا۔ وہ لوگ آئے اور مجھے ایسے دیکھنے لگے جیسے یہ تو میرا منہ نہ ہو کسی شوکیس میں سجا پتلا ہو گیا۔ کہ کھانا ایسے کھانے لگیں جیسے کبھی کھانا دیکھا تک نہ ہو۔ خیر پتا نہیں وہ لوگ کیسے ہاں کر گئے اور اماں ابا نے بھی بغیر سوچے سمجھے ہاں کر دی۔ جبکہ زنجیر میرے گلے میں ڈال دی گئی۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے یہ زنجیر میں نے باخوشی و رضا کیوں اپنے گلے میں لٹکائی اور انکار کیوں نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے میں ہر ممکن کوشش کی تھی کہ انکار کرنے کی مگر اماں اور ابا کے پاس صرف ایک ہی جواب تھا تم جاؤ گی تو تمہارے بعد تمہاری چھوٹی بہن کی باری آئے گی اور ہم اکٹھے دو دو بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اب نہیں کون سمجھاتا کہ بیٹیوں کو بوجھ سمجھ کر گھر کی دہلیز سے ماں باپ رخصت تو کر دیتے ہیں مگر وہ بیٹیاں ہمیشہ سسکیوں بھری زندگی ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ اماں ابا کو سمجھانا ناممکن ہے تو میں نے یہ سوچ کر ہتھیار ڈال دیے کہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی بہتری ہو۔

ادھر جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی بات کی گئی۔ اماں ابا منگنی پر تو فوراً مان گئے مگر رخصتی کے لیے تین ماہ کا وقت لیا۔ منگنی کے بعد تین ماہ گزرنے میں پتا ہی نہیں چلا۔ مہندی کی رات آ گئی، ہر طرف ڈھولک کی تھاپ سنائی دے رہی تھے۔ سب خوش تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے یہ خوشیاں ختم نہیں ہوں گی مگر میرا دل ہول کھا رہا تھا۔ ایک انجان سا خوف دل میں کہیں بسا ہوا تھا۔ ساری لڑکیاں خوب بن سنور کر آئی ہوئی تھیں۔ زرق برق کپڑوں میں گھر سے سب لوگوں کو بارات کا انتظار

تھا۔ ہر کسی کی نظر مجھ پر تھی۔ آخر کیوں نہ ہوتی بقول ان لڑکیوں کے سولا سنگھار کر کے میں بہت اچھی لگ رہی ہوں۔ ہر کوئی مجھے یہ کہتا تھا کہ محلے کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی تھی۔ آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں اپنی تعریف کر رہی ہوں۔ میری تو یہ جو میں ایسا کردوں۔ یہ تو محلے والوں کے خیالات بتا رہی ہوں۔ تھوڑی ڈری ہوئی اور کچھ سہمی ہوئی تھی مگر پیا کا انتظار تو مجھے بھی تھا۔ میں ان کو اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے تو زیادہ خواہش ہو رہی تھی انہیں دیکھنے کی۔ آخر بارات آگئی۔ لڑکیاں خوشی سے جھوم رہی تھیں۔ بارات کا خوب استقبال کیا گیا۔ دولہے کو میرے نزدیک اسٹیج پر بیٹھایا گیا۔ پہلے لوگوں کی نظروں کا مرکز میں تھیں اور پھر میرے ساتھ انہیں بھی دیکھا جا رہا تھا۔

نکاح شروع ہونے کو ہی تھا کہ میری ہونے والی ساس آگئیں۔ نکاح سے پہلے ہماری کچھ شرائط سن لیں۔ میں ابا اماں سمیت سب ہی اچانک ان کی شرط والی بات پر حیران اور پریشان ہوگئے۔ میری صرف ایک ہی شرط ہے کہ نکاح کے بعد دولہن کے والدین دولہے کو منہ دیکھائی کے تحفے میں سونے کی گھڑی اور موٹر سائیکل دیں گے اگر نہیں دے سکتے تو ہم بارات واپس لے جانے کے لیے تیار ہیں۔

اماں ابا اور میرے قدموں کے نیچے سے جیسے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اگر انہیں اپنی شرائط منوانی ہی تھی تو شادی کی تاریخ طے کرنے سے پہلے ہی منواتے۔ میرے اماں ابا اپنی حیثیت سے بڑھ کر مجھے جہیز دے رہے تھے کہ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہ سب کچھ بھی دے سکتے تھے۔ مجھے زندگی اس وقت ٹوٹی پھوٹی اور بکھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ زمین باجود اپنی فراخی کے مجھے تنگ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں جیسے زمین میں دھنستی چلی جا رہی تھی۔ نا جانے مجھ میں ہمت اور جوش کہاں سے آیا کہ میں اسٹیج سے اٹھ کر ان تک پہنچی جہاں اماں ابا اور وہ لالچی لوگ کھڑے تھے۔ اگر آپ کو یہ چیزیں چاہئیں تھیں تو رشتے طے کرتے وقت بتانا چاہیے تھا۔ اگر ہم لوگ آپ کے معیار پر پورا اترتے تو اس رشتے کی حامی بھرتے ورنہ انکار کا راستہ موجود تھا۔

بڑی تیز زبان چلتی ہے تمہاری۔ ہمیں معلوم ہوتا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ رشتہ جوڑ رہے ہیں تو پہلے ہی اس رشتے پر تھوک چکے ہوتے۔ اتنی بدلحاظ لڑکی، جانے چال چلن کیسے ہوں گے۔ ہم لوگ جا رہے ہیں۔ بہت عزت افزائی ہوگئی ہماری، یہ غالبن میرے ہونے والی ساس کے الفاظ تھے۔ اماں روتی ہوئیں میری ساس محترمہ کے آگے آئیں۔ بہن ہم پر رحم کریں۔ ہم آپ کی یہ خواہش کچھ دنوں بعد پوری کردیں گے۔ بس تھوڑی ہی مہلت دے دیں۔ ہماری عزت کو یوں مٹی میں رول کر تو نا جائیں۔ اماں جانے دیں انہیں۔ جنہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمان کا پتا نہ ہو۔ جنہیں صرف جہیز کا لالچ ہو وہ بھلا تمہاری بیٹی کو کہاں خوش رکھ سکتے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ میں ساری زندگی اسی دہلیز پر بیٹھی رہوں۔ اماں کبھی میری طرف اور ابا کی طرف دیکھتیں اور کبھی ان لالچ پرست لوگوں کی طرف دیکھتیں۔ زینت کیا دیکھ رہی ہو جانے دو۔ تمہاری بیٹی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ خالہ حاضراں اپنے مخصوص انداز میں گویا ہوئیں۔ تو حاضراں کون کرے گا اس سے شادی۔ لڑکی ذات کو تو ہم ساری زندگی اپنی دہلیز پر نہیں بیٹھا سکتے۔ ہاں تو کون کہہ رہا ہے بیٹھانے کو۔ مولوی صاحب آپ نکاح شروع کریں۔ دلاور جاؤ اپنی دلہن کو لے کر مولوی صاحب کے پاس جاؤ۔ اس افراتفری میں نکاح ہوگیا۔ سب اپنی اپنی جگہ حیران کھڑے رہے تھے اور وہ زیادہ لالچ کے چکر میں آنے والے سب کچھ گنوا کر شرمندہ شرمندہ سے نظریں لیے جا چکے تھے۔

اب آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ دلاور کہاں سے آگیا۔ تو میں آپ کو بتاتی چلوں کہ دلاور خالہ حاضراں کا بیٹا تھا۔ آج میں اپنی زندگی میں خوش ہوں۔ لیکن ان ماں باپ سے کہوں گی کہ جو میرے ماں باپ کی طرح اپنی بیٹیوں کو بوجھ سمجھتے ہیں اور بغیر کچھ سوچے سمجھے ان کی زندگیوں کے فیصلے کردیتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ زندگی ان کی بیٹیوں کے لیے کتنے کانٹوں کے بیچ بچھائی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کوئی ثریا اپنے ماں باپ کے انہیں فیصلوں کی وجہ سے گھر چھوڑنے پر مجبور ہوجاتی ہے تو کوئی ثریا میری طرح سرعام تماشا بنتی ہے۔ کاش وہ سمجھ جائیں ہر ثریا کو خالہ حاضراں نہیں

ملے گی اور نہ ہی آخر میں خوشیاں نہیں ملیں گی اور نہ دلاور جیسا شوہر ملے گا۔ ہاں ایک صورت میں انہیں خوشیاں مل سکتی ہیں کہ اگر ماں باپ بیٹیوں کے مستقبل کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔ ارے ثریا جلدی کر کھانا تیار کر لو۔ دلاور آنے والا ہوگا۔ یہ تو خالہ حاضراں کی آواز ہے میں تو چلی۔ بہت باتیں کر لیں آپ دوستوں کے ساتھ۔

......☆☆☆......

خسارہ

سیما بنت عاصم

کہانی کا آغاز ہو چکا تھا۔ کبھی تم نے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کرتی کونجوں کی ڈار کو دیکھا ہے، بظاہر وہ اپنے آپ میں گم، یکساں سمت میں پرواز کرتی ہیں ان سب کے دھیان و گمان مختلف سہی سب ایک ہی منزل کی راہی ان کی سمتیں منزلیں ایک سہی مگر قسمتیں جدا ہوتی ہیں۔

انسان بھی ایسے ہی گھیراؤ کا اسیر ہے انسان کی پرواز سب سے بلند مگر دکھ سب کے مختلف ہیں مگر حوصلے جدا انسان کی منزل کا تعین قسمت کے ہاتھ ہے اس کی سمت، اس کی پرواز بھی قسمت مقدر کرتی ہے کسی کو گھر سے نکلتے ہی منزل مل جاتی ہے اور کوئی عمر بھر کا مسافر کوئی مٹی کو سونا بنانے والی قسمت لے کر آتا ہے اور کسی کے ہاتھ صرف خسارہ، کہانی کی ابتدائی سطریں لکھ کر ماہی نے قلم رکھ دیا تھا رات کا جانے کون سا پہر تھا دیوار گیر گھڑی نے نامعلوم کتنے اور کب گھنٹے بجائے تھے وہ لکھتی تو وقت کا شمار نہ رکھتی۔

اسی دم پاس سے گزرتی کسی سرکش ہوا کے تیز جھونکے نے کسی ان کہی کا بھید کھولا تھا قریبی کھڑکی کا سبز ریشمی پردہ دھیرے سے سرکا تھا تیسری منزل کی کھڑکی سے سامنے کا منظر واضح تھا۔

''ریاض منزل'' کی کئی منزلہ عمارت کا عقبی حصہ وسیع و عریض رقبہ پر یہاں سے وہاں تک نفاست سے ترشی گھاس چار جانب سبز باڑ کے ساتھ ساتھ پھل دار درخت اور اسی باغیچے کے ایک سرے پر کچا پکا سا کمرہ، عمارت کا صدر دروازہ سامنے سے گزرتی سڑک کی جانب کھلتا تھا محلہ کی سب سے عالی شان عمارت جو مالکان کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

تیسرے پہر کے سناٹے میں جا بجا جھینگر سے ٹرٹرائے، گلی میں اکا دکا ٹمٹماتے بلبوں کی نیم تاریکی اور دور کہیں گاہے بگاہے بجتی چوکیدار کی سیٹی۔

ماہی نے بس ایک ثانیے میں جھٹکا دینے والا منظر دیکھا تھا۔

اسی نیم تاریکی میں عمارت کے عقبی حصہ میں پھاٹک پر چڑھ کر اک سایہ کودا تھا چوروں کی طرح ادھر اُدھر تاک کر اپنے ہی گھر کی نچلی منزل میں کچے پکے کمرے کی کھڑکی پر محتاط سی دستک دی اوپری منزل پر اس کی بیوی گہری نیند میں غافل تھی اندر میٹھی نیند میں مست گلابو اس دستک سے آشنا تھی وہ تیر کی طرح سنسناتی کھڑکی تک پہنچی تھی۔

''ریاض...... تم...... تم تو آج نائٹ ڈیوٹی پر تھے؟'' رات کے سناٹے میں اس کی سرگوشی بھی واضح تھی۔

''فضول باتیں نہ کر میں اگر کمپنی گیا تھا تو ضروری نہیں کہ رات بھی وہیں کالی کرتا۔''

ریاض کے لیے وہ دن مثل عید رہتا جب گلابو کا شوہر شیرو گاؤں سدھارتا اور رات وہیں پڑاؤ ڈالتا۔

گلابو نے کچھ کہنا چاہا کہ ریاض نے اس کے لبوں پر اپنا بھدا ہاتھ رکھ دیا۔ ''جلدی کر آج میں نے اس بدبخت کو چسکی گھول کر نہیں پلائی ہے۔''

چوکیدار کی سیٹی کہیں قریب ہی بجی دروازہ کھٹ سے کھلا اور ریاض غڑاپ سے اندر گلابو نے اسے یوں سمیٹ لیا جیسے کبرا چنتے کسی مفلس کو قیمتی شے ہاتھ لگ جائے۔ یہ سب صرف چند لمحات پر محیط تھا۔

ماہی نے شکن زدہ پپوٹوں کو موند کر ہاتھ آنکھوں پر دھر لیے جیسے تخیل کسی دوشیزہ کی اٹھتی عمر کا بھید ڈھانپ لیتا ہے۔

......☆☆......

کہانی کا اگلا باب چل رہا تھا۔
ماہی کے قلم سے اگلی سطریں روانی کے ساتھ پھسل رہی تھیں۔
گلابو شیرو کی نو بیاہتا تھی اجلی نکھری چاندنی جیسی کرنجی آنکھوں والی گلابو شیرو سے کسی دور دراز گاؤں سے بیاہ کر لایا تھا سچ تو یہ تھا کہ گٹھے قد، چوڑے جبڑوں اور چندی آنکھوں والا شیرو گلابوں کی جوتی برابر بھی نہ تھا شیرو کی ماں گلابو کے نام سے بھی خار کھاتی اسے گالیاں بکتی، شیرو جب گاؤں جاتا اسے بچپن کی منگ کو بیاہنے پر اکساتی مگر گلابو شیرو کی سر چڑھی بیوی تھی۔
عجب پارہ صفت طبیعت تھی گلابو کی۔ شیروا سے کس کر تو رکھتا مگر ادھر اسی کی نظر چوکتی ادھر تھر کتا مچلتا پارہ تڑپ اٹھتا، شیرو کی آنکھ مندتی اور وہ کھٹ کھٹ کرتی سیڑھیاں چڑھتی اوپری منزل پر اعلیٰ بڑھیا اترن، سجنے سنورنے کے لوازمات اسے ریاض کی بیوی بانو سے ہی ملتے، یہی نہیں وہ سج سنور کے چھمک چھلو بنی اتراتی یہاں وہاں تاک جھانک کرتی پھرتی، کہیں ٹکرا تو ڑلیا۔ کہیں آگ لگادی زبان ایسی کہ اللہ کی پناہ گلی محلوں کے لڑکوں، دکانداروں سے ہنسی ٹھٹھول چلتی یہاں وہاں سے جانے کیا کچھ اڑا لاتی۔ اسی محلے کی کچھ من چلیاں ایسی بھی تھیں ادھر میاؤں کی پیٹھ مڑی ادھر ان کا جمگھٹا لگا اور پھر ان کی اپنی لن ترانیاں بہتان طرازیاں جیسے پرنالہ اپنے گھر کی کثافتیں بہا کر دوسروں پر چھینٹیں اڑا جائے۔
لوگ دوسروں کے بارے میں کیا کہتے کیا سوچتے ہیں گلابو کو ایسی عورتوں کے بیچ مزہ ملتا اس سے زیادہ مزہ، ان باتوں کو مرچ مسالا لگا کر ادھر سے ادھر لگانے میں۔
ایسے میں کہاں ممکن تھا کہ ریاض اور اس کی بیوی کا کردار درمیان میں نہ آتا۔
ریاض کے پاس پیسہ بے حساب تھا لاکھوں کی ملکیت تھی اور اپنا عالی شان سہ منزلہ مکان آڑھتی کے گوداموں سے لدے ٹرکوں کا حساب کتاب رکھتا، جانے کہاں کہاں ہیرا پھیری چلتی جو تنخواہ سے کئی گنا بھاری پڑتی، اسے اپنے پیسے پر گھمنڈ تھا چھاتی پھلاتا تن فن کرتا پھرتا اسے گمان تھا کہ دنیا کا حقہ پانی اسی کے دم سے چلتا ہے بن مانگے دوسروں کو احسان کی جوتی تلے دباتا اور پھر گاتا پھرتا تنگ دستوں کا مضحکہ اڑاتا وہ ناکام تھے اپنی دانست میں اس نے زندگی کے ایک ایک پل کا حق ادا کیا تھا۔
مگر زندگی میں سب ہی کچھ حسب منشا ہو تو وہ زندگی نہ کہلائے انسان دنیا یا خود کے لیے لاکھ بخت آور ہو تقدیر کہیں نہ کہیں اس کی لگام ضرور کس کر رکھتی ہے۔
اور شاید یونہی قدرت نے اس کی ایک رگ دبا رکھی تھی۔
اس کی شادی کو گیارہ سال گزر چکے تھے اور وہ بے اولاد تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں سوال اٹھتے ریاض پیسے والا آدمی تھا ایک کیا چار بیویاں بھگت سکتا تھا ورنہ لے پالک ہی سہی۔
مگر ریاض کو لے پالک اولاد منظور ہوتی تو دیر کا ہے کی تھی ایسے کیسے وہ کسی ایرے غیرے کو لاکھوں کی ملکیت کا وارث بنا دیتا۔ امید پر دنیا قائم ہے۔ شادیاں وہ چار کر لیتا مگر خود ہی کھوٹا سکہ ثابت ہو جاتا تو دنیا کو کیا منہ دکھاتا میڈیکلی وہ دونوں پازیٹیو ہیں بانو کہتی تو یہی تھی۔
شیرو سے بڑھ کر گلابو، ریاض اور اس کی بیوی کی سر چڑھی تھی۔
بانو کو بھی علاقہ بھر کی خبریں گلابو سے ہی ملتیں وہ بھی ایک کی چار لگا کر بدلے میں اترن بچا کچھا گلابو کو دے دیتی مگر بانو نے نہ کبھی کسی سے سوال کیا نہ کسی کا سر پھوڑا اپنے کام سے کام رکھتی۔
عجیب دھوپ چھاؤں سا مزاج تھا بانو کا خود کو محدود رکھتی۔

شاید انسان تنہا چلتا ہے تو جلدی تھک جاتا ہے وہ بھی تھک گئی تھی۔

دنیا سے ریاض کے معاملات جو بھی ہوں وہ نہ کبھی مداخلت کرتی نہ اس پر نظر رکھتی، ریاض کے لیے یہی کافی تھا عرصہ پہلے اس نے غیر ملک کے کسی لٹے پٹے قافلے سے اسے خرید کر نکاح کیا تھا تب اسے ٹھیک سے بولنا بھی نہ آتا تھا اس وقت بانو کی عمر بارہ سال تھی ریاض نے ہی اسے بیوی کا درجہ نہ دیا یا اس نے ہی خود کو ریاض کی باندی قرار دے رکھا تھا بات یکساں تھی سو گاڑی چل رہی تھی۔ ان ہی کونجوں کی مانند جن کی سمتیں منزل ایک مگر دھیان قسمتیں جدا۔ دونوں کے درمیان کبھی کسی نے چوں تک نہ سنی تھی خرابی، کمی، کجی جانے کہاں تھی، شاید قسمت میں قسمت جو سیرت سے مشروط ہوتی ہے لوگوں کے لیے ریاض جو کچھ بھی کرتا مگر پیٹھ پیچھے لوگ اس پر تھوکتے ہی تھے۔ دنیا کے لیے ریاض کا کردار جو بھی ہو مگر اس کے پاس پیسہ تھا اور پیسے سے بہت کچھ خریدا جا سکتا ہے مجبوریاں بھی اور......!

گلابو نے شہر آ کر دنیا دیکھی تھی محرومی یا تو انسان کو بہت اچھا بناتی ہے یا بہت برا خیر کہنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے کہنے والے تو یہ بھی کہتے باغیچہ کی نگرانی کے عوض ریاض نے سودا سستا کر رکھا ہے اچھا بھلا نچلا پورشن باغیچہ کے منوں پھل کی آمدنی ریاض کے لیے کوڑیوں کا مول تھی شاید یوں کہ گلابو کے لش لش حسن کا صدقہ تھی۔

ریاض نے دو اعلیٰ نسل ریشمین پال رکھے تھے ان کی نگہداشت باغیچہ کی دیکھ بھال اور رکھوالی کے لیے علاقہ میں پانی کی قلت تھی ریاض نے اسی باغ کے ایک سرے پر کنواں کھدوا کر پائپ لائن باہر نکال دی تھی۔ علی الصبح باغ کے سامنے ڈول، ڈرم، گیلن کی قطار لگتی۔ شیرو پائپ لگا کر سب کے برتن بھرتا اور اک مخصوص وقت پر موٹر بند کر دیتا پھر دن چڑھے تک پڑا اینڈتا رہتا، جب باغ کے درختوں کا پھل اترتا وہ منہ اندھیرے منڈی جاتا بھاؤ تاؤ اٹھائی دھرائی اور کھیسہ اپنا بھی بھاری۔ اگلی فصل تک اسی آمدنی سے گھر کا چولہا چوکی چلتا، باغبانی شیرو کا شوق بھی تھا اور آبائی پیشہ بھی گاؤں کی زمینوں سے اپنا حصہ وصول کر کے شہر میں زمینیں تو خرید لی تھیں مگر زمین کو باغیچہ بنانا چند لوگوں کا کام تھا بھلا۔

دنیا کب کسی کو بخشتی ہے علاقہ محلہ میں کہانیاں سفر کرتی ہی رہتیں، گلابو کے پچھن ایسے تھے کہ لوگوں کے لیے ایک چٹخارہ دار موضوع ٹھہرتی۔ لوگ تو یہ بھی کہتے کہ شیرو ایک ناکارہ آدمی ہے گلابو اس کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ نجانے سچ تھا کہ جھوٹ مگر یہ بات ریاض پر کھلی تو وہ کیوں نہ چلتی گنگا میں ہاتھ دھوتا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا گلابو کے لیے دنیا جو کچھ بھی کہتی رہے ریاض کو اپنے کام سے کام تھا اسے کون سا گلابو کو اپنی گھر والی بنانا تھا۔

ساری باتیں ایک طرف مگر گناہ کنویں کی کھوہ میں بھی ہو تو اوپر آ جاتا ہے انسان کی اپنی دو، مگر دنیا کی دو لاکھ آنکھیں ہوتی ہیں۔ لوگوں میں گلابو اور ریاض کے لیے جو بھی باتیں گردش کرتیں کیسے ممکن تھا کہ شیرو کے کانوں تک نہ پہنچتیں۔ وہ خود کو ریاض کا نمک خوار سمجھتا مگر سوراخ اپنی کشتی میں تھا اس نے گلابو کی ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دی شاید وہ اس کی جان ہی لے لیتا۔ اگر ریاض درمیان میں نہ کودتا شیرو کو کونے میں لے جا کر اس کے کانوں میں جانے کیا سر پھونکا کہ اک خاموشی چھا گئی کسی بڑے طوفان کی غماز خاموشی۔

کمی کجی جانے کہاں تھی کہاں نہ تھی بس ایک خاموش سمجھوتا یا معاہدہ ہو گیا تھا جس میں لین دین کا نرالا حساب تھا۔ شیرو کمزور نہ ہوتا تو شاید کمزور نہ پڑتا جو بات بگڑ چکی تھی ہاتھ سے نکل گئی تھی اب پرائی اور لاحاصل تھی پھر لاحاصل سے کچھ حاصل ہو جانا قسمت کی بات تھی شیرو بھلا کیوں ہاتھ روکتا۔

گیارہ سال کم نہیں ہوتے بالآخر خود ریاض بانو کو بھی اس کے کھوکھلے پن کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا بند دروازے کے پیچھے جو بھید تھا وہ اب بھید نہ رہا تھا اس بار شیرو گاؤں سدھارا تو ریاض کو بانو کے دودھ میں چٹکی گھولنے کی ضرورت نہ پڑی۔

مہرے بساط سے بھٹک جائیں تو کھیل بگڑ جاتا ہے۔ یہ کھیل بھی بگڑ چکا تھا۔ ریاض نے اپنی غرض کے لیے معاملہ سلجھا سنبھال تو لیا تھا مگر دنیا کو کیسے سنبھالتا دنیا کے لیے اگر کسی کا کردار لائق نفرین ٹھہرے تو کہیں پورے قد سے کھڑا نہیں ہو سکتا۔

یہ وہ کہانی تھی جو سب پڑھیاں تھی۔

☆☆

کہانی اپنے انجام کی جانب گامزن تھی۔

گلابو کی چوکڑیاں سست پڑنے لگی تھیں اس کی طبیعت بوجھل ہاضمہ خراب رہنے لگا پہلے تو شیرو گلابو کو بدہضمی کے چورن لاکر دیتا رہا مگر اصل معاملہ کچھ اور تھا تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ گلابو کی بدہضمی بڑھی تو شیرو کی کرامت والے بابا سے اس کا علاج کرانے اسے لے کر گاؤں سدھار گیا پھر شیرو کچھ دن بعد لوٹ آیا گلابو صرف خبروں میں رہ گئی۔ شیرو کا گاؤں اک بڑے سیلاب کی زد میں آ گیا تھا سیلاب کی تباہ کاریوں نے سب کچھ تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اخبارات، ٹی وی پر ہزاروں اموات سننے میں آتی رہیں۔ جو بچ گئے وہ بکھر گئے۔

جانے اس سے کتنے پرے کی بات تھی۔

اک روز ریاض راتوں رات بانو کو اسپتال لے کر گیا تھا اور جب بانو گود میں کرنجی آنکھوں والا گول مٹول بچہ لے کر ٹیکسی سے اتری تو دنیا انگشت بدنداں مانو یہاں سے وہاں تک کھلبلی مچ گئی ریاض کے ہاں گیارہ سال بعد خوشخبری متوقع تھی اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔ اک دھوم مچی ہوتی حاملہ کا پیٹ تھا۔ کوئی سربکھیرتا طنبورہ تو نہ تھا کہ اب تک سینت سنبھال کر چھپائے رکھا۔

دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والی بات تھی بچہ ہو بہو گلابو کا عکس تھا۔

اجلی نکھری چاندنی جیسی گلابو۔

فرسو کی کہتی کہ گلابو کا پرچھاواں پڑا ہے اور آگاہی خاموشی تھی۔

مانو کنوئیں کی کھوہ میں کیا گناہ اوپر آ گیا تھا۔

صدقہ دیا گیا مٹھائیاں بٹیں، کسی نے یقین کیا نہ کیا ریاض تو باپ بن ہی گیا تھا۔ اگلے کچھ دنوں میں شیرو کے پلاٹ پر تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

لوگ گلابو کو بھولنے لگے تھے ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔ مگر دنیا اپنے حسابوں سے کڑی سے کڑی جوڑتی ہے کڑیاں جوڑ کر کہانی بن گئی تھی۔

سیلاب کا زور ٹوٹنے کے بعد شیرو کے گاؤں میں کوئی جان لیوا وبا پھیلی تھی شیرو نے گلابو کو لا کر جانے کس اسپتال میں جا پھینکا پھر پلٹ کر اس کی خبر نہ لی۔

اس کا پلاٹ اب سبزہ پھل پھلواری سے سج گیا تھا پھلوں کے درخت اونچے ہونے لگے تھے کچھ دنوں بعد وہ گاؤں سے اپنی منگ بھی بیاہ لایا۔

کچھ پنچھی جھنڈ میں اڑتے ہوں
اور رستہ بھی کچھ مشکل ہو
کچھ دور افق پہ منزل ہو
اک پنچھی گھائل ہو جائے
اور بے دم ہو کر گر جائے
تو رشتے، ناتے پیار بھی
کب اس کی خاطر رکتے ہیں
اس دنیا کی ہے ریت یہی
جو ساتھ چلو تو ساتھ بہت

جو رک جاؤ تو تنہا ہو

کہانی کا آغاز ماہی کے ہاتھوں ہوا تھا اور اسی کے قلم سے اختتام ہونا تھا مگر کہانی کا کردار گم ہو گیا تھا کہانی ادھوری رہ گئی تھی۔

......☆☆......

ماہی ایک بڑے اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل تھی اس کی سفید کرولا اک روز سگنل پر رکی تھی پہیوں والی گاڑی پر سوار اک بھکارن کی چھڑی سے فرنٹ ڈور کا شیشہ کھٹ کھٹ بجا تھا ماہی کی نظریں مڑیں اور پھر پلٹنا بھول گئیں، اس کی جلد سیاہ پڑ چکی تھی اور جسم کے عیاں حصے آبلوں سے بھرے پڑے تھے سیاہ ملگجی چادر میں ملفوف چہرے سے آنکھیں ہی آنکھیں نمایاں تھیں۔ کرچی لودیتی آنکھیں۔

''گلابو!'' ماہی کے لبوں کی بے اختیار جنبش پر وہ بجلی کی طرح تڑپی تھی ہاتھ سڑک پر رکھ کر پہیوں والی گاڑی کو تیز تیز رگڑتی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

سگنل کی بتی بدلی ماہی کی گاڑی نے موڑ کاٹا مگر وہ گاڑیوں کے درمیان رستہ بناتی تیزی سے گم ہو چکی تھی۔

ماہی نے کہیں پڑھا تھا زندگی تو بہت ہلکی پھلکی ہے بوجھ تو سارا خواہشات کا ہے یہ سارا خواہشات کا ہی تو کھیل تھا اک خاموش سمجھوتہ اک معاہدہ اور اس سارے کھیل کا سب سے کارآمد مہرہ اس معاہدہ کی آلہ کار اس کے ہاتھ صرف خسارہ یہی اس کہانی کا انجام ہے اور یہی اس کا عنوان۔

......☆☆☆......

اماں جنتے

ڈاکٹر عفت بھٹی

کچے صحن کی لپائی کرتے جیسے ہی اس کی نظر باہر سے آنے والے رستے پہ گئی۔ اڑتی دھول کا غبار نظر آیا مارے تجسس کے اماں جنتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رب دیاں خیراں کدرے ریاض پتر تے نہیں آ گیا۔ اس نے فٹافٹ نلکے سے ہاتھ دھوئے اور باہر نکل آئی سامنے چوڑی سی پگڈنڈی تھی جو حد نظر فاصلے پہ جا کر کچی سڑک میں ضم ہو جاتی تھی اس کچی سڑک سے شہر سے آنے والی بس دو ٹائم گذرتی تھی صبح وہ جاتی اور شام ڈھلے واپس آتی۔ گاؤں والے اسی بس پہ شہر جاتے اور شام کو لوٹ آتے۔ شہر جانے والے لوگ بھی مخصوص تھے۔ ڈاکٹر فضل دین جو کسی زمانے میں کسی حکیم کے پاس دو ماہ کی نوکری کر کے ڈاکٹر کہلاتا تھا ہر ہفتے پندرہ دن بعد شہر دوائیاں لینے جاتا۔ اس کے پاس ست رنگے رومال ہوتے جس میں وہ مختلف گولیاں باندھ کر لاتا۔ لال رومال میں بخار کی، پیلے میں درد کی، نیلے میں قبض کی، گلابی میں جلاب کی، الغرض اس کے رومال دواخانے میں گاؤں والوں کے ہر مرض کا علاج موجود ہوتا۔ شہر جانے والا دوسرا شخص اسلم ڈاکیا تھا جو ڈاک لاتا تھا۔ پھر اکرم پنساری جو ضرورت کا سودا سلف لینے جاتا تھا گاؤں میں اس کی واحد دکان تھی جہاں سے گاؤں والے خریداری کرتے۔ گاؤں میں پانچویں تک نام کا اسکول موجود تھا جہاں ماسٹر اللہ بخش کا راج تھا بچے پڑھتے کم اور لڑائیاں اور کشتیاں زیادہ کرتے تھے ایک بجا سارا دن پہاڑے ایک دونی دو، دو دونی چار، رٹا لگا تا رہتا اور ماسٹر صاحب رنگین پائیوں والی چارپائی پہ لیٹے حقے کی نال منہ میں دبائے حقہ گڑگڑاتے رہتے۔ صدیق ذرا جاندار لڑکا تھا وہ ان کی مٹھی چاپی کرتا رہتا۔ ریاض اماں جنتے کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کا شوہر ایک وبائی بیماری میں چل بسا تھا۔ بھری جوانی میں بیوگی کے بعد اس کی ساری توجہ کا مرکز ریاض ہی تھا۔ ریاض نے پانچویں تک ماسٹر اللہ بخش کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی آگے پڑھا کر باؤ بنانا جنتے کا خواب تھا۔ دو بیگھے زمین سے گذر بسر ہی ہوتی تھی گھر کا آٹا دانا چلتا۔ مگر اماں جنتے بڑی توکل پسند عورت تھی

اس نے ٹھان رکھی تھی کہ ریاض کو پڑھانا ہے۔ سو اس نے کچھ کر کرا کے ریاض کو شہر بھجوا دیا وہاں اس کا دور کے رشتے کا بھائی رہتا تھا اس نے ایک سرکاری اسکول میں ریاض کو داخل کروا دیا فیس تو برائے نام تھی مگر جنتے کی بھابھی کو ریاض کی دو روٹیاں بھاری لگتیں۔ آخر جیسے تیسے کر کے ریاض نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ کل ہی اس کا خط آیا تھا کہ وہ آج کل میں واپس آ رہا ہے اس لیے اماں جنتے کو اس کا انتظار تھا۔

اماں جنتے نے ہاتھوں کا چھجا بنا کر دور نظر دوڑائی آنے والے کی شبیہ واضح ہو گئی وہ ریاض ہی تھا۔ ماں کی ممتا بے تابی سے آگے بڑھی بسم اللہ میرا پتر آ گیا اس نے ریاض کے گرد آلود چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر ماتھے پہ بوسہ دیا ماں صدقے قربان۔ ریاض نے ماں کو سلام کیا اور ساتھ لگائے گھر میں داخل ہوا۔ بیٹھ میرا بچہ اماں جنتے نے بڑا سا پیڑھا بچھایا اس کو اپنے بوسیدہ دوپٹے سے جھاڑا اور بلائیں لیتے ہوئے ریاض کو بیٹھنے کو کہا۔ خود جلدی سے لسی کا گلاس بھر کے لے آئی جس پہ مکھن کا پیڑا تیر رہا تھا۔

اماں کیسی ہے؟ ریاض نے گلاس تھامتے ہوئے پوچھا۔ میں ٹھیک ہوں پتر تو بڑا ماڑا ہو گیا ہے۔ ٹھیک تو رہتا ہے نا؟ اماں جنتے کو اپنا قد نکالتا ہوا بیٹا کمزور لگ رہا تھا۔

ہاں اماں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اماں بھوک لگ رہی ہے کتنے دن ہو گئے تیرے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا۔ ریاض نے لاڈ سے ماں کی گود میں سر رکھ دیا۔

میں واری میرے لعل تو منہ ہاتھ دھو میں ابھی تیرے لیے روٹی پکا کے لائی۔ ریاض مسکراتے ہوئے نلکے کی طرف بڑھ گیا۔

اب آگے کیا کرنا ہے تو نے پتر؟ چاچا رحیم ریاض سے پوچھ رہا تھا۔ بس چاچا نتیجے کا انتظار پھر آگے پڑھوں گا ابھی تو منزل دور ہے۔ اس نے کھیتوں میں لگے پانی کے کنارے پہ بیٹھے سفید بگلوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

پر پتر تیری ماں اب وڈیری ہو گئی ہے اس کا خیال کر آگے پڑھنے کے لیے تو سنا ہے بڑا پیسہ چاہیے۔ میری مان تو کوئی کام دام کر لے شہر میں۔ چاچا رحیم نے صلاح دی۔

اچھا چاچا اماں انتظار کر رہی ہو گی میں چلتا ہوں ریاض نے کھڑے ہو کر کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا اور گھر کی طرف چل دیا۔

امتحان کا نتیجہ آ گیا اور ریاض اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا تھا مگر اب آگے پڑھنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اماں جنتے نے اپنی زمین زمیندار کے پاس گروی رکھوا دی اور اس سے رقم لا کر ریاض کے ہاتھ پہ رکھ دی۔ اماں جنتے اپنی آنکھوں کے خواب ٹوٹتے ہوئے کیسے دیکھ سکتی تھی سو اس کا مطمع نظر ریاض اور اس کا مستقبل تھا۔ ریاض نے پارٹ ٹائم ایک گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ چار سال اسی طرح بیت گئے۔ گریجویشن مکمل ہوئی تو نوکری کی تلاش شروع ہوئی مگر جب جوتوں میں سوراخ ہو تو نوکری کون دیتا ہے چھ ماہ بیت گئے۔ ریاض ہر آنے والے دن کے ساتھ مایوس اور اماں جنتے کی کمر خمیدہ ہوتی چلی گئی۔ زمین بھی ہاتھ سے گئی نہ اتنی رقم ہوتی کہ زمیندار کا قرض اترتا۔ اب ریاض پہ باہر جانے کی دھن سوار ہو گئی۔ وہ بہت چڑچڑا ہو گیا تھا اور اماں جنتے خاموش۔ آخر ایک دن غیر قانونی طور پہ لانچ کے ذریعے مسقط جانے کا انتظام ہو گیا۔ رہی سہی زمین بھی زمیندار کو بیچ کر رقم لے کے، ریاض اماں جنتے کو خواب اور تسلیاں دے کر کراچی چلا گیا جہاں سے اسے مسقط جانا تھا۔ ایک بار پھر اماں جنتے کے دامن میں خوابوں کا انتظار سما گیا اور اس کی بوڑھی نظریں دھول اڑاتی پگڈنڈی پہ جم گئیں جہاں سے ریاض نے آنا تھا۔ برسوں پہ برس بیت گئے آنکھوں میں انتظار کی شمعیں ماند پڑنے لگیں اور پھر ایک دن شمع بجھ گئی مگر آنکھیں دھول اڑاتی پگڈنڈی پہ ہی تھیں جہاں کسی کی آمد کی دھول اڑ رہی تھی۔ مگر وہ آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ انہیں کیا خبر تھی کہ مسافر تو سفر کے دوران ہی غیر قانونی طور پر سرحد پار کرتے ہوئے کوسٹ گارڈ کی فائرنگ سے عازم سفر ہو گیا تھا۔

ذوقِ آگہی

سباس گل

نعمتوں کی بقا کا نسخہ

اللہ رب العزت کا فرمان ہے اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم اپنی نعمتیں ضرور بالضرور اور زیادہ عطا کریں گے۔ گویا شکر ایک ایسا عمل ہے کہ جس کی وجہ سے نعمتیں باقی بھی رہتی ہیں اور بڑھتی بھی چلی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ مانگنے والوں کو اپنے مانگنے میں کمی کا شکوہ رہا جبکہ دینے والے کے خزانے بہت زیادہ ہیں اور مانگنے والوں کے دامن چھوٹے ہیں جو جلدی بھر جاتے ہیں حضرت رابعہ بصریؒ ایک دفعہ کہیں کھڑی تھیں ان کے قریب سے ایک نوجوان گزرا اس نے اپنے سر پر پٹی باندھی ہوئی تھی انہوں نے پوچھا بیٹا کیا ہوا، اس نے کہا اماں میرے سر میں درد ہے اس وجہ سے پٹی باندھی ہوئی ہے پہلے تو کبھی درد نہیں ہوا انہوں نے پوچھا۔

بیٹا آپ کی عمر کتنی ہے وہ کہنے لگا جی میری عمر تیس سال ہے یہ سن کر وہ فرمانے لگیں بیٹا تیرے سر میں تیس سال تک درد نہیں ہوا تو نے شکر کی پٹی تو کبھی نہیں باندھی تجھے پہلی دفعہ درد ہوا تو تو نے شکوے کی پٹی فوراً باندھ لی ہے ہمارا حال بھی یہی ہے کہ ہم سالہا سال اس کی نعمتیں اور سکون کی زندگی گزارتے ہیں ہم اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور جب ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے تو فوراً شکوے کرنے شروع کر دیتے ہیں۔

عائشہ ملک اعوان۔۔۔۔ رحیم یار خان

حضرت محمد ﷺ

آپ ﷺ جو چادر مبارک اوڑھتے تھے اس کی لمبائی 4 گز اور چوڑائی سوا دو گز تھی۔

آپ ﷺ جو عمامہ پہنتے اس کی لمبائی 7 گز تھی۔

آپ ﷺ کو دو خوشبوئیں پسند تھیں عود اور مشک۔

آپ ﷺ جس دھات کی انگوٹھی پہنتے تھے وہ چاندی تھی۔

آپ ﷺ کے پاس 3 تلواریں تھیں ذوالفقار، آسور، تابار۔

آپ ﷺ کے پاس 2 اونٹنیاں تھیں عقبی اور قسوئی۔

آپ ﷺ نے اسلام کی دعوت صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر دی یہ پہاڑی مکہ میں ہے۔

تارا شاہ۔۔۔۔۔ چکوال

قرآن کیا ہے؟

اللہ کی کتاب جو پوری دنیا کی سردار۔

کتاب کو لانے والے حضرت جبرائیل علیہ السلام جو فرشتوں کے سردار۔

جس نبی پر اتارا وہ نبیوں کے سردار یعنی حضرت محمد ﷺ۔

جس امت پر اتارا وہ امتوں کی سردار یعنی امت مسلمہ۔

جس شہر میں اتارا وہ شہروں کے سردار یعنی مکہ، مدینہ۔

جس مہینے میں اتارا وہ مہینوں کا سردار یعنی رمضان۔

جس رات کو مکمل ہوا وہ راتوں کی سردار شب قدر۔

یہ ہے ہماری وراثت افسوس صد افسوس امت مسلمہ پھر بھی تہی دامن نظر آتی ہے۔

گل مہر۔۔۔۔۔ کراچی

پانامہ

کون پوچھے گا اہل ثروت کو
جرم جتنا بڑا کیا ہوتا
مجھ سا ہوتا کوئی مفلس تہذیب
وہ تو اندر بھی ہو چکا ہوتا

راؤ تہذیب حسین تہذیب۔۔۔۔۔ رحیم یار خان

رشتے

کہتے ہیں کہ جب رشتوں پر اعتبار اور موبائل فون پر نیٹ ورک نہ ہو تو پھر لوگ گیمز کھیلنا شروع کر دیتے ہیں سو ایسے میں جب لوگ موسموں کی طرح بدلنے لگیں کچھ اصول رشتوں ناطوں کو بھی سانچ کر خود سے قریب کر لیں کہ کہیں وقت کی چھلنی سے چھنتے دھوپ چھاؤں جیسے کچھ خیالات اور احساسات ان کے رنگوں کو ماند نہ کر دیں۔ سچ ہے وقت کے ساتھ اگر رشتے بھی بدلنے لگیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے تو پھر یہ زخم گھاؤ تا دیر ہرے ہی رہتے ہیں تب ہی تو سیانے کہتے ہیں کہ جذبہ چاہے شدید محبت ہو یا شدید نفرت کا ہو

دونوں ہی صورتوں میں دل کی دنیا میں قیامت مچا دیتا ہے سو گاہے بگاہے ان گلاب جیسے رشتوں کو مضبوط تر کرنے کے لیے اور کچھ نہیں تو میل ملاپ کے کچھ بہانے ہی تلاش کرتے رہا کریں۔

پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

اقوال زریں

انسانی زندگی کا دارومدار فکر پر ہے اور عمل کی صورت میں دراصل انسانی فکر ہی کی جلوہ گری ہوتی ہے۔

اگر ہارنے والا اپنے چہرے پر مسکراہٹ برقرار رکھے تو جیتنے والا جیت کی خوشی اور تسکین سے محروم رہتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ مسکراتے رہو۔

دنیا کی محبت سے اللہ نہیں ملتا لیکن اللہ کی محبت سے دنیا اور آخرت دونوں مل جاتی ہیں۔

انسان کی عزت اور اس سے محبت کرو کیونکہ انسان کے اندر خدا کی کوئی نہ کوئی صفت موجود ہوتی ہے۔

خوش اخلاقی پاکیزہ نسب کی دلیل ہے غلط بات پہ آنا شرافت کی نشانی ہے لیکن غصے کو پی جانا مومن کی نشانی ہے۔

دو چہرے انسان کبھی نہیں بھلا سکتا ایک مشکل وقت میں کام آنے والا دوسرا مشکل وقت میں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

غم کا نقش تمہارے اندر جتنا گہرا ہوتا ہے اتنی ہی تم میں مسرت کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور

لمحہ فکریہ

ایک غریب فیملی جس میں پانچ افراد تھے باپ ہمیشہ بیمار رہتا آخر میں فوت ہو گیا تین دن تک پڑوسیوں نے کھانا بھیجا، پھر ماں نے کچھ دن جیسے تیسے بچوں کو کھلایا پھر فاقے پڑنے لگے جس کی وجہ سے ان کا آٹھ سال کا بیٹا بیمار پڑ گیا اور بستر پکڑ لیا۔ پانچ سال کی بچی نے ماں کے کان میں پوچھا۔

''اماں بھائی کب مرے گا؟'' ماں تڑپ گئی اور کہا ایسا کیوں کہہ رہی ہوں۔

بچی نے معصومیت سے کہا

اماں بھائی مرے گا تو گھر میں کھانا آئے گا نا۔

یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے ہمارے آس پاس کئی ایسے غریب لوگ ہیں جن کے گھر رات کے لیے آٹا بھی نہیں ہوتا ہمارے مال میں غریبوں کا حق ہے صدقہ خیرات ماہ رمضان یا عید کا محتاج نہیں ہے بلکہ ہمیشہ صدقہ کرتے رہیں تاکہ نار جہنم سے بچ سکیں۔

محمد یاسر اعوان...... رحیم یار خان

سنہری باتیں

خوب صورت مرد وہ ہوتا ہے جو عورت کو موتیے کا پھول سمجھے۔

علم ایک ایسا ساتھی ہے جو تمام عمر ساتھ نہیں چھوڑتا۔

کنجوسی دولت کا مالک نہیں بلکہ دولت اس کی مالک ہوتی ہے۔

ہم دولت سے بستر تو خرید سکتے ہیں مگر نیند نہیں۔

پھول نے وقت سحر آسمان سے فریاد کی کہ مجھ سے شبنم چھینی جا رہی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ آسمان اپنے ستارے کھو رہا ہے۔

زندگی کی ٹھوکریں انسان کو جگمگاتی ہیں اور مصائب کی آگ پختہ کرتی ہے۔

زندگی کی لو دوسروں سے ادھار نہیں لی جا سکتی اسے خود روشن کرنا پڑتا ہے۔

زندگی وہ منتظر آنکھ ہے جو موت کا انتظار کرتی ہے۔

مصیبت سے مت گھبرایئے کیونکہ ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔

محمد رفاقت...... واہ کینٹ

حاجی کا اللہ سے راز و نیاز

ایک بزرگ غلاف کعبہ پکڑے بارگاہ الٰہی میں عرض گزار ہیں۔ الٰہی اس گھر کی زیارت کو حج کہتے ہیں اور کلمہ حج میں دو حرف ہیں اللہ ح سے تیرا حکم اور ج سے میرے جرم مراد ہیں تو اپنے حکم سے میرے جرم معاف فرما دے۔

آواز آئی اے میرے بندے تو نے کتنی عمدہ مناجات کی پھر کہو۔

وہ بندہ خدا دوبارہ نئے انداز سے یوں پکارتا ہے اے میرے بخشن ہارا اے غفار تیری مغفرت کا دریا گناہگاروں کی مغفرت و بخشش کے لیے پرجوش ہے اور تیری رحمت کا خزانہ ہر سوالی کے لیے کھلا ہے الٰہی اس گھر کی زیارت کو حج

کہتے ہیں اور حج دو حروف پر مشتمل ہے ح اور ج ح سے میری حاجت اور ج سے تیرا جود و کرم تو اپنے جود و کرم سے اس مسکین کی حاجت پوری فرما آواز غیب آئی اے جوانمرد تو نے کیا خوحمد کی پھر کہو وہ پھر عرض کرنے لگا اے خالق کائنات تیری ذات ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے تو نے اپنی عافیت کا پردہ مسلمانوں پر ڈال رکھا ہے میرے رب اس گھر کی زیارت کو حج کہتے ہیں حج کے دو حروف ہیں ح ج۔ ح سے مراد میری حلاوت ایمانی اور ج سے تیری جلالت جہانگیری مراد ہے تو تو اپنی جلالت جہانگیری کی برکت سے اس ناتواں ضعیف بندے کے ایمان کی حلاوت کو شیطان سے محفوظ رکھنا۔ آواز آئی اے میرے مخلص ترین عاشق وصادق بندے تو نے میرے حکم میرے جود و کرم اور میری جلالت جہانگیری کے توسل سے جو کچھ طلب کیا ہے میں نے تجھے عطا فرمایا میرا تو کام ہی مانگنے والے کا دامن بھر دینا ہے مگر بات یہ ہے کہ کوئی مانگے تو سہی کسی کو مانگنے کا سلیقہ تو آتا ہو۔

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان

قربانی

درخت کیا ہے ایک بیج کی قربانی ایک بیج جب اپنے آپ کو فنا کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے تو اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک سرسبز شاداب درخت زمین پر کھڑا ہو، اینٹوں سے اگر آپ پوچھیں کہ مکان کس طرح بنتا ہے تو وہ زبان حال سے یہ کہیں گی کہ کچھ اینٹیں جب اسے کے لیے تیار ہوتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن کر دیں اس کے بعد وہ چیز ابھرتی ہے جس کو مکان کہتے ہیں یہی حال انسانی زندگی کی تعمیر کا ہے انسانیت کے مستقبل کی تعمیر اس وقت ممکن ہوتی ہے جب کچھ لوگ اپنے آپ کو بے مستقبل دیکھنے پر راضی ہو جائیں قربانی کے ذریعے تعمیر قدرت کا ایک عالمگیر قانون ہے اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی قدرت کا یہی اصول مادی دنیا کے لیے بھی ہے اور یہی اصول انسانی دنیا کے لیے بھی عمارت کا اوپر والا حصہ ہر کسی کو دکھائی دیتا ہے مگر بنیاد کسی کو دکھائی نہیں دیتی کیونکہ وہ زمین کے اندر دفن رہتی ہے اور یہی نہ دکھائی دینے والی بنیاد ہی ہے جس پر پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے قومی تعمیر کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قربانی یہ ہے کہ آدمی قومی تعمیر میں ان کی بنیاد بننے پر راضی ہو جائے۔ قربانی یہ نہیں کہ آدمی جوش میں آ کر لڑ جائے اور اپنی جان دے دے وہ ایسے کام میں اپنی کوشش صرف کرے جس میں دولت یا شہرت کی شکل میں ملنے والی کوئی قیمت نہ ہو جو مستقبل کے لیے عمل کرے نہ کہ حال کے لیے۔ کسی قوم کی ترقی اور کامیابی کا انحصار ہمیشہ اسی قسم کے افراد پر ہوتا ہے یہی وہ لوگ ہیں جو کسی قوم کے مستقبل کی بنیاد بنتے ہیں وہ اپنے آپ کو دفن کر کے قوم کے لیے زندگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

محمد کاشف...... رحیم یار خان

اظہار محبت
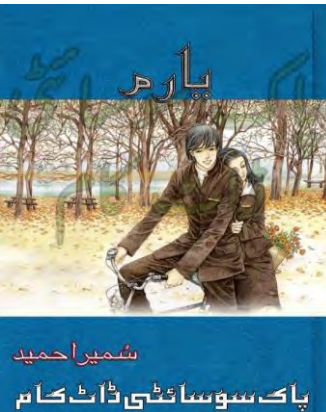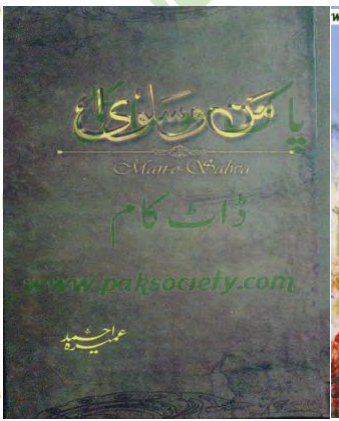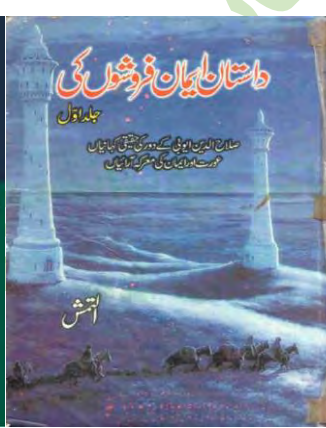
اکثر میں تمہیں اتنی شدت سے یاد کرتا ہوں کہ صحن دل کے در و دیوار روشن ہو جاتے ہیں۔ میں نے خانہ دل میں صرف اور صرف تمہارا بت تراش رکھا ہے ہاں یہ ضروری تو نہیں کہ ہر محبت کو وصال حاصل ہو ویسے بھی میں نے سچی محبتوں کو دفن ہوتے ہی دیکھا ہے تم ہر وقت میری سوچوں میں شامل ہو تمہاری یادوں نے میرے چاروں طرف حصار ڈالے ہوئے ہیں اکثر عالم تصور میں میں تمہارے ساتھ باتیں کرتا ہوں تمہاری الجھی زلفیں اداس چہرہ مجھے پریشان رکھتا ہے ہاں کچھ لوگ ظلم ہوتے ہیں لیکن تمہاری اک اک ادا ظالم ہے تمہاری سرمئی آنکھیں کہ ہم داستاں چہرہ پھول کی طرح شاداب ہے جسم مہکتی ہوئی چاندنی میرے لیے تو جنت کی پری ہے میری زندگی تیری خوشی سے جڑی ہے۔

خواجہ حسین...... منچن آباد

سات موتی

زندگی کی مالا میں ایسے قیمتی موتی جمع کرو جن کی چمک سے سارے جہاں میں روشنی پھیل جائے۔

اپنی زندگی میں ایسی شمعیں روشن کرو جن کی روشنی سے آنے والی نسلیں روشنی حاصل کریں۔

وہ انسان جو علم حاصل کر کے بھی گناہ کرے وہ اس پھول کی طرح ہے جو شوخ رنگ ہونے کے باوجود خوشبو نہ دے سکے۔

کتابوں کو زمین پر نہ گرنے دیا کرو کیونکہ کتابیں انسان کو آسمان پر لے جاتی ہیں۔

عادتیں ابتدا میں کچے دھاگے کی طرح ہوتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ لوہے کی تار بن جاتی ہیں جن میں شخصیت محصور ہو کے رہ جاتی ہے۔
بہتے ہوئے پانی کا رخ موڑ دیں۔

نور شاہ...... مانسہرہ

جب سچائی دل میں ہو تو کردار میں حسن پیدا ہوتا ہے
اگر کردار میں حسن ہو تو ماحول خوش گوار ہوتا ہے۔
اچھی بات چاہے کوئی بھی کہے پلو سے باندھ لو کیونکہ جب موتی کی قیمت مقرر کی جاتی ہے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ سمندر کی تہہ سے لانے والا شریف ہے یا ذلیل۔

فیصل کمال...... فیصل آباد

محبت کیا ہے؟

محبت کیا ہے؟ محبت کتاب ہے اخبار نہیں جو آج پڑھا اور کل باسی ہو جائے۔ محبت ٹشو پیپر کا باکس نہیں جسے استعمال کے بعد پھینک دیا جائے۔ محبت تو عطر میں بھیگا ہوا رومال ہے جو ہزار بار دھل جائے تو بھی عطر کی مہک دیتا رہتا ہے اور ہر وقت استعمال میں رہتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے درمیان ذات کی نفی ۰ ۰ وقت کی کمی ۰ ۰ مالی مسائل اور ذاتی رکھ رکھاؤ حائل نہیں ہوتے۔ محبت تو شیئرنگ کا دوسرا نام ہے بیگانگی کا نہیں۔

جہانگیر بٹ...... گوجرانوالہ

دعا

میں نے دعا مانگی
زمین کی سلامتی کی
اس پر رزق کی فراوانی کی
درختوں کی پناہ گاہیں آباد ہونے کی
ہجرت کر کے جانے والے پرندوں کی واپسی کی
لیکن ان سب دعاؤں سے پہلے
میں نے دعا مانگی
زمین کی رہائی کی

شازیہ احمد...... چنیوٹ

ایک اہم نصیحت

کچھ چیزیں وزن میں اتنی ہلکی ہوتی ہیں کہ وہ پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہیں مثلاً کاغذ لکڑی اور گھاس پھوس وغیرہ لیکن کچھ چٹانیں ہوتی ہیں جو پانی کے ساتھ بہتی نہیں ہیں بلکہ وہ پانی کا رخ موڑ دیتی ہیں۔ ہم مومن ہیں اس لیے ہم گھاس پھوس اور تنکے نہ بنیں بلکہ ہم چٹان بن جائیں اور

عورت

سچے پیار کا مظہر ہیں یہ عورت کے دو روپ
جلتے دن میں سایہ ہے وہ ٹھٹھرے دن میں دھوپ
قدم قدم قربانی ہے وہ قدم قدم ایثار
وہ آنکھوں سے چن لیتی ہے ہر اک راہ کے خار
وقت کے طاق میں رکھ دیا ہے اس کا اک اک پل
نسلِ نو کا آج اسی سے اور اسی سے کل
روشنی رنگ ہوا اور خوشبو سب اس کی پہچان
وہ جو نہ ہو تو دنیا ساری ہو جائے ویران

کلام: سعد اللہ شاہ
انتخاب: ماہ جبین...... کراچی

توبہ

یہ زلزلے شہر روشنی کے بدل گئے نالہ و فغاں میں
نوائے غم ہے ہر اک صدا میں
مہکتی شاموں کے پھول چہرے
دھوئیں کے بادل میں اٹ گئے ہیں
لہو میں رنگ تڑپ تڑپ کر گزر رہے ہیں
حیا کی پتلی جواں بیٹی سڑک پر بکھری
حریص نظروں سے منہ چھپائے
ردائے عصمت کو ڈھونڈتی ہے
سیاسی جلسوں میں حکمراں ہمارے! نام اپنا پکار رہے ہیں
مگر یہ دعویٰ ہے ان کا یہ مملکت ہے عظیم جس میں ہماری طاقت جمہوریت ہے اگر یہی وہ جمہوریت ہے
تو میری توبہ ہے ایسی زندگی سے

نذیر خان...... گجرات

خوش بوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

غزل

محبت میں کس نے ملائی ہے نفرت
مری جان کو اب تو آئی ہے نفرت
وہ رنگِ فضا بھی لہو ہو گیا ہے
زمیں آسمانوں پہ چھائی ہے نفرت
ہیں ساز اور الفاظ آپس میں الجھے
کسی نیتو گیتوں میں گائی ہے نفرت
کیا کھل سکیں گے گلستان میں گل اب
پیامِ بہار میں آئی ہے نفرت
رواں سال فصلوں میں کانٹے اُگے ہیں
یہ دریا میں کس نے بہائی ہے نفرت
جواں اک بھی زندہ نہیں گاؤں میں اب
وراثت میں ہم نے یہ پائی ہے نفرت
ہوے جاں کے دشمن ہم اِک دوسرے کی
یہ واعظ نے کیسی سکھائی ہے نفرت
مسلماں کا کٹتے گلا دیکھتا ہوں
سبھی کے دلوں میں سمائی ہے نفرت
محبت میں بھی آگ سی لگ گئی تھی
بڑی مشکلوں سے بجھائی ہے نفرت

عامر شہزاد تشنہ

حیرت کیسی......؟

ہم بھی مسکرا سکتے ہیں
اس میں جاناں
حیرت کیسی؟
ہم بھی رنگ بکھرا سکتے ہیں
ہوائیں دیپ جلا سکتے ہیں
تم سے دور بھی جا سکتے ہیں
اس میں جاناں
حیرت کیسی؟

سباس گل......رحیم یار خان

غزل

بات کو سمجھا نہیں تو کس قدر نادان ہے
چل رہا ہے جس پہ تو یہ راستہ آسان ہے
بحر عصیاں میں تو غوطہ زن ہوا ہے کس لیے
سامنے تیرے اگر چہ حشر کا میدان ہے
گو میسر ہے اسے ہر اک سہولت کی گھڑی
پھر بھی انسان آج کتنا بے سرو سامان ہے
تو نے کیوں اپنا لیا ہے جھوٹ کو ہر کام میں
اے مسلمان حق پرستی ہی تیری پہچان ہے
بات ہے انسان کی فہم و ذکا سے بالا تر
زندگی میں زر پرستی کا بڑا نقصان ہے
پر سکوں رہنے کا ہم نے راز پایا ہی نہیں
اپنے جیون میں تو اب ہیجان ہی ہیجان ہے
کیوں ہے اپنی آخرت کی زندگی سے بے خبر
اس جہاں میں تو قمر چند روز کا مہمان ہے

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

نظم

نیلا آکاش بوندیں کاجل مہندی
بارش کی جھنکار سنگ میرے تو
ساگر پنچھی شبنم دھنک پروا
بارش کی جھنکار سنگ میرے تو
سرمئی کبوتر کرن بنفشی بادل ساون
بارش کی جھنکار سنگ میرے تو
شبہ مہ نکہت رم جھم بھیگا بدن گھٹا
بارش کی جھنکار سنگ میرے تو
خندہ گل دھانی آنچل خوش بو گلاب
عنبرین بارش سنگ محبتوں کے دکھ

عنبرین اختر......لاہور

غزل

دل ہے مجبور تیری یاد ستانے کے سوا
کوئی چارہ ہی نہیں تجھ کو منانے کے سوا
اپنے انداز پہ میں آج پشیماں ہوں بہت
چین آئے نہ مجھے تجھ کو بتانے کے سوا
ہر طرف یاد کی صورت میں تو ہی تو مجھے
کوئی رستہ ہی نہیں ہاتھ اٹھانے کے سوا

ہو کے مجبور یہ عرض سی لکھی ہے آ جا
کاش وہ منظور کر کے آئے زمانے کے سوا
تو نے پیروں کے تلے راکھ مسل دی خط کی
یہ بڑا ظلم کیا آگ لگانے کے سوا
کون سا جرم کیا شاہین نے بتا دے مجھ کو
اپنی آہوں کو مگر تجھ سے چھپانے کے سوا
انتخاب: پرنس افضل شاہین...... بہاولنگر

غزل

دل کے داغوں سے وفا کرتا رہا
دوستی کا حق ادا کرتا رہا
دل کو غم سے آشنا کرتا رہا
قرض تھا مجھ پر ادا کرتا رہا
پھول سے خوش بو جدا کرتا رہا
یہ نہ سوچا میں کیا کرتا رہا
راہزنوں کو راہ نما کرتا رہا
کتنا سادہ دل تھا کیا کرتا رہا
ظلمت شب کو مٹانے کے لیے
خون دل سے میں ضیا کرتا رہا
کوئی تو ملتا پرستار وفا
زندگی بھر میں دعا کرتا رہا
میں تو دشمن کو نہ دھوکا دے سکا
وہ محبت میں دغا کرتا رہا
دستگیر شہزاد...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

غزل

سپاہیوں کو نکلتا ہوا دکھائی دیا
کوئی چراغ تو جلتا ہوا دکھائی دیا
دکھوں نے رابطے مضبوط کر دیے میرے
تمام شہر بدلتا ہوا دکھائی دیا
یہ پیاس مجھ کو زمین بوس کرنے والی تھی
کہ ایک چشمہ ابھرتا ہوا دکھائی دیا
وہ میرے ساتھ بھلا کتنی دور جائے گا
جو ہر قدم پہ سنبھلتا ہوا دکھائی دیا
نئی ہوا سے سفر اب کہاں کہ شہر مرا
نئے مزاج میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیا
توقعات بھی اٹھنے لگیں زمانے سے
جو ایک شخص بدلتا ہوا دکھائی دیا
شکست دے کے مجھے خوش تو تھا بہت حرا
مگر وہ ہاتھ بھی ملتا ہوا دکھائی دیا
حرا نعیم...... فیصل آباد

غزل

یہ معجزہ آنکھوں کی تمازت سے ہوا ہے
دل زندہ اگر ہے تو محبت سے ہوا ہے
کس شوق کے رستے پہ پڑا پاؤں کہ اب تو
اندیشہ جاں شہر ملامت سے ہوا ہے
نکلا ہے یہ کس آگ سے پھر غوطہ لگا کر
کندن میرا دل کیسی حرارت سے ہوا ہے
اک خواب دلآویز تھا دنیا کی نظر میں
پلکوں سے جدا کیسی اذیت سے ہوا ہے
پتھر میں ازل سے کہیں موجود تھا شاہکار
پیدا مگر اک تیشۂ حیرت سے ہوا ہے
کیوں آج ان آنکھوں نے کیا مجھ پہ ترحم
کیا رنج نمایاں میری صورت سے ہوا ہے
حسین جاوید...... مخن آباد

غزل

ایک غلطی جناب ہم نے کی
زندگانی خراب ہم نے کی
جو گزاری تمہاری قربت میں
بس گھڑی وہ ثواب ہم نے کی
پی کے تیری مست آنکھوں سے
ہستی اپنی شراب ہم نے کی
ساری بنجر زمیں اداسی کی
چشم تر سے سیراب ہم نے کی
ظرف پروانے کو سکھایا ہے
رت موسم گلاب ہم نے کی
اس نے مانگا خراج الفت کا
ذات اپنی نصاب ہم نے کی
لے کر میکشی بہار سے عامر
اک کہانی کتاب ہم نے کی
عامر زمان عامر...... بورے والا

غزل

تجھ سے مل کر تو یہ لگتا ہے کہ اے اجنبی دوست
تو میری پہلی محبت تھی میری آخری دوست
لوگ ہر بات کا افسانہ بنا دیتے ہیں
یہ تو دنیا ہے کئی دشمن کئی دوست
یاد آئی ہے تو پھر ٹوٹ کے یاد آئی ہے
کوئی گزری ہوئی منزل کوئی بھولی ہوئی دوست
اب بھی آئے ہو تو احسان تمہارا لیکن
وہ قیامت جو گزرنی تھی گزر بھی گئی دوست
تیرے لہجے کی تھکن میں تیرا دل شامل ہے
ایسا لگتا ہے جدائی کی گھڑی آگئی دوست
بارش سنگ کا موسم ہے میرے شہر میں تو
تو یہ شیشے سا بدن لے کے کہاں آگئی دوست
میں اسے عہد شکن کیسے سمجھ لوں جس نے
آخری خط میں یہ لکھا تھا فقط آپ کی دوست

محمد یاسر اعوان...... رحیم یار خان

خواب

مجھے خواب دیکھنے سے ڈر لگتا ہے
خواب صرف خواب نہیں ہوتے
ان کی تعبیر بھی ہوتی ہے
اور تعبیر کی تلاش میں
زندگی کڑی مسافت بن جاتی ہے

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

یہ کیسے موسم میں لوٹے ہو تم
اب تو نہ پھولوں میں شبنم ہے باقی
نہ بہاروں کی رونقیں ہیں باقی
دریاؤں کی طغیانیاں بھی نہیں باقی
اب کیوں لوٹے ہو تم...؟؟
ہے پت جھڑ کا موسم اب
زرد زرد سا منظر ہے سب
مرجھا رہی ہیں ساری کلیاں
ٹوٹا بکھرا ہے شجر کا پتہ پتہ
یہ کیسے موسم میں لوٹے ہو تم جاناں
کہ نہیں باقی رہی اب جذباتوں میں حدت
نہ نگاہوں میں بسی آس کوئی
نہ چہرے پہ رقم یاس کوئی
کیوں لوٹے ہو اس موسم میں تم
اب تو بارشوں کی طلب بھی نہیں رہی
خواہش محبت بھی نہیں رہی
کہ کچھ باقی نہ رہا
میں بھی نہیں رہی باقی
کیوں لوٹے ہو تم

اقصیٰ سحر...... کراچی

نظم

سنو اب ہم نہیں ہیں تو
تم اب کس پہ مرتے ہو
کہ اب ہم نہیں ہیں تو
کسکی خاطر تم جیتے ہو
سنو اب ہم نہیں ہیں تو
دکھ اپنے وہ سارے تم
اب کس سے شیئر کرتے ہو
ملے کوئی خوشی کی خبر تو
اب کسکو کال کرتے ہو
اب جب اداس ہوتے ہو
تو کس سے بات کرتے ہو
کہ اب کس سے بات کرنے سے
اداسی دور ہوتی ہے
سنو اب ہم نہیں ہیں تو
سارے دن کے قصے تم
اب کسکو سناتے ہو
سنو اب ہم نہیں ہیں تو
کس کے گیت گاتے ہو
کہ کسکی خاطر تم
اب پھول لاتے ہو
سنو اب ہم نہیں ہیں تو
اب کسکو مناتے ہو
کہ اب کسکو ستانا تمکو
اچھا سا لگتا ہے
سنو اب ہم نہیں ہیں تو
وہ سارے دن کے قصے تم
اب کسکو سناتے ہو

اریشہ فاروق ..... گجرانوالہ

راجہ

وہ راجہ کسی شیش محل کا
میں داسی کوئی تھرکی
میری پہنچ سے وہ دور مسلسل اور
میں انتہا پر بے بسی کی
نوحہ کناں دل میرا
وہ شانت سمندر سا
حلق میں کانٹوں کا جھنڈ جیسے
سیرابی من کی خواہش لاحاصل سی
کاشت جن جذبوں کی دل بے اختیار نے کی
فرق کی وہ نظر ہوئے
میں منا نہ سکی دنیاوی خداؤں کو
وہ سمجھ نہ سکا میری سادہ سی زبان
کہ وہ راجہ تھا کسی شیش محل کا
اور میں داسی سی کوئی تھرکی

کوثر ناز ..... حیدر آباد

غزل

میں تھا اور کُہرا تھا
لیکن منصف بہرہ تھا
تیرے قرب میں جو بھی گزرا
وہ اک دور سنہرا تھا
اس کے روپ کو تکتے تکتے
چاند افق پہ ٹھہرا تھا
اپنوں نے جو زخم دیا
غیروں سے بھی گہرا تھا
ترے بن جو جیون گزرا
تپتی ریت کا صحرا تھا
کس سے شکوہ کرتے ہم
شہر تو سارا بہرہ تھا
جھوٹ تھا اتنا عام ندیم
سچ کہنے پہ پہرہ تھا

شفیق احمد ندیم ..... کراچی

غزل

اجلا اجلا سا سماں ہے
تم سے مہکا گلستاں ہے
کچھ سمجھ آتا نہیں ہے
دل میرا جانے کہاں ہے
وہ بھی کترانے لگا ہے
کون جانے درمیاں ہے؟
وہ بھی تھا اک موسم گل
یہ بھی اک دور خزاں ہے
زخم دے کر مسکرانا
یہ بھی دستور جہاں ہے
بجلیاں ہر سو رانا
اور غریب آشیاں ہے

قدیر رانا ..... راولپنڈی

غزل

ارادے جن کے آہن ہوں قوی ہوں فیصلے جن کے
وہ طوفاں خیز موجوں سے بھی گھبرایا نہیں کرتے
شرارے آنکھ میں بجلی بھری ہو جن کے پیکر میں
وہ مومن مرد سچ کہنے پہ پچھتایا نہیں کرتے
نگاہوں میں شرافت ہو حیا ہو آنکھ میں جن کی
وہ سوئے اور چڑھ جانے پہ کترایا نہیں کرتے
نگاہیں ان کو ڈھونڈیں گی قیامت سے قیامت تک
جو چھپ جاتے ہیں دنیا سے وہ پھر آیا نہیں کرتے
دلوں کو توڑنے والے کہاں آباد ہوتے ہیں
ہمیشہ تشنہ لب رہتے ہیں کچھ پایا نہیں کرتے
غزل کیسے بھلادوں اتنے پیاروں کو جو دل میں
بنا لیتے ہیں گھر اپنا وہ پھر جایا نہیں کرتے

سلمیٰ غزل ..... کراچی

زرین قمر

سمیر احمد فاروقی کوئی عام نوجوان نہیں تھا وہ کم عمری ہی سے ذہین پڑھنے کی خداداد صلاحیت لے کر پیدا ہوا تھا۔ خطرے کا احساس اسے وقت سے پہلے ہو جاتا تھا لیکن اس کی سترہویں سالگرہ پر اسے احساس ہوا کہ وہ کتنا مختلف ہے پھر ایک حادثے نے اسے احساس دلایا کہ اسے اپنی خداداد صلاحیت کو بڑھانے کی ضرورت ہے ورنہ اس کا جینا ناممکن ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنی صلاحیتوں کو بڑھانا شروع کر دیا اور سپر ہیرو بن گیا لیکن کوئی نادیدہ قوت تھی جو اسے مارنا چاہتی تھی۔

اس کہانی کے نام، کردار، جگہیں اور واقعات رائٹر کے ذہن کا تخیل ہیں اور کسی سے ان کی مماثلت صرف اتفاقیہ ہوگی۔

لمبے لمبے تناور درختوں کے درمیان کچے راستے پر وہ سرپٹ دوڑے جارہا تھا اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں، بھاگتے بھاگتے وہ تھک گیا تھا لیکن اس سیاہ ہیولے نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا جب بھی اس نے مڑ کر دیکھا تھا، وہ اسے اپنے تعاقب میں ہی نظر آیا تھا کئی جگہ راستے کے پتھروں سے ٹکراتا ہوا وہ آگے بڑھتا جارہا تھا وہ سیاہ ہیولا اسے کوئی چھلاوہ لگ رہا تھا کبھی وہ درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوتا کبھی وہ سائے کی طرح اس کے پیچھے فضا میں اڑتا نظر آتا کبھی کسی درخت کے اوپر موجود ہوتا خوف سے اس کا برا حال تھا وہ پسینے سے شرابور تھا اس کی ٹانگیں شل ہوگئی تھیں پر دوڑتے دوڑتے وہ ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر گیا تھا اور وہ سیاہ ہیولا اس کے اوپر آگیا تھا اس کا چہرہ بالکل سیاہ اور خوف ناک تھا اس نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا تو اس کی نظر چمکدار خنجر پر پڑی وہ اسے مارنا چاہتا تھا خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔

''ممی ممی مجھے بچاؤ۔'' وہ پوری قوت سے چیخا اور اس کی آنکھ کھل گئی وہ زمین پر پڑا تھا اس کے سر پر گھنے درختوں کا سایہ تھا اس کی کتاب اس کے برابر میں پڑی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ اپنے گھر کے اطراف موجود جنگل میں اسٹڈی کرنے کے لیے آیا تھا اور شاید یہ پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔

سمیر احمد فاروقی کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ انٹر کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ یہ امتحان پرائیویٹ اسٹوڈنٹ کے طور پر دے رہا تھا کیونکہ وہ جس علاقے میں رہتا تھا وہاں آس پاس کوئی کالج نہیں تھا۔ اس نے دو سال پہلے مقامی اسکول سے میٹرک کیا تھا اور اس کے والدین اسے کسی دور دراز کے علاقے میں اکیلا بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھے چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ انٹر کا امتحان پرائیویٹ دے دے۔ کبھی کبھی وہ اسٹڈی کرنے گھر کے قریب جنگل میں آجایا کرتا تھا۔ ان کا گھر مقامی آبادی سے کچھ دور لمبے لمبے اور گھنے چناروں کے جنگل میں واقع تھا۔ یہ جگہ سمیر احمد کے والدین نے منتخب کی تھی یہ بہت پر فضا مقام تھا اور سمیر کو بھی پسند تھا۔

سمیر احمد ہڑبڑا کر اٹھا اور تیزی سے دوڑتا ہوا گھر کی طرف جانے لگا اس نے پیچھے درختوں میں پڑی کتاب بھی اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی گھر کا دروازہ کھول کر جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں وہ ڈرائنگ روم میں موجود براؤن صوفے پر ڈھیر ہوگیا تھا۔

''کیا ہوا سمیر؟'' اس کی والدہ نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی تیز بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور وہ پسینے میں شرابور تھا۔

''کچھ نہیں! میں بھاگتا ہوا آیا ہوں۔'' سمیر نے مختصر جواب دیا۔

''کیوں۔'' بھلا اس طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی تمہارا پیچھا کر رہا تھا؟''

''ہاں یہ ہی سمجھ لیں۔'' سمیر نے کہا۔

''اچھا لو یہ پانی پیو اور مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے؟'' انہوں نے میز پر رکھے جگ سے ایک گلاس میں پانی انڈیل کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ پانی پینے کے بعد اس کے سانسیں کچھ سنبھلیں۔

''اب بتاؤ کیا بات ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔'' سمیر نے کہا۔

''پھر؟...... پھر کیا ہوا...... اس طرح سرپٹ بھاگتے ہوئے کیوں آئے ہو؟''

''میں نے خواب دیکھا تھا۔''

''کیسا خواب؟''

''کوئی میرا تعاقب کر رہا تھا...... وہ مجھے مارنا چاہتا تھا...... میں بھاگ رہا تھا پھر میں گر گیا اور وہ میرے اوپر سوار ہوگیا اس کے ہاتھ میں چمکدار خنجر لہرا رہا تھا میری چیخ نکل گئی اور پھر میری آنکھ کھل گئی میں اتنا خوفزدہ ہوگیا تھا کہ کتاب اٹھانا بھی بھول گیا اور بھاگتا ہوا گھر آگیا۔'' سمیر احمد نے اپنا خواب سنایا تو اس کی والدہ کے چہرے پر تفکر کے آثار نظر آنے لگے۔

''اچھا چلو...... منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوجاؤ...... آج مجھے

مہینے کی شاپنگ کے لیے جانا ہے تم بھی میرے ساتھ ہی چلو گے۔'' انہوں نے کہا تو سمیر کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آنے لگے یہ اس کا پسندیدہ کام تھا کیونکہ اس کے علاوہ اسے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔

کچھ ہی دیر میں تیار ہو کر وہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنے والد کی جیپ میں بیٹھ کر قریبی بستی کے شاپنگ سینٹر پہنچ گیا تھا اور اپنی پسندیدہ چیزوں کی شاپنگ میں مصروف ہو گیا تھا پھر اسے احساس ہوا کہ ایک شخص مسلسل اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس نے ایک سیاہ جینز، سیاہ جیکٹ اور سیاہ ہیٹ پہنا ہوا تھا اس کا قد غیر معمولی طور پر لمبا تھا اور وہ دبلے پتلے جسم کا مالک تھا پہلے تو سمیر کو خیال آیا کہ یہ اس کی غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے لیکن کئی بار چیک کرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ اس سیاہ لباس والے شخص کی توجہ کا مرکز وہی ہے اس وقت وہ اپنی والدہ کے ساتھ سپر مارکیٹ کے بیکری والے سیکشن میں تھا پھر اس شخص نے ایک الماری سے بریڈ اٹھا کر اپنی باسکٹ میں ڈالی اس کی نظریں اب بھی سمیر پر ہی تھیں اور سمیر کو عجیب سی بے چینی کا احساس ہو رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ شخص صرف اس کو ہی مسلسل کیوں گھور رہا ہے اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی عجیب بات تھی سمیر کو اس کی آنکھیں دیکھ کر نہ جانے کیوں شارک مچھلی کی آنکھوں کا خیال آ رہا تھا۔ سرد مردہ آنکھیں ان کے پیچھے جیسے کوئی روح یا زندگی نہ ہو اس شخص کی توجہ ان چیزوں پر نہیں تھی جو وہ خریدنے کے لیے اپنی باسکٹ میں ڈالتا جا رہا تھا سمیر لاکھ کوشش کے باوجود اس کی سوچ کو پڑھ نہیں پا رہا تھا حالانکہ وہ دوسروں کی سوچ کو پڑھ لینے کی خداداد صلاحیت رکھتا تھا اور یہی چیز اس کے لیے حیرت کا باعث تھی کہ اس شخص کا ذہن سمیر کی پہنچ سے باہر تھا سمیر کو یوں لگا جیسے وہ پراسرار شخص اس کی خداداد صلاحیتوں سے واقف ہو اور اس نے اپنا ذہن سمیر کے لیے بالکل بند کر دیا ہو۔ سمیر بھی اپنی پسند کی چیزیں منتخب کر کے اپنی باسکٹ میں ڈالتا جا رہا تھا اور وہ شخص اس کے ارد گرد قریب ہی موجود تھا۔

''کیا تمہیں اپنی پسند کی بریڈ مل گئی؟'' اس کی والدہ نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو سمیر نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا وہ چند قدم کے فاصلے پر موجود تھیں انہیں دیکھ کر سمیر کی ہمت بڑھی اس نے چند گہری گہری سانسیں لے کر خود کو نارمل کیا۔

''آپ مجھ سے کچھ کہہ رہی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا کوئی پریشانی کی بات ہے تم ایک ہی جگہ کھڑے ہو؟'' انہوں نے پوچھا اور سمیر اس سیاہ لباس والے شخص کی طرف مڑا اور اپنا ہاتھ بھی اس سمت میں اٹھایا تا کہ اپنی والدہ کو اس کے بارے میں بتا سکے لیکن وہ شخص اپنی شاپنگ باسکٹ لیے آگے بڑھ گیا تھا اور آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ الماریوں میں سے کچھ پیکٹ اٹھا کر اپنی باسکٹ میں ڈالتا جا رہا تھا اس نے ایک بار بھی پلٹ کر سمیر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ سمیر نے پھر ایک لمبی گہری سانس لی اس نے ایک بار پھر یہی سوچا کہ شاید اس کی غلط فہمی ہو اور اس شخص کی توجہ کا مرکز شاید کوئی اور چیز رہی ہو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

''کچھ نہیں! کوئی بات نہیں۔'' سمیر نے والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں یقین ہے؟'' اس کی والدہ نے اس کے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے چہرے پر مجھے خوف کے آثار نظر آ رہے تھے؟'' انہوں نے فکرمندی سے کہا وہ ہمیشہ ایسی ہی سچی باتیں کہہ دیتی تھیں کہ سمیر حیران رہ جاتا تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں ممی۔'' سمیر نے انہیں یقین دلانے والے انداز میں کہا وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں پریشان کرے جب کہ اس کے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھا وہ ویسے ہی سمیر کے لیے کافی فکرمند رہتی تھیں اور اس کی حفاظت کے خیال سے اسے گھر میں بند رکھتی تھیں جس کی وجہ سے سمیر قیدیوں والی زندگی گزار رہا تھا اس رویے کی وجہ اس کے والدین نے اسے کبھی نہیں بتائی تھی۔

''سب ٹھیک ہے۔'' سمیر نے کہا پھر اس کی والدہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے انہیں روک دیا۔

''کیا میں کہانی کی نئی کتاب لے سکتا ہوں؟'' سمیر نے

بات بدلتے ہوئے پوچھا۔
"ہوں!...... لے سکتے ہو۔" انہوں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا۔
"یس!" سمیر خوشی سے چیخا اور اسٹور میں موجود سارے لوگ اس کی آواز پر چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔
"اوہ سوری۔" اس نے شرمندگی سے کہا۔
"شکریہ ممی...... بہت شکریہ...... آپ بہت اچھی ہیں۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ پھر وہ اسٹور کے دوسرے حصے میں چلا گیا تھا جہاں کتابوں کا سیکشن تھا اور مختلف الماریوں میں کہانیوں کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں اس کے علاوہ بچوں کے انڈور گیمز کا سامان بھی موجود تھا وہ ٹہلتا ہوا اس شیلف کی طرف چلا گیا جہاں کہانیوں کی کتابیں موجود تھیں۔ وہ باری باری ان کا جائزہ لینے لگا۔ ایک ایک کہانی کا نام پڑھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ سب کہانیاں اس کی پسندیدہ تھیں لیکن وہ انہیں کافی عرصہ پہلے پڑھ چکا تھا وہ کوئی ایسی نئی کتاب نہیں تھی جو اس کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کر سکے سمیر نے اداسی سے گہری سانس لی اور اسی وقت ایک بھورے بالوں والا اسی کی عمر کا لڑکا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اس نے دھاری دار شرٹ اور بلیو جینز پہنی ہوئی تھی۔
"تم یہ کیوں نہیں پڑھتے۔ یہ میری پسندیدہ ہے۔" اس نے ایک کتاب دکھاتے ہوئے کہا جس کے کور پر ایک آدمی کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس نے ایک نوعمر لڑکے کے سینے میں ایک نوکدار لکڑی اتاری ہوئی تھی اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔
"نہیں شکریہ!" سمیر نے کہا اور پیچھے ہٹ گیا۔
"میری ممی مجھے ایسی خوفناک کہانی پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گی جبکہ میں اس سے ملتی جلتی ایک کہانی پہلے ہی پڑھ چکا ہوں میری ممی نے مجھے بہت ڈانٹا تھا وہ ایسی کہانیاں پسند نہیں کرتیں میں نے جو کہانی پڑھی تھی اس میں بھی ایک خوفناک آدمی تھا جو جنگلوں میں رہتا تھا اور بچوں کو مار ڈالتا تھا اس کے بعد مجھے ڈراؤنے خواب آنے لگے۔ مجھے ہر طرف وہی نظر آتا تھا اور میرے خوفزدہ ہونے پر لوگ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتے تھے لیکن پھر میری ممی نے کہا کہ یہ میرا وہم ہے اور انہوں نے ایسی خوفناک کہانیاں پڑھنے پر پابندی لگا دی۔" سمیر نے اسے بتایا۔
"ارے نہیں تم یہ پڑھو...... یہ خوفناک نہیں ہے...... یہ تو مزاحیہ کہانی ہے۔" اس نے کہا۔
"مزاحیہ؟ لیکن اس کا کور دیکھ کر مجھے اس کے مزاحیہ ہونے کا اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔" سمیر نے کہا۔
"لیکن اس شیلف میں یہی واحد کتاب ہے جو میں نے پڑھی نہیں ہے۔" سمیر نے کہا اور کتاب لے لی۔ وہ پھر مزید چیزیں دیکھتا ہوا اسٹور میں آگے بڑھنے لگا وہ اجنبی لڑکا بھی اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا یوں لگتا تھا کہ وہ سمیر سے دوستی کرنا چاہتا ہو اور بات کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا ہو لیکن سمیر ایسا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر اس کی ممی کو پتہ چل گیا تو وہ اسے ماریں گی اسے صرف اپنے والدین سے بات کرنے کی اجازت تھی یا پھر وہ اپنی آنٹی سارہ سے بات کر سکتا تھا جو سال میں دو بار ان لوگوں سے ملنے ان کے گھر آتی تھیں۔
بعض اوقات سمیر کو الجھن ہوتی تھی کہ اس کے والدین اس کی اتنی سخت حفاظت کیوں کرتے ہیں اور انہوں نے اسے کالج میں داخلہ کیوں نہیں دلایا ہے جہاں وہ دوسرے بچوں سے مل سکتا تھا باتیں کر سکتا تھا وہ اکثر سوچتا کہ ان کا گھر بھی شہر کے ہنگاموں سے دور جنگل کے بیچ میں واقع ہے جہاں عام لوگوں کا گزر نہیں ہوتا اس کی اسٹڈی میں اس کے والدین اس کی مدد کرتے تھے اور دوسرے لوگوں سے وہ صرف شاپنگ کے دوران ہی مل سکتا ہے اس وقت اس کی ممی اسٹور کے دوسرے حصے میں تھیں چنانچہ اس کے لیے گولڈن چانس تھا کہ وہ اس لڑکے سے کچھ باتیں کر لے۔
"کیا تم ایک کھیل کھیلنا پسند کرو گے؟" اس نے اجنبی لڑکے سے پوچھا اور اجنبی لڑکے کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی جیسے یہ اس کی بھی خواہش ہو۔
"ہاں! کیوں نہیں؟" اس نے کہا اور اپنی جیب سے تاش کی ایک گڈی نکال لی۔

"میں تمہیں ایک جادو دکھا سکتا ہوں۔" اجنبی لڑکے نے کہا۔

"جادو؟ وہ کیسے؟" سمیر نے تجسس سے کہا۔

"اس میں سے ایک کارڈ اٹھاؤ..... مجھے مت دکھانا میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کون سا کارڈ اٹھایا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" سمیر نے کہا اور تاش کی گڈی سے اوپر والا کارڈ اٹھالیا اور اسے دیکھ کر اپنے سینے سے لگالیا ایسے کہ وہ اجنبی اسے نہ دیکھ سکے۔

"یہ دل کا بادشاہ ہے۔" اس نے پوچھنے والے انداز میں کہا۔

"نہیں! یہ اینٹ کا چوکا ہے۔" سمیر نے ہنستے ہوئے کہا اور اسے کارڈ بھی دکھایا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ کرتب میں زیادہ اچھا دکھا سکتا ہوں اب تم کارڈ اٹھاؤ۔" سمیر نے اس کے ہاتھ سے تاش کی گڈی لیتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں کرسکو گے..... یہ آسان نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"صرف تربیت یافتہ لوگ ہی یہ کرتب کرسکتے ہیں۔"

"ارے تم کارڈ تو اٹھاؤ۔" سمیر نے پھر کہا۔

"چلو دیکھتے ہیں ویسے یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔" اس اجنبی لڑکے نے کارڈ اٹھاتے ہوئے کہا پھر اس نے کارڈ دیکھ کر اسے چھپانے کے لیے اپنے سینے سے لگالیا تھا سمیر نے اس کی سوچوں پر توجہ دی۔

"یہ ڈائمنڈ کی کوئن ہے۔" سمیر نے کہا

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اجنبی لڑکے نے حیرت سے کہا۔

"لیکن یہ تو تم نے اتفاق سے بتادیا چلو دوبارہ کرتے ہیں۔" اس نے گڈی سمیر کے ہاتھ سے لے کر پھینٹی اور اس سے ایک پتا نکال کر گڈی اسے پکڑادی۔

"یہ چڑیا کا ستہ ہے۔" سمیر نے کہا اس نے پھر اجنبی لڑکے کی سوچوں کو پڑھ لیا تھا اور وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ایک بار پھر۔" اجنبی لڑکے نے شوق سے کہا اسے مکمل

میں دلچسپی ہوتی جارہی تھی اس نے ایک اور کارڈ اٹھالیا تھا پھر ان دونوں نے تقریباً بیس بار یہ کھیل کھیلا تھا اور سمیر ہر بار درست جواب دیتا رہا تھا۔

''تم یہ کیسے کرسکتے ہو؟'' اجنبی لڑکے نے حیرت سے کہا۔

''میں تمہاری سوچیں پڑھ سکتا ہوں۔'' سمیر نے فخریہ انداز میں کہا۔

''ارے چھوڑو...... اچھا بتاؤ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟'' سمیر سے اجنبی نے پوچھا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' سمیر نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا وہ یونہی اداکاری کررہا تھا حالانکہ وہ جہاں کھڑا تھا وہاں سے بھی آسانی سے اس کی سوچیں پڑھ سکتا تھا۔

''تم سوچ رہے ہو کہ میری سیاہ آنکھیں بہت خوبصورت ہیں اور انہیں دیکھ کر تمہیں اپنی امی کی سیاہ آنکھوں کا خیال آرہا ہے۔'' سمیر نے کہا اور اجنبی لڑکا حیرت سے اچھل پڑا۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''صرف یہی نہیں میں اور بھی کچھ کرسکتا ہوں۔'' سمیر نے فخریہ انداز میں کہا۔

''ارے چھوڑو...... اچھا بتاؤ میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟'' سمیر سے اجنبی نے پوچھا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' سمیر نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا وہ یونہی اداکاری دکھارہا تھا حالانکہ وہ جہاں کھڑا تھا وہاں سے بھی آسانی سے اس کی سوچیں پڑھ سکتا تھا۔

''تم سوچ رہے ہو کہ میری سیاہ آنکھیں بہت خوبصورت ہیں اور انہیں دیکھ کر تمہیں اپنی امی کی سیاہ آنکھوں کا خیال آرہا ہے۔'' سمیر نے کہا اور اجنبی لڑکا حیرت سے اچھل پڑا۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''صرف یہی نہیں میں اور بھی کچھ کرسکتا ہوں۔'' سمیر نے فخریہ انداز میں کہا۔

''وہ کیا؟ تم اور کیا کرسکتے ہو؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اگر میرے ساتھ کچھ غلط ہونے والا ہو تو مجھے اس کا اندازہ ہوجاتا ہے۔'' سمیر نے کہا۔

''جیسے کہ Spider man محسوس کرلیتا ہے اپنے SpiderSens سے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں! اور یہ میری خداداد صلاحیت ہے میں اس خوبی کے ساتھ پیدا ہوا ہوں۔'' سمیر نے کہا۔

پھر وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہوگیا تھا کیونکہ بلیک لباس میں موجود شخص اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا وہ قریب ہی ایک شیلف سے کوئی کتاب اٹھا رہا تھا۔

''وہ کون ہے؟'' اس اجنبی لڑکے نے بھی اس شخص کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی قاتل یا خوفناک شخص ہے۔'' اجنبی لڑکے نے پھر کہا شاید وہ بھی اس سے خوف محسوس کررہا تھا۔

''ہاں؟ ایسا ہی لگتا ہے۔'' سمیر نے جواب دیا اسے بھی خوف محسوس ہورہا تھا لیکن وہ اس شخص کے سامنے سے بھاگ کر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ ڈر گیا ہے جب کہ اس شخص کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ سمیر کو ڈرانا چاہتا ہو سمیر کو یوں لگا جیسے اس کا ذہن ماؤف ہوگیا ہو اس نے سوچا کہ اسے اس شخص سے دور ہوجانا چاہئے وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف دوڑا وہ ہر قدم پر پیچھے مڑ کر دیکھتا جارہا تھا لیکن وہ پراسرار اجنبی اپنی جگہ موجود تھا اور یہ ظاہر کررہا تھا جیسے اس کی ساری توجہ کہانیوں پر ہی ہو اور وہ سمیر کی طرف سے بے خبر ہو لیکن اب وہ سمیر کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا کیونکہ سمیر سمجھ گیا تھا کہ وہ سمیر کے پیچھے ہی تھا سمیر کو اپنی ممی کی تلاش تھی تاکہ وہ جلد از جلد ان کے ساتھ اسٹور سے نکل جائے۔ وہ اپنی ممی کی سوچیں پڑھنے کی کوشش کررہا تھا جو اسے اسٹور میں پچاس قدم کے فاصلے پر محسوس ہورہی تھیں۔ سمیر نے انہیں پکارا اور کوشش کی کہ وہ اس کی یہ خاموش پکار سن لیں۔

''آپ کہاں ہیں؟'' سمیر نے پوچھا۔

''میں Frozen Section میں ہوں۔'' انہوں نے سوچوں ہی میں جواب دیا اور سمیر نے سوچا کہ یہ بہت اچھا

ہے اب وہ جلد از جلد اسٹور سے نکل جائیں گے کیونکہ اس کی والدہ ہمیشہ شاپنگ کے آخری حصے ہی میں Frozen Section سے چیزیں خریدتی تھیں۔

"میں آرہا ہوں آپ کے پاس۔" سمیر کے دماغ نے پیغام دیا اور ان کی سمت آگے بڑھا ابھی وہ چند قدم آگے ہی گیا تھا کہ وہ شخص اس کے سامنے آ کھڑا ہوا سمیر اس سے بچنے کے لیے دائیں جانب مڑا تو وہ ادھر آ گیا۔ سمیر بائیں جانب مڑا تو وہ اس طرف آ کھڑا ہوا اس کے چہرے پر خوفناک مسکراہٹ تھی اور سمیر کی چھٹی حس چیخ چیخ کر اس سے کہہ رہی تھی کہ بھاگو...... یہاں سے بھاگو یہاں خطرہ ہے۔ اس سے دور ہو جاؤ۔"

سمیر تیزی سے بھاگ رہا تھا اور وہ شخص اس کا تعاقب کر رہا تھا سمیر کو اپنے دل کی دھڑکن اپنے کانوں میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اس اجنبی کی آواز نہیں سن سکتا تھا سمیر نے اندازہ لگانے کے لیے پیچھے کی طرف دیکھا کہ وہ اس سے کتنی دور ہے وہ اس سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا سمیر نے اپنی رفتار اور بڑھا دی لیکن اس شخص نے بڑھ کر سمیر کا کاندھا پکڑ لیا تھا اور اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا سمیر مزید خوفزدہ ہو گیا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ اجنبی شخص اسے پکڑ کر نہ جانے کہاں لے جائے گا اور اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا پھر اچانک اسے اپنی ممی کی آواز سنائی دی۔

"چلو سمیر! اب واپسی کا وقت ہو گیا ہے انہوں نے کہا اور اس شخص کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"میں آرہا ہوں۔" سمیر نے کہا اور دوڑتا ہوا تیزی سے اگلا موڑ مڑا اس کی والدہ سامنے ہی کھڑی تھیں وہ دوڑتا ہوا ان کی طرف بڑھا پھر اسی لمحے اس نے اس اجنبی شخص کی سوچ پڑھی تھی۔

"اس بار قسمت سے تم بچ گئے ہو اگلی بار جب میں آؤں گا تو ایسا نہیں ہوگا۔" سمیر خوفزدہ ہو گیا اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے حلق میں کوئی چیز پھنس گئی ہو۔

"چلیں جلدی کریں۔" سمیر نے شاپنگ باسکٹ پکڑ کر استقبالیہ کی طرف دوڑ لگا دی اس کی والدہ حیرت سے اسے

دیکھ رہی تھیں۔

"ارے سمیر اتنی جلدی کس بات کی ہے۔" انہوں نے اس کی بدحواسی دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم تو شاپنگ بڑے شوق سے کرتے ہو اب بھاگ کیوں رہے ہو؟"

"میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا میں یہاں ایک لمحہ مزید ٹھہرنا نہیں چاہتا۔" سمیر نے رکے بغیر ہی کہا اور استقبالیہ پر پہنچ کر سامان کی رسید بنوانے لگا اسی لمحے سیاہ لباس میں ملبوس وہ پراسرار اجنبی اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا اب وہ اپنی سوچیں سمیر کی طرف بھیج رہا تھا۔

"اگلی بار جب میں تمہیں پکڑوں گا تو میں تمہیں مار ڈالوں گا وہ بھی اذیت سے۔ تمہارے جسم کا ایک ایک حصہ الگ کروں گا۔" اس کی سوچ پڑھ کر سمیر خوف سے کانپنے لگا اس کا جی چاہا وہاں سے بھاگ جائے اس نے سارا سامان کاؤنٹر پر پھینک دیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اس کی ممی نے ڈانٹا اور سامان درست کرنے لگیں۔

"ممی یہ......" سمیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکی وہ شخص اس کے پیچھے ہی لائن میں آ کھڑا ہوا تھا وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ سمیر میں پوچھنے کی سکت نہیں تھی۔ اس شخص نے آہستہ سے بلیک کلر کی ایک کتاب کاؤنٹر پر رکھی وہ مسلسل سمیر کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس سے اتنا قریب تھا کہ اس کا ایک ہاتھ سمیر کے بازو کو چھو رہا تھا سمیر کا دل چاہا کہ وہ زور سے چیخ مارے لیکن خوف سے اس کی آواز نہیں نکلی بس ہلکی ہلکی بے معنی سی آوازیں اس کے حلق سے نکل رہی تھیں۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس کی ممی نے پوچھا اور جیسے ان کی آواز سن کر وہ پراسرار اجنبی کے سحر سے آزاد ہو گیا۔ پھر وہ تیزی سے دوڑ کر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا اور اس اجنبی کی طرف اشارہ کر رہا تھا لیکن اسی وقت اس کی ممی اسٹور کیپر کے ساتھ حساب کتاب میں مصروف ہو گئی تھیں وہ انہیں بل کی رقم کے بارے میں بتا رہا تھا اور اس کی ممی کی پوری توجہ اسٹور کیپر کی طرف تھی۔

"معاف کیجیے گا یہ آپ کا ہے۔" اس پراسرار شخص نے ایک میگزین سمیر کی ممی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا اس کی آنکھیں ان کے پرس پر لگی ہوئی تھیں جو انہوں نے پیسے نکالنے کے لیے کھولا ہوا تھا اور جس میں سے ان کا ڈرائیونگ لائسنس جھانک رہا تھا۔ سمیر کے دماغ میں اچانک یہ خیال آیا کہ وہ شخص اس ڈرائیونگ لائسنس سے ایڈریس دیکھنا چاہتا ہے۔

چنانچہ اس نے فوراً اپنی والدہ کے ہاتھ سے ان کا پرس چھین لیا۔ اس حرکت پر ان کی والدہ نے حیرت اور غصے سے اسے گھورا لیکن سمیر کو اس کی پروا نہیں تھی وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اسٹور سے باہر آ گیا تھا۔ وہ جلد از جلد اس پراسرار اجنبی کی پہنچ سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاپنگ بیگز جیپ کی پچھلی سیٹ پر پھینکے تھے اور دروازہ بند کر کے اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور اپنی سانسیں درست کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ پھر اس نے دیکھا تھا کہ سیاہ لباس میں ملبوس شخص بھی اسٹور سے باہر آ گیا تھا اور اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"سمیر تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے آخر کیا مسئلہ ہے تم نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا؟" سمیر کی والدہ نے جیپ کی طرف آتے ہوئے اس سے کہا ان کے چہرے سے غصہ عیاں تھا۔

"سوری ممی۔" سمیر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آپ جلدی سے جیپ میں بیٹھیں اور یہاں سے چلیں۔" اس اجنبی شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔

"کیوں کیا بات ہے، تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" اس کی والدہ نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس شخص سے خوف آ رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ گھر تک ہمارا پیچھا کرے۔" سمیر نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا۔

"بھلا وہ ہمارے گھر تک پیچھا کیوں کرے گا؟" اس کی

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد
صائمہ اکرام
عُشنا کوثر سردار
اشفاق احمد
نمرہ احمد
سعدیہ عابد
نبیلہ عزیز
نسیم حجازی
فرحت اشتیاق
عفت سحر طاہر
فائزہ افتخار
عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو
تنزیلہ ریاض
نبیلہ ابر راجہ
ہاشم ندیم
نگہت سیما
فائزہ افتخار
آمنہ ریاض
مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ
سباس گُل
عنیزہ سید
مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ
رُخسانہ نگار عدنان
اقراء صغیر احمد
علیمُ الحق
رفعت سراج
اُمِ مریم
نایاب جیلانی
ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

والدہ نے پوچھا۔

"اس نے اسٹور میں مجھے پکڑنے کی کوشش کی تھی اور دوبارہ ایسا کرنے کی دھمکی بھی دی تھی۔"

"تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں بتایا؟" اس کی والدہ نے اس شخص کی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو تیزی سے وہاں سے روانہ ہوگئی تھی اور ان کی مخالف سمت جارہی تھی۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہمارا پیچھا کرے گا وہ ہمارے مخالف سمت جارہا تھا۔ جب کہ ہمیں دوسری طرف جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم دوسرے راستے سے چلتے ہیں جو طویل ہے لیکن زیادہ محفوظ ہے۔" سمیر نے مشورہ دیا۔

پھر انہوں نے جوراستہ اختیار کیا تھا وہ بہت تنگ، موڑ دار اور ناہموار تھا اور جنگل سے گزرتا تھا تقریباً آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ان کی جیپ ان کے گھر کے روڈ پر آئی تھی تو سمیر نے سکون کا سانس لیا تھا پھر ایک جگہ رک کر اس کی والدہ نے اطراف کا جائزہ بھی لیا تھا اور انہیں اطمینان ہوگیا تھا کہ ان کا تعاقب نہیں کیا جارہا ہے تو انہوں نے اپنی جیپ آگے بڑھادی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے کیا تمہیں محسوس ہورہا ہے کہ وہ ہمارا تعاقت کررہا ہے؟" ان کی والدہ نے سمیر سے پوچھا۔ ان کا اشارہ اس کی ذہنی صلاحیتوں کی طرف تھا جن سے وہ خطرات کا ادراک کرتا تھا۔

"نہیں!" سمیر نے جواب دیا۔

"میری چھٹی حس بھی اب مجھے خطرے سے آگاہ نہیں کر رہی ہے لیکن مجھے اب بھی اس کے بارے میں سوچتے ہوئے خوف محسوس ہورہا ہے۔"

"نہیں پریشان ہونے کی بات نہیں ہے سمیر یہ تمہارا وہم بھی ہوسکتا ہے میں نے تو اس کے رویے میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں کی تھی وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا اس نے مجھ سے بات بھی کی تھی۔"

"آپ کو اندازہ نہیں ہے...... اس نے مجھے خوف زدہ کردیا تھا۔" سمیر نے جواب دیا۔

ان کے گھر کا فاصلہ اب صرف پانچ منٹ کا رہ گیا تھا۔

ان کی جیپ چناروں کے جنگل سے گزر کر آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ سڑک سیدھی ان کے گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی جس کے دونوں اطراف جنگل تھا اور چنار کے ان درختوں کی لمبائی ہزاروں فٹ تک تھی۔ ان کے تنے اتنے چوڑے تھے کہ کئی آدمی بیک وقت ان کے عقب میں چھپ سکتے تھے اور وہ درخت صدیوں پرانے تھے۔

سمیر کو وہ جنگل بہت پسند تھا۔ وہ اکثر تنہائی میں اپنے گھر کے پچھلے حصے میں چلا جاتا تھا اور اس جنگل میں سکون کے کچھ لمحات گزارتا تھا۔ جیپ ان کے گھر کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور سمیر نے اپنے گھر کی طرف دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔ سڑک کے جس حصے میں ان کی جیپ رکی تھی اس سے ایک سیدھا پکا راستہ ان کے گھر کے دروازے تک جاتا تھا اور ایک چبوترا چڑھنے کے بعد ان کے گھر کا صدر دروازہ تھا جس کے دونوں اطراف کی دیواروں میں ایک بڑی اور کشادہ کھڑکی موجود تھی۔ جس سے اکثر سمیر باہر کے منظر سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ گھر سے چند قدم کے فاصلے پر ان کا پرانا گیراج بنا تھا جس میں اکثر اس کے والد اپنی جیپ کھڑی کرتے تھے اور ان کی ایک پرانی گاڑی کھڑی تھی یا پھر ان کے کام کرنے کے اوزار تھے۔

''یہ لو گھر کی چابیاں تم اندر جاؤ..... میں سامان لے کر آتی ہوں۔'' اس کی والدہ نے اس کی طرف گھر کی چابیاں بڑھاتے ہوئے کہا۔ سمیر نے ان کے ہاتھ سے چابیاں لیں اور جیپ سے اترتے ہی گھر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ پھر انٹرنس کے راستے پر بھاگتا ہوا وہ چبوترے پر چڑھ گیا تھا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو گیا تھا اسے ہمیشہ اپنے گھر میں قید رہنے سے نفرت تھی لیکن اس وقت اسے گھر میں داخل ہو کر سکون محسوس ہو رہا تھا اور اس کے دل میں اجنبی کا خوف اب بھی موجود تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ پراسرار اجنبی اب بھی کہیں گھر کے اطراف میں موجود ہو سکتا تھا جو اسے تشدد کر کے ہلاک کرنا چاہتا تھا۔

پھر اگلے چند لمحوں بعد ہی اس کی والدہ سامان کے شاپر لے کر گھر میں داخل ہوئی تھیں اور انہوں نے ڈرائنگ روم میں رکھی میز پر وہ شاپرز رکھ دیئے تھے خود بھی نڈھال سی صوفے پر بیٹھ گئی تھیں ان کے چہرے پر پریشانی عیاں تھیں وہ چند لمحے تک سمیر کو غور سے دیکھتی رہیں۔

''اب مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ اسٹور میں ہر جگہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔'' سمیر نے کہا اس کا اشارہ اس پراسرار اجنبی کی طرف تھا۔

''کیوں؟ بھلا کوئی اجنبی جو تمہیں جانتا بھی نہیں وہ تمہارا پیچھا کیوں کرے گا؟''

''میں نہیں جانتا' پہلے تو مجھے شک تھا پھر میں نے سوچا کہ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے لیکن پھر اس نے مجھے پکڑنے کی کوشش بھی کی میں تب ہی تو بھاگتا ہوا آپ کے پاس آیا تھا اور وہ وہاں بھی آ گیا تھا۔''

''تمہیں یہ یقین کیسے ہے کہ وہ تمہیں پکڑ کر تمہیں کوئی نقصان پہنچاتا؟''

''اس نے کہا تھا کہ اس بار تو تم بچ گئے ہو لیکن اگلی بار جب میں تمہیں پکڑوں گا تو میں تمہیں تشدد کر کے ماروں گا اور تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔'' سمیر نے کہا تو اس کی والدہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار زیادہ گہرے ہو گئے۔

''اس نے تم سے یہ بات کب کی؟ میں نے تو تمہیں اس سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''اس نے کتابوں والے شوکیس میں مجھ سے سوچوں میں یہ بات کی تھی جب میں اس سے ڈر کر بھاگ رہا تھا اور آپ کے پاس آنے کی کوشش کر رہا تھا تب اس نے مجھے ایک موقع پر پکڑ بھی لیا تھا اور اس کی گرفت سے چھوٹ کر بھاگا تھا تب میں نے اس کی سوچ پڑھی تھی وہ کہہ رہا تھا کہ وہ آئندہ مجھے نہیں چھوڑے گا اور آئندہ پکڑے گا تو میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔'' سمیر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم یہ بتاؤ کہ تم نے وہاں کسی سے کوئی بات کی تھی؟''

''ہاں! کتابوں والے سیکشن میں جب میں کتابیں دیکھ

رہا تھا تو وہاں میری ہی عمر کا ایک اور لڑکا بھی موجود تھا اس نے مجھ سے بات کی تھی۔

"کیا بات کی تھی؟"

"اس نے مجھے ایک کتاب دی تھی اور کہا تھا کہ یہ کتاب پڑھو یہ بہت اچھی ہے۔"

"پھر؟"

"پھر میں نے کتاب لے لی تھی اس کے بعد میں نے اسے پیش کش کی تھی کہ ہم کوئی کھیل کھیلتے ہیں۔"

"کون سا کھیل؟"

"اس نے تاش کے جادو دکھانے کے لیے کہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے تاشوں کی گڈی نکال کر مجھے دی تھی اور کہا تھا کہ میں اس کا امتحان لوں کوئی کارڈ اٹھالوں وہ بتائے گا کہ میں نے کونسا کارڈ اٹھایا ہے۔"

"پھر...... پھر کیا ہوا تھا؟"

"پھر میں نے کارڈ اٹھایا اور اس نے اس کارڈ کے بارے میں جو بتایا وہ غلط تھا تب میں نے کہا کہ اب میں بھی وہی کرتب دکھاؤں گا۔"

"تو تم نے بھی وہی ٹرک دکھائی؟"

"ہاں! اور میں جیت گیا...... میں نے تقریباً بیس بار اس ٹرک کو بار بار کیا وہ بہت حیران ہو رہا تھا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں ہر بار یہ ٹرک کیسے درست کر رہا ہوں تو میں نے اسے بتایا کہ میں اس کا ذہن پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں وہ حیران رہ گیا تھا تب میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میرے اندر ایک اور خداداد صلاحیت موجود ہے کہ مجھے وقت سے پہلے کسی بھی ناخوش گوار واقعہ کے ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔ وہ بہت حیران ہوا تھا۔

"پھر اس کے بعد کیا ہوا؟"

"جب میں اسے اپنے بارے میں بتا رہا تھا تب ہی میں نے اس اجنبی کو دوبارہ دیکھا وہ بھی کتابوں کے شیلف کے قریب آ کھڑا ہوا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ لڑکا بھی خوف زدہ ہو گیا تھا جو مجھ سے باتیں کر رہا تھا پھر میں ڈر کر بھاگا تو وہ میرا پیچھا

کرنے لگا۔

"سمیر! میں نے تم کو کتنی بار منع کیا ہے کہ اجنبیوں سے بات مت کیا کرو اور اپنی اس صلاحیت کے بارے میں ہر کسی کو مت بتایا کرو۔" اس کی والدہ نے ناراضگی سے کہا۔

"سوری ممی غلطی ہوگئی۔"

"دیکھو تم جیسے لوگوں کے بہت دشمن ہوتے ہیں۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا ہے۔ تمہارے اندر تین صلاحیتیں ہیں انہیں لوگوں پر آشکار کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہیں کالج میں بھی داخلہ نہیں دلوایا ہے اور تم نے اس لڑکے کے سامنے اپنی خوبی بیان کرنے کے چکر میں اپنی حقیقت بیان کردی بلکہ تاش کے پتوں سے کرتب دکھا کر ثبوت بھی فراہم کر دیا۔"

"اوہ مجھ سے غلطی ہوگئی تھی، میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔" سمیر نے شرمندگی سے کہا۔

"خیر! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں تمہارے ڈیڈی سے اس سلسلے میں بات کروں گی۔ خدا جانے وہ اجنبی کون تھا اور کیا چاہتا تھا؟ وہ تمہارے پیچھے کیوں لگا ہوا تھا؟ ہم دیکھتے ہیں اس سلسلے میں تمہاری حفاظت کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔" انہوں نے کہا اور پھر سامان کے شاپرز اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئیں۔

اگلے چند روز تک سمیر اپنے گھر میں بند رہا تھا اس کی والدہ نے اس کے والد کو ساری تفصیل بتادی تھی لیکن انہوں نے سمیر سے کچھ نہیں کہا تھا۔ سمیر زیادہ وقت ڈرائنگ روم میں رکھی ٹیبل کے قریب کرسی پر بیٹھا کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتا رہتا تھا۔ جہاں سے دور تک کا منظر نظر آتا تھا اب اس کا مقصد باہر کے منظر سے لطف اندوز ہونا نہیں بلکہ کسی آتے جاتے اجنبی پر نظر رکھنا زیادہ ہوتا تھا۔ اس کے سامنے ٹیبل پر اس کے کورس کی کوئی کتاب رکھی ہوتی تھی اور اس کی نظریں کھڑکی کے باہر ہوتی تھیں۔ اسے ہر لمحے اس پراسرار اجنبی کا دھڑکا لگا رہتا تھا لیکن اسے دور دور تک اس شخص کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔

اس کے والد نے اس ناخوش گوار واقعے کی اطلاع علاقے کی پولیس کو دے دی تھی اور مطمئن ہوگئے تھے۔ جب کہ سمیر کا شک تھا کہ وہ آئندہ بھی سمیر کو پکڑے گا اور تشدد کر کے ہلاک کر دے گا۔

......☆☆☆......

"کیسے ہو سمیر؟" ایک دن اس کے والد نے ڈرائنگ روم میں رکھی براون لیدر کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں ڈیڈی۔"

"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟" انہوں نے پوچھا تو سمیر نے سوچا کہ شاید وہ اس سے شاپنگ اسٹور میں ہونے والے واقعے کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔

"آپ کا کیا مطلب ہے؟" سمیر نے پوچھا وہ اب بھی اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا کھڑکی سے باہر روڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری جو کتاب جنگل میں کھوگئی تھی اس کا کیا ہوا؟" انہوں نے پوچھا۔ ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری توجہ پڑھائی پر نہیں ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ایسا نہیں ہے میں پڑھتا رہتا ہوں اور امتحان کی تیاری بھی کر رہا ہوں۔" سمیر نے جواب دیا۔

"لیکن میں دیکھتا ہوں کہ کتاب تمہارے سامنے رکھی ہوتی ہے اور تمہاری توجہ اس کی طرف نہیں ہوتی اب جو کتاب تم جنگل میں چھوڑ آئے ہو اس کی بھی تمہیں پروا نہیں ہے۔"

"میں دوسری کتاب خرید لوں گا۔ اس کا ملنا مشکل ہے۔" سمیر نے کہا اسے وہ واقعہ یاد آگیا تھا جو جنگل میں اسے پیش آیا تھا اور وہ کتاب چھوڑ کر بھاگتا ہوا گھر آگیا تھا۔ اسے دوبارہ جاتے ہوئے خوف آرہا تھا۔

"تم پرانی کتاب ڈھونڈنے کے بجائے نئی منگواؤ گے؟" اس کے والد نے حیرت سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ شاید تم باہر جانے سے ڈر رہے ہو لیکن تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے وہ شخص اب تک بہت دور جاچکا ہوگا اور تم نے بھی اپنی والدہ کو بتایا تھا کہ تمہیں اس کی طرف

سے خطرہ محسوس نہیں ہو رہا اور تمہاری چھٹی حس بھی اب تمہیں اس کے خطرے سے آگاہ نہیں کر رہی اس کا مطلب ہے کہ وہ اطراف میں موجود نہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" سمیر نے اپنے والد سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ اسے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اب تک اس پراسرار اجنبی کے خوف میں مبتلا تھا جب کہ اس کے والد ہمیشہ کی طرح اس کی ہمت بندھا رہے تھے۔

"لیکن مجھے اب بھی باہر جانے سے ڈر لگ رہا ہے، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں محفوظ نہیں ہوں۔" سمیر نے کہا اور اس بات پر اس کے ڈیڈی بڑی دیر تک کھڑکی کے قریب کھڑے ہو کر باہر کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے اور وہ کسی گہری سوچ میں تھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اہم فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ تمہاری چھٹی حس تمہیں خطرے سے آگاہ کر رہی ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے تمہاری زندگی دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔" انہوں نے کہا اور سمیر جھک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"اچھا! اگر تم اکیلے باہر جانے سے ڈرتے ہو اور سمجھتے ہو کہ وہاں محفوظ نہیں رہو گے تو میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" انہوں نے کہا اور پھر انہوں نے سمیر کو سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھے تھے اور سمیر بھی تیزی سے ان کے پیچھے بھاگا تھا وہ ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا پھر گھر کے انٹرنس سے گزرتے ہوئے وہ دونوں کچے راستے پر ہو لیے تھے اور جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔

جنگل کے درخت کئی ہزار فٹ لمبے اور بہت چوڑے تھے ان کی ٹہنیاں فضا میں ایسے پھیلی ہوئی تھی جیسے آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں اور ان کی وجہ سے زمین پر دھوپ کی کرنیں نہیں پہنچ پا رہی تھیں ہر طرف ان کی سوکھی چھال بکھری ہوئی تھیں چند منٹ تک سمیر اور اس کے والد ان لمبے اور گھنے چناروں میں آگے بڑھتے رہے۔ وہ جنگل کے درمیانی حصے میں اندر کی طرف آگے بڑھتے جا رہے تھے اور ان کا فاصلہ اپنے گھر سے آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر سمیر کے والد ایک پرانے درخت کے قریب جا کر رک گئے اس درخت کا تنا بلاشبہ کسی کار کی چوڑائی سے کم نہیں تھا انہوں نے وہاں رک کر سمیر کو بغور دیکھا۔

"سمیر! اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ تمہیں زندگی میں بہت سے خطروں کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ تمہیں بہادر بننا ہو گا۔" انہوں نے سمیر کے کاندھے پکڑ کر جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بہادر بننے کی ضرورت ہے، زندگی میں بہت سے مقام ایسے آتے ہیں جہاں انسان کو بہادری کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ چاہے اندر سے اسے کتنا ہی خوف محسوس کیوں نہ ہو رہا ہو۔ یاد رکھو لوگ جب کسی کے اندر کوئی غیر معمولی صلاحیت دیکھتے ہیں تو وہ بظاہر خوشی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اندر سے وہ اس شخص سے حسد کرتے ہیں اور اسے نیچا دکھانے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں یا اسے اپنے لیے خطرہ سمجھ لیتے ہیں اور اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تم اب بڑے ہو گئے ہو۔ کوشش کرو کہ تمہاری والدہ کو تمہاری وجہ سے کوئی پریشانی نہ ہو۔ چلو ہمت کرو اور بتاؤ کہ اب کس سمت جانا ہے؟" انہوں نے سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے اپنی کتاب اس درخت کے نیچے چھوڑی تھی۔" سمیر نے دور ایک تناور درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کے تنے کے بڑے حصے سے لکڑیاں کاٹ لی گئی تھیں اور اس کے تنے میں نیچے زمین کے قریب اتنا بڑا سوراخ تھا کہ ایک آدمی آرام سے بیٹھ جائے۔

"جاؤ...... کتاب لے کر آؤ۔" اس کے والد نے کہا۔

"میں اکیلا جاؤں؟"

"ہاں! میں نے ابھی تمہیں کیا سمجھایا ہے راستے میں چند قد آور جھاڑیاں ہیں۔ میں یہاں کھڑا ہوں تم ہمت کرو کچھ نہیں ہو گا۔" انہوں نے کہا۔

"جی! ٹھیک ہے۔" سمیر نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہا اور آگے بڑھنے لگا اسے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں کسی بھی جھاڑی

کے پیچھے سے وہ پراسرار اجنبی اچانک اس کے سامنے نہ آ کھڑا ہو۔ اس نے پھر فیصلہ کیا کہ وہ اکیلا آگے نہیں جائے گا وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔ اور پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

''آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں اکیلا نہیں جانا چاہتا۔''

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' انہوں نے قدرے برہمی سے کہا لیکن اس سے پہلے کہ وہ آگے قدم بڑھائے ایک زوردار دھماکا ہوا تھا اور درختوں سے بہت سے پرندے شور مچاتے اڑ گئے تھے چاروں طرف گھنے دھوئیں کے بادل چھا گئے تھے۔ فضا میں بارود کی بو رچ گئی تھی۔ آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل نہیں رہی تھیں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور سانس بھی لینا مشکل ہوگیا تھا۔ سمیر بری طرح کھانس رہا تھا۔

''سمیر جاؤ تم گھر جاؤ۔'' اس کے والد زور سے چیخے اور خود جھاڑیوں کے پیچھے نظر آنے والی روشنی کی طرف لپکے سمیر نے اطراف کا جائزہ لیا اسے یقین تھا کہ کسی چیز کو آگ نہیں لگی تھی وہ کوئی چھوٹا بم تھا جو انہیں ہراساں کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

اچانک سمیر کی چھٹی حس نے اسے احساس دلایا کہ خطرہ کہیں اس کے قریب ہی موجود ہے وہ سیاہ لباس والا پراسرار شخص یقیناً کہیں قریب ہی موجود ہوسکتا تھا اور اس شخص نے ہی دھماکا کیا تھا تاکہ اس کے ڈیڈی اس سے جدا ہوجائیں۔

''ڈیڈی! آپ نہ جائیں۔'' سمیر زور سے چیخا لیکن دیر ہوچکی تھی۔ وہ دھوئیں کی موٹی دیوار کے پیچھے غائب ہوچکے تھے۔ جنگل میں خاموشی چھا گئی تھی کوئی ایک آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی سوائے سمیر کے دل کی دھڑکن کے جو اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور جس کی وجہ سے وہ اردگرد کی کوئی آواز سن نہیں پارہا تھا وہ فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہے یا گھر کی طرف دوڑ لگادے یا پھر کہیں چھپ جائے۔ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی وزنی چیز کے وزن سے زمین پر پڑی درختوں کی سوکھی پتیاں چرچرائی ہوئی ہوں اس نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ اسے خطرہ ہے اور اس کو گھر کی طرف بھاگنا چاہیے اس کے والد نے بھی اسے یہی ہدایت کی تھی چنانچہ اس نے سرپٹ گھر کی طرف دوڑنا شروع کردیا اس نے دھوئیں سے بچنے کے لیے اپنا سر نیچے جھکایا ہوا تھا اور اسی راستے پر واپس دوڑ رہا تھا جس سے کچھ دیر پہلے اپنے ڈیڈی کے ساتھ وہاں تک آیا تھا پھر اچانک ہی وہ راستے میں آجانے والی جھاڑیوں سے بچنے کے لیے ایک پتھر سے ٹکرایا اور گر گیا دھواں بھی آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا اس نے دیکھا اس کا گھر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔

وہ اٹھا اور لمبی لمبی گھاس کے درمیان راستہ بناتا ہوا دوڑنے لگا لیکن ابھی وہ گھر سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ سیاہ لباس میں ملبوس وہ پراسرار شخص جھاڑیوں کے درمیان سے نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا وہ تیزی سے دائیں جانب مڑا لیکن وہ پھر اس کے سامنے آ گیا وہ بائیں جانب مڑا وہ پھر اس کے سامنے آ گیا پھر سمیر نے اپنا دایاں پاؤں ہوا میں لہراتے ہوئے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان کک ماری تھی جیسے اس کے ڈیڈی نے اسے سکھایا تھا وہ شخص کراہتا ہوا زمین پر گرا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ضرب لگنے کی جگہ پکڑی ہوئی تھی سمیر کو فرار کا موقع ملا جسے وہ ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا اس نے ایک بار پھر گھر کی طرف دوڑ لگادی تھی ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اس شخص نے اسے دوبارہ پکڑ لیا تھا۔

''اب کہاں بھاگو گے؟ میں نے تمہیں پکڑ لیا ہے۔'' اس نے سمیر کو دھکا دے کر نیچے گراتے ہوئے کہا اور پھر اس کی پیٹھ پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور سمیر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

''ممی...... ڈیڈی......'' سمیر مسلسل چیخ رہا تھا پھر سمیر کے منہ پر اس شخص نے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی خوشی کے آثار تھے۔

''تم بہت تیز ہو۔ تمہیں دیکھ کر لگتا ہے تم میرے لیے خطرہ بن سکتے ہو۔ ابھی تو تم معصوم ہو۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں

اپنے پاس رکھوں اور تمہاری ساری صلاحیتوں کا فائدہ اٹھاؤں لیکن......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر جیب سے خنجر نکالا۔ اس خنجر کی دھار چمک رہی تھی۔ سمیر کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ نہیں بچ سکے گا۔

''تم بڑے ہو کر میرے لیے خطرہ ہو گے۔ چنانچہ مجھے تمہیں قتل کرنا ہو گا اس سے پہلے کہ تم اس قابل ہو جاؤ کہ اپنی طاقتوں سے ہم سب کو تباہ کر دو'' اس اجنبی نے کہا۔ سمیر نے اس کا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور وہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی کلائی پر دانت گاڑ چکا تھا اس شخص نے درد کی شدت سے بچنے کے لیے لمحے بھر کو اپنا ہاتھ سمیر کے منہ سے ہٹایا اور سمیر نے زور کی چیخ ماری۔

''مدد......میری مدد کرو......'' اس کے ساتھ ہی اس پراسرار شخص نے سمیر کے منہ پر چانٹا مارا تھا اور اس کا سر چکرا گیا تھا۔ اس نے دوبارہ فضا میں خنجر لہرایا تھا تاکہ اسے سمیر کے سینے میں پیوست کر دے۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں اور انتظار کرنے لگا کہ چند ہی لمحوں میں وہ خنجر اس کے دل میں پیوست ہونے والا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا اچانک اس اجنبی شخص کی گرفت سمیر پر سے ڈھیلی پڑ گئی تھی اور وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ خنجر اب اجنبی کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور درختوں میں جا گرا تھا اور سمیر کے ڈیڈی نے اسے زور کی ٹھوکر ماری تھی جو سمیر کی آواز سن کر وہاں پہنچ گئے تھے اسی وقت سمیر کی والدہ بھی ایک درخت کے چوڑے تنے کے پیچھے سے نمودار ہوئی تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر سمیر کا ہاتھ پکڑا تھا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا اور گھسیٹتی ہوئی گھر کی طرف دوڑی تھیں وہ تیزی سے دوڑ رہی تھیں انہوں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر سمیر کے ڈیڈی کی طرف نہیں دیکھا تھا اور پھر جب تک نہیں رکی تھیں جب تک انہوں نے گھر میں داخل ہو کر گھر کا دروازہ اندر سے بند نہیں کر لیا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' سمیر کی والدہ نے اس سے پوچھا ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں یہی حال سمیر کا بھی تھا وہ کانپ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''وہ......وہ شخص مجھے خوف ناک بلا کہہ رہا تھا'' سمیر نے سسکتے ہوئے کہا۔

''وہ بکتا ہے'' سمیر کی والدہ نے اسے خود سے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''تم کوئی خوف ناک بلا نہیں ہو۔''

''لیکن وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی طاقتوں سے سب کو تباہ کر دوں گا'' سمیر نے کہا تو اس کی والدہ نے اسے خود سے جدا کر کے سمیر کی آنکھوں میں جھانکا ان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

''کیا وہ جانتا ہے کہ تم دوسروں کا ذہن پڑھ سکتے ہو؟'' ان کے لہجے میں خوف تھا۔

''ہاں! اس نے مجھے اسٹور میں اس لڑکے کے ساتھ کارڈز کھیلتے ہوئے دیکھا تھا ممکن ہے ہماری گفتگو بھی سنی ہو۔ میں نے اپنے اندازے سے اس کے سارے جواب درست دیئے تھے'' سمیر نے جواب دیا۔

''سمیر! میں تمہیں کتنی بار سمجھاؤں کہ تم دوسروں سے خود کو چھپاؤ......اپنی صلاحیتوں کو دوسروں پر ظاہر مت کرو'' سمیر کی والدہ نے اس کے کاندھے پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں؟ میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟'' سمیر نے پوچھا۔

''سمیر ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اس شخص جیسے ہیں جو یہ صلاحیتیں نہیں رکھتے، تمہیں اور تمہاری صلاحیت کو دیکھ کر حسد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تم ان پر برتری حاصل کر لو گے۔ آج کل کے زمانے میں دشمن بنانے کے لیے کسی سے لڑائی ضروری نہیں بس اتنا کافی ہے کہ کوئی صلاحیت رکھتے ہوں اور تھوڑا کامیاب ہو جائیں پھر دشمن ڈھونڈنے نہیں پڑتے'' اس کی والدہ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے یقین نہیں آتا......اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں صرف اس کے لیے خطرناک ہوں کہ میں ان کا ذہن پڑھ سکتا ہوں......لیکن اس میں ان کا کیا نقصان؟'' سمیر نے

پوچھا۔

"یہ تم نہیں سمجھو گے..... وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے پھر بھی یہ حرکت کر سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں بہت محبت اور چاہت سے پالا ہے۔ تمہاری حفاظت کی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔" اس کی والدہ نے کہا اور اس کا ماتھا چومنے لگیں۔

"مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی بھی کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ تم کیا صلاحیتیں رکھتے ہو اور کیا کر سکتے ہو۔" انہوں نے کہا تو سمیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ میں بھی پھر ایسے خوف ناک حادثے سے دوچار نہیں ہونا چاہتا۔" سمیر نے کہا وہ پھر اپنی والدہ کے سینے سے چمٹ گیا تھا اور پھر گھر کے دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی تھی سمیر اور اس کی والدہ گھبرا گئے تھے ان کا خیال تھا کہ وہ اجنبی سیاہ پوش وہاں نہ آ گیا ہو اور سمیر کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔

"دروازہ کھولو سمیر...... مجھے اندر آنے دو۔" سمیر کے ڈیڈی کی آواز سنائی دی تو سمیر کی والدہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

"سب ٹھیک ہے وہ چلا گیا ہے۔" سمیر کے ڈیڈی نے اندر آتے ہوئے کہا پھر وہ ڈرائنگ روم میں رکھے براؤن لیدر کے صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی شرٹ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی اور ان کا بھی سانس پھولا ہوا تھا۔

"کیا ہوا نصیر احمد؟" سمیر کی والدہ نے سمیر کے ڈیڈی کا نام لے کر انہیں مخاطب کیا تھا۔

"میں نے پولیس کو کال کر دی تھی وہ اب تک اس کو پکڑ چکے ہوں گے۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تو وہ جیل لے جائیں گے؟" سمیر کی والدہ نے پوچھا ان کی آواز میں تجسس تھا۔

"ہاں! فوزیہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کے والد نے جواب دیا اور پھر سمیر کی طرف مڑے۔

"سمیر بیٹا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اور ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگے کچھ دیر بعد وہ مڑے تھے اور بیرونی دروازے کے قریب جا کر چیک کیا تھا کہ وہ اچھی طرح لاک ہے اور پھر سمیر کی طرف مڑے تھے۔

"تم اطمینان سے یہاں بیٹھو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔" اس کے والد نے سمیر سے کہا اور اس کی والدہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے باورچی خانے کی طرف چلے گئے۔ اس کی والدہ بھی سمیر کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کرتی ہوئی ان کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ اور سمیر تذبذب میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس کے ڈیڈی اس کی غیر موجودگی میں اس کی والدہ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں کہیں معاملہ زیادہ خطرناک تو نہیں ہے جو وہ اس سے چھپا رہے ہیں۔ اس نے ان کے ذہنوں پر پہنچنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی وہ ان کی سوچ نہیں پڑھ سکا تھا۔

پھر کچھ دیر بعد جب دونوں واپس آئے تھے تو اس کے ڈیڈی نے اس کی طرف پیار سے دیکھا تھا۔

"سمیر! ہم نے ابھی ایک فیصلہ کیا ہے ہم تمہیں ایک سفر پر لے جا رہے ہیں۔ دراصل اس ناخوش گوار واقعے کے بعد ہم سب ہی کو ایک بریک لینے کی ضرورت ہے۔"

"واقعی؟" سمیر نے اپنی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی اور انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوں...... ہاں......" انہوں نے کہا۔

"تم جاؤ اپنی پیکنگ کرو ہم آج رات ہی روانہ ہوں گے۔" سمیر کی والدہ نے کہا وہ ابھی کوشش کر رہا تھا کہ ان کی سوچیں پڑھ لیں لیکن وہ اسے کوئی موقع نہیں دے رہے تھے۔

"آپ کو یقین ہے کہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"ہاں ہمیں یقین ہے...... پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔" سمیر کے ڈیڈی نے اسے دوسرے کمرے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

"جاؤ جلدی سے اپنی پیکنگ کرو۔" انہوں نے ہدایت کی اور سمیر اپنے کمرے میں جا کر ضروری چیزیں پیک کرنے

لگا وہ حیران تھا کہ ان کے والد نے اچانک ہی یہاں سے کہیں اور جانے کا پروگرام کیوں بنالیا۔

ایک گھنٹے کے بعد سمیر جیپ کے آخری حصے میں سامان کا آخری بیگ رکھ رہا تھا اس کے والدین نے بھی اپنا سامان پیک کرلیا تھا۔ گھر کے فرنیچر کے علاوہ زیادہ سامان پیک کیا گیا تھا جس پر سمیر کو حیرت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کافی عرصے کے لیے یہاں سے کہیں جارہے ہوں اور سمیر حیران تھا کہ وہ اتنا سامان اپنے ساتھ کیوں لے جارہے تھے لیکن اسے ابھی تک ان کے دماغوں سے جواب حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

''کیا آپ لوگ مجھے بتائیں گے کہ کیا معاملہ ہے؟'' سمیر نے پوچھا۔

''ہم تمہیں بتاچکے ہیں۔'' نصیر احمد نے جواب دیا۔

''ہاں ہم نے تمہیں بتادیا ہے...... یوں سمجھ لو کہ تبدیلی آب وہوا کے لیے اور تمہاری تفریح کے خیال سے ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں تفریحی مقامات کی سیر کرائیں اور سب سے پہلے ہم نے جس جگہ کا انتخاب کیا ہے وہ ہمارے ملک کے شمالی پہاڑی علاقے ہیں جو گرمیوں کا موسم گزارنے کے لیے بہت بہترین اور پرفضا جگہ ہے۔'' سمیر کی والدہ نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''تم لوگ جیپ میں بیٹھو میں چیک کرکے آتا ہوں کہ گھر اچھی طرح لاک کردیا گیا ہے؟'' سمیر کے ڈیڈی نے کہا اور گھر کی طرف چلے گئے۔

''ممی میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہم واقعی گرمیاں گزارنے یہاں سے جارہے ہیں یا اس سیاہ پوش اجنبی کے خوف سے بھاگ رہے ہیں۔'' سمیر نے اپنی والدہ سے پوچھا۔

''تم کیسی باتیں کررہے ہو سمیر...... مجھے جتنا پتا تھا میں نے تمہیں بتادیا۔'' اس کی والدہ نے ناراضگی سے کہا۔ کچھ ہی دیر میں اس کے والد بھی واپس آگئے تھے اور اس نے وہی سوال ان سے پوچھا تھا۔

''ڈیڈی میں جاننا چاہتا ہوں کہ اصل بات کیا ہے کیا اس شخص نے آپ سے کچھ کہا ہے؟'' آخری بار جب ہم جنگل سے آئے تھے تو آپ اس سے گتھم گتھا تھے پھر کیا ہوا؟'' سمیر نے پوچھا اور اس کی بات پر اس کی والدہ اور والد ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے پھر انہوں نے خاموشی سے کچھ فیصلہ کیا تھا لیکن اب سمیر کو ان کا جواب سننے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اپنے ڈیڈی کے دماغ سے اسے جواب مل گیا تھا وہ صرف لوگوں کی سوچیں پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتا تھا بلکہ ان کے خوابوں میں بھی جھانک سکتا تھا اور اسے جو کچھ معلوم ہوا تھا اس نے اس کے رونگٹے کھڑے کردیئے تھے۔

''اوہ خدایا!'' اسے لگا کہ جیسے کسی نے دھکا دے کر اسے زمین پر گرادیا ہو۔

''آپ نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ پولیس اسے نہیں پکڑسکی ہے اور وہ فرار ہوگیا ہے؟'' سمیر نے غصے اور خوف کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے بیٹا!'' سمیر کے ڈیڈی نے اس کا شانہ تھپک کر کہا۔

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے کبھی بھی تنہا نہیں چھوڑے گا یہی بات ہے نا؟'' سمیر نے کہا۔

''نہیں...... ایسا نہیں ہے۔'' سمیر کے ڈیڈی نے کہا اور سمیر انہیں دیکھنے لگا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ پولیس اسے مجھ سے دور رکھ سکے گی؟ نہیں ہرگز نہیں پولیس اس کا کچھ بھی نہیں کرسکتی کیونکہ ہمیں اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے بھلا پولیس کسی سائے کو کیسے پکڑسکتی ہے اس کے لیے اسے ٹھوس ثبوت چاہیے۔'' سمیر نے کہا۔

''اس لیے ہم لوگ شمالی علاقہ جات جارہے ہیں تاکہ آپ مجھے اس سے دور رکھ سکیں؟'' سمیر نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ اتنا طاقتور نہیں ہوا کہ اس سے خوف کھایا جائے۔'' سمیر کے ڈیڈی نے کہا۔

''تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟'' سمیر نے پوچھا۔

''میں صرف چاہتا ہوں کہ کچھ عرصے کے لئے تمہیں اس معاملے سے دور رکھا جائے اور پولیس کو اس کا کام کرنے

دیا جائے۔'' انہوں نے کہا۔ سمیر کو ان کی بات پر یقین نہیں آیا تھا اس کا خیال تھا کہ اس کے ڈیڈی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ پورا سچ نہیں ہے اس کے پیچھے جو بات ہے وہ اسے بتانا نہیں چاہتے تھے۔

''آپ کو یقین ہے کہ ہم بھاگ نہیں رہے ہیں کیونکہ آپ کو کسی عورت نے میرے بارے میں کچھ چیزیں بتائی تھیں جو آپ نے مجھ سے چھپائی ہیں لیکن مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔'' سمیر نے کہا تو اس کے ڈیڈی کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آنے لگے۔

''تم نے میرے ذہن کو پڑھ لیا؟'' انہوں نے چونک کر کہا۔

''ہاں!'' سمیر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''بتائیں وہ کون تھی؟ اور وہ کیسے جانتی تھی کہ میرے پیچھے کوئی آ رہا ہے۔'' سمیر نے پوچھا۔

''وہ کوئی نہیں تھی۔'' نصیر احمد نے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

''بس یوں سمجھ لو کہ جب تم بہت چھوٹے تھے تب وہ مجھے ملی تھی وہ اجنبی تھی اسے بھی خداداد صلاحیتیں میسر تھیں اور وہ ہمیں بتا گئی تھی کہ تم کو بھی خدا نے خداداد صلاحیتوں سے نوازا ہے اور تمہیں بھی اس کی طرح خطرات کا سامنا ہے مجھے اس کی باتوں پر اس وقت یقین نہیں آیا تھا جب تک تمہاری زندگی میں یہ پراسرار اجنبی نہیں آیا تھا۔ میں تو اس عورت کی کئی باتوں کو بھول بھی گیا تھا لیکن جب یہ پراسرار اجنبی ہماری زندگیوں میں آیا تب مجھے احساس ہوا کہ برسوں پہلے اس عورت نے جو بات کی تھی وہ بالکل درست تھی اور اب تو اس شخص نے تمہیں مارنے کی کوشش کی ہے وہ تمہیں یہ الزام لگا کر مارنا چاہتا ہے کہ تمہاری صلاحیتیں آگے جا کر شیطانی قوتوں میں تبدیل ہو جائیں گی اور سب کچھ تباہ کر دیں گی اور اسی لیے تمہیں مارنا چاہتا ہے۔''

''کیا وہ سمجھتی تھی کہ جیسا یہ شخص میرے بارے میں خیال کرتا ہے اسی طرح دوسرے لوگ بھی سوچیں گے۔'' سمیر نے پوچھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات اس نے نہیں کی تھی۔''

''تو پھر اس شخص نے یہ کیوں کہا کہ تم میرے لیے خطرہ بن سکتے ہو؟'' سمیر نے پوچھا۔

''سمیر! یہ سب احمقانہ باتیں ہیں۔'' سمیر کے ڈیڈی نے خوف زدہ انداز میں اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا وہ غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

سمیر کا خیال تھا کہ کافی عرصہ پہلے اس کی والدہ کو ایک اجنبی عورت نے جو باتیں بتائی تھیں ان کی وجہ سے وہ بہت خوف زدہ تھے اور اسی لیے وہ احتیاط کر رہے تھے کہ سمیر ان کی سوچیں نہ پڑھ سکیں چنانچہ انہوں نے اپنی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

''بہت دیر ہو گئی ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' سمیر کی والدہ نے کہا وہ نہیں چاہتی تھی کہ سمیر اس پر مزید بات کرے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سمیر کہہ سکتا تھا کہ وہ دونوں اب بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

''چلو جیپ میں بیٹھو۔'' اس کے والد نے کہا اور پھر سمیر جیپ کے پچھلے حصے میں سامان کے شوپرز کے ساتھ جگہ بنا کر بیٹھ گیا اس نے سامان میں سے اپنا تکیہ نکال کر اسے اپنے سر کے نیچے رکھ لیا تھا اور پچھلی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا تھا لیکن وہ فوراً ہی سویا نہیں تھا بلکہ وہ اپنے والدین کی سوچوں کو پڑھنے اور سننے کی کوشش کر رہا تھا اسے تجسس تھا کہ اس کے والدین اس سے کیا چھپا رہے ہیں۔ وہ یوں خاموش ہو کر لیٹ گیا تھا جیسے اسے نیند آ رہی ہو لیکن نہ چاہنے کے باوجود پھر نیند اس پر غلبہ کرتی چلی گئی تھی وہ سارا دن کی بھاگ دوڑ اور پراسرار شخص کی سرگرمیوں کی وجہ سے تھک گیا تھا اور نیند نے اس کے ذہن کو کب قابو کر لیا اس کو پتہ ہی نہیں چلا تھا۔
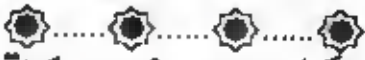
پھر اس کی آنکھ کھلی تو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی اور جیپ میں دھوپ آ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے دھنک رنگ ہیولے خارج ہو رہے تھے۔ اچانک ہی اسے اپنے ذہن کے پچھلے حصے میں ایک سرگوشی سی سنائی دی اسے یوں لگا کہ کسی نے اس کا نام پکارا ہو لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا پھر

اسے لگا جیسے بہت سے لوگوں کی سوچیں اور آوازیں ایک ساتھ اس کے دماغ میں گھس آئی ہو۔ بہت سی آوازیں تھیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اس نے سوچا شاید سفر کرتے ہوئے وہ کافی دور آ چکے ہیں اور اس کے والدین کسی جگہ راستے میں رک گئے ہیں اور جہاں رکے ہیں وہاں اطراف میں تقریباً بیس کے قریب لوگ موجود ہیں جن کی آوازیں اسے سنائی دے رہی ہیں۔

جس چیز نے اسے حیرت میں ڈالا وہ یہ تھی کہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا شہر اسے ڈھونڈ رہا ہو۔ جیسے وہ کھو گیا ہو اور سب اس کے لیے پریشان ہوں اس نے سوچا کہ وہ اپنے والدین کو بتائے کہ اسے کیا محسوس ہو رہا ہے۔ اس خیال سے وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اس کی آنکھیں بھی روشنی میں دیکھنے کے قابل نہیں ہوئی تھی اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور اس کے گال بھی بھیگے ہوئے تھے۔ وہ اس کے آنسو تھے وہ حیران رہ گیا کہ کیا وہ رو رہا ہے؟ پھر اس نے پلٹ کر اس جگہ دیکھا جہاں اس نے سیٹ پر تکیہ رکھا تھا۔ اب تکیہ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا پھر اس کو احساس ہوا کہ جیپ کی پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا سامان بھی غائب تھا۔

یہ عجیب بات تھی اس نے سوچا کہ اس کے والدین نے وہ سامان وہاں سے ہٹا دیا ہوگا لیکن اس بات نے بھی اسے مطمئن نہ کیا بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے والدین وہاں سے سامان ہٹا کر لے جائیں اور اسے چھوڑ جائیں۔

''ممی...... ڈیڈی...... کیا آپ نے میرا تکیہ لیا ہے؟'' اس نے پوچھا لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا کیونکہ اس کے والدین وہاں موجود نہیں تھے۔ اس نے سر گھما کر باہر کی طرف دیکھا لیکن وہ وہاں پر بھی نہیں تھے پھر وہ حیران ہو گیا جب اس نے غور کیا کہ وہ جیپ جس میں وہ بیٹھا تھا ایک پرانی کار میں تبدیل ہو گئی تھی اس میں ونڈ اسکرین کے سامنے گڑیا لٹک رہی تھی اب اس کی جگہ ایک پرانے طرز کی پھولوں کی لڑی لٹک رہی تھی جس کے تمام کلرز پھیکے پڑ چکے تھے۔ وہ حیرت سے سوچ رہا تھا کہ وہ تو اپنے ڈیڈی کی نئی جیپ میں بیٹھا تھا وہ اب پرانی اور بوسیدہ شیورلیٹ کار میں کیسے آ گیا تھا جو وہاں سے سیکڑوں میل دور ان کے گھر کے گیراج میں کھڑی تھی۔

''سمیر!'' اسے دور سے آتی ہوئی جانی پہچانی آواز سنائی دی تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''سارہ آنٹی!'' اس نے اپنی سوچوں میں اپنی آنٹی کا نام دہرایا پھر اس نے اپنی سوچوں کو ان کی سوچوں سے ملانے کی کوشش کی تھی۔

''تم کہاں ہو سمیر؟'' سمیر کو اپنے ذہن کے گوشوں میں سارہ آنٹی کی آواز سنائی دی وہ جیسے جانتی تھی کہ سمیر انہیں سن سکتا ہے۔

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' سمیر نے جواب دیا اور کار کے دھندلے شیشوں سے باہر جھانکنے لگا تا کہ باہر کا منظر دیکھ کر اپنی آنٹی سارہ کو اپنا محل وقوع سمجھا سکے اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ واقعی اپنے گھر کے پرانے گیراج میں ہی تھا۔

''میں اپنے گھر کے پرانے گیراج میں ہوں؟'' اس نے اپنی سوچوں میں بتایا۔

کچھ دیر بعد گیراج کے دروازے کے باہر قدموں کی آواز سنائی دی تھی اور پھر وہ بہت زوردار آواز کے ساتھ کھلے تھے اور ایک قد آور سیاہ شبیہ اندر داخل ہوئی تھی باہر سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا پھر وہ سیاہ ہیولہ کار کی طرف بڑھا تھا۔

''اوہ خدا کا شکر ہے کہ یہ تم ہو'' اس کی آنٹی سارہ نے کہا وہ کار کا دروازہ کھول رہی تھیں۔

''میں سب جگہ تمہیں ڈھونڈ رہی تھی اور ڈر رہی تھی کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔'' انہوں نے فکرمندی سے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' سمیر نے اپنی ٹانگیں کار سے باہر نکال کر فرش پر رکھتے ہوئے کہا اور آنٹی سارہ کی طرف دیکھا جنہوں نے اپنی ڈاکٹروں والی بلو کلر کی یونیفارم پہنی ہوئی تھی جو وہ ایمرجنسی میں پہنتی تھیں اور ان کے براؤن بال پونی ٹیل کی صورت میں پیچھے بندھے ہوئے تھے۔

''آپ یہاں کیوں ہیں؟'' سمیر نے ان سے پوچھا

کیونکہ وہ تو سال میں بس دو بار ہی ان کے گھر آتی تھیں۔
"ممی ڈیڈی کہاں ہیں؟" اس نے ساتھ ہی دوسرا سوال بھی کر دیا۔ اس کی آنٹی اس کے سوالوں کے جواب دینے کے بجائے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھیں۔
"تمہیں یاد نہیں کہ کیا ہوا ہے؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ چند لمحوں تک سمیر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر اس نے اپنی یادداشت پر زور دیا۔
"آخری بات جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ ممی ڈیڈی مجھے شمالی علاقہ جات لے جا رہے تھے گرمیاں گزارنے کے لیے۔" سمیر نے بتایا۔
"کیا؟" آنٹی سارہ نے حیرت سے کہا۔
"ہاں اور میں جیپ کی پچھلی سیٹ پر سو گیا تھا۔" سمیر نے اپنی بات مکمل کی۔
"لیکن اس بات کو تو چار ماہ سے زیادہ گزر چکے ہیں۔" سارہ نے کہا لیکن سمیر کو ان کی بات پر یقین نہیں آیا کیونکہ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے اس بات کو چند گھنٹے ہی گزرے ہیں۔ پھر اس نے غور کیا تو اس نے وہ کپڑے بھی نہیں پہنے ہوئے تھے جو پہن کر وہ جیپ میں بیٹھا تھا اسے احساس ہوا کہ وہ شدید گرمی کا موسم تھا لیکن اب موسم بدل چکا تھا فضا میں ہلکی ہلکی سردی کا احساس ہو رہا تھا اور وہ گھر واپس آ گیا تھا۔
"او خدایا! یہ سب کیا ہے؟" اس نے حیرت سے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ چار ماہ سے بے خبر ہے اس کے اطراف میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے لگا کہ جیسے اس کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا ہو اسے اچانک سردی کا احساس ہوا اور وہ کانپنے لگا اس کا دل گھبرانے لگا اور اسے یوں لگا کہ اسے لیٹ جانا چاہیے لیکن شاید اس کی کیفیت اس کی آنٹی سمجھ گئی تھیں۔ انہوں نے فوراً اسے بانہوں میں جکڑ لیا تھا اور تسلی دینے لگی تھیں۔
"تم پریشان مت ہو سمیر...... سب ٹھیک ہے...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے کہا تو سمیر ان کی بات پر چونکا۔
"کیا ٹھیک ہے...... کیا ٹھیک ہو جائے گا؟ میرے ممی ڈیڈی کہاں ہیں؟" سمیر نے ایک ساتھ کئی سوالات کر دیے سارہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔
"مجھے افسوس ہے سمیر۔" سمیر نے سر اٹھا کر سارہ آنٹی کی طرف دیکھا۔
"کیا میرے موم ڈیڈ کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہے؟" سمیر نے کہا اور اس کی بات پر سارہ آنٹی نے ایک گہری سانس لی انہوں نے بولنے کی کوشش کی لیکن الفاظ ان کے منہ سے ادا نہیں ہو سکے اور انہیں کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی سمیر ان کی سوچیں پڑھ سکتا تھا۔
"نہیں...... نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" سمیر نے خود کو سارہ آنٹی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔
"وہ نہیں مر سکتے۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔" وہ رو رہا تھا۔
"مجھے افسوس ہے۔" سارہ آنٹی نے سرگوشی میں کہا ان کی آواز میں دکھ تھا وہ اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتی جا رہی تھی سمیر نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے گالوں پر آ گئے تھے اور جسم کانپ رہا تھا اس کی ہچکیوں کے ساتھ ساتھ کار بھی ہچکولے لے رہی تھی۔
"سب ٹھیک ہو جائے گا سمیر۔" سارہ آنٹی نے اپنے ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔
"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا سمیر۔" سارہ آنٹی نے اپنے ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔
"سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"
"بھلا سب کیسے ٹھیک ہو جائے گا سارہ آنٹی...... کوئی جا کے بھی واپس آیا ہے؟" سمیر نے روتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں وہ واپس نہیں آ سکتے تو سب کچھ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ وہ اب کبھی اپنے والدین کو نہیں دیکھ سکے گا نہ ان سے بات کر سکے گا۔
"میں کبھی اپنے ڈیڈی کو نیا انجن ڈیزائن کرتے نہیں دیکھ

سکوں گا۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "اور نہ کبھی امی والدہ کو دیکھ سکوں گا جو ہر وقت گھر کا کونہ کونہ سجانے میں لگی رہتی تھیں اور میں ان کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔"

"پریشان مت ہو سمیر...... یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔" اس کی آنٹی نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"جو دنیا میں آیا ہے اس کو واپس بھی جانا ہے باری باری ہم سب جائیں گے کوئی پہلے اور کوئی بعد میں...... ہمیں اس بات پر پورا یقین ہونا چاہیے...... یہ ہمارا مقدر ہے اسے ہم بدل بھی نہیں سکتے۔" انہوں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن کیوں؟ میرے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہوا؟" سمیر نے روتے ہوئے کہا۔

"سمیر! جب ہم دکھی ہوتے ہیں تو ایسا ہی لگتا ہے لیکن ہمیں ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے یہ اس کا نظام ہے یہ سب ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔"

"ان کا انتقال کیسے ہوا؟" سمیر نے اچانک ان سے پوچھا پھر اس کی بات کا جواب دینے کے لیے آنٹی سارہ نے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ ایک پولیس آفیسر گیراج میں داخل ہوا اس نے پولیس کا یونیفارم پہنا ہوا تھا اس کی شرٹ پر لگا اس کا بیج چمک رہا تھا۔

سمیر نے سوچا کہ اس کا وہاں کیا کام پھر اسے اپنے والدین کا خیال آیا اور اس نے سوچا کہ وہ اس کے والدین کے سلسلے میں آیا ہوگا۔

"اوہ تم نے اسے ڈھونڈ لیا؟" آفیسر نے سارہ آنٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور سمیر کو احساس ہوا کہ وہ وہاں اس کے والدین کے لیے نہیں بلکہ اس کے سلسلے میں آیا ہے۔ سمیر نے سوالیہ نظروں سے سارہ آنٹی کی طرف دیکھا لیکن انہوں نے سمیر کی طرف توجہ نہیں دی۔

"ہاں! میں نے اسے ڈھونڈ لیا۔" سارہ آنٹی نے پولیس آفیسر کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسو صاف کیے۔

"معافی چاہتی ہوں مجھے اتنی جلدی میں آپ کو کال نہیں کرنا چاہیے تھی۔" انہوں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" آفیسر نے جواب دیا۔

"میں پھر آجاؤں گا اور ضابطے کی کارروائی مکمل کروں گا اور جب اس کے حواس درست ہو جائیں گے تو اس سے بھی اکیلے میں بات کروں گا۔" اس نے سمیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے مسٹر انور کہ آپ ایک دن کے لیے انتظار کرلیں۔" سارہ آنٹی نے کہا۔

"ہاں۔" پولیس انسپکٹر نے کہا لیکن اس کی آواز میں ناگواری تھی۔

"میرا پولیس چیف مجھے اتنی دیر انتظار کی اجازت نہیں دے گا۔"

سمیر کو لگا جیسے اس کا دل اچھل کر اس کے سینے سے باہر آجائے گا بھلا اس سے پولیس آفیسر کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق میرے والدین سے ہے؟"

"ہاں! ایسا ہی ہے۔" آنٹی سارہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا وہ بھی ان کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"مجھے ابھی آفیسر انور سے بات کرنا ہے اور انہیں بتانا ہے کہ تم سب بھول گئے ہو...... تم یہاں رکو اور میرا انتظار کرو...... میں ابھی آتی ہوں۔" آنٹی سارہ نے کہا اور گیراج کے دروازے کی طرف بڑھیں لیکن سمیر وہاں انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا اسے بھی اپنے ذہن میں اٹھنے والے بہت سے سوالات کے جوابات چاہیے تھے وہ بھی تیزی سے ان کے ساتھ ہی گیراج سے باہر آیا تھا۔

"میرے والدین کا انتقال کیسے ہوا؟" اس نے آنٹی سارہ سے پوچھا اور وہ چلتے چلتے رک گئیں۔

"ان کا انتقال ایک......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگیں وہ کچھ سوچ رہی تھیں جیسے فیصلہ کر رہی ہو کہ آگے کیا کہیں۔

"ایک ایکسیڈنٹ میں ہوا تھا۔" انہوں نے جملہ مکمل کیا لیکن سمیر کو اس بات پر یقین نہیں آیا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ڈیڈی بہت اچھی ڈرائیونگ کرتے تھے انہیں کبھی کوئی ایکسیڈنٹ پیش نہیں آیا تھا اگر کسی شخص کی گاڑی ان کی گاڑی

سے ٹکرائی بھی تھی تو انہوں نے سنگین حادثہ ہونے سے بچالیا تھا اور سب خیریت سے رہے تھے بھی کسی کو خراش بھی نہیں آنے دی تھی۔ انہوں نے بہت اچھے ادارے سے ڈرائیونگ کی تربیت لی تھی۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ ایک کار ایکسیڈنٹ میں مارے گئے ہیں؟'' سمیر نے آنٹی سارہ سے پوچھا۔

''ہاں!'' آنٹی سارہ نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں سب کچھ بعد میں بتاؤں گی...... ابھی میں آفیسر انور سے بات کرنا چاہتی ہوں تاکہ ہم سب یہاں سے نکل سکیں۔'' آنٹی سارہ نے بات مکمل کی اور پھر اس سے پہلے کہ سمیران سے مزید کوئی سوال کرے وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھیں اور گھر کی انٹرنس پر چلتی ہوئی گھر کی طرف بڑھ رہی تھیں سمیر بھی اس تیزی سے ان کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا لیکن گھر کے سامنے پہنچنے کے بعد وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔

وہاں پولیس کے آفیسرز ہر جگہ موجود تھے وہ جہاں کھڑا تھا وہاں سے اسے سارا منظر صاف نظر آرہا تھا وہ گھر کے باہر...... گھر کے لان میں...... گھر کے اندر اور جنگل میں بھی موجود تھے اسے ڈرائنگ روم کی کھلی ہوئی کھڑکی سے گھر کے اندر موجود پولیس کے افراد بھی نظر آرہے تھے۔

''یہاں اتنے زیادہ پولیس آفیسر کیوں ہیں؟'' سمیر نے آنٹی سارہ سے پوچھا وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جس علاقے میں رہتا ہے وہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور وہاں بہت زیادہ پولیس نہیں ہیں لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ قریبی علاقے کی پولیس کو بھی وہاں بلا لیا گیا ہو۔

''کیا کسی نے میرے والدین کو مار ڈالا ہے؟'' سمیر نے پوچھا اسے اس وقت کی صورت حال کی وجہ سے یہ بات زیادہ اہم لگی۔

''پولیس یہاں تمہارے والدین کے سلسلے میں نہیں آئی ہے۔'' آنٹی سارہ نے جواب دینے میں کچھ وقت لیا تھا۔

''یہ لوگ تمہارے لیے آئے ہیں۔'' انہوں نے کہا اور سمیر حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

''پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے؟ کیوں؟ کیا جو حادثہ ہوا اس سے میرا کوئی تعلق ہے؟'' سمیر نے پوچھا لیکن سارہ آنٹی نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے والدین کو جس کسی نے بھی بتایا تھا کہ آگے چل کر وہ شیطانی قوتوں کا مالک بن جائے گا وہ بات درست تھی۔

اس کی آنٹی سارہ خاموش تھیں وہ بالکل نہیں بول رہی تھیں یا شاید بولنا نہیں چاہتی تھیں لیکن سمیر کو ان کی آواز سننے کی ضرورت نہیں تھی وہ ان کے چہرے پر موجود خوفزدگی کے تاثرات پڑھ سکتا تھا اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ صورت حال بہت خراب ہے۔

''کیا میں نے انہیں مار ڈالا ہے؟ ہے نا؟ یہی بات ہے نا؟'' اس نے ایک بار پھر آنٹی سارہ سے پوچھا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے...... وہ ایک حادثہ تھا...... تم سمجھ گئے؟'' آنٹی سارہ نے اس کی طرف رخ کر کے کہا۔

''وہ ایک حادثہ تھا'' انہوں نے پھر دہرایا اور سمیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم سے پولیس صرف یہ پوچھنا چاہتی ہے کہ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ انہیں حادثہ پیش آیا ہے؟'' آنٹی سارہ نے اس سے کہا اور اس کا منہ ایک بار پھر حیرت سے کھل گیا۔

''مجھے کیسے پتہ چلا؟ کیا مطلب؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم گھر پر تھے...... اکیلے تھے...... حادثہ کے بعد تم نے کال کر کے پولیس کو اطلاع دی تھی اور پھر غائب ہو گئے تھے یہ سب کیسے ہوا...... وہ تم سے اس بارے میں ہی پوچھیں گے۔'' سارہ آنٹی نے اسے بتایا۔

''کک...... کیا؟...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ لیکن پھر آنٹی سارہ نے اسے جواب نہیں دیا۔

سمیر نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ مین روڈ پر آگئے تھے اور جنگل میں بھی کچھ تلاش کر رہے تھے۔ سمیر چاہتا تو ان کے ذہنوں میں جا کر اصل معاملہ جان سکتا تھا لیکن وہ ابھی ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے بہت سے سوال اٹھ سکتے تھے

لیکن ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور وہ یہ کہ اپنے والدین کے ساتھ کیوں نہیں تھا؟ وہ کبھی بھی اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر نہیں گئے تھے وہ ہر جگہ ان کے ساتھ جاتا تھا چاہے وہ ڈاکٹرز کا کلینک ہو پوسٹ آفس ہو ڈرائی کلینرز کی جگہ ہو یا پھر وہ روڈ کے آخر میں واقع میل کیفین ہو وہ ہر جگہ ان کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

''مجھے بتائیں اصل بات کیا ہے؟'' اس نے ایک بار پھر آنٹی سارہ سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی بیٹا!'' سارہ آنٹی نے کہا۔ ان کی آنکھیں ایک خوبرو نوجوان پر جمی ہوئی تھیں جس کے بال سیاہ تھے قد لمبا تھا اس نے ایک نیوی بلو شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کے ساتھ بلو جینز تھی۔

''لگتا ہے تمہارے والدین تمہاری سالگرہ پر تمہیں کچھ گفٹ دینا چاہتے تھے کیونکہ ان کی کار میں ان کے ساتھ ایک آئی پیڈ بھی رکھا ہوا تھا جو ڈبے میں پیک تھا۔''

سمیر کو یاد آیا کہ اس کی سترہویں سالگرہ تھی جسے وہ بھول گیا تھا جب کہ اسے کئی مہینوں سے اپنی سالگرہ کا شدت سے انتظار تھا وہ سوچتا تھا کہ جب وہ اپنا ڈرائیونگ لائسنس بنوائے گا تو اپنے ڈیڈی سے کہے گا کہ وہ پرانی شیورلیٹ اسے گفٹ کردیں اس کے ڈیڈی نصیر احمد فاروقی گاڑیوں کے بہت اچھے مکینک تھے اور انہوں نے مکینکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا ہوا تھا بھلا وہ دن سمیر کیسے بھول سکتا تھا۔ پھر اسے سن کر بھی حیرت ہوئی تھی کہ اس کے والدین کی جیپ میں ایپل کا نیا پیڈ رکھا ہوا تھا جو گفٹ کی طرح پیک تھا سمیر کے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے والد ایپل کی پروڈکٹس کو پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سمیر کی موجودگی کے بغیر اس کے لیے کبھی کوئی چیز نہیں خریدی تھی وہ ہمیشہ اس کی پسند کا خیال رکھتے تھے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا وہ اسے اپنے ساتھ ہی اسٹور لے جاتے تھے

اسے بار بار خیال آرہا تھا کہ اگر اس کے والدین کی جیپ سے نیا آئی پیڈ ملا ہے تو اس کی کوئی اور وجہ ہوسکتی ہے

لیکن وہ اس کی سالگرہ کا گفٹ نہیں ہوسکتا اس کے ساتھ ہی سمیر کو خیال آیا کہ اسے گھر کے اندر جا کر دیکھنا چاہیئے۔ ممکن ہے کوئی ایسی چیز ہو جسے دیکھ کر اسے یاد آجائے کہ وہاں کیا ہوا تھا؟

سمیر تیزی سے آگے بڑھا تھا اور دوڑتا ہوا گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوگیا تھا چند لمحے دروازے کے قریب کھڑے کھڑے اس نے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ براؤن لیدر کا صوفہ اور کرسیاں اپنی جگہ موجود تھیں بڑی ڈائننگ ٹیبل بھی اسی طرح کھڑکی کے سامنے رکھی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی دیوار پر فلیٹ اسکرین ٹی وی موجود تھا سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ شمالی علاقہ جات جاتے ہوئے چھوڑ کر گیا تھا۔

پھر سمیر کچن کی طرف گیا تھا جہاں کچن کے سامنے برآمدے میں کھانے کی میز پڑی تھی جس پر ایک سفید رنگ کا کیک رکھا ہوا تھا۔ یہی ایک نئی تبدیلی اس نے محسوس کی تھی۔ کیک کے اوپر تازہ اسٹرابیریز لگی ہوئی تھیں اور کیک کی خوشبو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی تیار کیا گیا ہے۔ اسے یاد تھا اس کی ممی ہر سال اس کی سالگرہ پر ایسا ہی برتھ ڈے کیک بناتی تھیں کیونکہ ان کے ہاتھ کا اسٹرابیری کیک سمیر کو بہت پسند تھا وہ اسے اسی طرح اسٹرابیریز سے سجاتی تھیں اور اس سے پہلے کہ سمیر اس کیک کو کاٹے وہ اس پر تازہ بنایا ہوا اسٹرابیریز ساس بھی ڈالتی تھیں جس سے کیک اور بھی خوب صورت اور مزیدار ہوجاتا تھا۔ اس نے دیکھا کیک کے قریب ہمیشہ ایک کپ میں اسٹرابیری ساس بھی رکھا ہوتا تھا جو اب نہیں تھا اس کا مطلب تھا کہ اس کی والدہ کو اسٹرابیری ساس بنانے کا موقع نہیں ملا تھا اور انہیں حادثہ پیش آگیا تھا۔

سمیر وہیں برآمدے میں دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوگیا تھا۔ سامنے میز کے قریب کرسی پر ایک پولیس آفیسر بیٹھا تھا اور سمیر کو گھور رہا تھا۔ پھر سمیر کی سوچوں میں نہ جانے وہ ساس کا کپ کہاں سے آگیا وہ اسے میز پر رکھا ہوا محسوس ہو رہا تھا پھر نہ جانے وہ کیسے لڑھک گیا۔ اس میں سے سرخ سرخ

سانس میز پر بکھر گیا اور ایک موٹی سی دھار بن کر میز سے نیچے گر کر ایک گڑھے میں جمع ہونے لگا۔ سمیر کو لگا جیسے اسے شدید چکر آ رہے ہیں اور وہ مزید کھڑا نہیں رہ سکتا اس کا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا وہاں موجود ہر چیز سرخ نظر آ رہی تھی جیسے وہ خون میں ڈوبی ہوئی ہو یہاں تک اسے اپنے ہاتھ، اپنے کپڑے، ہر چیز سرخ نظر آ رہی تھی۔ اس کا وہاں کھڑے رہنا ناممکن ہو گیا وہ دوڑتا ہوا واپس ڈرائنگ روم میں چلا گیا تھا جہاں اس کی آنٹی سارہ موجود تھیں۔ وہ تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ آنٹی سارہ تیزی سے اس کے قریب آ گئی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے پریشانی سے پوچھا انہیں بھی اس کی حالت بہتر نہیں لگ رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں...... مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔'' اس نے تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

''کیا لگ رہا ہے؟'' انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے اسٹرابیریز کی خوشبو آ رہی ہے...... مجھے تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے...... مجھے سانس لینے میں مشکل ہو رہی ہے۔'' سمیر نے رک رک کر کہا وہ خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کر رہا تھا اور اپنی آنٹی کے سامنے خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''اس کا رنگ تو بالکل زرد پڑ گیا ہے۔'' خوبرو شخص جو بلیو ڈریس میں تھا وہ اس کے قریب آ گیا پھر وہ اس کا جائزہ لینے کے بعد ایک طرف ہٹ گیا تھا اور آنٹی سارہ کو اشارے سے اپنے قریب بلایا تھا۔ شاید وہ ان سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا اس نے سر اونچا اٹھایا ہوا تھا جس سے تکبر کا احساس ہو رہا تھا ایسے جیسے وہ خود کو سب سے بہتر سمجھتا ہو۔

''میں ایک منٹ میں آئی۔'' آنٹی سارہ نے سمیر سے کہا اور سمیر وہاں رکھی روکنگ چیئر میں لیٹ سا گیا۔ آنٹی سارہ چند قدم آگے جا کر اس شخص سے باتیں کرنے لگی تھیں وہ اس شخص کی آواز سن سکتا تھا۔

''میں ہر چیز سنبھال لوں گا تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے سارا کام احتیاط اور دھیان سے کروں گا۔'' اس نے کہا اور سمیر سوچ رہا تھا کہ وہ کیا بات کر رہا ہے وہ کس کام کو احتیاط اور دھیان سے کرنے کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ سمیر نے چاہا کہ وہ اس بارے میں کچھ پوچھے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس شخص کی سیاہ آنکھیں سمیر ہی کو گھور رہی تھیں۔ اس کی کوئی بات سمیر کو تنگ کر رہی تھی اسے اس شخص سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ سمیر کرسی میں اور پیچھے کو کھسک کر بیٹھ گیا جیسے خود کو اس کی پہنچ سے محفوظ کر رہا ہو۔ اس کی اس حرکت کو اس شخص نے بھی محسوس کر لیا تھا اور بامعنی انداز میں مسکرایا تھا وہ پھر آنٹی سارہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''تم اسے اپنے ساتھ گھر لے جاؤ...... میں اس کا سامان آج رات وہاں پہنچا دوں گا۔'' اس نے کہا اور آنٹی سارہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی اس کی طرف واپس آ گئیں۔

''چلو آؤ!'' انہوں نے سمیر کو اٹھاتے ہوئے کہا لیکن سمیر اسی طرح بیٹھا رہا وہ اپنے گھر کو دیکھ رہا تھا جہاں اس نے اپنی زندگی کا اب تک کا وقت گزارا تھا۔ اسے لگا اس سے یہ سب کچھ چھینا جا رہا ہے۔ اس کی ممی اس کے ڈیڈی اس کا گھر اس کی یادیں سب کچھ اس سے جدا کیا جا رہا تھا لیکن کیوں؟ اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے سوچا کیا اس کے ساتھ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ اس کے ممی ڈیڈی کا کار ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے یا اس لیے کہ ایک سیاہ لباس والا آدمی اس کے تعاقب میں پھر آیا ہو اور اس نے اس کے والدین کو مار ڈالا ہو کیونکہ وہ اس کی حفاظت کر رہے تھے اور اس کے راستے کی رکاوٹ تھے جو بھی ہو وہ یہ جان گیا تھا کہ اس کی آئندہ زندگی اس کے لیے آسان نہیں ہوگی اور اس میں اسے بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا تھا۔

''چلو اٹھو سمیر ہمیں یہاں سے جانا ہے یہ لوگ اس جگہ کو سیل کریں گے اور جب تک اس حادثے کی تحقیقات ہوں گی یہ جگہ سیل ہی رہے گی تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہوگا ہماری جب جب بھی ضرورت پڑے گی بلایا جاتا رہے گا۔'' آنٹی سارہ نے کہا۔

''میں اب اپنے گھر سے دور رہوں گا؟'' سمیر نے پوچھا۔

"ہاں فی الحال یہ بہت ضروری ہے۔" آنٹی سارہ نے کہا۔ سمیر نے سر اٹھا کر اطراف کا جائزہ لیا تھا۔ ہر طرف پولیس کے افسران موجود تھے جو مختلف چیزوں کا معائنہ کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ضروری معلومات بھی درج کرتے جا رہے تھے۔ سمیر نہ چاہتے ہوئے بھی کرسی سے اٹھ گیا اور آنٹی سارہ کے ساتھ گھر کی سیڑھیاں اترتا ہوا انٹرنس سے گزر کر ان کی کار میں جا بیٹھا وہ خوبرو آفیسر بھی ان کے پیچھے ہی کار تک آ گیا تھا۔

"اچھا خالد وحید صاحب اجازت دیجئے میں آپ کے ساتھ رابطے میں رہوں گی۔" آنٹی سارہ نے کہا اور کار میں بیٹھ گئی۔

"آپ فکر مت کیجئے میں سب دیکھوں گا آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی معاملات انشاء اللہ تعالیٰ ہمارے حق میں ہی ہوں گے۔" اس نے کہا اور آنٹی سارہ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سمیر پیچھے مڑ کر اپنے گھر کو نظروں سے دور ہوتے دیکھ رہا تھا۔

"کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ یہ شخص کون ہے اور بار بار آپ کو تسلیاں کیوں دے رہا ہے۔" سمیر نے کہا۔

"یہ ایک اچھا سراغ رساں ہے سمیر..... آخر ہمیں پتا تو چلنا چاہیے کہ کیا ہوا ہے۔ میں صبح اسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تب مجھے انسپکٹر انور کا فون موصول ہوا اور اس نے حادثے کی اطلاع دی میں جس حالت میں تھی اسی حالت میں دوڑ پڑی۔" آنٹی سارہ نے بتایا۔

"یہ سب کچھ کیسے ہوا؟" سمیر نے پوچھا۔

"یہ تو تم بتاؤ گے سمیر کیونکہ تم ہی واحد گواہ ہو...... یہاں کوئی اور نہیں تھا۔" آنٹی سارہ نے کہا۔

"لیکن مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں سوائے اس کے کہ میں ڈیڈی اور ممی کے ساتھ گرمیاں گزارنے شمالی علاقہ جات کی طرف جا رہا تھا پھر میں جیپ کی پچھلی سیٹ پر سو گیا تھا اور جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے گھر کے پرانے گیراج میں تھا۔" سمیر نے کہا۔

"خیر! اس موضوع پر گھر پہنچنے کے بعد بات کریں گے۔ تم جانتے ہو کہ میں فوزیہ سے کتنی محبت کرتی تھی وہ میری بڑی بہن تھی مجھے تمہارے والدین کے فوت ہونے کا بہت دکھ ہے۔ میں خود کو اس صدمے سے نڈھال محسوس کر رہی ہوں۔" آنٹی سارہ نے کہا اور سمیر خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی آنٹی کیا محسوس کر رہی ہوں گی کیونکہ وہ خود بھی اپنے والدین کا صدمہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور وہ رونے لگا تھا۔

"سمیر! مت رو...... رونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ تم بڑے ہو گئے ہو تمہیں بہت بہادری سے رہنا ہوگا اپنی کمزوریوں کو چھپا کر۔ کسی پر بھی اپنی کوئی کمزوری ظاہر مت ہونے دینا میں تو تمہاری آنٹی ہوں تم میرے سامنے دل ہلکا کر لو اور پھر کبھی نہیں رونا۔" آنٹی سارہ نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"جی!" سمیر نے کہا لیکن وہ مسلسل رو رہا تھا آنٹی سارہ نے اس سے پھر زیادہ بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ رو کر اپنا دل ہلکا کر لے راستے میں ایک جگہ انہوں نے گاڑی روک کر کچھ سامان خریدا تھا اور پھر ان کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

تقریباً دو گھنٹے کا راستہ طے کرنے کے بعد وہ ایک بستی میں داخل ہوئے تھے جو سمندر کے کنارے واقع تھی وہ سمندر کے کنارے بنے ہوئے خوب صورت پلازہ کے ایک کشادہ فلیٹ میں رہتی تھی جو ان کے اسپتال سے قریب ہی واقع تھا۔

"آؤ سمیر تم نے تو میرا فلیٹ دیکھا ہی نہیں ہے تم پہلے کبھی یہاں نہیں آئے۔ ہاں ایک بار تم آئے تھے تب تم بہت چھوٹے تھے تم نے چلنا بھی نہیں سیکھا تھا۔" آنٹی سارہ نے کہا۔ ساتھ ہی انہوں نے کار کی ڈکی سے سامان کے شاپرز نکال کر سمیر کو تھما دیئے تھے اور کار ایک سمت پارک کر کے اس کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

"میں چوتھی منزل پر رہتی ہوں وہاں سے سمندر کا منظر بہت خوب صورت نظر آتا ہے۔" آنٹی سارہ نے اسے بتایا لیکن وہ مشینی انداز میں ان کے پیچھے چل رہا تھا لیکن ان کی باتوں میں کوئی دل چسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس کو خوف تھا کہ

کہیں اس کا پیچھا کرنے والا پراسرار شخص اس کے تعاقب میں وہاں تک نہ پہنچ جائے اس نے راستے میں بھی اپنے ذہن کو ٹٹولا تھا لیکن اسے اس اجنبی کی سوچوں کا دور دور تک نشان نہیں ملا تھا۔ سمیر حیران تھا کہ جو شخص اس بری طرح اس کے تعاقب میں تھا وہ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا تھا اور اگر اس کے علم میں یہ ہو کہ سمیر ٹھیک ہے اور بچ گیا ہے تو وہ اس کا پیچھا ہرگز بھی نہیں چھوڑے گا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو سمیر؟'' اس کی آنٹی نے اسے پکارا تو وہ چونکا۔ وہ اپنے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھیں۔

''سامان وہاں میز پر رکھ دو۔'' انہوں نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب بنے کچن کی طرف اشارہ کیا اور سمیر نے سامان کے شاپرز کچن میں جا کر ٹیبل پر رکھ دیے۔

''میں نے تمہارا کچھ سامان پیک کر لیا تھا جو گاڑی کی ڈگی میں ہے میں ابھی جا کر نکال لاؤں گی تم تھوڑا آرام کرو پھر فریش ہو کر کپڑے بدل لینا پھر ہم باتیں کریں گے۔'' آنٹی سارہ نے اس سے کہا اور وہ ہال کمرے میں بنی بڑی سی کھڑکی کے قریب کرسی پر آ بیٹھا جہاں سے سمندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

''تم بیٹھو سمیر میں باقی سامان لے کر آتی ہوں۔'' آنٹی سارہ نے اس سے کہا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آنٹی سارہ باقی سامان لینے چلی گئی تھی اور سمیر فلیٹ کا جائزہ لینے لگا تھا وہ پانچ کمروں کا فلیٹ تھا جس میں آنٹی سارہ اپنی بیٹی اور شوہر کے ساتھ رہتی تھیں ان کے شوہر بھی ان کے ساتھ اسپتال میں ڈاکٹر تھے اور ان کی بیٹی نائلہ ابھی میٹرک میں تھی۔ فلیٹ کو بڑے قرینے سے سجایا گیا تھا۔ نائلہ کا کمرہ بند تھا وہ پھر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا تھا جو سمندر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے قریب رکھی تھی۔

''یہ لو سمیر میں تمہارے کپڑوں کا اٹیچی کیس بھی لے آئی ہوں اب تم فریش ہو کر کپڑے بدل لو میں کھانا بنا لیتی ہوں تب تک اسلم اور نائلہ بھی آ جائیں گے پھر ساتھ ہی کھانا کھائیں گے۔'' انہوں نے کہا۔ ان کا اشارہ اپنے شوہر اور بیٹی کی طرف تھا۔

''جی ٹھیک ہے۔'' سمیر نے کہا اور اپنے کپڑے اٹیچی سے نکال کر باتھ روم کی طرف چلا گیا پھر وہ کچھ ہی دیر میں فارغ ہو کر باہر آ گیا تھا۔

''لو میں نے تمہارے لیے چائے بنائی ہے یہ پی لو اور میں نے تمہارا سامان نائلہ کے برابر والے کمرے میں رکھ دیا ہے وہ تمہارے لیے ٹھیک رہے گا تم بور بھی نہیں ہو گے اور نائلہ تمہیں کمپنی دے گی۔'' آنٹی سارہ نے کہا وہ حتی المقدور اس کی دلجوئی کر رہی تھیں لیکن اس کے چہرے پر اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور وہ تھوڑی دیر بعد اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا۔

رات کو نائلہ اور اس کے ڈیڈی آئے تھے انہوں نے سمیر سے اس کے والدین کی موت پر اظہار افسوس کیا تھا لیکن اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کی تھی کیونکہ آنٹی سارہ انہیں سب بتا چکی تھیں پھر رات کے کھانے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے اور آنٹی سارہ سمیر کے کمرے میں آ گئی تھیں۔

''سمیر! دن بھر اتنی مصروفیت رہی ہے کہ میں تم سے اس سلسلے میں تفصیل سے کوئی بات نہیں کر سکی ہوں جو کچھ ہوا مجھے بھی اس کا افسوس ہے فوزیہ میری بڑی بہن تھی میں اس کی اور نصیر احمد فاروقی کی یہ ناگہانی موت کبھی بھول نہیں سکوں گی۔'' انہوں نے اس کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا سمیر اپنے بیڈ پر نیم دراز تھا وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''میں خود حیران ہوں کیونکہ مجھے جو یاد ہے وہ یہی ہے کہ ہم ڈیڈی کی جیپ میں سامان رکھ کر گھر سے روانہ ہو رہے تھے میں تکیہ لے کر پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا تھا اور مجھے نیند آ گئی تھی اس کے بعد میری آنکھ کھلی تو میں جیپ کے بجائے اپنی پرانی کار میں تھا اور گیراج میں کار کھڑی تھی آپ نے مجھے بتایا کہ جب ہم گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے شمالی علاقہ جات گئے تھے اس واقعے کو چار ماہ گزر چکے ہیں۔ آپ کو ممی نے ہمارے شمالی علاقہ جات جانے کی اطلاع دی تھی لیکن اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ یاد نہیں۔'' سمیر نے کہا۔

"اس عرصہ میں میری بھی فوزیہ باجی سے کوئی بات نہیں ہوئی۔" آنٹی سارہ نے کہا۔

"کیا میرے والدین کا انتقال آج ہوا ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"نہیں۔" ان کے انتقال کو دو دن ہو گئے ہیں۔" آنٹی سارہ نے کہا پھر چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"لیکن اس حادثے کی خبر پولیس کو تم نے فون کر کے دی تھی اور موقع پر پہنچنے کے بعد پولیس تمہیں تلاش کر رہی تھی لیکن تم نہیں ملے؟"

"مجھے تو بالکل یاد نہیں...... میں تو خود کو گیراج میں پرانی کار میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔" سمیر نے کہا۔

"ان دونوں کی لاشیں جنگل سے ملی ہیں وہ ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر پڑے تھے گھر میں تو کسی قسم کی لڑائی یا فائرنگ وغیرہ کے کوئی نشانات نہیں تھے یوں لگتا ہے کہ وہ جنگل میں ٹہلنے گئے ہوں گے یا کسی کام سے گئے ہوں گے اور یہ حادثہ پیش آ گیا ہوگا لیکن تم اس وقت کہاں تھے؟"

"مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔"

"یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ تمہارے والدین نے کوئی خطرہ دیکھ کر تمہیں وہاں چھپا دیا ہو۔" آنٹی سارہ نے قیاس آرائی کی۔

"لیکن ایسا ہوتا تو مجھے تو کچھ یاد ہوتا۔" سمیر نے کہا۔

"فوزیہ نے آخری بار جب مجھ سے بات کی تھی تب وہ تمہارے ساتھ گھر سے روانہ ہو رہی تھی اس نے کہا تھا کہ وہ کسی پر فضا مقام کی طرف جا رہے ہیں جگہ کا نام نہیں بتایا تھا میں نے اچانک پروگرام بنانے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا تھا کہ سمیر کو کچھ پرابلم ہے۔" انہوں نے سمیر کو دیکھتے ہوئے کہا

"وہ کس پرابلم کا ذکر کر رہی تھیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"روانگی والے دن صبح میں اپنی ممی کے ساتھ شاپنگ کرنے کے لیے سپر مارکیٹ گیا تھا وہاں شاپنگ کے دوران مجھے سیاہ لباس میں ایک پراسرار شخص نظر آیا تھا جو مسلسل میرے پیچھے لگا رہا تھا اور وہ میری سوچوں میں مجھ سے باتیں کر رہا تھا اس نے مجھے مار ڈالنے کی دھمکی بھی دی تھی پھر جب ہم گھر واپس آئے تھے تو وہ بھی ہمارا تعاقب کرتا ہوا وہاں آ گیا تھا اور جب میں ڈیڈی کے ساتھ جنگل میں اپنی کتاب لینے گیا تھا تب وہ ایک بار پھر ہمارے سامنے آ گیا تھا اور اس نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ وہ مجھے خنجر سے مارنا چاہتا تھا تب ڈیڈی اور ممی نے مجھے بچایا تھا اور اس کے بعد ہی ڈیڈی نے مجھے وہاں سے شمالی علاقہ جات لے جانے کا پروگرام بنایا تھا میں اس وقت بھی حیران تھا کہ وہ اس کے خوف سے مجھے لے کر گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ میں نے ان سے بہت پوچھا تھا لیکن انہوں نے مجھے پوری بات نہیں بتائی تھی وہ خوفزدہ لگ رہے تھے سمیر نے مختصراً سارا واقعہ آنٹی سارہ کو بتایا۔

"تم نے اچھا کیا جو میرے سامنے تفصیل بیان کر دی ہمیں تفتیش کے دوران یہ باتیں پولیس کو بتانا ہوں گی تاکہ انہیں معاملے کی تحقیقات کرنے میں آسانی ہو اور تم پر سے ان کا شک بھی ختم ہو جائے۔"

"مجھ پر شک؟" سمیر نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں کیونکہ جائے واردات سے تم ہی ملے ہو اور تم نے ہی پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔" آنٹی سارہ نے کہا اور سمیر حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

"بھلا میں اپنے والدین کو کیسے؟" سمیر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا اور حیرت اور افسوس کے انداز میں آنٹی سارہ کو دیکھ رہا تھا۔

❁.....❁.....❁.....❁

سمیر کی آنٹی اس سے کافی دیر اس کے والدین کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھیں اور اسے سمجھاتی رہی تھیں پھر انہوں نے اس کے پاس سے اٹھنے سے پہلے اسے ایک پرچہ دیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"یہ ایک جگہ کا ایڈریس ہے...... میں نہیں جانتی کہ اس سے تمہاری کوئی مدد ہو سکے گی یا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ تمہارے والدین اگر واقعی تمہیں شمالی علاقہ جات لے جا رہے تھے تو یقیناً وہ تمہیں اس جگہ ہی لے جا رہے ہوں گے۔" آنٹی سارہ نے کہا اور سمیر نے ان کے ہاتھ سے پرچہ

لے لیا۔

"اس میں تو کسی ڈریم سینٹر کا پتہ لکھا ہوا ہے جو شمالی علاقہ جات میں واقع ہے۔" سمیر نے پرچے پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میرا خیال ہے کہ جب حادثے کے بعد تمہارے والدین نے تمہیں شمالی علاقہ جات لے جانے کا فیصلہ کیا تھا تو تمہیں صرف تفریح کروانے نہیں لے جا رہے تھے بلکہ وہ اس نامعلوم شخص سے خوفزدہ ہو کر تمہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتے تھے اور شاید اس ڈریم سینٹر سے زیادہ محفوظ جگہ تمہارے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟" سمیر نے پوچھا۔

"اگر اس جگہ کا ذکر انہوں نے تم سے اور مجھ سے بھی نہیں کیا تو وہ اسے راز رکھنا چاہتے تھے اور اس کی وجہ بھی اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اجنبی دشمن تمہارا اور کسی کا بھی دماغ پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے گویا ہمارے علم میں جو بھی بات ہے وہ محفوظ نہیں ہے اسی لیے انہوں نے تمہیں بھی صحیح بات نہیں بتائی ہوگی۔"

"ہاں! مجھے اس بات کا احساس ہو تو رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔" سمیر نے کہا۔

"ہو سکتا ہے وہ یہی بات ہو۔"

"ہوں..... ممکن ہے۔" سمیر نے کہا۔

"پھر اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"میرا خیال ہے تمہیں اس ڈریم سینٹر سے رابطہ کر کے معلومات کرنا چاہیے۔"

"لیکن یہ ایڈریس آپ کو کہاں سے ملا؟"

"جب تمہارے والدین کے قتل کے بعد پولیس جائے حادثہ پر پہنچی تو تمہارے والدین کی بہت سی چیزیں انہوں نے سرکاری تحویل میں لے لی تھیں ان میں یہ موبائل بھی تھا انہوں نے اس کا ڈیٹا اپنے پاس محفوظ کرنے کے بعد موبائل واپس کر دیا تھا جو اب خالد وحید کے پاس ہے میں نے اس موبائل میں سے ہی یہ ایڈریس کاپی کیا تھا جو میسج کی صورت میں تمہارے والد کو بھیجا گیا تھا اور یہ اسی تاریخ کو بھیجا گیا تھا جب تم لوگ شمالی علاقہ جات جانے کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔"

"ٹھیک ہے اس ایڈریس کے ساتھ فون نمبر بھی موجود ہے میں کسی وقت یہاں رابطہ کر کے معلومات حاصل کروں گا۔" سمیر نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے اور خدا کے لیے معلومات ملنے کے بعد انہیں اپنے ذہن کے گوشوں میں یوں محفوظ کر دینا کہ انہیں کوئی پڑھ نہ سکے تب ہی شاید تم دشمن کی پہنچ سے آزاد رہ سکو گے۔" آنٹی سارہ نے نصیحت کی۔

"جی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" سمیر نے جواب دیا پھر آنٹی سارہ اس کے کمرے سے چلی گئی تھیں اور وہ بہت دیر تک سونے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

سمیر کو تین دن تک کچھ سمجھ نہیں آیا وہ گھنٹوں سوچتا رہتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تین راتیں وہ سو نہیں سکا تھا جب بھی وہ سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا تو اسے ایک ہی خواب نظر آتا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا وہ پریشان تھا کہ ایک ہی خواب اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا آخر چوتھے دن اس نے اپنی آنٹی سے اس کا ذکر کیا۔

"کیا تم نے پہلے بھی کبھی یہ خواب دیکھا ہے کہ کوئی سیاہ سایہ تمہارا پیچھا کر رہا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں یہ خواب اکثر مجھے نظر آتا ہے لیکن اس بار اس میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ یہ کہ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہوتا ہے وہ دونوں مجھے مارنے کے لیے میرے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں میں ٹھوکر کھا کر گر جاتا ہوں اور وہ دوڑتے ہوئے میرے قریب آ جاتے ہیں اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔" سمیر نے انہیں بتایا۔

"سمیر! کیا تمہارے والدین نے تمہیں یہ بات بتائی تھی کہ تمہاری پیدائش کے بعد انہیں ایک بوڑھی عورت ملی تھی اور اس نے انہیں بتایا تھا کہ تم غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہو گے اور جب تم سترہ سال کے ہو گے تو تمہاری صلاحیتوں میں اضافہ ہو جائے گا اور اس وقت کوئی پراسرار شخصیت تمہیں

مارنے کی کوشش کرے گی چنانچہ انہیں بہت احتیاط کی ہدایت کی تھی۔" آنٹی سارہ نے اسے بتایا۔

"نہیں! لیکن انہوں نے مجھے گھر میں بند رکھ کر پروان نہ چڑھایا یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کبھی عام بچوں کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں دی مجھے اس پر حیرت بھی تھی اور میں اکثر ان سے پوچھتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں لیکن ڈیڈی ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ وہ نہیں چاہتے کہ میں دوسرے بچوں کے ساتھ رہ کر اپنا وقت برباد کروں وہ چاہتے ہیں کہ میں پڑھ لکھ کر ایک کامیاب انسان بنوں۔"

"میرا خیال ہے سمیر کہ وہ وقت آ گیا ہے جس کی پیشن گوئی اس بوڑھی عورت نے کی تھی اور تمہارے ساتھ ہونے والے حادثات اسی کا حصہ ہیں۔" آنٹی سارہ نے کہا۔

"اگر اس بات کو درست مان بھی لیا جائے تو میں اکیلے ان حالات کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا؟"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے والدین نے تمہارے لیے جو فیصلہ کیا تھا وہ درست تھا تمہیں اس پر ہی عمل کرنا چاہیے۔" آنٹی سارہ نے کہا اور سمیر نے اثبات میں سر ہلایا۔

مزید دو دن بعد سمیر شمالی علاقہ جات کے لیے روانہ ہو گیا تھا اس کے لیے سارہ آنٹی کے شوہر نے اس کی مدد کی تھی اس کے ہوائی سفر کے انتظامات کیے تھے اور پھر وہ نائلہ اور آنٹی سارہ کے ساتھ اسے ائرپورٹ پر رخصت کرنے بھی آئے تھے۔

"اپنا خیال رکھنا سمیر اور اپنے بارے میں ہمیں باخبر رکھنا۔" آنٹی سارہ نے ہدایت کی۔

"جی ضرور۔" سمیر نے جواب دیا۔

"میں تمہیں یاد رکھوں گی سمیر کبھی وقت ملے تو ہم سے ملنے ضرور آنا۔" نائلہ نے کہا۔

"جب بھی موقع ملا میں ضرور آؤں گا۔" سمیر نے وعدہ کیا اور ان سے رخصت ہو گیا۔

جب وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچا تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا اور اسے اپنا اگلا سفر ٹیکسی کے ذریعے کرنا تھا جو اسے شہر کے آخری سرے تک لے جاتی جہاں سے ڈریم سینٹر تک کا سفر شروع ہوتا تھا۔ ٹیکسی تقریباً دو گھنٹے تک شہر کی سڑکوں سے گزرتی آگے بڑھتی رہی تھی راستے میں ایک جگہ رک کر سمیر نے ایک ہائی وے ریسٹورنٹ سے کھانا بھی کھایا تھا اور پھر آگے روانہ ہو گیا تھا۔

"جناب! ٹیکسی یہاں سے آگے نہیں جا سکتی باقی سفر آپ کو پیدل یا گھوڑے پر کرنا ہوگا یہاں سے آگے کوئی سڑک نہیں جاتی۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ایک سڑک کے اختتام پر ٹیکسی روکتے ہوئے کہا۔ وہاں ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ بنا تھا جس میں چند مقامی لوگ بیٹھے قہوے کا مزہ لے رہے تھے۔

"ٹھیک ہے!" سمیر ٹیکسی سے اتر گیا اور قہوہ خانے میں داخل ہو گیا پھر ایک میز منتخب کر کے اس پر بیٹھ گیا تھا اور کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے لگا تھا جہاں دور دور تک پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں جن کی چوٹیوں پر سفید برف جمی ہوئی تھی اور نیچے وادیوں میں کہیں کہیں سرسبز درخت نظر آ رہے تھے کہیں نیچے میدانوں میں خودرو جھاڑیوں میں رنگ برنگے پھول عجب بہار دکھا رہے تھے۔

"صاحب! کیا لو گے؟" کسی نے کہا اور سمیر نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا ایک بارہ تیرہ سال کا بچہ شلوار قمیص پہنے اس کے سامنے کھڑا تھا اس کے کاندھے پر چیک دار رومال لٹکا ہوا تھا اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس قہوہ خانے کا ملازم ہے۔

"کھانے میں کیا ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"قہوہ کے ساتھ آپ کو بسکٹ باقر خانی اور کیک رس مل سکتا ہے صاحب۔" اس نے کہا۔

"ہوں اور کھانے میں؟"

"کھانا ابھی مشکل ہے...... اگر آپ اسپیشل آرڈر پر بنواؤ گے تو ایک گھنٹہ لگے گا۔" بچے نے کہا۔

"اچھا قہوہ لے آؤ...... اور یہاں کا مالک کون ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"میرا بابا۔" بچے نے جواب دیا۔

"کیا وہ موجود ہے؟"

"ہاں وہ بیٹھا ہے۔" بچے نے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا

جہاں تیس پینتیس سال کا توانا شخص بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔
"انہیں میرے پاس بھیج دو مجھے کچھ بات کرنا ہے۔" سمیر نے کہا۔
"جی اچھا۔" بچے نے مستعدی سے کہا اور چلا گیا۔
تھوڑی ہی دیر میں کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شخص اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔
"آپ نے مجھے بلایا جناب؟" اس نے کہا۔
"ہاں تم یہاں کے مالک ہو؟"
"مالک کیا صاحب بس پیٹ پالنے کا ذریعہ ہے ہم آپ کی خدمت کے لیے بیٹھے ہیں۔"
"تمہارا نام کیا ہے؟" سمیر نے پوچھا۔
"گل خان۔"
"اچھا گل خان پہلے تو یہ بتاؤ کہ یہاں کھانا مل سکتا ہے؟"
"مل تو سکتا ہے صاحب لیکن اگر کوئی گاہک فرمائش کرے تو بنا دیتے ہیں ورنہ تو بس قہوہ ہی چلتا ہے۔"
"اچھا میں بہت دور سے آیا ہوں اور مجھے کافی آگے جانا ہے میں چاہتا ہوں کہ رات یہاں کہیں گزار لوں اور صبح آگے روانہ ہو جاؤں کیا اس کا کوئی انتظام ہو سکتا ہے؟" سمیر نے پوچھا۔
"ہاں ہو تو سکتا ہے۔" گل خان نے سوچتے ہوئے کہا۔
"کبھی کوئی ایسا مسافر آتا ہے تو ہم اسے ادھر اندر ہی جگہ دے دیتے ہیں۔" گل خان نے قہوہ خانے کے اندر کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک دروازہ بنا تھا جو شاید دوسری طرف کسی کمرے میں کھلتا تھا۔
"ٹھیک ہے تم میرا لیٹنے کا انتظام کر دو اور کھانا بھی تیار کر دو اور میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" سمیر نے کہا۔
"میں کروا دیتا ہوں تب تک آپ قہوہ لو۔" گل خان نے اٹھتے ہوئے کہا اس کا بیٹا سمیر کے لیے ایک ٹرے میں قہوہ اور ساتھ پلیٹ میں کچھ بسکٹ لے آیا تھا۔
"یہ لو صاحب۔" اس نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"تمہارا کیا نام ہے۔" سمیر نے بچے سے پوچھا۔
"صنوبر خان۔" بچے نے جواب دیا۔
"پڑھتے ہو؟"
"ابھی نہیں پڑھتا پہلے پڑھتا تھا۔"
"کس کلاس میں پڑھتے تھے؟"
"میں چوتھی کلاس میں تھا پھر اسکول بند ہو گیا۔" صنوبر خان نے کہا۔
"کیوں؟ اسکول کیوں بند ہو گیا؟" سمیر نے پوچھا۔
"صاحب وہ ہمارا استاد تھا نا وہ مر گیا۔ وہ بہت بیمار تھا۔" صنوبر نے کہا۔
"تو اسکول میں کوئی اور پڑھانے والا نہیں تھا۔"
"نہیں صاحب بس ہمارا استاد اکیلا ہی تھا۔"
"تو اب اسکول بند ہو گیا۔"
"نہیں بند تو نہیں ہوا...... پر ادھر پڑھانے والا کوئی نہیں...... بچے جاتے ہیں کھیلتے کودتے ہیں اور بس۔" صنوبر خان نے ہنستے ہوئے کہا۔
"اچھا صنوبر خان میں رات کو ادھر رکوں گا۔" سمیر نے کہا تو صنوبر نے اس کی بات کاٹ دی۔
"مجھے پتہ ہے صاحب...... میرے ابو نے بتایا ہے میں تمہارا بستر لگانے جا رہا ہوں تم قہوہ پی لو پھر میں آ کر تمہیں بتاتا ہوں۔" صنوبر نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔
سمیر نے قہوہ ختم کیا تھا تو صنوبر واپس آ گیا تھا اور پھر اسے اپنے ساتھ قہوہ خانے کے اندرونی حصے میں لے گیا تھا۔
وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو قہوہ خانے کے اندرونی حصے میں بنا ہوا تھا اس کی دیواریں مٹی اور تختوں کی مدد سے بنائی گئی تھیں جن پر اندر کی جانب سے چونا کر دیا گیا تھا اور چھت بانسوں اور گھاس پھوس سے بنی تھی۔
کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو باہر کی سمت کھلی ہوئی تھی اور کمرے میں ہوا آنے کا واحد راستہ تھی کمرے میں ایک کونے میں ایک پلنگ پڑا تھا جس پر صنوبر نے بستر لگا دیا تھا ایک میز تھی جس پر مٹی کے تیل کا ایک لیمپ رکھا ہوا تھا۔
"ٹھیک ہے صنوبر۔ غسل خانہ کدھر ہے؟" سمیر نے

پوچھا۔
"ادھر۔" صنوبر نے کمرے کی پچھلی دیوار میں بنے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ سمیر نے اندازہ لگایا کہ وہ باتھ روم کمرے کے باہر بنایا گیا تھا لیکن اسکا دروازہ کمرے میں کھلتا تھا۔
"اچھا شام ہوگئی ہے میں اس وقت سوتا تو نہیں ہوں لیکن سفر کی تھکن بہت ہے میں ایک دو گھنٹے لیٹوں گا پھر کھانا کھاؤں گا اپنے ابو کو بتا دینا کہ میں رات کے کھانے پر ہی ان سے معاوضے کی بات کرلوں گا۔" سمیر نے کہا۔
"جی صاحب۔" صنوبر خان نے کہا اور چلا گیا۔
"سمیر نے اپنا سفری بیگ کمرے میں رکھی میز پر لٹا دیا تھا اور خود جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ چند ہی دن میں قسمت اسے کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ کہاں تو اس کے والدین سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے اور کہاں وہ اتنا لمبا سفر اکیلے کر رہا تھا اور کوئی اس کا مددگار نہیں تھا اس سفر کے اخراجات کے لیے رقم اس کی آنٹی سارہ نے اسے دی تھی کیونکہ اس کے والد کے اثاثے بھی ان کی موت کے بعد سیل کر دیئے گئے تھے اور کیس کا کوئی فیصلہ ہونے تک کوئی بھی انہیں استعمال نہیں کرسکتا تھا کچھ دیر بعد سمیر نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر ڈریم سینٹر کا نمبر ملایا تھا وہ انہیں اپنے پہنچنے کی اطلاع دینا چاہتا تھا ایک کال وہ آنٹی سارہ کے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے وہاں کر چکا تھا اور اسے بتایا گیا تھا کہ اسے وہاں شاہ ویز نامی شخص سے ملنا ہوگا۔
"ہیلو......ہیلو!" سمیر نے دوسری طرف سے کال ریسیو ہونے پر کہا۔
"ہیلو السلام علیکم......ڈریم سینٹر پلیز۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔
"جی مجھے شاہ ویز صاحب سے بات کرنا ہے میں سمیر احمد فاروقی بات کر رہا ہوں۔" سمیر نے کہا۔
"جی ایک سنٹ۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور چند لمحوں کی خاموشی ہوگئی۔
"ہیلو میں شاہ ویز بات کر رہا ہوں سمیر۔"
"جی میں نے آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ میں آپ کو بتا سکوں کہ میں یہاں قریبی بستی کے قہوہ خانے تک پہنچ گیا ہوں صبح تک ڈریم سینٹر پہنچ جاؤں گا۔"
"تم گل خان کے قہوہ خانے پر ہو؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔
"جی ہاں۔" سمیر نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے صبح نو بجے تک ایک شخص تمہیں لینے آجائے گا۔ تم یقیناً یہاں کے راستوں سے واقف نہیں ہوگے وہ تمہاری مدد کرے گا اور آگے کا سفر تم گھوڑے پر کرو گے۔"
"جی ٹھیک ہے۔" سمیر نے کہا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوگیا اس کے بعد سمیر کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا پھر اس کی آنکھ گل خان کی آواز پر ہی کھلی تھی۔
"آرام کرلیا ہو تو آجاؤ دوست کھانا تیار ہوگیا ہے۔" گل خان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔
"ہاں میں اٹھ گیا ہوں۔" سمیر نے بھی بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔
"تھکن بہت تھی میں لیٹتے ہی سو گیا تھا۔"
"سفر میں ایسا ہی ہوتا ہے ویسے تم کہاں سے آرہے ہو؟"
"میں بہت دور سے آیا ہوں۔" سمیر نے جان بوجھ کر جگہ کا نام بتانے سے گریز کیا۔
"ہاں لمبے سفر میں ایسی ہی تھکن ہوتی ہے۔" گل خان نے بھی جگہ کا نام جاننے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔
"آؤ باہر ہی آجاؤ کھانا میز پر لگوا دیا ہے۔" گل خان نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا اور سمیر بھی اس کے پیچھے ہی چلا گیا تھا۔
اس وقت حال میں چند ہی لوگ بیٹھے تھے کچھ کھانا کھا رہے تھے کچھ قہوہ سے دل بہلا رہے تھے۔
سمیر اس میز کی طرف بڑھ گیا جس کی طرف گل خان نے اشارہ کیا اور اس کے پہنچتے ہی صنوبر کھانا لے کر اس کی میز پر پہنچ گیا تھا۔

"کیا بنایا ہے صنوبر؟" سمیر نے پوچھا۔
"صاحب جو آپ نے کہا تھا چکن فرائی ہے۔" صنوبر نے بتایا۔
"ٹھیک ہے۔" سمیر کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔
"صاحب آپ صبح کب تک جائیں گے۔" صنوبر نے پوچھا۔
"مجھے لینے ایک شخص آئے گا صبح نو بجے اگر میں سو رہا ہوں تو مجھے اٹھا دینا۔
"ٹھیک ہے۔" صنوبر نے کہا اور چلا گیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد سمیر نے قہوہ کی ایک پیالی منگوائی تھی اور کافی دیر وہیں میز پر بیٹھا قہوہ سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔
تقریباً آدھی رات کا وقت ہوا ہو گا اچانک ہونے والے ایک کھٹکے سے سمیر کی آنکھ کھل گئی تھی کمرے میں سیاہ لباس میں ملبوس ایک سایہ کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں سمیر کا بیگ تھا سمیر تیزی سے اٹھا تھا اور اس نے سائے کو دبوچ لیا تھا۔ وہ جو بھی کوئی تھا نہایت مضبوط اعصاب کا مالک تھا اس نے ایک جھٹکے سے سمیر کو پیچھے دھکیل دیا تھا لیکن سمیر نے بھی بجلی کی سی تیزی سے اس کے ہاتھ سے اپنا بیگ چھین لیا تھا اور اچھل کر اپنی سیدھی ٹانگ اس کی کمر پر ماری تھی وہ شخص اس غیر متوقع وار سے لڑکھڑا گیا تھا لیکن خود کو سنبھالتا ہوا کھڑکی کی طرف بھاگا تھا اور ایک ہی چھلانگ میں کھڑکی سے باہر کود گیا تھا۔ شور سے قہوہ خانے کے باہر لیٹے ہوئے لوگوں کی آنکھ بھی کھل گئی تھی اور وہ شور پر سمیر کے کمرے کی طرف آئے تھے۔ گل خان کی نظر سمیر پر اس وقت پڑی تھی جب وہ اس سیاہ سائے کے پیچھے چھلانگ لگا کر کھڑکی سے باہر کود رہا تھا۔ گل خان آگے بڑھ کر اس کو پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے دیر ہو گئی تھی سمیر باہر چھلانگ لگا چکا تھا چنانچہ گل خان نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔
"سنو دوست رک جاؤ..... میری بات سنو۔" گل خان نے سمیر کو آواز دی تھی اور سمیر نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا اور اپنے پیچھے گل خان کو دیکھ کر رک گیا تھا۔
"اس کے پیچھے مت جاؤ..... یہ خطرناک ہے۔" گل خان نے زور سے کہا اس عرصے میں سیاہ سایہ دوڑتا ہوا سامنے لگے درختوں کے پیچھے جا کر غائب ہو گیا تھا سمیر نے پیچھے مڑ کر جائزہ لینے کی کوشش کی تھی کہ اندازہ لگا سکے کہ وہ سایہ کدھر گیا لیکن فضول تھا رات کے اندھیرے میں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنی دیر میں گل خان اس کے قریب آ گیا تھا۔
"اس کے پیچھے جانا فضول ہے۔" گل خان نے کہا۔
"یہ مقامی چور ہیں اکثر مسافروں کا سامان لوٹ لیتے ہیں اور اگر کوئی اکیلا شخص مزاحمت کرے تو اسے مارنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔" گل خان نے کہا۔
"وہ کھڑکی کے راستے آیا تھا شاید۔ کیونکہ باہر تو لوگ سو رہے تھے ادھر سے آتا تو آپ لوگوں کو پتہ چل جاتا۔" سمیر نے کہا۔
"ہاں صاحب کیا کروں چھوٹا سا قہوہ خانہ ہے زیادہ آمدنی نہیں ہوتی بس جتنا بنا لیا ہے اتنا ہی بنا ہوا ہے۔ کھڑکی میں لوہے کی جالی لگانی ہے کچھ پیسے جمع ہوں تو یہ کام بھی کروا لوں گا۔" گل خان نے کہا۔
"یہ تو پہلی فرصت میں کرنے والا کام ہے گل خان۔"
"جی صاحب! آپ کی کوئی چیز تو نہیں گئی؟"
"میرا خیال ہے کہ نہیں..... اس نے شاید میرا بیگ اٹھایا ہی تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔"
"اچھا ہوا آپ بچ گئے..... چلیں واپس چلیں۔"
"ہاں! چلو۔" سمیر نے بھی پلٹتے ہوئے کہا وہ لوگ بھی قہوہ خانے کے باہر بچھی چارپائیوں کی طرف چلے گئے تھے اور سمیر واپس کمرے میں آ گیا تھا اسے باہر سے گل خان اور اس کے ساتھیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں وہ کافی دیر تک جاگتے رہے تھے یہاں تک کہ صبح کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ سمیر نے کمرے میں آ کر اپنا بیگ چیک کیا تھا اس کی تمام چیزیں محفوظ تھیں اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا اور پھر لیٹ گیا تھا لیکن اب نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

کچھ دیر بعد گل خان کے قہوہ خانے میں لوگ آنے لگے تھے۔ سمیر بھی تیار ہو کر اور اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر آ گیا تھا اور ایک میز پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے صنوبر کو اشارہ کیا تھا جس نے اس کی میز پر ناشتہ لا کر رکھ دیا تھا اور سمیر ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ کاؤنٹر پر گیا تھا اور گل خان سے بل مانگا تھا۔ گل خان نے زبانی حساب کتاب کر کے اسے پیسے بتائے تھے جو سمیر نے ادا کر دیئے تھے اور گل خان کو الوداع کہہ کر قہوہ خانے سے باہر بچھی ایک چارپائی پر آ بیٹھا تھا اب اسے "ڈریم سینٹر" سے آنے والے شخص کا انتظار تھا۔

پھر تھوڑی دیر میں اسے پہاڑوں کی جانب سے ایک گھڑ سوار آتا نظر آیا تھا جس نے ایک دوسرے گھوڑے کی لگام اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ مضبوطی سے باندھی ہوئی تھی وہ تیزی سے سمیر کے قریب آ کر رکا تھا اور چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" اس نے پوچھا۔

"میں سمیر احمد ہوں۔" سمیر نے جواب دیا۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے چارپائی پر رکھے ہوئے اس سفری بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈریم سینٹر۔" سمیر نے پھر مختصر جواب دیا۔

"آ جاؤ۔" اس نے دوسرے گھوڑے کی لگام اپنے گھوڑے کی زین سے کھولتے ہوئے کہا۔

"گھڑ سواری آتی ہے؟"

"ہاں! کچھ کچھ۔" سمیر نے کہا اسے اچانک وہ زمانہ یاد آ گیا تھا جب اس کے والد اپنے گھوڑے پر بٹھا کر اسے گھڑ سواری سکھاتے تھے۔ شروع شروع میں وہ بہت ڈرتا تھا لیکن پھر عادی ہو گیا تھا لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکا تھا کہ سیاہ لباس والے اجنبی نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

"ہمارا اصل سفر آدھے گھنٹے کے بعد شروع ہوگا کیونکہ اتنی دیر میں ہم اس راستے تک پہنچیں گے جو ہمیں ڈریم سینٹر تک لے جائے گا۔" اجنبی نے کہا۔ اتنی دیر میں سمیر گھوڑے پر بیٹھ چکا تھا۔

"اور وہاں سے آگے کتنی دیر کا سفر ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"تقریباً اتنا ہی دور اور ہوگا۔" اجنبی نے کہا اور اپنا گھوڑا اسی سمت آگے بڑھا دیا۔ جدھر سے وہ آیا تھا۔

"یہ پہاڑ کتنے خوب صورت نظر آ رہے ہیں۔" سمیر نے تعریفی انداز میں کہا۔

"ان کی بلند و بالا چوٹیاں کس شان سے سر اٹھائے کھڑی ہیں اور قدرت کی شان کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔" سمیر اطراف کا جائزہ لیتا جا رہا تھا وہ اس مقام کے قدرتی حسن سے بہت متاثر ہوا تھا۔ پھر آدھے گھنٹے بعد انہیں ایک کچی پگڈنڈی نظر آ گئی تھی جو پہاڑوں کے درمیان سانپ کی طرح بل کھاتی دور تک چلی گئی تھی وہ راستہ خاصا پتھریلا تھا اور سمیر کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے گھوڑے سے گر سکتا ہے۔

"پریشان مت ہو...... یہ گھوڑے ان راستوں کے لیے ہی تیار کیے گئے ہیں اور نہایت چاق و چوبند ہیں۔" اجنبی نے کہا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟" سمیر نے پوچھا۔

"مجھے ناصر محمود کہتے ہیں...... میں ڈریم سینٹر کے سربراہ خلیل کامران کا اسسٹنٹ ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"خلیل کامران کیسے شخص ہیں؟" سمیر نے پوچھا وہ جاننا چاہتا تھا کہ اب اسے جس شخص کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا ہے اور آئندہ کے حالات کے لیے خود کو تیار کرنا ہے وہ شخص کیسی شخصیت اور صلاحیتوں کا ماہر ہے۔

"ان کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ وہ قدرتی صلاحیتوں سے بھرپور شخصیت ہیں اور ان کی نگرانی میں رہنے والے لوگ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کر کے دنیا کے مختلف مقامات پر اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔" ناصر محمود نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ڈریم سینٹر ایسے افراد کے لیے بہترین

تربیت گاہ ہے جن میں کوئی نہ کوئی خداداد صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن وہ اس کے استعمال...... یا یوں سمجھ لو کہ درست استعمال سے ناواقف ہوتے ہیں انہیں یہاں تربیت دی جاتی ہے۔''

''ہاں! میں خلیل کامران کا اسسٹنٹ ایسے ہی نہیں ہوں...... وہ مجھ پر بہت بھروسہ کرتے ہیں اور اپنے خاص کام میرے ہی ذمہ دیتے ہیں...... چلو آہستہ آہستہ تمہیں یہاں کے بارے میں معلومات ملتی رہیں گی۔'' ناصر محمود نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں وہ پگڈنڈی ایک کھلے ہوئے پہاڑی میدان میں ختم ہوگئی تھی دور دور تک پہاڑوں کے درمیان جگہ جگہ پائن کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے اور فضا میں پائن کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''واہ! لاجواب نظارہ ہے۔'' سمیر نے تعریفی انداز میں کہا۔

''اب ہم ترشوب' گاؤں کی حدود میں داخل ہوگئے ہیں وہ دیکھو...... وہ دور نیچے وادی میں تمہیں بہتی ہوئی ندی نظر آرہی ہے جس کے گرد سبز جھاڑیاں لگی ہوئی ہیں۔'' ناصر محمود نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا اور سمیر نے گھنے اور لمبے پائن کے درختوں سے جھانکتی ہوئی وادی کی طرف دیکھا جہاں صاف و شفاف پانی اپنی بہار دکھا رہا تھا اب وہ ندی کے پانی کے بہنے کی آواز بھی سن سکتا تھا۔

''اس ندی میں پائی جانے والی مچھلی یہاں کی سوغات ہیں...... بہت عمدہ اور لذیذ ہوتی ہیں۔'' ناصر محمود نے تعریف کی۔ سمیر نے سر اٹھا کر درختوں کی لمبائی کا اندازہ کرنا چاہا تو ناصر ہنسنے لگا۔

''یہ درخت ہزاروں فٹ اونچے ہیں اور بہت پرانے ہیں وہ دیکھو نیچے میدانوں میں کھلے وہ رنگ برنگے پھول کتنے خوش نما معلوم ہو رہے ہیں۔''

''ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔'' سمیر نے کہا۔ اس کی نظریں اب وادی میں جگہ جگہ کھلے اودے' نیلے' گلابی اور پیلے پھولوں پر لگی تھیں جو میدانوں میں جگہ جگہ جمی ہوئی برف سے سر اٹھائے سبزہ میں کھلے ہوئے تھے۔ برف پر سورج کی روشنی پڑ رہی تھی اور برف چمک چمک کر عجب نظارہ دکھا رہی تھی۔

''شہر سے ایک طویل ریلوے لائن یہاں آتی ہے لیکن وہ بہت پرانی ہے اور کم استعمال ہوتی ہے۔ اس جگہ پر پہنچنا آسان نہیں ہے کیونکہ راستہ ناہموار ہے اور بے شمار رکاوٹیں ہیں اور ریل کی سیٹی کی آواز بھی کبھی کبھی ہی سنائی دیتی ہے ورنہ مکمل خاموشی کا راج ہوتا ہے۔'' ناصر نے بتایا۔

سمیر توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا لیکن اس کی نظریں دور دور درختوں کے پار پھول دار جھاڑیوں اور ندی کے قریب ایک نوجوان مقامی لڑکی کو دیکھ رہی تھیں جس نے موتیوں' سیپیوں اور رنگ برنگے دھاتوں سے بنا ہوا خوش رنگ لباس پہنا ہوا تھا اور پھران کے گھوڑے اس لڑکی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ سمیر نے اپنا گھوڑا اس کے سامنے روک دیا تھا اور اس کے کندن جیسے چمکتے چہرے پر اس کی نظریں جم سی گئی تھیں۔ اس لڑکی میں کچھ ایسی کشش تھی جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور وہ لڑکی بھی جیسے سمیر کے چہرے سے نظریں ہٹانا بھول گئی تھی۔ سمیر نے محسوس کیا کہ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔

''زرتاشے!...... زرتاشے!'' اچانک فضا میں گونجنے والی آواز نے سمیر کو چونکا دیا تھا اس نے آواز کی سمت دیکھا تھا ایک ادھیڑ عمر عورت جس نے زرتاشے سے ملتا جلتا لباس پہنا ہوا تھا ان کی طرف آرہی تھی۔

''زرتاشے! میں تمہیں کتنی دیر سے ڈھونڈ رہی ہوں...... کیا بات ہے؟'' اس عورت نے کہا اور زرتاشے اس کی طرف مڑی۔

''میں...... میں مویشیوں کا انتظار کر رہی ہوں...... وہ واپس آتے ہی ہوں گے۔'' زرتاشے نے کہا۔

''بس بہت دیر ہوگئی ہے چلو...... گھر چلو۔ مویشی میں لے آؤں گی۔'' اس عورت نے کہا وہ ناگوار انداز سے سمیر اور ناصر کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن ان سے بات نہیں کی تھی۔

''تم بہت وقت برباد کرتی ہو۔'' اس نے زرتاشے سے کہا۔

"ایسے نظارے یہاں قدم قدم پر نظر آئیں گے..... ذرا سنبھل کر رہنا..... یہاں کے لوگ کسی اجنبی کی ذرا سی غلطی معاف نہیں کرتے ہیں۔" ناصر نے کہا لیکن سمیر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"ابھی ڈریم سینٹر کا کتنا فاصلہ باقی ہے؟" سمیر نے بات کا رخ بدلا۔

"بس دس' پندرہ منٹ اور لگیں گے۔"

پھر کچھ ہی دیر بعد دور پہاڑوں کے درمیان بنی' بڑی مضبوط لیکن بہت بڑی عمارت اسے نظر آئی تھی وہ پرانی طرز کی اینٹوں اور پتھروں سے بنی ہوئی تھی اس کا داخلی دروازہ دو دیواروں کے نزدیک ایک تنگ سا راستہ تھا اس عمارت کی کھڑکیاں مستطیل شکل کی تھیں اور بڑی اور کشادہ تھیں باہر کی جانب سے اس عمارت پر کوئی رنگ روغن نہیں ہوا تھا اور باہر سے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عمارت کسی خاص مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اور کسی اہم منصوبے کا حصہ ہے۔

عمارت کے قریب پہنچنے پر سمیر اور ناصر کے لیے عمارت کے بڑے اور مضبوط گیٹ کھول دیے گئے تھے اور وہ دونوں گھوڑوں سمیت اندر داخل ہو گئے تھے اندر ایک بہت بڑا میدان تھا جس کے چاروں طرف بڑے بڑے برآمدے بنے ہوئے تھے۔ جن میں برآمدوں کے ساتھ ساتھ کمرے بھی تھے اور کچھ راہداریاں عمارت کے اندرونی حصوں کی طرف جاتی تھیں عمارت دو منزلہ تھی اوپری منزل میں بھی چاروں طرف کمرے تھے جن کی مستطیل کھڑکیاں عمارت کے درمیان میں واقع بڑے سے صحن میں کھلتی تھیں اور کمروں میں روشنی جانے کا واحد راستہ تھیں۔

"آؤ! تمہیں تمہارا کمرا دکھا دوں تم فریش ہو جاؤ۔ کچھ دیر آرام کرلو۔ پھر خلیل کامران تم سے ملیں گے۔" ناصر محمود نے کہا۔ سمیر گھوڑے سے اترا تھا اور ایک شخص اس کا اور ناصر کا گھوڑا وہاں سے لے گیا تھا اور ناصر' سمیر کے ساتھ عمارت کے اندرونی گیٹ سے ایک راہداری میں داخل ہو گیا تھا جس میں کچھ فاصلے پر موجود سیڑھیوں اوپری حصے کی طرف جا رہی تھیں۔ ناصر' سمیر کو ساتھ لیے ان سیڑھیوں سے گزرتا ہوا اوپری منزل میں پہنچا تھا اور ایک کمرے کے دروازے کے پاس رک گیا تھا پھر اس نے ہاتھ سے دھکا دے کر دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل ہو گیا تھا سمیر نے اس کے ساتھ ہی کمرے میں قدم رکھا تھا۔

"یہ تمہارا کمرہ ہے۔" ناصر محمود نے کہا اور سمیر عمارت کی اندرونی تعمیر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ عمارت میں اندر بہت بڑے بڑے ہال تھے جن میں مختلف لوگ مختلف کاموں میں مصروف تھے اور یہاں موجود سہولیات کسی طرح بھی آج کی جدید اور ماڈرن دنیا سے کم نہیں تھیں۔ ناصر محمود اسے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا اور سمیر نے اپنا بیگ کمرے میں موجود الماری میں رکھ دیا تھا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا تھا کمرے میں ایک بیڈ ایک کرسی ایک الماری موجود تھی۔ عمارت میں موجود کمروں کو دیکھ کر یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہاں رہنے والے اس عمارت کو ایک ہاسٹل کے ساتھ ساتھ ایک تجربہ گاہ کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہاں مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے سمیر نے دیکھا تھا کہ لائن سے بنے ہوئے بڑے بڑے کمروں میں مختلف قسم کا سامان رکھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا جیسے سائنس' حساب' بایولوجی' فزکس غرض مختلف شعبوں کے لیے مختلف کمرے موجود تھے جن میں لوگ کاموں میں مصروف تھے۔ سمیر ابھی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کس قسم کا کام کر رہے تھے کچھ دیر بعد اس نے اٹھ کر الماری سے بیگ نکال کر اپنے کپڑے نکالے تھے اور نہانے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا تھا جب نہا کر نکلا تو ساری تھکن اتر چکی تھی اور وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد خلیل کامران نے اسے بلوایا تھا اور وہ آنے والے کے ساتھ خلیل کامران کے آفس تک گیا تھا جو نچلی منزل میں واقع تھا۔ اسے آفس تک لانے والا شخص باہر ہی ٹھہر گیا تھا اور سمیر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ خلیل کامران کا آفس کافی کشادہ تھا سامنے کی دیوار کے ساتھ ایک بڑی سی میز رکھی ہوئی تھی جس کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر خلیل کامران بیٹھا تھا وہ ادھیڑ عمر کا توانا اعصاب کا مالک شخص تھا۔ چہرے پر خطاودار داڑھی تھی جس میں کہیں کہیں سفید بال جھلک رہے

تھے اس کی نظروں میں کچھ ایسی خاص بات تھی کہ سمیر کو محسوس ہوا جیسے وہ اس کے اندر تک اترتی جا رہی ہو۔

"آؤ سمیر بیٹھو۔" اس نے سامنے پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور سمیر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں حیران ہوں تمہیں یہاں آنے میں بہت زیادہ دن لگ گئے۔" خلیل کامران نے کہا۔

"جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟" سمیر نے کہا۔

"جب تمہارے ڈیڈی نصیر احمد سے میری بات ہوئی تھی تو اب چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا اور تم اب آ رہے ہو...... وہ تو چھ ماہ پہلے یہاں آنے کے لیے روانہ ہوا تھا اور یہاں کا راستہ بہ مشکل تین دن کا ہے۔"

"جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" سمیر نے کہا وہ سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے اور انہیں کیسے بتائے کہ اس کے والدین کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

"دراصل میرے والدین کو حادثہ پیش آ گیا تھا اور شاید اسی لیے وہ آ نہیں سکے۔"

"شاید!...... کیا مطلب؟ کیا تمہیں صحیح بات پتہ نہیں ہے۔ جہاں تک میری اطلاع ہے تم ان کے ساتھ ہی آ رہے تھے؟" خلیل کامران نے پوچھا۔

"جی!...... میں خود حیران ہوں...... اور اب تک اپنے ذہن میں اٹھنے والے کئی سوالوں کے جوابات ڈھونڈ رہا ہوں۔" سمیر نے کہا۔

"کیسے سوالات؟"

"کیا آپ کو میرے ڈیڈی نے میرے بارے میں کچھ بتایا تھا؟"

"ہاں! وہ تمہارے لیے بہت پریشان تھے...... انہوں نے مختصراً یہ بتایا تھا کہ کچھ خداداد صلاحیتیں موجود ہیں مثلاً تمہیں نظر آنے والے خواب سچے ہوتے ہیں اور تم دوسروں کا ذہن پڑھ لیتے ہو تمہیں آنے والے واقعات کے بارے میں پہلے سے پتہ چل جاتا ہے اور یہ کہ تمہارے بچپن میں کسی عورت نے تمہارے بارے میں پیشن گوئی کی تھی کہ تم اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے کچھ غلط لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاؤ گے اور وہ تمہیں ہلاک کرنا چاہیں گے ایسا تمہاری 17 ویں سالگرہ کے موقع پر ہوگا اور پھر کچھ واقعات ہوئے جنہوں نے اس پیشن گوئی کو درست ثابت کر دیا اور تمہارے والدین ان واقعات سے خوف زدہ ہو گئے کہ وہ تمہیں کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کے لیے تیار ہو گئے ایسی جگہ جہاں تم محفوظ بھی ہو اور اپنی صلاحیتوں کو مزید بڑھا بھی سکو اور اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ انسانیت کی خدمت بھی کر سکو پھر کسی نے انہیں ڈریم سینٹر کے بارے میں بتایا اور وہ تمہیں یہاں بھیجنے کے لیے تیار ہو گئے۔" خلیل کامران نے تفصیل بتائی سمیر خاموشی سے سن رہا تھا۔ آج اسے اس کے ایک سوال کا جواب تو مل گیا تھا کہ اس کے والدین اسے چھٹیاں گزارنے کے بہانے گھر سے دور کیوں کرنا چاہتے تھے لیکن ابھی بہت سوالوں کے جواب اسے ڈھونڈنا تھے۔

"کیا آپ کو میرے والدین کی موت کے بارے میں علم ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"بس اتنا کہ تقریباً تین چار دن پہلے تمہاری آنٹی سارہ کا فون آیا تھا اور انہوں نے تمہارے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں اور تمہارے یہاں نہ پہنچنے کی وجہ بھی بتائی تھی اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ وہ تمہیں یہاں بھیج دیں گی۔" خلیل کامران نے کہا۔

"ہاں! شاید آپ سے بات کرنے کے بعد ہی انہوں نے مجھے آپ کا نمبر دیا تھا جو میرے ڈیڈی کے موبائل میں موجود تھا پھر میں نے یہاں آتے ہی پہلے آپ سے بات کی تھی۔"

"ہاں! مجھے یاد ہے۔"

"ایک بات تو بتاؤ...... جس شخص نے تمہیں مارنے کی کوشش کی تھی کیا اسے تم نے پہلے کبھی دیکھا تھا؟" خلیل کامران نے پوچھا۔

"جی ہاں! سب سے پہلے وہ مجھے سپر اسٹور میں نظر آیا تھا جب میں اپنی والدہ کے ساتھ شاپنگ کرنے وہاں گیا تھا۔" سمیر نے کہا اور پھر اس نے انہیں سپر اسٹور میں پیش آنے والا سارا واقعہ بھی بتا دیا تھا۔

"یعنی وہ پھر اسٹور سے تمہارا تعاقب کرتا ہوا تمہارے گھر پہنچا تھا اور پھر تمہارے ڈیڈی کی موجودگی میں تمہارے گھر کے قریب واقع جنگل میں تم پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔"

"جی! وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کے لیے خطرہ ہوں......وہ مجھے مارنا چاہتا تھا۔"

"ہوں......اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"میری والدہ مجھے لے کر گھر میں آ گئی تھی اور ڈیڈی جنگل میں ہی تھے پھر وہ بھی آ گئے تھے اور فوراً ہی گھر سے روانگی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں انہوں نے مجھے اور میری ممی کو کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ میں نے ان کا ذہن پڑھنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن میں ناکام رہا تھا انہوں نے اپنے ذہن کے دروازے مجھ پر بند کر دیے تھے اور پھر مجھے سامان کے ساتھ جیپ میں بیٹھنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ میں تھکا ہوا تھا جیپ میں بیٹھتے ہی سو گیا تھا۔"

"پھر؟......پھر کیا ہوا؟"

"پھر مجھے یاد نہیں......جب میری آنکھ کھلی تو سب کچھ بدل چکا تھا میں اپنے گھر کے ساتھ واقع اپنے گیراج میں ڈیڈی کی پرانی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑا تھا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور مجھے اپنی آنٹی سارہ کی آواز نے جگایا تھا جو مجھے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں پھر انہوں نے مجھے کار سے نکالا تھا اور مجھے بتایا تھا کہ میرے والدین قتل ہو چکے ہیں۔"

"وہ کب قتل ہوئے؟"

"جب مجھے ہوش آیا اس سے دو دن پہلے۔"

"اور تمہاری آنٹی سارہ نے تمہیں کیا بتایا؟"

"انہوں نے بتایا کہ جب میرے والدین یہاں آنے کے لیے روانہ ہو رہے تھے انہوں نے فون کر کے سارہ آنٹی کو بھی اس بارے میں بتایا تھا اور اس کے بعد ان کی میرے والدین سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی پھر انہیں پولیس نے میرے والدین کے قتل کے بارے میں بتایا تھا اور آنٹی سارہ کا کہنا تھا کہ میرے والدین کی شمالی علاقہ جات کی روانگی سے لے کر ان کے قتل تک درمیان میں چھ ماہ کا عرصہ تھا اس عرصے کے بارے میں مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کیسے گزارا۔ میں تو جیپ میں روانگی کے وقت سویا تھا اور گیراج میں پرانی کار میں اپنے والدین کے قتل کے دو دن بعد ہوش میں آیا تھا۔"

"ہوں......" خلیل کامران نے بہت گہری سانس میں ہنکارا بھرا تھا۔

"میری آنٹی نے ایک اور بات بھی کی جس نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔"

"وہ کیا بات ہے؟"

"ان کا کہنا ہے کہ اپنے والدین کے قتل کی اطلاع بھی فون پر میں نے ہی پولیس کو دی تھی جب کہ میں تو بے ہوش تھا مجھے تو کچھ یاد نہیں۔"

"حیرت انگیز۔"

اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو میں نے وہاں نوٹ کیں لیکن ابھی تک کسی کو اس کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"مثلاً......وہ کونسی باتیں ہیں؟" خلیل کامران نے پوچھا وہ نہایت دل جمعی سے سن رہے تھے۔

"جب میں نے اپنی آنٹی کے ساتھ کار سے نکل کر اپنے گھر میں پہنچا تو پولیس کے افراد ہر جگہ موجود تھے وہ میرے گھر میں......گھر کے باہر......جنگل میں سب جگہ کچھ تلاش کر رہے تھے اور میں نے دیکھا کہ باورچی خانے کے سامنے پڑی میز پر تازہ اسٹرابیری کیک پڑا تھا۔ جو میری والدہ ہی کے ہاتھ کا بنا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ میری سالگرہ پر اسٹرابیری کیک بناتی تھیں کیونکہ وہ مجھے پسند تھا اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی انہوں نے سترھویں سالگرہ کے لیے بنایا ہوگا۔ لیکن اس کیک کے ساتھ اسٹرابیری ساس نہیں تھا جو وہ ہمیشہ بناتی تھیں انہیں ساس بنانے کی مہلت نہیں ملی تھی اور انہیں قتل کر دیا گیا تھا لیکن گھر میں کہیں خون کے دھبے نہیں ملے تھے اور میرے والدین کی لاشیں جنگل سے ملی تھیں۔" میر نے تفصیل بتائی۔ خلیل کامران غور سے سن رہا تھا۔

"اور کوئی بات؟"

"ہاں......میری آنٹی نے بتایا کہ میرے والدین نے

میری سالگرہ پر دینے کے لیے apple company کا i-pad خریدا تھا وہ وہیں گھر میں رکھا ہوا ہے میں نے دیکھا تھا اور پولیس والوں کو وہ ڈیڈی کی جیپ کی اگلی سیٹ سے ملا تھا۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے..... والدین اپنے بچوں کے لیے سالگرہ کا گفٹ خریدتے ہی ہیں۔"

"نہیں..... حیرت کی بات یہ ہے کہ میرے ڈیڈی ایپل کی بنائی ہوئی چیزیں پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کبھی ایپل کا آئی پیڈ نہیں خرید سکتے اور وہ بھی میری موجودگی کے بغیر..... وہ اور ممی ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جاتے تھے اور مجھے ہر چیز میری پسند کے مطابق دلواتے تھے۔"

"پھر؟..... وہ گفٹ کس نے خریدا؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"اور سب سے بڑا سوال..... کہ تم اپنے والدین کے قتل کے وقت کہاں تھے؟" خلیل کامران نے کہا۔

"جی! اور مجھے کار میں کس نے پہنچایا..... اور چھ ماہ کے عرصے تک میں کہاں تھا۔ کیونکہ مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"ہاں! بہت سے سوالات ہیں جن کے جوابات ہمیں ڈھونڈنا ہیں..... میں نے ایک تو تمہیں اس لیے یہاں بلایا تھا کہ تم سے یہ ساری معلومات لینا تھیں اور دوسرے تمہیں یہ بتانا تھا کہ تم کو اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے تم ایسے لوگوں کے درمیان ہو جہاں تم محفوظ ہو اور جہاں تمہاری خداداد صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی جائے گی۔" خلیل کامران نے کہا۔

"یہاں تم جیسے اور لوگ ہیں جو بہت کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ یہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں مستقبل کی کامیابیوں کے لیے تجربات کیے جاتے ہیں یہاں رہنے والے تھکن کا نام نہیں جانتے انہیں بہت کم تنخواہ ملتی ہے جو پوری کی پوری بچ جاتی ہے کیونکہ انہیں یہاں زندگی کی تمام سہولتیں مفت فراہم کی جاتی ہیں انہیں ان کی صلاحیتوں کے مطابق تربیت دی جاتی ہے اور پھر اس کے مطابق کام بھی سونپے جاتے ہیں جن سے ان کی صلاحیتیں مزید نکھر کر سامنے آتی ہیں۔"

"اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟" سمیر نے کہا۔

"کل تمہیں تمہارا شیڈول مل جائے گا..... اب تو شام ہونے والی ہے تم تھکے ہوئے ہو آرام کرو۔ انشاء اللہ کل ملاقات ہوگی۔

"ٹھیک ہے۔" سمیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ دیر میں ناصر محمود تمہارے پاس آئے گا وہ تمہیں وہ ہال دکھاوے گا جہاں یہاں رہنے والے تمام لوگ کھانا کھاتے ہیں تم رات کا کھانا ناصر کے ساتھ ہی کھا لینا اور باقی باتیں ناصر تمہیں سمجھا دے گا۔" خلیل کامران نے کہا۔

پھر سمیر اس سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ چند ہی دنوں میں اس کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آ گئی تھیں اس کے والدین نے اسے کتنی پابندیوں میں پالا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اسکول میں داخلہ تک نہیں دلوایا تھا صرف اس خیال سے کہ کوئی نادیدہ قوت اسے نقصان نہ پہنچاوے۔ اسے کسی غیر شخص سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے اکیلے کہیں جانے کی اجازت نہیں تھی اس کے والدین کو اگر کہیں جانا ہوتا تو وہ اسے اکیلا گھر پر چھوڑ کر نہیں جاتے تھے۔ ساتھ لے جاتے تھے۔ اور اسے اپنی آنکھوں سے ایک سنٹ کے لیے بھی دور نہیں ہونے دیتے تھے اور آج جب کہ ان کی موت کو چند روز ہی گزرے تھے اس کی زندگی میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس نے اتنا لمبا سفر اکیلے کیا تھا اور ہر قدم پر نئے نئے لوگوں سے متعارف ہو رہا تھا۔ اسے اپنی آئندہ زندگی تنہا گزارنی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کے قتل کے معمے کو بھی سلجھانا تھا اور اپنے نادیدہ دشمن کا مقابلہ بھی کرنا تھا۔

وہ انہیں خیالات میں منہمک تھا کہ ناصر محمود اس کے کمرے میں آیا تھا اور اسے اپنے ساتھ ڈائننگ ہال میں لے گیا تھا۔ اس کا رویہ دوستانہ تھا اور اس نے کئی لوگوں سے سمیر کا تعارف بھی کروایا تھا اور بتایا تھا کہ وہ لوگ اس کے بہترین دوست ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی اس کے جیسی

صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ پھر سمیر نے کھانا کھایا تھا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

سمیر کی آنکھوں سے نیند جیسے روٹھ ہی گئی تھی۔ اس نے سونے کی بہت کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا پھر کچھ دیر بعد اسے یوں لگا کہ جیسے وہ اپنے گھر میں اپنے کمرے میں ہو اور اس کی والدہ کچن میں کام کر رہی ہوں شاید وہ کچھ پکانے کی تیاری کر رہی تھیں پھر وہ سمیر کو اپنے سامنے کھڑی نظر آئیں وہ اس کی طرف بہت پیار سے دیکھ رہی تھیں۔

"آج تمہاری سترھویں سالگرہ ہے..... تم مجھے اپنی زندگی سے بھی پیارے ہو۔" انہوں نے جیسے اس سے کہا۔ پھر ان کے ہونٹ ہل نہیں رہے تھے لیکن ان کے الفاظ کو وہ اپنے ذہن میں محسوس کر رہا تھا۔

"میں نے تمہارے لیے اسٹرابیری کیک بنایا ہے۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر کے بالوں کو درست کیا۔

"اٹھو تیار ہو جاؤ..... تمہارے ڈیڈی آنے والے ہیں..... پھر ہم مل کر تمہاری سالگرہ منائیں گے۔" وہ اس کے قریب سے ہٹ گئی تھیں۔

"میں تمہارے لیے اسٹرابیری ساس بنانے جا رہی ہوں۔" انہوں نے جیسے کمرے سے باہر جاتے ہوئے اسے پیغام دیا تھا لیکن اب وہ باہر جانے کے لیے مڑ چکی تھیں سمیر لیٹا ہوا انہیں دیکھ رہا تھا۔ لیکن ان کی باتوں کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا پھر اسے باہر سے شور کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ وہ جا کر دیکھے کہ کیا ہوا ہے لیکن اس میں اٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ وہ بے سدھ پڑا رہ گیا تھا اور پھر اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں اور وہ دنیا وما فیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔

❋ ❋ ❋ ❋

دوسری صبح وہ ناشتے سے فارغ ہو کر ڈریم سینٹر سے نکل گیا تھا۔ اور اطراف کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ان پہاڑی علاقوں میں صبح کا منظر بہت دلکش ہوتا تھا۔ پہاڑی سلسلوں کے درمیان جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ تھے جن پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ جابجا خودرو جھاڑیاں اگی تھیں جن میں مختلف قسم کے رنگ اور پھول بہار دکھا رہے تھے۔ وہ ٹہلتا ہوا آگے نکل گیا تھا کافی آگے جانے کے بعد گھاس کے میدان شروع ہو گئے تھے اور خوب صورت ندی کا صاف و شفاف پانی اپنی لہروں سے موسیقی بکھیرتا نیچے وادی کی طرف بہہ رہا تھا۔ اچانک سمیر کی نظر دور میدان میں بنے ایک گھر پر پڑی جو چھوٹا تو تھا لیکن بہت خوب صورت تھا اس کے اطراف میں کھڑکیں اور تاروں کی مدد سے ایک احاطہ بنایا گیا تھا جو شاید جانوروں سے بچاؤ کے لیے تھا۔ سمیر اس گھر کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا کہ اچانک گھر کا دروازہ کھلا اور اس میں سے زرتاشے باہر آئی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو ڈریم سینٹر آتے ہوئے اسے راستے میں ملی تھی اور جس کا مسحور کر دینے والا حسن دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔ لیکن اس سے بات کرنے کی خواہش اس کے دل ہی میں رہ گئی تھی کیونکہ زرتاشے کی ماں اسے بلانے آ گئی تھی۔ زرتاشے بھی اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"یہ تمہارا گھر ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"ہاں! خوش آمدید اجنبی۔" زرتاشے نے کہا۔

"میرا نام سمیر ہے۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"تم اس علاقے میں اجنبی لگتے ہو؟" زرتاشے نے پوچھا۔

"ہاں! میں یہاں ڈریم سینٹر میں اپنی تعلیم مکمل کرنے آیا ہوں۔" سمیر نے جواب دیا۔

"آؤ..... اندر آؤ..... ہم مہمانوں کو یونہی جانے نہیں دیتے۔" زرتاشے نے خوش اخلاقی سے کہا اور اسی وقت گھر سے اس کی ماں نکل آئی۔

"کون ہے زرتاشے؟" انہوں نے باہر آتے ہوئے پوچھا اور سمیر پر نظر پڑتے ہی وہ اسے پہچان گئی۔

"تم وہی نوجوان ہو جو کل یہاں سے گزر رہے تھے؟"

"جی ہاں۔" سمیر نے کہا۔

"یہ ڈریم سینٹر! اس میں اپنی تعلیم مکمل کرنے آئے ہیں۔" زرتاشے نے اس کا تعارف کروایا۔

"اچھا..... ہمارے علاقے میں مہمان ہیں..... آؤ اندر
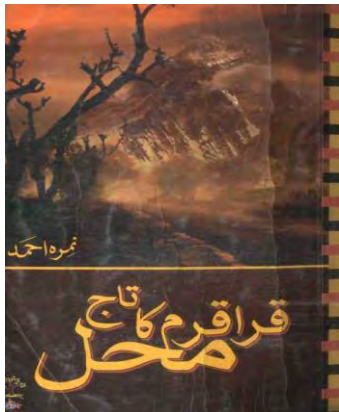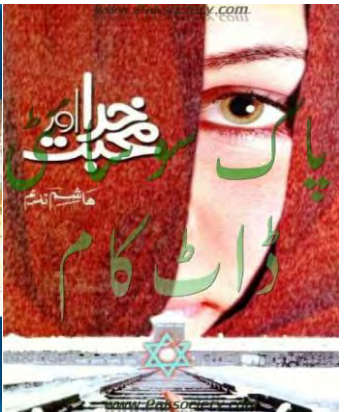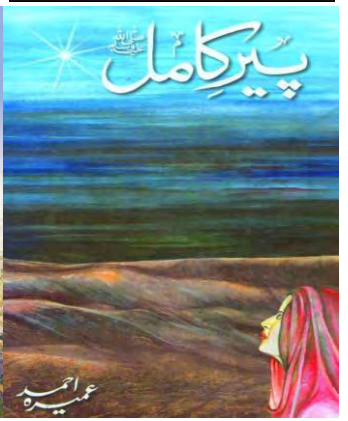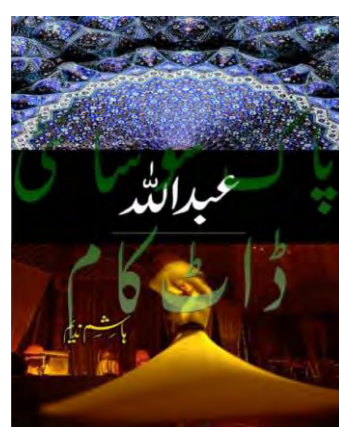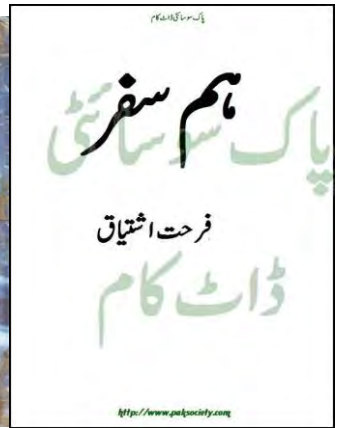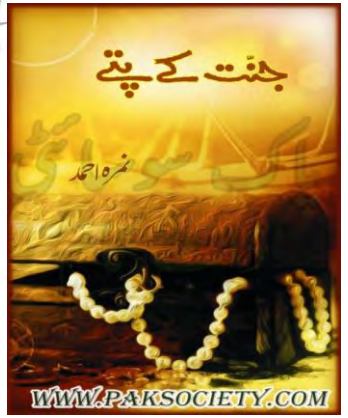
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

آ جاؤ۔" زرتاشے کی ماں نے بھی گھر میں آنے کی دعوت دی تو سمیر ان کے ساتھ ان کے گھر میں چلا گیا۔

"ان کا نام سمیر ہے۔" زرتاشے نے اپنی ماں کو بتایا۔

"اچھا نام ہے..... تم کیا پڑھتے ہو؟"

"میں سائنس کا طالب علم ہوں۔"

"ہوں..... ڈریم سینٹر بہت پرانا ادارہ ہے اور بہت اعلیٰ معیار کا کام کرتا ہے۔" زرتاشے کی ماں نے کہا۔

"آپ کب سے یہاں رہ رہی ہیں؟" سمیر نے پوچھا۔

"ہم آٹھ سال پہلے اس جگہ آئے تھے اس سے پہلے ہم اوپر پہاڑوں پر رہتے تھے۔" زرتاشے کی ماں نے کہا۔ سردیوں میں نیچے میدانوں میں آ جاتے تھے اور گرمیوں میں اوپر پہاڑ کی چوٹیوں پر چلے جاتے تھے لیکن اب پچھلے آٹھ سالوں سے ہم یہیں رہ رہے ہیں۔"

"لیکن ان علاقوں میں عام آدمی نہیں رہ سکتا یہاں سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ صرف وہی لوگ یہاں رہ سکتے ہیں جو یہاں کے موسم کے عادی ہیں اور یہاں پہاڑوں میں کان کنی کرتے ہیں۔" سمیر نے کہا۔

"ہاں میرے شوہر کی پہاڑوں پر زمرد کی ایک کان ہے وہ بہت کم نیچے علاقے میں آتا ہے اب بھی ایک ہفتے سے وہیں ہے دراصل وہ وہاں کچھ مشینری لگوا رہا ہے۔" زرتاشے کی ماں نے کہا۔

"کیا زرتاشے بھی یہاں خوش ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"نہیں؟ مجھے تو شہر میں رہنا پسند ہے۔" زرتاشہ جلدی سے بولی۔

"شہر؟..... تم نے شہر دیکھا ہے کیسا ہوتا ہے؟" سمیر نے پوچھا۔

"ہاں! جب میں چھوٹی تھی تو یہ "خوش آب" شہر میں اپنی خالہ کے ساتھ چار سال رہی تب یہ اسکول میں پڑھتی تھی پھر میں واپس لے آئی۔" زرتاشے کی ماں نے بتایا۔

"مجھے تو وہ شہر بہت اچھا لگا..... پکی سڑکیں، پکے گھر، اسکول، اسپتال، ہوٹل۔" زرتاشے خوش ہو کر بتا رہی تھی۔

"کیا تم پھر وہاں جانا چاہو گی؟" سمیر نے پوچھا اور سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں! ضرور اگر مجھے موقع ملا تو ضرور جاؤں گی۔"

"یہ وائلن کون بجاتا ہے؟" سمیر نے دیوار پر لگا وائلن دیکھ کر کہا۔

"یہ زرتاشے کا شوق ہے۔" اس کی ماں نے کہا۔

"بہت خوب..... یہ بجانا کس نے سکھایا؟"

"مجھے اسکول میں میری میوزک ٹیچر سکھاتے تھے۔" زرتاشے نے کہا۔

"اچھا! آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی میں چلتا ہوں پھر ملاقات ہو گی۔" سمیر نے کہا اور واپسی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ زرتاشے نے یوں چونک کر اسے دیکھا تھا جیسے وہ نہ چاہتی ہو کہ سمیر ابھی جائے۔

"ٹھیک ہے سمیر! آتے رہنا۔" زرتاشے کی ماں نے کہا اور سمیر ان سے رخصت ہو کر واپسی کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس نے زرتاشے میں کچھ ایسی بات محسوس کی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکا تھا لیکن کچھ تھا جو اسے بار بار زرتاشے کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر رہا تھا۔

وہ ڈریم سینٹر پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ خلیل کامران اس کا انتظار کر رہے ہیں وہ سیدھا ان کے آفس پہنچ گیا۔

"تم بتا کر بھی نہیں گئے تھے کہ کہاں جا رہے ہو؟" خلیل کامران نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"میں تو ناشتہ کر کے ٹہلنے باہر نکلا تھا کہیں خاص طور پر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔"

"ٹھیک ہے لیکن یہ جگہ تمہارے لیے اجنبی ہے اکیلے باہر نہ جاؤ جب تک میں اجازت نہ دوں اور جاؤ تو کسی کو ساتھ لے کر جاؤ۔" خلیل کامران نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں خیال رکھوں گا۔"

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)